

ماہیاتی نمونہ کے اہم اجزاء کے اصول و ضوابط اور حیثیاتی تحقیق کے یہ نمونہ مسائل
اور مختلف مسائل حل کرنے کے لیے مسائل اور مسائل کے حل کے لیے مسائل

مالی معاملات

اصولی مباحث اور جدید تحقیقات

1



مصطفیٰ شاہ محمد شاہ
فاضل و متخصیص مدرسہ دارالعلوم کراچی

آکا اذیتہ الحسنات

مَالِيّ مُعَامَلَات

اصولی مباحث اور جدید تحقیقات

جلد اول

مالیاتی فقہ کے اہم ابواب کے اصول و ضوابط اور مباحث کی تلخیص، قدم و جدید مسائل اور مختلف رسائل و جرائد میں مالی معاملات پر شائع شدہ تحقیقی مقالات و مضامین کا دلچسپ مجموعہ

مفتی شام محمد شاد

فاضل و متخصّص ہائے دارالعلوم کراچی

اِكَادِمِيَّةُ الْحَسَنِ

لِلطَّبَاعَةِ وَالنَّشْرِ وَالتَّعْلِيمِ

جملہ حقوق بحق مولف محفوظ ہیں

یہ کتاب یا اس کا کوئی بھی حصہ مصنف کی تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اور اس کی پی ڈی ایف / سافٹ کاپی بنانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ بصورت دیگر قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

نام کتاب:----- مالی معاملات: اصولی مباحث اور جدید تحقیقات
مولف:----- مفتی شاد محمد شاد

ISBN----- (978-969-23664-0-3)

اشاعت اول:----- اکتوبر، ۲۰۲۲ء

ناشر:----- اکادمیہ الحسان

ای میل:----- shadkhan654@gmail.com

فون نمبر:----- +923443884654

ملنے کے پتے:

الحسان اکیڈمی، اسلام آباد----- 03443884654

مکتبہ الایمان، کراچی----- 03212466024

مکتبہ عزیز، بنوری ٹاؤن، کراچی----- 03002343814

مکتبہ حسنین، محلہ جنگلی، پشاور----- 03155252835

مکتبہ سید احمد شہید، لاہور----- 03013668272

مکتبہ عثمانیہ، کمیٹی چوک راولپنڈی----- 03335141413

فہرست

صفحہ	عنوان
۳۲	احساب
۳۳	تقریظ حضرت مولانا شیخ عبدالمنان صاحب مدظلہم
۳۶	تقریظ حضرت مولانا شیخ حسین ظلیل رحیل صاحب مدظلہم
۳۷	عرض مصنف

مقدمہ

فقہ اور معاملات کا تعارف

۴۳	۱۔ فقہ کا تعارف
۴۳	۱۔ فقہ کی تعریف
۴۴	۲۔ فقہ کا موضوع
۴۴	۳۔ فقہ کے مآخذ
۴۴	۴۔ فقہ کے اہم ابواب
۴۶	۵۔ شریعت اور فقہ میں فرق
۴۷	۶۔ مکاتب فقہ
۴۸	۲۔ معاملات کا تعارف
۴۸	۱۔ معاملات کا تعارف

- ۵۰ ۲۔ اہم ضوابط
- ۵۲ ۳۔ معاملات کی اقسام
- ۵۳ ۱۔ معاوضات
- ۵۳ ۲۔ تبرعات
- ۵۳ ۳۔ استقانات
- ۵۳ ۴۔ اطلاعات
- ۵۴ ۵۔ تھیوریات
- ۵۴ ۶۔ مشارکات
- ۵۴ ۷۔ توشیحات
- ۵۵ ۸۔ استسفاتانات
- ۵۵ ۳۔ معاملات کے مصادر
- ۵۶ ۳۔ نقد المعاملات کا مطالعاتی نصاب
- ۶۲ ۴۔ معاملات کے مسائل کیسے حل کریں؟
- ۶۲ ۱۔ توجہ الی اللہ
- ۶۳ ۲۔ سوال کا فہم، تحلیل اور فقہی تکمیف
- ۶۳ الف۔ معلومات
- ۶۳ ب۔ ماہرین سے رابطہ
- ۶۳ ج۔ تحلیل و تجزیہ
- ۶۳ د۔ فقہی تکمیف
- ۶۵ ۳۔ کتاب و سنت سے جواب
- ۶۵ ۴۔ فقہی کتب میں جواب کی تلاش
- ۶۶ ۱۔ صریح جزیئہ

۶۶	۲۔ تخریج
۶۶	۵۔ فتاویٰ میں جواب کی تلاش
۶۶	۶۔ قواعد کی روشنی میں جواب
۶۸	۷۔ فقہی اکیڈمیز کی قراردادیں
۶۸	۸۔ معاصر فقہاء کی تحقیقات و بحوث
۶۸	۹۔ پی ایچ ڈی و ایم فل مقالات

پہلا باب

بیوع اور ربا کے اصولی مباحث اور معاصر صورتیں (Sale and Interest)

۷۱	پہلی فصل : بیوع کے اصولی مباحث و احکام
۷۱	۱۔ بیوع کا تعارف، ارکان، شرائط اور اقسام
۷۱	۱۔ بیع (خرید و فروخت) کا تعارف
۷۱	الف۔ بیع کی تعریف
۷۱	ب۔ اہم اصطلاحات
۷۳	ج۔ مال کیا ہے؟
۷۶	د۔ مستقوم کسے کہتے ہیں؟
۷۸	ھ۔ مال کی اقسام
۷۹	۲۔ بیع کے ارکان
۷۹	الف۔ بیع کے ارکان کونسے ہیں؟
۷۹	ب۔ ایجاب و قبول کی تعریف
۸۰	ج۔ ایجاب و قبول کی صورتیں

- ۸۰۔ ۱۰۲۔ زبانی الفاظ اور تحریر کے ذریعے
- ۸۱۔ سکوت
- ۸۱۔ اشارہ
- ۸۱۔ عمل کے ذریعے
- ۸۲۔ ۱۔ ایجاب و قبول معتبر ہونے کی شرائط
- ۸۳۔ ۵۔ خیاب مجلس
- ۸۴۔ ۱۔ ایجاب کب ساقط ہوگا؟
- ۸۴۔ ۲۔ ایجاب و قبول بذریعہ آلات جدیدہ
- ۸۴۔ ۱۔ ایجاب و قبول بذریعہ فون
- ۸۴۔ ۲۔ ایجاب و قبول بذریعہ تحریر
- ۸۶۔ ۳۔ بیع کی شرائط
- ۸۶۔ ۱۔ شرائط انعقاد
- ۸۷۔ الف۔ عاقد کی شرائط
- ۸۷۔ ب۔ عقد کی شرائط
- ۸۷۔ ج۔ مکان عقد کی شرائط
- ۸۷۔ د۔ معقود علیہ (مبیع) کی شرائط
- ۸۷۔ ۲۔ شرائط صحت
- ۸۸۔ ۱۔ شرائط عامہ
- ۸۹۔ ۲۔ شرائط خاصہ
- ۸۹۔ ۳۔ شرائط نفاذ
- ۹۰۔ ۴۔ شرائط لزوم
- ۹۱۔ ۵۔ اہم شرائط کی تفصیل

- ۹۱ • صحیح کی شرائط
- ۹۲ • قیمت سے متعلق شرائط
- ۹۳ • وقتِ ادائیگی سے متعلق شرائط
- ۹۳ رضامندی کی شرط اور اس میں خلل ڈالنے والی چیزیں
- ۹۳ ۱۔ اکراہ (Coercion)
- ۹۳ ۲۔ اضطرار (Dire Need)
- ۹۳ ۳۔ تغیر (Misrepresentation)
- ۹۳ ۴۔ تدلیس (Fraud)
- ۹۵ ۵۔ خطا (Mistake)
- ۹۵ ۶۔ ہزل (joke)
- ۹۵ ۳۔ بیع کی اقسام
- ۹۸ ۲۔ بیوع کی اقسام کا تفصیلی تعارف و احکام
- ۹۹ ۱۔ بیوع کی جائز اقسام
- ۹۹ ۱۔ بیع صحیح (Valid Sale)
- ۹۹ ۱۔ بیع صحیح کا مفہوم
- ۹۹ ۲۔ بیع صحیح کے احکام
- ۱۰۰ ۳۔ ضمان کے مسائل
- ۱۰۰ ۱۔ المقبوض علی سوم النظر
- ۱۰۰ ۲۔ المقبوض علی سوم الشراء
- ۱۰۰ ۳۔ المقبوض للتجربة
- ۱۰۱ ۳۔ بیع کے بعد ضمان
- ۱۰۱ ۳۔ کونسی چیزیں بیع میں داخل ہوں گی؟

- ۱۰۲ ۲۔ بیع موقوف کا تعارف و احکام (Suspended Sale)
- ۱۰۲ ۱۔ بیع موقوف کا مفہوم
- ۱۰۳ ۲۔ بیع موقوف کی صورتیں
- ۱۰۳ ۳۔ فضولی کی بیع کے احکام
- ۱۰۳ ۱۔ فضولی کی تعریف
- ۱۰۳ ۲۔ بیع فضولی کا حکم
- ۱۰۳ ۳۔ شرائط
- ۱۰۴ ۴۔ مالک کی اجازت
- ۱۰۵ ۳۔ بیع صرف کا تعارف و احکام (Exchange of Gold and Silver)
- ۱۰۵ ۱۔ عمومی ضوابط
- ۱۰۶ ۲۔ بیع صرف کا مفہوم
- ۱۰۷ ۳۔ بیع صرف کی خاص شرائط
- ۱۰۷ ۱۔ مجلس عقد میں عوضین پر قبضہ
- ۱۰۷ ۲۔ تماثل / برابری
- ۱۰۷ ۳۔ خیال شرط
- ۱۰۸ ۴۔ اجل
- ۱۰۸ ۴۔ صرف مافی الذمہ
- ۱۰۸ ۵۔ کونسی صورت بیع صرف کی ہے کونسی نہیں؟
- ۱۰۹ ۶۔ سونا/چاندی کے علاوہ اثمان کا حکم
- ۱۰۹ ۷۔ موجودہ کرنسی / نقد کی حیثیت
- ۱۱۰ ۸۔ چیک پر قبضہ
- ۱۱۱ ۹۔ سفیر اور اس کا حکم

- ۱۱۱ الف۔ سفتجہ کا مفہوم
- ۱۱۱ ب۔ فقہی تکلیف
- ۱۱۱ ج۔ حکم شرعی
- ۱۱۲ د۔ منی آرڈر / ایزی پیسہ
- ۱۱۲ ۱۰۔ کرنسی کے ذریعے سونا خریدنا
- ۱۱۳ ۱۱۔ تماشل / مساوات کا مطلب
- ۱۱۳ ۱۲۔ بیع مقایضہ (Barter Sale)
- ۱۱۳ ۱۔ مقایضہ کی تعریف
- ۱۱۳ ۲۔ مقایضہ کا حکم
- ۱۱۳ ۳۔ مقایضہ اور عام بیع میں فرق
- ۱۱۵ ۵۔ بیع الحال (Cash/Spot Sale)
- ۱۱۵ ۱۔ بیع حال کی تعریف
- ۱۱۵ ۲۔ بیع حال کا حکم
- ۱۱۵ ۳۔ بیان مدت کے بغیر خریداری
- ۱۱۶ ۴۔ پہلے چیز حوالہ کی جائے گی یا قیمت؟
- ۱۱۷ ۵۔ قیمت کی وصولی کے لیے چیز کو روکنا
- ۱۱۷ ۶۔ بیعانہ (Token Money)
- ۱۱۸ ۱۔ بیع المؤجل (Deferred Sale)
- ۱۱۸ ۱۔ بیع المؤجل کی تعریف
- ۱۱۹ ۲۔ اہم شرائط و احکام
- ۱۱۹ ۳۔ بیع الکالی بالکالی
- ۱۱۹ ۳۔ ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا

- ۱۲۰ ۷۔ بیع سلم (Forward Sale)
- ۱۲۰ ۱۔ بیع سلم کی تعریف
- ۱۲۱ ۲۔ بیع سلم کی مشروعیت
- ۱۲۱ ۳۔ بیع سلم کی شرائط
- ۱۲۱ ۱۔ عقد کی شرائط
- ۱۲۲ ۲۔ راس المال (ثمن) کی شرائط
- ۱۲۲ پہلی شرط: علم
- ۱۲۲ دوسری شرط: قبضہ
- ۱۲۳ ۳۔ مسلم فیہ (مبیع) کی شرائط
- ۱۲۳ پہلی شرط: علم
- ۱۲۳ دوسری شرط: مثلی ہونا
- ۱۲۳ تیسری شرط: مقدور تسلیم ہونا
- ۱۲۴ ۴۔ تسلیم کی شرائط
- ۱۲۴ پہلی شرط: ادھار
- ۱۲۴ دوسری شرط: مقام کا علم
- ۱۲۴ تیسری شرط: چیز میں تبدیلی نہ ہو
- ۱۲۵ ۴۔ عوضین/بدلین کے دو اہم اصول
- ۱۲۵ پہلا اصول: عوضین/بدلین حسی و مادی ہوں
- ۱۲۵ دوسرا اصول: عوضین/بدلین میں ربا کی کوئی ایک علت نہ پائی جائے
- ۱۲۶ ۵۔ ثمن/ کرنسی میں سلم
- ۱۲۷ ۶۔ شئیرز میں سلم
- ۱۲۷ ۷۔ متوازی سلم

۱۲۸	۸۔ سونا، چاندی میں سلم
۱۲۸	۸۔ استقناع (Manufacturing Contract)
۱۲۸	۱۔ استقناع کی تعریف
۱۲۹	۲۔ بیع سلم اور استقناع میں فرق
۱۳۰	۳۔ استقناع کی مشروعیت
۱۳۰	۳۔ استقناع کی فقہی تکمیف
۱۳۰	۵۔ استقناع کا لزوم
۱۳۱	۶۔ استقناع کی شرائط
۱۳۲	۷۔ مصنوع کے احکام
۱۳۳	۸۔ ثمن کے احکام
۱۳۳	۹۔ معاصر صورتیں
۱۳۳	• تعمیراتی کام
۱۳۳	• فلیٹوں کی خرید و فروخت
۱۳۳	• گاڑیوں کی بیگ
۱۳۵	۹۔ مراہقہ (Cost plus Profit)
۱۳۵	۱۔ مراہقہ کی تعریف
۱۳۶	۲۔ مراہقہ کا ثبوت
۱۳۶	۳۔ مراہقہ و عام بیع میں فرق
۱۳۶	۴۔ مراہقہ للأمر بالشراء
۱۳۷	۵۔ مراہقہ کی شرائط
۱۳۷	۶۔ اصل قیمت کا مطلب
۱۳۸	۷۔ ایپورٹ چیزوں میں مراہقہ

- ۱۳۹ ۸۔ قیمت میں اخراجات کو شامل کرنا
- ۱۴۰ ۹۔ عقد مراہقہ میں خیانت
- ۱۴۱ ۱۰۔ ۱۱۔ تولیہ، وضعیہ (Cost to Cost Sale/Less than Cost)
- ۱۴۲ ۱۲۔ مساومہ (Bargaining Price)
- ۱۴۳ ۲۔ بیوع کی ممنوع اقسام
- ۱۴۳ ۱۔ بیع باطل کا تعارف و احکام (Void Sale)
- ۱۴۳ ۱۔ بیع باطل کی تعریف
- ۱۴۴ ۲۔ حکم شرعی
- ۱۴۴ ۳۔ بیع باطل کی اقسام
- ۱۴۴ پہلی قسم: زر کو بیع میں خلل
- ۱۴۵ دوسری قسم: محل بیع میں خلل
- ۱۴۶ تیسری قسم: صحیح و باطل کا اجتماع
- ۱۴۷ ۲۔ بیع فاسد کا تعارف و احکام (Irregular Sale)
- ۱۴۸ ۱۔ بیع فاسد کا مفہوم
- ۱۴۸ ۲۔ بیع فاسد کے اسباب
- ۱۴۸ پہلا سبب: قیمت میں خرابی
- ۱۴۹ دوسرا سبب: مبیع میں خرابی
- ۱۵۰ تیسرا سبب: عقد میں خرابی
- ۱۵۱ ۳۔ بیع فاسد کا شرعی حکم
- ۱۵۱ ۴۔ چیز واپسی کے قابل نہ رہے
- ۱۵۲ ۵۔ چیز میں نقصان ہو جائے
- ۱۵۲ ۱۔ خریدار، مبیع یا آفتِ مساویہ کا سبب

- ۱۵۲ ۲۔ فروخت کنندہ کا سبب
- ۱۵۲ ۳۔ اجنبی کا سبب
- ۱۵۳ ۳۔ بیع مکروہ کا تعارف و احکام (Disliked Sale)
- ۱۵۳ ۱۔ بیع مکروہ کا مفہوم اور حکم
- ۱۵۳ ۲۔ بیع مکروہ کی صورتیں
- ۱۵۳ ۱۔ دوسرے مسلمان کی بیع پر بیع کرنا
- ۱۵۴ ۲۔ دوسرے کی بھائی یا بیوی میں مداخلت کرنا
- ۱۵۵ ۳۔ اذان جمعہ کے بعد خرید و فروخت
- ۱۵۶ ۳۔ نجش (False Bidding)
- ۱۵۷ ۵۔ تلقی رکبان یا تلقی جلب
- ۱۵۸ ۶۔ بیع الحاضر للبادی
- ۱۵۹ ۷۔ احکار (Hoarding/Monopoly)
- ۱۶۰ ۴۔ بیع الحصاة
- ۱۶۱ ۵۔ بیع الملامسہ
- ۱۶۱ ۶۔ بیع المناذہ
- ۱۶۲ ۷۔ بیع المرابنہ
- ۱۶۲ ۸۔ بیع الحاقہ
- ۱۶۳ ۹۔ بیع الجازفہ
- ۱۶۳ ۱۰۔ صفقہ فی صفقہ
- ۱۶۵ اقالہ (Rescission Contract)
- ۱۶۶ ۱۔ تعریف
- ۱۶۶ ۲۔ حکم شرعی

- ۱۶۶ ۳۔ اقالہ کی حقیقت
- ۱۶۷ ۴۔ شرائط
- ۱۶۸ ۳۔ خیارات کا تعارف و احکام (Options in Sale)
- ۱۷۰ ۱۔ خیارات شرمیہ
- ۱۷۰ ۱۔ خیاریت (Option of Inspection)
- ۱۷۰ ۱۔ خیاریت کی تعریف
- ۱۷۰ ۲۔ فقہاء کی آراء
- ۱۷۱ ۳۔ کیا بائع کو یہ اختیار حاصل ہوگا؟
- ۱۷۱ ۴۔ کتنا دیکھنا کافی ہے؟
- ۱۷۲ ۵۔ بین الاقوامی تجارت میں خیاریت
- ۱۷۲ ۲۔ خیاریت عیب (Option of Defect)
- ۱۷۲ ۱۔ خیاریت عیب کا تعارف
- ۱۷۳ ۲۔ شرائط
- ۱۷۳ ۱۔ عیب معتبر ہو
- ۱۷۳ ۲۔ خریدار کو عیب کا علم نہ ہو
- ۱۷۳ ۳۔ خریدار عیب پر راضی نہ ہو
- ۱۷۵ ۴۔ بغیر عذر تاخیر نہ ہو
- ۱۷۵ ۵۔ عیب سے براءت کی شرط نہ لگائی ہو
- ۱۷۵ ۳۔ کیا فوراً واپس کرنا ضروری ہے؟
- ۱۷۵ ۴۔ اگر بائع نے عیب ختم کر دیا
- ۱۷۶ ۵۔ موانع رد
- ۱۷۷ ۶۔ بعض چیزیں عیب نکل آئی

- ۱۷۷ ۳۔ خیاء مغبون (Option of Ddefraud)
- ۱۷۸ ۱۔ خیاء مغبون کی تعریف
- ۱۷۸ ۲۔ حکم شرعی
- ۱۷۹ ۴۔ خیاء تغیر (Option of Misrepresentation)
- ۱۸۰ ۱۔ خیاء تغیر کی تعریف
- ۱۸۰ ۲۔ خیاء تغیر کی صورتیں
- ۱۸۱ ۴۔ خیاءات وضعیہ
- ۱۸۱ ۱۔ خیاءات الوصف (Option of Description)
- ۱۸۱ ۱۔ تعریف
- ۱۸۲ ۲۔ خیاء وصف اور خیاء عیب میں فرق
- ۱۸۳ ۳۔ شرائط
- ۱۸۳ ۴۔ حکم شرعی
- ۱۸۳ ۴۔ خیاء شرط (Option of Stipulation)
- ۱۸۳ ۱۔ خیاء شرط کا تعارف
- ۱۸۵ ۲۔ خیاء شرط کی مدت
- ۱۸۵ ۳۔ خیاء شرط کا ملکیت پر اثر
- ۱۸۶ ۴۔ خیاء شرط کب ختم ہوگا؟
- ۱۸۷ ۴۔ خیاء تعیین (Option of Determination)
- ۱۸۷ ۱۔ خیاء تعیین کا تعارف
- ۱۸۸ ۲۔ حکم شرعی
- ۱۸۸ ۳۔ شرائط
- ۱۸۹ ۴۔ خیاء نقد (Option due to Non-payment)

- ۱۸۹ ۱۔ خیاری نقد کی تعریف
- ۱۹۰ ۲۔ حکم شرعی
- ۱۹۰ ۳۔ خیاری نقد کی مدت
- ۱۹۱ ۳۔ بیوع کی معاصرہ جدید اسماٹ
- ۱۹۱ ۱۔ بیع تعاطلی (Sale by Act)
- ۱۹۱ ۱۔ بیع تعاطلی کی تعریف
- ۱۹۲ ۲۔ حکم شرعی
- ۱۹۲ ۳۔ شرائط
- ۱۹۳ ۳۔ اقالہ و اجارہ میں تعاطلی
- ۱۹۳ ۲۔ بیع التجار (Supply Sale)
- ۱۹۳ ۱۔ بیع الاتجار کا تعارف
- ۱۹۳ ۲۔ بنیادی صورتیں
- ۱۹۳ پہلی صورت: استرجار بمبلغ مقدم
- ۱۹۳ دوسری صورت: استرجار بمبلغ مؤخر
- ۱۹۵ ۳۔ فقہاء کی آراء
- ۱۹۵ ۳۔ احکام شرعیہ
- ۱۹۵ ۱۔ بمبلغ مؤخر
- ۱۹۶ ۲۔ بمبلغ مقدم
- ۱۹۷ ۳۔ مزایدہ (Auction)
- ۱۹۷ ۱۔ مزایدہ کا تعارف
- ۱۹۸ ۲۔ حکم شرعی
- ۱۹۹ ۳۔ ایجاب و قبول

- ۱۹۹ ۴۔ دو سوالات
- ۱۹۹ ۱۔ کیا فروخت کنندہ پر زیادہ بولی لازم ہے؟
- ۱۹۹ ۲۔ کیا بولی لگانے والوں پر بولی لازم ہے؟
- ۲۰۰ ۴۔ مناقصہ (Reverse Auction)
- ۲۰۰ ۱۔ مناقصہ کی تعریف
- ۲۰۰ ۲۔ بنیادی احکام
- ۲۰۱ ۳۔ اتفاقیات التورید
- ۲۰۳ ۵۔ بیع عینہ (Buyback)
- ۲۰۳ ۱۔ بیع عینہ کا تعارف
- ۲۰۳ ۲۔ حکم شرعی
- ۲۰۳ ۳۔ جائز صورتیں
- ۲۰۳ ۶۔ تورق (Monetization)
- ۲۰۵ ۱۔ تورق کی تعریف
- ۲۰۵ ۲۔ حکم شرعی
- ۲۰۵ ۳۔ صورتیں
- ۲۰۶ ۱۔ اتفاقی تورق
- ۲۰۶ ۲۔ منظم تورق
- ۲۰۶ ۳۔ تورق عکسی
- ۲۰۶ ۴۔ تورق مصرنی
- ۲۰۹ ۷۔ بیع بالتقسیط (Installment Credit Sale)
- ۲۰۹ ۱۔ بیع بالتقسیط کا تعارف
- ۲۱۰ ۲۔ شرائط

- ۲۱۰ ۳۔ جلدی ادا کیلئے ڈسکاؤنٹ
- ۲۱۱ ۴۔ تاخیر پر جرمانہ
- ۲۱۱ الف۔ اصل حکم
- ۲۱۱ ب۔ متبادل صورت
- ۲۱۲ ۸۔ وضع و تعجل (Discount for Accelerated Payment)
- ۲۱۳ ۱۔ وضع و تعجل کی تعریف
- ۲۱۳ ۲۔ حکم شرعی
- ۲۱۳ ۳۔ شرائط
- ۲۱۵ ۹۔ عربون (Earnest Money)
- ۲۱۵ ۱۔ عربون کا تعارف
- ۲۱۵ ۲۔ حکم شرعی
- ۲۱۷ ۱۰۔ ہامش الجدیہ (Security Deposit)
- ۲۱۷ ۱۔ ہامش الجدیہ کا تعارف
- ۲۱۸ ۲۔ فقہاء کی آراء
- ۲۱۸ ۳۔ حکم شرعی
- ۲۲۰ ۱۱۔ عقد البناء و التشنیل (B-O-T)
- ۲۲۰ ۱۔ عقد البناء و التشنیل کا تعارف
- ۲۲۱ ۲۔ عقد البناء و التشنیل کی فقہی حیثیت
- ۲۲۳ ۵۔ خرید و فروخت میں اضافی شرط لگانا
- ۲۲۳ ۱۔ شرط کی تعریف
- ۲۲۵ ۲۔ خرید و فروخت میں اضافی شرط کا مفہوم
- ۲۲۵ ۳۔ فقہاء کی آراء

- ۲۲۵ ۱-ظاہریہ کا منج
- ۲۲۶ ۲-فقہاء شافعیہ کا منج
- ۲۲۷ ۳-فقہاء مالکیہ کا منج
- ۲۲۷ ۴-فقہاء حنبلیہ کا منج
- ۲۲۸ ۵-فقہاء حنفیہ کا منج
- ۲۲۹ ۱-جائز شرائط
- ۲۲۹ ۲-فاسد شرائط
- ۲۳۰ ۱-فقہاء کی آراء
- ۲۳۰ ۲-فاسد شرط کا الحاق
- ۲۳۱ ۳-لغو/باطل شرائط
- ۲۳۲ ۶-خرید و فروخت کے اہم جدید مسائل
- ۲۳۲ ۱-خریداری سے پہلے آگے بیچنا (sale without ownership)
- ۲۳۲ ۲-قبضہ سے پہلے آگے بیچنا (sale without possession)
- ۲۳۳ ۳-ڈیلیوری آرڈر (D.O) کے ذریعے خرید و فروخت
- ۲۳۳ ۴-انوائس (invoice)
- ۲۳۵ ۵-مال میں کمی بیشی
- ۲۳۵ ۶-خریدار کو ڈسکاؤنٹ دینا
- ۲۳۶ ۷-حرام تصاویر والی اشیاء کی خرید و فروخت
- ۲۳۷ ۸-کسی کے نام پر چیز خریدنا/زمین کسی کے نام کرنا
- ۲۳۸ ۹-رقوم کی ترسیل/بھندی
- ۲۳۹ ۱۰-خرید و فروخت میں دوبارہ تولنے یا مانپنے کا حکم
- ۲۴۱ ۱۱-سیمنز (semen) کی خرید و فروخت

- ۲۳۲ ۱۲۔ حرام اجزاء پر مشتمل فیہ
- ۲۳۳ ۱۳۔ تصاویر اور گزیٹوں کی خرید و فروخت
- ۲۳۵ ۱۴۔ نجس و ناپاک اشیاء کی خرید و فروخت
- ۲۳۶ ۱۵۔ پرندوں اور جانوروں کی خرید و فروخت
- ۲۳۶ ۱۶۔ خرید و فروخت میں ”غلطی“ کی شرعی حیثیت
- ۲۳۷ ۱۔ الفاظ میں خطایا غلطی
- ۲۳۷ ۲۔ چیز کے وجود میں غلطی
- ۲۳۸ ۳۔ ملکیت میں غلط فہمی
- ۲۳۸ ۴۔ چیز کی معرفت میں غلطی
- ۲۳۹ ۱۷۔ خرید و فروخت میں ”غلط بیانی“ کا حکم
- ۲۵۰ ۱۔ چیز کی جنس میں غلط بیانی
- ۲۵۰ ۲۔ چیز کی صفت میں غلط بیانی
- ۲۵۰ ۳۔ چیز کی مارکیٹ ویلیو بتانے میں غلط بیانی
- ۲۵۱ ۱۔ بیوع کے عمومی ضوابط
- ۲۵۵ دوسری فصل: رہا کے اصولی مباحث و احکام
- ۲۵۵ ۱۔ رہا کا تعارف و اقسام
- ۲۵۵ الف۔ رہا الدین (Interest in Loan)
- ۲۵۶ ب۔ رہا البیع (Interest in Sale)
- ۲۵۷ ۲۔ رہا کی حرمت
- ۲۵۸ ۳۔ رہا کی شرائط
- ۲۵۹ ۱۔ معاملہ کرنے والوں کی شرائط
- ۲۵۹ پہلی شرط: معاملہ کرنے والوں کی ملکیت معصوم ہو

- ۲۵۹ ۱۔ دارالحرب میں سود
- ۲۶۰ ۲۔ دارالحرب کے مسلمان کا مال
- ۲۶۱ ۳۔ غیر مسلم ممالک کے بینکوں سے سود لینا
- ۲۶۲ دوسری شرط: دونوں اموال ایک فریق کی ملک نہ ہوں
- ۲۶۲ حکومت اور عوام کے درمیان سودی معاملہ
- ۲۶۲ تیسری شرط: فریقین تبادلہ کی چیزوں میں شریک نہ ہوں
- ۲۶۳ ۲۔ محل رہا کی شرائط
- ۲۶۳ پہلی شرط: اموال ربویہ ہونا
- ۲۶۳ دوسری شرط: معیار شرعی ہونا
- ۲۶۵ ۳۔ رہا کی علت
- ۲۶۶ ۱۔ رہا بفضل کی علت
- ۲۶۷ ۲۔ رہا بالنسیبہ کی علت
- ۲۶۹ ۳۔ جس کے اصول
- ۲۷۲ ۳۔ قدر کے اصول
- ۲۷۴ ۵۔ تماشل کی تحقیق
- ۲۷۴ ۱۔ تماشل کا وقت
- ۲۷۵ ۲۔ کو الٹی کا اعتبار
- ۲۷۶ ۳۔ مسئلہ مدعجہ
- ۲۷۸ ۴۔ تماشل کا معیار
- ۲۷۹ ۱۔ منصوصی اموال
- ۲۸۰ ۲۔ غیر منصوصی اموال
- ۲۸۱ ۵۔ تماشل میں غفل

- ۲۸۱ ا۔ کی پیشی
- ۲۸۲ ۲۔ تراور خشک کا تبادلہ
- ۲۸۲ ۳۔ مقدار معلوم نہ ہونا
- ۲۸۲ ۴۔ اصل اور اجزاء کی بیخ
- ۲۸۳ ۶۔ تقابض کی بحث
- ۲۸۵ ۷۔ رہا کے عمومی ضوابط
- ۲۸۶ ۸۔ چند جدید مسائل
- ۲۸۶ ۱۔ صدقہ کی نیت سے سود وصول کرنا
- ۲۸۶ ۲۔ سود کی رقم کا مصرف
- ۲۸۷ ۳۔ سودی بینک میں ملازمت

دوسرا باب

مشارکات اور اجارہ کے اصولی مباحث

(Partnership and Leasing)

- ۲۸۹ ۱۔ شرکت کے اصولی مباحث (Partnership)
- ۲۸۹ ۱۔ شرکت کا تعارف
- ۲۹۰ ۲۔ شرکت کا ثبوت
- ۲۹۲ ۳۔ شرکت کی اقسام
- ۲۹۲ ۱۔ شرکت کی قدیم اقسام
- ۲۹۳ ۱۔ شرکتِ اہانت
- ۲۹۳ ۲۔ شرکتِ ملک
- ۲۹۳ الف۔ شرکتِ اختیاری

- ۲۹۳ ب۔ شرکت جبری
- ۲۹۳ ج۔ شرکتِ عین
- ۲۹۵ د۔ شرکتِ دین
- ۲۹۵ س۔ شرکتِ عقد
- ۲۹۵ الف۔ شرکت الاموال
- ۲۹۶ ب۔ شرکت الاعمال
- ۲۹۷ ج۔ شرکت الوجوہ
- ۲۹۷ الف۔ شرکت المقاضہ
- ۲۹۸ ب۔ شرکتِ عنان
- ۲۹۹ ۲۔ شرکت کی جدید اقسام
- ۳۰۳ ا۔ شخصی شرکت
- ۳۰۳ الف۔ شرکت تضامن
- ۳۰۳ ب۔ شرکت توصیہ بسیطہ
- ۳۰۳ ج۔ جوائنٹ و-نچر کمپنی
- ۳۰۴ ۲۔ مالی شرکت
- ۳۰۴ الف۔ جوائنٹ سٹاک کمپنی
- ۳۰۵ ب۔ توصیہ بمع حصص
- ۳۰۵ ج۔ محدود ذمہ داری کی شرکت
- ۳۰۵ ۳۔ عام شرکت
- ۳۰۵ الف۔ کنڈائٹریٹرز سسٹم
- ۳۰۶ ب۔ پبلک جوائنٹ سٹاک کمپنی
- ۳۰۶ ج۔ ہولڈنگ کمپنی

۳۰۶	و۔ ملٹی نیشنل کمپنی
۳۰۶	۳۔ شرکت متناقصہ
۳۰۸	۳۔ شرکت اباحت کے احکام
۳۰۸	۱۔ شکار
۳۰۸	۱۔ تعریف
۳۰۹	۲۔ شرائط
۳۱۰	۳۔ شکار کا پیشہ
۳۱۰	۲۔ پانی
۳۱۰	۱۔ پانی میں شرکت کی اقسام
۳۱۱	۲۔ پانی کی قسمیں
۳۱۲	۳۔ گھاس
۳۱۳	۳۔ آگ
۳۱۳	گھاس، پانی اور آگ کی شرکت میں فرق
۳۱۳	۵۔ معادن اور دھینے
۳۱۵	۵۔ شرکت ملک کے اصول
۳۱۶	۶۔ شرکت عقد کے اصول
۳۱۸	۷۔ راس المال کے اصول
۳۱۹	۸۔ نفع و نقصان کے اصول
۳۲۱	۹۔ شریک کو اجیر بنانا
۳۲۲	۱۰۔ شرکت کا اختتام
۳۲۳	۱۱۔ شرکت کے عمومی ضوابط
۳۲۵	• معاہدہ شراکت داری

- ۳۲۹ ۲۔ مضاربت کے اصولی مباحث (Mudaraba)
- ۳۲۹ ۱۔ مضاربت کا تعارف
- ۳۳۱ ۲۔ مضاربت کا ثبوت
- ۳۳۱ ۳۔ مضاربت کی فقہی حیثیت
- ۳۳۲ ۴۔ مضاربت کا لزوم
- ۳۳۲ ۱۔ مضاربت کا لزوم
- ۳۳۳ ۲۔ توقیت مضاربت
- ۳۳۴ ۵۔ مضاربت کی اقسام
- ۳۳۴ ۱۔ مضاربت مطلقہ
- ۳۳۵ ۲۔ مضاربت مقیدہ
- ۳۳۶ ۶۔ سرمایہ کے اصول
- ۳۳۹ ۷۔ اخراجات
- ۳۴۰ ۸۔ نفع و نقصان کے اصول
- ۳۴۱ ۹۔ مضاربت فاسدہ کا حکم
- ۳۴۳ ۱۰۔ مضاربت کی حیثیتیں
- ۳۴۳ ۱۱۔ مضاربت کے حقوق و فرائض
- ۳۴۵ ۱۔ کیا مضاربت صرف تجارت کرے گا؟
- ۳۴۶ ۲۔ کیا مضاربت مختلف لوگوں کا مال ملا سکتا ہے؟
- ۳۴۷ ۳۔ کیا مضاربت کسی کو مضاربت پر رقم دے سکتا ہے؟
- ۳۴۷ ۱۲۔ شرکت و مضاربت کا اجتماع اور مضاربت مشرکہ
- ۳۴۹ ۱۔ ارباب الاموال کا آپس میں تعلق
- ۳۴۹ ۲۔ ارباب الاموال اور مضاربت کا تعلق

- ۳۵۰ ۱۳۔ مزاربت کا اہتمام
- ۳۵۰ ۱۳۔ مزاربت کے عمومی ضوابط
- ۳۵۲ ۳۔ مزارعت کے اصولی مباحث (Sharecropping)
- ۳۵۲ ۱۔ مزارعت کا تعارف
- ۳۵۲ ۱۔ مخا برہ
- ۳۵۲ ۲۔ مساقات
- ۳۵۲ ۳۔ محالہ
- ۳۵۲ ۲۔ مزارعت کا حکم
- ۳۵۲ الف۔ مزارعت کا اصل حکم
- ۳۵۲ ب۔ مزارعت کا لزوم
- ۳۵۴ ۳۔ فقہی تکمیف
- ۳۵۴ ۴۔ مزارعت کے ارکان
- ۳۵۴ ۵۔ مزارعت کی شرائط
- ۳۵۸ ۱۔ عمومی شرائط
- ۳۵۸ ۲۔ بیج سے متعلق شرائط
- ۳۵۸ ۳۔ زمین سے متعلق شرائط
- ۳۵۸ ۴۔ پیداوار سے متعلق شرائط
- ۳۵۹ ۶۔ پیداوار کی تقسیم کے اصول
- ۳۵۹ ۷۔ مزارعت کی صورتیں
- ۳۶۰ ۸۔ مزارعت فاسدہ کا حکم
- ۳۶۱ ۹۔ فیسخ مزارعت
- ۳۶۱ الف۔ اسباب فیسخ مزارعت

- ۳۶۱ ب۔ فصیح مزارعت کے احکام
- ۳۶۳ ۱۰۔ مزارعت کے جدید مسائل
- ۳۶۴ ۱۔ مزارعت کے اخراجات
- ۳۶۴ ۲۔ مزارعت میں عشر کس کے ذمہ ہے؟
- ۳۶۴ ۳۔ چرس، بھنگ، افیون کی کاشت
- ۳۶۴ ۴۔ ٹیوب ویل کے پانی کی بنیاد پر مزارعت
- ۳۶۶ ۳۔ اجارہ (کرایہ داری) کے اصولی مباحث (Leasing)
- ۳۶۶ ۱۔ اجارہ کا تعارف
- ۳۶۶ الف۔ اجارہ کا مفہوم
- ۳۶۷ ب۔ چند اصطلاحات
- ۳۶۸ ج۔ اجارہ کے ارکان
- ۳۶۸ ۲۔ اجارہ کا ثبوت
- ۳۷۰ ۳۔ کراء الارض اور فقہاء کی آراء
- ۳۷۱ ۴۔ اجارہ کی شرائط
- ۳۷۲ ۱۔ عقدِ اجارہ کے منعقد ہونے کی شرائط
- ۳۷۲ ۲۔ عقدِ اجارہ کے نافذ ہونے کی شرائط
- ۳۷۳ ۳۔ عقدِ اجارہ کے صحیح ہونے کی شرائط
- ۳۷۴ ۴۔ عقدِ اجارہ کے لازم ہونے کی شرائط
- ۳۷۴ ۵۔ اجارہ کی اقسام
- ۳۷۴ الف۔ اجارہ کی قدیم اقسام
- ۳۷۶ ۱۔ اجارۃ العمل / اجارۃ الاشخاص (Employment)
- ۳۷۶ ۱۔ اجیر خاص

- ۳۷۷ ۲۔ اجیر مشترک
- ۳۷۹ ۱۔ مدت اور عمل کا اجتماع
- ۳۸۱ ۲۔ طاعت اور معصیت پر اجرت
- ۳۸۲ ۲۔ اجارۃ الاعیان / اجارۃ الاشیاء (Leasing)
- ۳۸۳ ب۔ اجارہ کی جدید اقسام
- ۳۸۵ ۱۔ اجارۃ علی الإجارۃ
- ۳۸۶ ۲۔ اجارۃ منتهیۃ بالتملیک
- ۳۸۸ ۳۔ اجارۃ موصوفۃ فی الذمۃ
- ۳۸۹ ۳۔ مترادف الإجازات
- ۳۹۰ ۵۔ التملک الزمفی
- ۳۹۱ الف۔ ملک تام
- ۳۹۲ ب۔ ملک ناقص
- ۳۹۲ ۶۔ اجرت کے اصول
- ۳۹۳ ۷۔ عقد اجارہ کے موجبات اور تقاضے
- ۳۹۵ ۱۔ صفت اجارہ
- ۳۹۶ ۲۔ منفعت کا تملک
- ۳۹۸ ۳۔ مرمت کی ذمہ داری
- ۳۹۹ ۳۔ ضمان کا اصول
- ۴۰۰ ۵۔ اجارہ باطلہ و فاسدہ
- ۴۰۱ ۶۔ اجارۃ بجزء من العمل / قفیز الطحان
- ۴۰۲ ۱۔ مفہوم
- ۴۰۳ ۲۔ فقہاء کی آراء

- ۳۰۳ ۳۔ صورتیں
- ۳۰۴ ۱۔ عمومی صورتیں
- ۳۰۵ ۲۔ متبادل جائز صورتیں
- ۳۰۶ ۸۔ انتظام اجارہ
- ۳۰۶ ۱۔ شرعی عذر کی وجہ سے معاملہ ختم کرنا
- ۳۰۷ ۲۔ اجارہ ختم کرنے کی وجوہات اور اقسام
- ۳۰۸ ۹۔ اجارہ کے عمومی ضوابط
- ۳۰۹ ۱۰۔ اجارہ کے چند جدید مسائل
- ۳۰۹ ۱۔ جمعہ کے دن کام کرنا
- ۳۱۰ ۲۔ پنشن کی رقم کی شرعی حیثیت
- ۳۱۱ ۳۔ جانوروں کی جفتی پر اجرت لینا
- ۳۱۱ ۴۔ جانور کو بٹائی پر دینا
- ۳۱۲ ۵۔ ناجائز کام کے لیے جگہ کرایہ پر دینا
- ۳۱۳ ۱۔ سودی بینک کو جگہ کرایہ پر دینا
- ۳۱۳ ۲۔ انشورنس کمپنی کے لیے جگہ کرایہ پر دینا
- ۳۱۳ ۳۔ شراب فروخت کرنے کے لیے جگہ کرایہ پر دینا
- ۳۱۳ ۶۔ اجارہ میں بطور ضمانت رقم لینا
- ۳۱۴ ۷۔ ٹول ٹیکس (Toll Taxes)
- ۳۱۴ ۸۔ پارکنگ کا کرایہ (Parking)
- ۳۱۵ ۹۔ ہائر پریچر (Hire Purchase)
- ۳۱۶ ۱۰۔ چٹائی

انتساب

ان کے نام!

جو اپنا تعارف آپ، اپنا حوالہ خود اور اپنی مثال آپ ہیں۔ جو بحر علم ہیں، جو بابِ کرم ہیں، جو چراغِ منزل ہیں۔ جو بادِ بہاری ہیں، جو فصلِ لالہ و گل ہیں، جو چمن زارِ محبت ہیں۔ علم ان کی علمیت پہ نازاں، نقاہت ان سے نسبت پہ مفخر، سیادت ان کی پیشانی پہ قرباں۔ قرآنیات نے ان کے ترجمہ و تفسیر کا خوش دلانہ استقبال کیا، حدیثیات نے ان کے تئیں ابن حجر و وقت سے ملاقات کی، فقہیات نے انہیں مجتہدِ زمانہ پایا، اقتصادیات نے پنجہ آزمائی میں ہار مان لی، سیاسیات نے نئے فکر و فلسفے سے دامن بھرا، ادبیات ان کے سامنے دست بستہ، کمر خمیدہ اور دل گرویدہ کھڑی ہیں۔ جو میرے لیے صرف ہمہ جہت استاذ ہی نہیں، بلکہ محبت و عقیدت کا مرکز بھی ہے۔ میری مراد میرے عظیم استاذِ محترم

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم ہیں۔

ضمیر کی آواز پہ مجبور، کسی پیشگی اجازت کے بغیر، یہ چند حروف ان کی ذات سے منسوب کر کے اپنی سعادت میں اضافہ چاہتا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ یہ محض عقیدت نہیں، عین حقیقت ہے۔

تقریظ

حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب دامت برکاتہم

نائب مفتی و استاذ حدیث جامعہ دارالعلوم کراچی

الحمد لله رب العلمین، والصلوة والسلام علی سیدنا محمد، خاتم النبیین، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین
أما بعد!

فقہ المعاملات یعنی کاروباری لین دین کی اہمیت مسلم ہے، کیونکہ فقہ المعاملات کا تعلق روزمرہ زندگی کی ان بنیادی مصروفیات سے ہے جن کا تمام افراد سے سابقہ پڑتا ہے۔ چنانچہ ”فقہ المعاملات یا مالی معاملات“ سے مراد شریعت کے وہ احکامات اور مسائل ہیں جن کا تعلق لوگوں کے لین دین، شرکت و مضاربت، خرید و فروخت اور دیگر کاروباری معاملات سے ہے۔ بلاشبہ یہ فقہ اسلامی کا ایک اہم باب ہے اور وقتاً فوقتاً کاروباری معاملات میں آنے والی تبدیلیوں کو وجہ سے نت نئی صورتیں وجود میں آرہی ہیں، جن کی شرعی تکلیف ایک مشکل کام ہے۔

یوں تو ہر زمانہ میں معاملات کی نت نئی صورتیں وجود میں آتی رہی ہیں، لیکن سترہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد مالی معاملات نے بہت زیادہ ترقی کر لی ہے اور بڑھتی ہوئی صنعتی و ذرائع اتصال کی ترقی سے تدریجاً صورتیں رونما ہو گئی ہیں، جن کے متعلق نئی نئی اصطلاحات بھی متعارف ہو گئی ہیں۔ بسا اوقات خواص کی نظر بھی ان کی طرف نہیں جاتی، اس لیے ضروری ہے کہ شرعی اصولوں کے ساتھ ساتھ معاملات کی جدید و معاصر صورتوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے، تاکہ عوام کی درست راہنمائی کا فریضہ انجام دیا جاسکے۔

فقہ المعاملات پر عربی زبان میں اچھا خاصا مواد موجود ہے، خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی کتاب ”فقہ البیوع“، ”تونیق الدیون“، ”بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ“ اور دیگر کتب جو جدید مسائل میں ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو زبان میں بھی اس موضوع پر مواد موجود ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی کتب ”اسلام اور معاشی مسائل“ اور ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ اور دیگر کاوشیں اس میدان میں حضرت کے تجدید کارنامے ہیں۔ حضرت دامت برکاتہم نے مذکورہ کتب کے علاوہ فتاویٰ اور

رسائل کی صورت میں اس میدان میں بہت سی خدمات انجام دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کا سایہ تادیر سلامت رکھے اور ہم سب کو حضرت کے علوم سے مستفید فرمائے۔ آمین

مفتی شاد محمد شاد کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، جنہوں نے اردو زبان میں زیر نظر کتاب ”مالی معاملات“ میں بہتر انداز میں تحقیقی کام کیا ہے اور فقہ المعاملات کے اہم شعبہ جات و ابواب کی تحقیق بیان کی ہے۔

عزیزم مفتی شاد محمد شاد جامعہ دارالعلوم کراچی کے قابل قدر فاضل و متخصص ہیں۔ علمی و تحقیقی مزاج کے حامل محنتی نوجوان ہے۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے علمی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ایک عرصہ سے آپ کے مضامین و مقالات مختلف رسائل و مجلات میں شائع ہوتے آرہے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آٹھ سو صفحات پر مشتمل، آپ کی مایہ ناز تحقیقی کتاب ”دفقی قواعد کا تحقیقی مطالعہ“ چھپ کر منظر عام پر آئی ہے جسے اہل علم نے خوب داد تحسین دی ہے۔

ہمارے سامنے موصوف کی دوسری تحقیقی کاوش بنام ”مالی معاملات“ ہے۔ اصولی مباحث اور جدید تحقیقات پر مشتمل یہ مجموعہ ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں فقہ و معاملات کا مختصر تعارف، فقہ المعاملات کا مطالعاتی نصاب اور معاملات کے مسائل کیسے حل کیے جائیں؟ جیسے عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ پہلا باب خرید و فروخت کے اصول و احکام پر، دوسرا باب شرکت و مضاربت، مزارعت اور کرایہ داری کے اصول و احکام پر، تیسرا باب تبرعات (گفٹ، عاریت، قرض) پر، جبکہ چوتھا باب معاملات کی مختلف جدید صورتوں اور تحقیقات پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب اہل علم اور عوام دونوں کے لیے یکساں مفید ہے، بلکہ ہماری نظر میں بینکنگ سے وابستہ افراد، تخصص کرنے والے اور فقہ و افتاء سے تعلق رکھنے والے اہل علم کے لیے اس کتاب کی اہمیت و افادیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ:

۱- اس کتاب میں ہر باب اور موضوع کے اصول و ضوابط کی طرف توجہ دی گئی ہے، جس سے اس موضوع کے احکام کو سمجھنا اور ذہن میں رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔

۲- اس کتاب میں فتویٰ کی شکل میں محض کسی صورت کے جائز یا ناجائز ہونے کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ ہر بحث کی تمام جہات پر علمی انداز میں تحقیق کی گئی ہے۔ خصوصاً چوتھے باب کے مقالات اپنی تحقیق اور علمی مرتبہ میں بہت اعلیٰ ہیں۔ عربی زبان میں اس قسم کے تحقیقی مقالات موجود ہیں، جیسے شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی ”بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ“، لیکن اردو زبان میں اس نوعیت کے مقالات بہت کم ہیں۔

۳- قدیم مباحث کے ساتھ ایسے جدید مباحث جن سے اکثر طلبہ کو شناسائی نہیں ہوتی، ان پر معاصر اہل علم کی آراء اور تحقیقات کا نچوڑ بہت عمدہ اور بہترین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ کتاب کی عمدہ ترتیب، بہترین اسلوب اور سلیس و سہل زبان سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ مصنف نے تقسیم در تقسیم کا منہج اختیار کر کے ہر بحث کو متعین نکات میں تقسیم کر کے، ہر نکتہ کا الگ تجزیہ کیا ہے اور ایک بحث کے تمام امور و نکات کو آپس میں مربوط رکھنے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔

معاملات کے شعبہ میں جو نئی صورتیں اور نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان میں علماء و مفتیان کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی اس کتاب میں اہل علم کی مختلف آراء کو سامنے رکھ کر کسی ایک رائے کو ترجیح دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور متعلقہ موضوع کے بنیادی احکام کو نہایت عمدہ اسلوب و آسان انداز میں سمجھایا گیا ہے۔ لہذا یہ ایک مفید اور مستحسن کتاب ہے، جس سے نہ صرف علماء، طلبہ، تخصص کرنے والے، مفتیان کرام مستفید ہو سکتے ہیں، بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی فقہ اسلامی کے ایک اہم باب ”فقہ المعاملات“ کے بنیادی خدوخال اور اصول و ضوابط کو آسان انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائے، اس کا نفع عام و تام ہو اور مؤلف کو مزید علمی خدمات کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محمد عبد المنان عفی عنہ

دہلی

۳۰/ربیع الاول ۱۴۴۳ھ

۶/نومبر/۲۰۲۱

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد حسین خلیل خلیل صاحب مدظلہم

مفتی و استاذ الحدیث جامعۃ الرشید کراچی

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى، أما بعد!

دین اسلام کی جامعیت ہر مسلمان کے عقیدے کا حصہ ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی ہر جائز ضرورت سے متعلق اسلام نے ایک آسان، معقول اور قابل عمل راستہ فراہم کیا ہے جو انسانی فطرت اور عدل عمرانی کا عکاس ہے۔

اسلام کی اسی جامعیت کے پیش نظر تجارت اور معاشی سرگرمیوں کی اہمیت بھی شریعت کی نظر کرم سے پوشیدہ نہیں رہی۔ شریعت نے اموال کو قیاماً للناس کی حیثیت دے کر تجارت اور مالی معاملات کو انسانی معاشرے کی ایک اہم ضرورت قرار دیا ہے اور اس سے متعلق انسانوں کی عملی اور اخلاقی، اجتماعی اور انفرادی ہر سطح پر رہنمائی فرمائی ہے۔

مالیاتی فقہ کی اس اہمیت کے پیش نظر ہر دور کے اہل علم نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے امت مسلمہ کو مستفید کرایا ہے، اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی مفتی شاد محمد شاد کی زیر نظر کتاب ہے جس کے مقدمے اور فہرست کے مطالعے سے واضح ہوا کہ فاضل مصنف نے مالیاتی فقہ کے قدیم اسلوب کو سہل بنا کر اور متعلقہ ابواب میں جدید فقہی رجحانات و آراء کا خلاصہ ذکر کر کے اس موضوع پر ایک معروضی اور حقیقی محنت کی ہے جو اہل علم کی طرف سے بھرپور تحسین کی مستحق ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کہ اس خدمت جلیلہ کو قبولیت سے نوازے اور اس کا فائدہ عام اور تام بنائے۔

وما ذالك على الله بعزيز

محمد حسین خلیل خلیل

۴/ صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

عرضِ مصنف

الحمد لله وكفى، وسلام على عباده الذين اصطفى

أما بعد!

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی پیدائش سے لے کر موت تک ہر لمحہ، ہر پہلو اور ہر شعبہ کی ضروریات سے متعلق مکمل ہدایات اور راہنمائی موجود ہے۔ اسلامی احکام و ہدایات کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے، جن میں ایک قسم باہمی لین دین و تجارت اور ”مالی معاملات“ بھی ہے۔ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

مالی معاملات کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے، کیونکہ انسان کی فطری ساخت ایسی ہے کہ وہ تہا زندگی نہیں گزار سکتا، بلکہ وہ اجتماعی زندگی اور باہمی تعاون اور لین دین کا محتاج ہوتا ہے اور اسلام کی تعلیمات میں بھی رہبانیت کی اجازت نہیں ہے، اسی لیے انسانی زندگی میں باہمی لین دین اور معاملات ناگزیر ہیں، بلکہ انسانی زندگی کی بقاء بھی باہمی معاملات پر ہے۔ چونکہ لین دین اور معاملات ہر فرد کی ضرورت ہے اور انسانی زندگی کے لوازم ہیں، اس لیے اسلام نے ایمان، عبادات، اخلاق و معاشرت اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح انسانوں کے لیے خرید و فروخت، صنعت و حرفت، محنت و مزدوری وغیرہ جیسے معاشی معاملات کے متعلق بھی ایسی اصولی ہدایات دی ہیں جو انسانوں کی دنیوی و اخروی فلاح کی ضامن ہیں، جن کی روشنی میں انسان اپنے معاملات کو جائز حد میں رکھ کر، نہ صرف اپنی دنیوی ضروریات پوری کر سکتا ہے، بلکہ ان ضروریات کو پورا کرتے وقت احکام الہی کی رعایت کر کے اپنی ضروریات کو عبادت اور ذریعہ ثواب بھی بنا سکتا ہے۔

فقہاء نے فقہ میں دیگر شعبہ ہائے زندگی کے احکام کی طرح مالی معاملات کے اصول و احکام کو بھی قرآن و سنت سے مستنبط و اخذ کر کے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، جو رہتی دنیا تک کے معاملات میں امت کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ہر دور کے علماء نے ان اصول و احکام کو عوام و خواص کو سمجھانے کے لیے مختلف زبانوں اور مختلف اسالیب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو میں بھی اس موضوع پر کچھ کتابیں موجود ہیں اور آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کتاب ”مالی معاملات“ بھی اسی سلسلے کو آگے بڑھانے کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔

موجودہ دور کی ترقی نے جہاں اور بہت سے مسائل پیدا کیے ہیں، وہاں تجارت اور لین دین سے متعلق ایسی نئی صورتیں پیدا کی ہیں، جن کا پہلے زمانے میں تصور بھی ناممکن تھا، اس لیے معاملات کی جدید صورتوں کا حل علماء کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ حالات کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق عصر حاضر کے علماء نے ”مالی معاملات“ پر بہت زیادہ کام کیا ہے اور کر رہے ہیں، خصوصاً علماء عرب نے اس موضوع پر درجنوں کتابیں اور تحقیقی مقالات لکھے ہیں، لیکن اہل علم اور خاص کر طلباء علم کے لیے یہ ایک مشکل کام ہے کہ وہ پہلے آئیں اور معتمد علماء کی پہچان حاصل کریں اور پھر ہر موضوع کے لیے الگ ان کی کتابیں تلاش کر کے ان کا مطالعہ کریں، خصوصاً جب وہ ضخیم ہوں اور عربی زبان میں بھی ہوں، اس لیے زیر نظر کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی، جو اپنے اکابر اور معتمد علماء کی تحقیقات اور کتابوں سے استفادہ کر کے تیار کی گئی ہے۔ اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ:

۱- متعلقہ موضوع کے ان تمام اصولوں کو آسان الفاظ میں بیان کیا جائے، جن کا تذکرہ قدیم فقہاء نے اپنی کتابوں میں کیا ہے، کیونکہ جدید صورتوں کو ان ہی اصولوں کی روشنی میں حل کیا جاسکتا ہے، البتہ کسی اصول یا ضابطہ میں فقہاء کا اختلاف ہو تو وہاں عصر حاضر کے علماء کی ترجیح کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

۲- دوسری کوشش یہ کی گئی ہے کہ ہر عنوان کے مختصر تعارف و بنیادی احکام کو نکات کی شکل میں بیان کیا جائے، خواہ وہ قدیم عنوان ہو یا معاصر، تاکہ متعلقہ عنوان / موضوع کے تمام مباحث کا خاکہ ذہن میں رہے۔

۳- یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ ہر موضوع سے متعلق معاصر تحقیقات کا خلاصہ پیش کیا جائے، تاکہ معاصر علماء کی تحقیقات اردو داں طبقہ کے سامنے آجائیں۔

۴- اسی کے ساتھ کتاب کے اسلوب و تعبیر کو آسان اردو میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے اور اصولی باتوں کے ساتھ جدید مسائل کو بھی کسی حد تک بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ اس کتاب کا فائدہ صرف اہل علم و طلبہ تک محدود نہ رہے، بلکہ عام لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

فقہ المعاملات سے بندہ کو شروع سے ہی دلچسپی رہی ہے۔ جامعہ دارالعلوم کراچی سے فراغت کے بعد درس و تدریس اور افتاء کے مبارک شعبے کے ساتھ وابستگی نصیب ہوئی تو ”تخصص فی الافتاء“ کے طلبہ کو فقہ المعاملات کے موضوع پر درس دینے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ اس درس کے لیے بندہ ایک موضوع کو منتخب کر کے مکمل ایک ہفتہ اس موضوع سے متعلق کئی عربی و اردو کتب کا مطالعہ کرتا تھا اور اس کا حاصل مطالعہ نوٹس کی شکل میں لکھ کر ہفتہ میں ایک

درس طلبہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ بعد میں بندہ نے ان دروس اور نوٹس کو باقاعدہ تحقیقی مضامین یا مقالات کی شکل دے دی جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو گئے اور ان پر اہل علم کی طرف سے کافی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کے تبصرے ملے۔ یہ تمام مضامین اور ان کے علاوہ دیگر تحقیقی مقالات اس کتاب کے چوتھے باب میں شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ بندہ کو تقریباً تین بار استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی کتاب ”فقہ البیوع“ پڑھانے کی سعادت نصیب ہوئی اور اب بھی اس کی تدریس جاری ہے۔ بندہ نے تدریس کے ساتھ اس کتاب کے اہم مضامین و مباحث کا خلاصہ آسان اردو میں لکھنا شروع کیا تھا جو کچھ تبدیلی اور کچھ مباحث کے اضافہ کے ساتھ اس کتاب کے پہلے باب ”بیوع اور ربا کے اصولی مباحث“ میں موجود ہے۔

پچھلے ایک عرصہ سے کئی اہل علم دوستوں کے اصرار پر بندہ نے آن لائن مختلف موضوعات پڑھانے کی ترتیب بھی شروع کی ہے، جن میں اصول فقہ، قواعد فقہیہ، فقہ الحلال اور فقہ المعاملات وغیرہ کے موضوعات شامل ہیں۔ فقہ المعاملات کی آن لائن کلاس میں بیوعات (خرید و فروخت) کے علاوہ ”شرکت“، ”مضاربت“، ”مزارعت“، اور ”اجارہ“ کے اصول و ضوابط، بنیادی احکام اور معاصر صورتوں کو بھی شامل کیا گیا تھا، جن کو آسان انداز میں لکھ کر اس کتاب کے دوسرے باب ”مشارکات اور اجارہ کے اصولی مباحث“ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں صرف قدیم کتب پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ معاملات پر لکھی ہوئی معاصر کتب کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے، خصوصاً ”المعايير الشرعية“ اور مجمع الفقہ الاسلامی کی قرا دادوں سے اہم اصول و ضوابط اور جدید صورتوں میں کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے تیسرے باب ”تبرعات کے معاملات“ کی بات ہے تو یہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے، لیکن اس کے اہم ابواب (”ہبہ“، ”گفتھ“، ”عاریت“، اور ”قرض“) کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے، کیونکہ ان تین ابواب کے اصول و احکام مالی معاملات کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے اور موجودہ دور میں ان کی کافی ضرورت بھی ہے۔ چنانچہ ان تینوں ابواب کے اصول و احکام اور جدید صورتوں کو آسان انداز میں مرتب کر کے اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے پہلے مندرجہ ذیل نکات پڑھنا مناسب ہیں:

۱۔ کتاب کے شروع میں ایک ”مقدمہ“ لکھا گیا ہے جس میں مختصر الفاظ میں ”فقہ“، ”معاملات“ اور ”مالی معاملات“ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو اہل علم فقہ المعاملات کے موضوع کا از سر نو شروع سے یا خود ایک

خاص ترتیب سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے فقہ المعاملات کے موضوعات کی ترتیب کو سامنے رکھ کر اہم کتابوں کا ایک مطالعاتی نصاب بنام ”فقہ المعاملات کا مطالعاتی نصاب“ ترتیب دیا گیا ہے۔ مقدمہ کے آخر میں ”معاملات کے مسائل کیسے حل کیے جائیں؟“ کے عنوان پر چند اہم گزارشات پیش کی گئی ہیں۔

۲۔ پہلے باب میں حوالہ جات کے اہتمام کی کوشش کی گئی ہے، لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ پہلے باب کے چند اہم موضوعات ”فقہ البیوع“ سے ماخوذ ہیں، اس لیے جہاں کہیں حوالہ نہ دیا گیا ہو، اس کے لیے اور خصوصاً ائمہ کی آراء کے حوالہ جات کے لیے اصل کتاب ”فقہ البیوع“ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ فقہ سے تعلق رکھنے والے اہل علم جانتے ہیں کہ قواعد فقہیہ کی ایک خاص اہمیت ہے، جس پر بندہ کی ایک تفصیلی کتاب ”فقہی قواعد کا تحقیقی مطالعہ“ کچھ عرصہ قبل چھپ چکی ہے۔ زیر نظر کتاب میں مالی معاملات کے اہم ابواب سے متعلق فقہی قواعد و ضوابط کو ہر باب میں ”عمومی ضوابط“ کے نام سے مختصر تشریح اور وضاحت کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ ہر قاعدہ یا ضابطہ فقہیہ کا الگ حوالہ نہیں دیا گیا، کیونکہ یہ قواعد و ضوابط کئی مختلف کتابوں سے ماخوذ ہیں، ان کو صرف اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ ان کو سمجھ کر یاد کرنے سے متعلقہ باب کے اکثر مباحث ذہن میں رہتے ہیں اور فقہ پڑھانے والے اساتذہ ہر باب کے شروع میں طلبہ کو یہ قواعد پڑھا کر یاد کرنے کی ترغیب دیں تو طلبہ کو کافی فائدہ ہوگا۔

۴۔ کتاب کے پہلے تینوں ابواب ”اصولی“ نوعیت کے ہیں، اسی لیے ان میں ہر باب کے بنیادی اور اہم اصولوں کو جمع کیا گیا ہے اور ہر باب کی جدید اور معاصر صورتوں کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں تک چوتھے باب کا تعلق ہے تو وہ ”تحقیقی“ نوعیت کا باب ہے جس میں مختلف موضوعات پر قدیم و معاصر اہل علم کی آراء و تحقیقات کا خلاصہ اور نتائج کو مقالات کی شکل میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۵۔ قارئین کی سہولت اور عصر حاضر کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے کتاب کے اسلوب اور منہج میں تحلیل و تجزیہ اور تقسیم در تقسیم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اسی لیے ہر باب کو مختلف نکات میں تقسیم کر کے، پھر ہر نکتہ کو چند پوائنٹس اور مزید نکات میں تقسیم کر کے ہر پوائنٹ یا نکتہ کو الگ الگ واضح کیا گیا ہے۔ اس سے مطالعہ میں بھی آسانی رہے گی اور مباحث بھی ذہن میں رہیں گے۔

۶۔ موضوعات کی اکثر اصطلاحات اور عربی ناموں کو اردو میں ڈھالنے اور ساتھ ساتھ انگریزی تعبیر یا ترجمہ لکھنے کی بھی کوشش کی گئی ہے، تاہم آسان اردو تعبیر نہ ملنے کی وجہ سے بعض الفاظ یا اصطلاحات کو عربی نام سے ہی ذکر کیا گیا ہے، تاکہ موضوع میں علمی رنگ برقرار رہے۔

یہ کتاب بندہ کی طرف سے ایک حقیر سے کاوش ہے جو مکمل طور پر اپنے اکابر کی کتب و تحقیقات کی خوشہ چینی سے وجود میں آئی ہے اور یہ ”مالی معاملات“ کے تمام ابواب اور جہات پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس موضوع کے اہم ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ اس موضوع کی پہلی کڑی ہے، اگر اللہ نے چاہا تو اس کی اگلی کڑیاں مختلف ناموں کے ساتھ منصف شہود پر آجائیں گی۔ ان شاء اللہ

چونکہ انسان کے فہم میں غلطی اور اختلاف کا امکان ہمیشہ رہتا ہے، اس لیے اس کتاب کی کسی بات سے کسی کو اختلاف ہو یا جہاں کہیں کوئی غلطی نظر آئے، اُسے بندہ کے فہم کی طرف منسوب کیا جائے اور بندہ کو اس پر مطلع بھی کر دیا جائے تو کرم نوائی ہوگی۔

آخر میں باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو صرف اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے، اہل علم اور عوام کے لیے اسے مفید بنائے اور بندہ اور بندہ کے والدین، تمام اساتذہ و شاگردوں کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین

شاد محمد شاد

فاضل و متخصص باسناد دارالعلوم کراچی

رہیس: الحسان اکیڈمی، اسلام آباد

0092-344-3884654

shadkhan654@ gmail.com

مقدمہ

مقدمہ میں فقہ اور معاملات کا مختصر تعارف، فقہ المعاملات کے مطالعہ کے لیے اہم کتب کی نشاندہی اور معاملات کے مسائل کے حل کرنے کے لیے چند گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔ ان باتوں کو مندرجہ ذیل چار نکات میں بیان کیا جائے گا:

۱۔ فقہ کا تعارف

۲۔ مالی معاملات کا تعارف

۳۔ فقہ المعاملات کا مطالعاتی نصاب

۴۔ معاملات کے مسائل کیسے حل کریں؟

۱۔ فقہ کا تعارف

اس عنوان کے تحت فقہ سے متعلق چند اہم امور و نکات کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا۔ یہ کل چھ نکات ہیں:

- ۱۔ فقہ کی تعریف
- ۲۔ فقہ کا موضوع
- ۳۔ فقہ کے مآخذ
- ۴۔ فقہ کے اہم ابواب
- ۵۔ شریعت اور فقہ میں فرق
- ۶۔ مکاتب فقہ

۱۔ فقہ کی تعریف

فقہ کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا، واضح کرنا، گہرا فہم حاصل کرنا۔ علماء لغت نے لکھا ہے کہ ”فقہ“ کا لفظ دراصل ”فقیہ“ سے بنا ہے، جس کے معنی ہے اشیاء کی گہرائیوں اور بواطن تک پہنچنے کا راستہ اور شق، لہذا جب دل کو بصارت حاصل ہوتی ہے تو وہ اشیاء کے حقائق تک راستہ پاتا ہے اور پھر اسے فہم حاصل ہو جاتا ہے۔^(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ فقط شرعی احکام کے علم کا نام نہیں ہے، بلکہ شرعی احکام کی گہرائیوں اور باطن کا علم فقہ ہے، جس میں احکام کی علل، مآخذ اور مقاصد وغیرہ سب شامل ہیں۔

ابتداء میں فقہ کا دائرہ وسیع تھا۔ اس میں عقائد و اخلاق جیسے مباحث بھی موجود تھے، لیکن بعد میں جب عقائد اور علم کلام میں یونانی فلسفہ کی ابحاث شامل ہو گئیں اور عقائد کے مباحث طویل، مشکل اور پیچیدہ ہو گئے تو عقائد کو الگ فن کی شکل کی دیکر فقہی مباحث سے نکال دیا گیا۔ اسی طرح اخلاق کے مباحث کو بھی الگ فن (علم تصوف) کی شکل دے دی گئی اور فقہ صرف عملی احکام تک محدود رہ گئی۔ اس لیے متاخرین نے فقہ کا اصطلاحی مفہوم یوں لکھا ہے:

علم بالمسائل الشرعية العملية المكتسبة من أدلتها التفصيلية.^(۲)

شریعت کے ان عملی احکام و مسائل کا علم جن کو تفصیلی دلائل سے لیا گیا ہو۔

اس تعریف میں عملی احکام و مسائل سے مراد وہ مسائل ہیں جن کا تعلق انسان کے افعال اور اعمال سے ہے،

^(۱) النہایة فی غریب الأثر ۳/۳۶۵

^(۲) درر الحکام فی شرح مجلة الأحکام ۱/۱۷

جہاں تک عقائد کے احکام ہیں تو ان کو فقہ کے بجائے عقائد کی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ تعریف میں ”ادلہ تفصیلیہ“ سے مراد فقہ کے ماخذ ہیں، یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔

۲۔ فقہ کا موضوع

فقہ چونکہ اُن عملی احکام کا نام ہیں جن کا تعلق انسان کے افعال کے ساتھ ہے، اس لیے علم فقہ کا موضوع عاقل، بالغ آدمی یعنی مکلف کے افعال ہیں۔ جن کو فرض، واجب، مستحب، مباح، حرام، مکروہ وغیرہ جیسے الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔

۳۔ فقہ کے ماخذ (Sources)

- ۱۔ فقہ کے بنیادی و اتفاتی ماخذ چار ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس یعنی فقہاء کے اجتہادات
- ۲۔ فقہ کے اختلافی ماخذ میں: پچھلی شریعتیں، اقوال صحابہ، استسنان، استصحاب، مصالح، سد ذرائع اور عرف وغیرہ شامل ہیں، جن کے تفصیلی مباحث اصول فقہ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

۴۔ فقہ کے اہم ابواب

قدیم و معاصر فقہاء نے فقہ کو مختلف حصوں اور مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے:

❖ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ دینی امور کی پانچ قسمیں ہیں: اعتقادات، آداب (اخلاق) عبادات، معاملات اور عقوبات، اور آپ نے یہ وضاحت کی ہے کہ ان میں سے پہلے دو امور کا تعلق فقہ کے ساتھ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فقہ مندرجہ ذیل تین قسم کے امور کا نام ہے:

۱۔ عبادات: یہ پانچ ہیں: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد۔

۲۔ معاملات: یہ بھی پانچ ہیں: معاوضات مالیہ، مناکحات (نکاح، طلاق، رضاعت وغیرہ) مخاصمات، امانات اور

ترکات (میراث)۔

۳۔ عقوبات: یعنی سزائیں، یہ بھی پانچ ہیں: قصاص، زنا کی حد، چوری کی حد، حدِ قذف (تہمت لگانے کی سزا) اور

حدِ شرب (شراب پینے کی سزا)۔^(۱)

❖ عصر حاضر کے فقہاء نے فقہی ابواب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے: عبادات، احوال شخصیہ، معاملات،

عقوبات، مرافعات اور سیر و مغازی۔ چنانچہ:

۱۔ عبادات: فقہ کے وہ احکام، امور و اعمال جن کی ادائیگی سے بندہ کا اصل مقصد ثواب اور اللہ کا تقرب ہوتا ہے۔ وہ عبادات ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔

۲۔ احوالِ شخصیہ: فقہ کے وہ احکام و اعمال جن کا تعلق خاندانی و عائلی نظام سے متعلق ہیں، ان کو احوالِ شخصیہ کہتے ہیں۔ جیسے نکاح، طلاق، نفقہ، رضاعت۔ اس کو بعض علماء نے ”فقہ الاسرۃ“ کا نام بھی دیا ہے۔

۳۔ معاملات: جن فقہی احکام کا تعلق مال اور اس کے کمانے سے متعلق ہیں، ان کو معاملات کہتے ہیں۔ جیسے اجارہ، بیع، شرکت، مضاربت وغیرہ۔

۴۔ عقوبات: جن احکام کا تعلق جرائم اور ان کی سزا سے متعلق ہیں، ان کو عقوبات یا حدود و تعزیرات کہتے ہیں۔

۵۔ مرافعات: وہ فقہی احکام جن کا تعلق دعویٰ، اس کے ثبوت، گواہی اور فیصلہ و قضاء سے متعلق ہیں، ان کو مرافعات کہتے ہیں۔

۶۔ سیر، مغازی: وہ فقہی احکام جن کا تعلق کفار سے لڑائی و حرب، اس کے اسباب و نتائج، بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ ہیں، ان کو سیر و مغازی کہتے ہیں۔^(۱)

شیخ مصطفیٰ الزرقاء نے فقہی احکام اور وضعی قوانین کا مقارنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فقہ سات قسم کے احکام و امور کا نام ہے:

۱۔ عبادات: وہ احکام جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ہیں، جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔

۲۔ ۳۔ قانون مدنی: یہ وضعی قانون اور جدید عرف کی اصطلاح ہے۔ اس کے تحت دو قسم کے فقہی احکام آتے ہیں:

الف۔ احوالِ شخصیہ: وہ احکام جن کا تعلق خاندانی نظام کے ساتھ ہیں، جیسے نکاح، طلاق، نسب، نفقہ، وصیت، اور میراث۔

ب۔ معاملات: وہ احکام جن کا تعلق کسب اور آمدنی کے ساتھ ہیں اور لوگوں کے باہمی مالی لین دین اور عقود کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح وہ احکام جن کا تعلق لوگوں کے باہمی تنازعات کو ختم کرنے (قضاء) کے ساتھ ہیں۔

۴۔ احکام سلطانیہ: وہ احکام جن کا تعلق حاکم کے حقوق اور ذمہ داریوں کے ساتھ ہیں۔ اس قسم کے احکام کو آج کل ”سیاست شرعیہ“ بھی کہتے ہیں۔ اسی قسم میں وضعی قانون کا ”ادارتی قانون“ اور ”دستوری قانون“ بھی داخل ہیں۔

۵۔ عقوبات: وہ احکام اور قواعد جن کا تعلق مجرم کو سزا دینے اور داخلی طور پر لوگوں کے درمیان نظام قائم رکھنے کے ساتھ ہیں۔

۶۔ بین الاقوامی حقوق: (الحقوق الدولیۃ) وہ قواعد اور احکام جن کے ذریعے مسلم ممالک کا دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات منظم واستوار ہوں۔ اسی میں جنگ اور صلح کے قوانین بھی آتے ہیں۔

۷۔ آداب: وہ قواعد اور احکام جن کا تعلق باہمی معاشرت، اخلاق، فضائل اور محاسن کے ساتھ ہیں۔^(۱)

۵۔ شریعت اور فقہ میں فرق

یہاں شریعت اور فقہ کے درمیان اصولی فرق سمجھنا ضروری ہے۔ شریعت صرف ”وحی“ کا نام ہے جو قرآنی نصوص اور سرورِ دو عالم ﷺ کے اقوال و افعال کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ جہاں تک فقہ کی بات ہے تو یہ شریعت کے فہم کا نام ہے۔ فقہاء و مجتہدین نے شرعی نصوص میں غور و فکر کر کے جو اصول و قواعد مقرر کیے اور ان کی روشنی میں جو احکام و مسائل مستنبط کیے ان کو فقہ کہا جاتا ہے۔ لہذا نہ تو شریعت اور فقہ کو ایک سمجھنا چاہیے اور نہ ہی فقہ کو الگ اور نئی شریعت کہنا درست ہے۔ شریعت اور فقہ کے درمیان اس اصولی فرق کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

۱۔ فقہ چونکہ فقہاء کا فہم اور عمل ہے، اس لیے اس میں اختلاف ممکن ہے، کیونکہ ایک فقیہ کا فہم دوسرے فقیہ کے فہم سے مختلف ہو سکتا ہے، اسی لیے مختلف مکاتبِ فقہ وجود میں آگئے ہیں جو حقیقی معنوں میں شریعت کی مختلف تشریحات ہیں۔

۲۔ نصوص اور ان سے ثابت ہونے والے صریح احکام میں اختلاف ممکن نہیں ہے اور یہ دائمی ہوتے ہیں، جبکہ فقہ اور فقیہ کے فہم کا دائمی ہونا ضروری نہیں ہے۔

۳۔ فقہ میں دونوں قسم کے احکام ہوتے ہیں: نصوص سے ثابت ہونے والے صریح احکام (قطع الثبوت و قطعی الدلالت) اور غیر صریح و اجتہادی احکام۔ شریعت اور فقہ کے درمیان جو فرق پہلے بیان کیا گیا ہے، وہ صرف دوسری

قسم (اجتہادی احکام) سے متعلق ہے، کیونکہ منصوصی واضح احکام میں اختلاف نہیں ہے۔^(۱)

۶۔ مکاتبِ فقہ

- تاریخ میں مختلف مکاتبِ فقہ وجود میں آئے، جن میں سے کچھ کا وجود وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا۔ آٹھ فقہی مکاتب و مسالک ایسے ہیں جو باقاعدہ مدون ہوئے ہیں اور آج تک موجود ہیں، وہ یہ ہیں:
- ۱۔ فقہ حنفی: جس کے مؤسس امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت (۱۵۰ تا ۱۵۰ھ) ہیں۔
 - ۲۔ فقہ شافعی: اس کے مؤسس امام محمد بن ادریس شافعی (۱۵۰ تا ۲۰۴ھ) ہیں۔
 - ۳۔ فقہ مالکی: اس کے بانی امام مالک بن انس (۹۳ تا ۱۷۱ھ) ہیں۔
 - ۴۔ فقہ حنبلی: اس کے بانی امام احمد بن حنبل (۱۶۴ تا ۲۴۱ھ) ہیں۔
 - ۵۔ فقہ جعفری: جس کے مؤسس ابو عبد اللہ جعفر صادق بن محمد باقر (متوفی ۱۳۸ھ) ہیں۔
 - ۶۔ فقہ زیدی: جس کے بانی زید بن علی زین العابدین (متوفی ۱۲۲ھ) ہیں۔
 - ۷۔ فقہ ظاہری: جس کے مؤسس داؤد ظاہری (متوفی ۴۷۰ھ) ہیں۔
 - ۸۔ فقہ اباضی: اس کے مؤسس عبد اللہ بن اباض (متوفی ۸۶ھ) ہیں۔

^(۱) الفقہ الاسلامی ومدارسہ، ص: ۱۹

۲۔ مالی معاملات کا تعارف

اس عنوان کے تحت ”مالی معاملات“ کا تعارف پیش کیا جائے گا۔ اس موضوع کے بنیادی نکات، جن پر مختصر چند

سطریں لکھی جائیں گی، یہ ہیں:

- | | |
|---------------------|---------------------|
| ۱۔ معاملات کا تعارف | ۲۔ اہم ضوابط |
| ۳۔ معاملات کی اقسام | ۴۔ معاملات کے مصادر |

۱۔ معاملات کا تعارف

معاملات، معاملہ کی جمع ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں کسی کے ساتھ سلوک، برتاؤ کرنا، لین دین یا معاملہ کرنا، بلکہ

انسان سے صادر ہونے والے ہر عمل کو لغوی اعتبار سے ”معاملہ“ کہا جاسکتا ہے۔^(۱)

معاملات کا اصطلاحی مفہوم مختلف اعتبار سے مختلف بیان کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے:

۱۔ بعض فقہاء کے ہاں معاملات سے مراد وہ تمام اعمال اور شرعی احکام ہیں جن میں لوگوں کا ایک دوسرے کے

ساتھ تعلق و تعامل ہو، خواہ ان کا تعلق اموال کے ساتھ ہو، نکاح و طلاق کے ساتھ ہو، قضاء یا ترکہ اور میراث کے ساتھ۔

چنانچہ مندرجہ ذیل تمام تعریفات اسی نوعیت کی ہیں:

الأمر الشرعية المتعلقة بالأمر الدنیویة.

وہ شرعی امور و احکام جن کا تعلق دنیوی امور کے ساتھ ہوتا ہے۔

الأمر الشرعية المنظمة لتعامل الناس.

وہ شرعی امور و احکام جو لوگوں کے تعامل و اعمال کو منظم کرتے اور ترتیب دیتے ہیں۔

اور بعض نے یوں تعریف کی ہے:

الأحكام الشرعية العملية التي تنظم علاقة المكلف بالآخرين.^(۲)

^(۱) المفردات للاصفهانی. ص: ۳۴۸

^(۲) معجم لغة الفقهاء. ص: ۳۳۸

شریعت کے وہ احکام جن کا تعلق عمل سے ہوتا ہے اور انسانوں کے باہمی تعلق اور لین دین کو منظم کرتے (شریعت کے دائرے میں لاتے) ہیں۔

۲۔ بعض فقہاء کے ہاں معاملات سے مراد وہ امور اور شرعی احکام ہیں جن کا تعلق لوگوں کے مالی معاملہ اور لین دین کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں معاملات کی تعریف یوں ہے:

الأحكام الشرعية المنظمة لتعامل الناس في الأموال. ^(۱)

وہ شرعی احکام جو لوگوں کے مالی اعمال و تعلقات کو منظم کرتے ہیں۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء اس لفظ کو دو مفاہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں:

۱۔ کبھی معاملات کا لفظ عبادات کے مقابل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں معاملات کا مفہوم ذرا وسیع ہوتا ہے، جس میں معاوضات مالیہ کے ساتھ ساتھ نکاح، طلاق وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔

۲۔ کبھی اس سے وہ تصرفات و اعمال مراد ہوتے ہیں جن کے ذریعے انسانوں کے مصالح کی تکمیل ہوتی ہیں، جیسے بیع، اجارہ، ضمان وغیرہ۔ اس مفہوم کا دائرہ تنگ ہے۔ یہ صرف معاوضات مالیہ کے ساتھ خاص ہے۔

”مالی معاملات / معاملات مالیہ“ سے مراد مال کا باہمی تبادلہ اور مالی لین دین کی تمام صورتیں ہیں، خواہ وہ خرید و فروخت ہو، شرکت ہو، مضاربت، مزارعت، کرایہ داری یا کوئی اور معاملہ، جہاں تک ”فقہ المعاملات المالیہ“ کے مجموعہ کی بات ہے تو اس کی تعریف معاصر فقہاء نے مختلف الفاظ میں کی ہے۔ ڈاکٹر محمد عثمان شبیر نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

المعرفة العميقة للأحكام المتعلقة بتبادل الأموال التي تكشف عن مقاصد تلك الأحكام، وعللها، ومآخذها، وترابطها بالمقاصد العامة للشريعة الإسلامية، وذلك للتمكن من إنزال تلك الأحكام على الوقائع الجديدة. ^(۲)

اموال کے تبادلہ سے تعلق رکھنے والے احکام کا ایسا گہرا علم حاصل کرنا جو ان احکام کے مقاصد کو واضح کر دے، ان کی علتیں، ان کے مآخذ کو بیان کرے اور ان کو شریعت کے عام مقاصد کے ساتھ مرتبط کرے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب ان شرعی احکام کو نئے پیش آنے والے حوادث / مسائل

^(۱) المدخل إلى فقه المعاملات المالیه، ص: ۱۲

^(۲) حوالہ بالا، ص: ۱۳

پر منطبق کیا جائے۔

معاملات سے ملتا جلتا عربی زبان کا ایک اور لفظ ”اقتصاد“ بھی ہے، جس کو اردو میں ”معیشت“ اور انگریزی میں (economics) کہتے ہیں۔ یہ معاملات سے مختلف فن ہے، جس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ کیسے انسان کے پاس موجود محدود وسائل کو استعمال میں لاکر زیادہ سے زیادہ انسانی ضروریات اور حاجات کو پورا کیا جاسکتا ہے؟ عربی میں اس کی تعریف علماء نے یوں کی ہے:

علم اجتماعي موضوعه الإنسان ذو الإرادة، يهدف إلى دراسة العلاقة بين الحاجات المتعددة والموارد المحدودة بغرض تحقيق أكبر قدر ممكن من إشباع الحاجات عن طريق الاستخدام الكفء للموارد المتاحة مع العمل على إنمائها بأقصى طاقة ممكنة.^(۱)

اقتصاد ایک ایسا سماجی علم ہے جس کا موضوع ارادہ رکھنے والا انسان ہے۔ اس کا مقصد متعدد ضروریات اور محدود وسائل کے درمیان علاقہ و تعلق کی تحقیق کرنا ہے تاکہ دستیاب وسائل کو مؤثر طریقے سے استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ ضروریات کی تکمیل ہو سکے، اس کے ساتھ ممکنہ حد تک کوشش کر کے ان وسائل میں اضافہ کیا جائے۔

۲-۱ ہم ضوابط

۱- الإسلام لم ينشئ المعاملات في المجتمع:

اسلام نے معاشرے کو معاملات کی صورتیں ایجاد کر کے فراہم نہیں کی، بلکہ اسلام کے ظہور کے وقت معاشرے میں جو معاملات رائج تھے، جیسے بیع و شراء، شرکت، مضاربت، ہبہ، قرض وغیرہ ان ہی صورتوں کو برقرار رکھ کر ان کی اصلاح کی گئی۔ کچھ معاملات کو بالکل ممنوع قرار دیا، کچھ کو اپنی حالت پر برقرار رکھا اور کچھ معاملات میں تصحیح کر دی اور ایسے ضوابط و اصول فراہم کر دیے جن کی روشنی میں ہر نیا معاملہ اور نئی صورت کو پرکھا جاسکتا ہے۔

۲- الإسلام أتى بقواعد كلية في المعاملات:

اسلام نے معاملات کے ہر جزاء کی تفصیلات بیان کرنے کے بجائے، اس کے لیے اساسی اور بنیادی قواعد فراہم کیے، جیسے رضامندی و طیب نفس، وعدہ اور عہد کی پاسداری، غرر، ربا، جو اور ضرر وغیرہ سے ممانعت وغیرہ۔ ان منصوصی

(۱) المدخل إلى فقه المعاملات المالية، ص: ۱۳

واساسی قواعد کو معاملات میں بہر صورت مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

۳- الإسلام ربط المعاملات بكل من العقيدة والأخلاق:

اسلام نے معاملات کو نظری اور عملی، ہر دو جہتوں کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ نظری جہت کا مطلب ہے عقیدہ، لہذا اللہ تعالیٰ نے کبھی اپنی خالقیت کا ظہار کرتے ہوئے فرمایا:

{هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا} ^(۱)

کبھی اپنی حقیقی ملکیت کا یوں اظہار فرمایا:

{لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ} ^(۲)

اسی طرح معاملات کو اخلاق کے ساتھ بھی مربوط فرمایا ہے، چنانچہ ضرر اور غرر سے ممانعت، غبن اور دھوکہ دہی کی ممانعت، منجش اور دوسروں کے سودے پر سودا کرنے کی ممانعت جیسی کئی صورتوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

۴- الإسلام ربط المعاملات بمقاصد الشريعة:

اسلام نے معاملات کو شریعت کے مقاصد کے ساتھ جوڑے رکھا ہے۔ اسی میں لوگوں کی مصالح کی رعایت بھی شامل ہے، چنانچہ جلبِ مصلحت اور دفعِ مضرت کے کئی پہلو معاملات میں نمایاں ہیں۔ اسی لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ معاملات ”معلل“ ہیں، تعبدی نہیں ہیں کہ ان کی علت و مصلحت سمجھ ہی نہ آئے۔ چنانچہ بیعِ سلم، استصناع اور اجارہ کو جائز قرار دینا اور خیارات کو مشروع کرنا لوگوں کی مصلحت کی بنیاد پر ہے۔

۵- الأصل في المعاملات الإباحة:

عبادات میں بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر عبادت توقیفی ہے اور صرف وہی عبادت ہے جسے شریعت نے عبادت قرار دیا ہو، لیکن معاملات کی بات عبادات سے مختلف ہے۔ معاملات میں اصول جواز اور اباحت ہے، یعنی زمانے کے مختلف ہونے سے اگر معاملات مختلف ہو جائے اور نت نئے معاملات وجود میں آجائے تو ان میں شریعت کے بنیادی اصول و قواعد کو دیکھا جاتا ہے، اگر شریعت کے بنیادی قواعد خلاف درزی نہ ہو تو ہر نیا معاملہ جائز قرار دیا جائے گا۔

۶- فقه المعاملات يجمع بين الثبات والمرونة:

فقہی و شرعی معاملات دو قسم کے ہیں: ایک وہ معاملات ہیں جن کو شریعت نے واضح طور پر نصوص میں حرام اور

^(۱) البقرة: ۲۹

^(۲) المائدة: ۱۲۰

ممنوع قرار دیا، جیسے سود اور قمار وغیرہ۔ یہ معاملات دائمی ہیں اور قیامت تک حرام رہیں گے۔ یا وہ معاملات جن کو شریعت نے واضح طور پر نصوص میں جائز قرار دیا، جیسے بیع وغیرہ۔ یہ بھی دائمی ہیں، یہ قیامت تک جائز رہیں گے۔ دوسری قسم کے معاملات ایسے ہیں جن سے نصوص میں سکوت اور خاموشی اختیار کی گئی ہیں، نہ ان کو واضح طور پر جائز قرار دیا گیا ہے، نہ حرام، ایسے معاملات مروون و متغیر ہیں۔ ان میں شریعت کے بنیادی اصولوں کو دیکھا جاتا ہے، اگر اصولوں کی پابندی کی جا رہی ہے تو معاملہ جائز، ورنہ ناجائز سمجھا جائے گا۔ ایسے مسائل و معاملات بسا اوقات عرف پر مبنی ہوتے ہیں اور عرف وزمانے کے بدلنے سے یہ مسائل بدلتے ہیں، جیسے اشیاء کا وزنی یا کھلی ہونا، یا نقد کی مالیت اور حقوق وغیرہ کا مال ہونا۔^(۱)

۳۔ معاملات کی اقسام

قدیم و معاصر فقہاء نے معاملات کی اقسام کو مختلف تقسیمات کے ضمن میں بیان کیا ہے، جن میں سے چند اہم تقسیمات کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

✽ علامہ شامیؒ نے معاملات کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ معاوضات مالیہ (وہ معاملات جن میں انسان مال کے بدلے کسی چیز یا منفعت کا مالک بنتا ہے۔ جیسے بیع اور اجارہ وغیرہ) ۲۔ مناکحات (نکاح، طلاق، نفقہ اور رضاعت کے مباحث) ۳۔ محاصمات (دعویٰ، گواہی اور قاضی کا فیصلہ وغیرہ کے مباحث) ۴۔ امانات (امانت، ودیعت اور عاریت وغیرہ کے مباحث) ۵۔ ترکات (میراث کے مباحث)۔^(۲)

✽ معاصر علماء میں سے بعض نے معاملات کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ عقود المعاوضات ۲۔ عقود الارفاق ۳۔ عقود التبرعات ۴۔ عقود الایمان

۱۔ عقود المعاوضات: اس میں بیع (خرید و فروخت) اجارہ (کرایہ داری) اور جعالہ (کسی خاص کام کرنے پر انعام دینا) شامل ہیں۔

۲۔ عقود الارفاق: اس میں دو معاملات داخل ہیں: قرض اور عاریت (کسی کو بلا عوض استعمال کے لیے اپنی چیز دینا)۔

۳۔ عقود التبرعات: اس میں تین معاملات داخل ہیں: ہبہ (گفت) ہدیہ یا صدقہ اور وقف۔

فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر کسی کو بلا عوض کوئی چیز اس نیت سے دی جائے کہ ثواب حاصل ہو اور اللہ راضی ہو تو یہ ”صدقہ“

^(۱) المدخل إلى فقه المعاملات المالية، ص: ۱۷

^(۲) حاشیة ابن عابدین ۷۹/۱

ہے۔ اگر سامنے والے کی عزت و اکرام کی وجہ سے دی جائے تو یہ ”ہدیہ“ ہے اور اگر اپنی محبت وغیرہ کی وجہ سے چیز دی جائے تو یہ ”ہبہ“ یعنی گفٹ ہے۔

۴۔ عقود الايمان: اس میں ودیعت و امانت شامل ہے۔ یعنی بلا عوض کسی کو اپنی چیز حفاظت کے لیے دینا۔^(۱)
 ڈاکٹر عثمان شبیر نے معاملات کو آٹھ اقسام میں تقسیم کیا ہے:

- | | | | |
|------------|------------|------------|--------------|
| ۱۔ معاوضات | ۲۔ تبرعات | ۳۔ اسقاطات | ۴۔ اطلاقات |
| ۵۔ تقييدات | ۶۔ مشاركات | ۷۔ توقيفات | ۸۔ استحقاقات |

۱۔ معاوضات:

یہ ”معاوضہ“ کی جمع ہے۔ اس میں وہ تمام معاملات شامل ہیں جن میں دو فریق ہوتے ہیں اور ہر فریق کوئی چیز/منفعت وغیرہ دیکر اس کا عوض وصول کرتا ہے۔ اگر مال کا تبادلہ مال کے ساتھ ہو تو اسے ”بیع“ کہتے ہیں۔ اگر مال کا تبادلہ منفعت (services) کے ساتھ ہو یہ ”اجارہ“ ہے۔ اسی میں نکاح اور خلع بھی شامل ہیں۔

۲۔ تبرعات:

یہ ”تبرع“ کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص فی الفور یا مستقبل کی طرف منسوب کر کے اپنی کوئی چیز احسان کے طور پر بلا عوض کسی کو مستقل یا عارضی طور پر دیدے۔ جیسے ہبہ، ہدیہ، صدقہ، وصیت، وقف اور عاریت۔

۳۔ اسقاطات:

اسقاطات میں وہ معاملات شامل ہیں جن میں انسان اپنے حق یا ملکیت کو زائل اور ختم کر دیتا ہے، اس کے بعد اسے اپنی چیز یا حق کے مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ جیسے طلاق دینا، خلع، غلام آزاد کر دینا، شفعہ سے دستبرداری، کسی کو اپنے حق سے بری کر دینا۔

۴۔ اطلاقات:

ان میں وہ معاملات شامل ہیں جن میں ایک انسان دوسرے کو کسی معاملہ کی کھلی آزادی اور چھوٹ (اطلاق) دے دیتا ہے۔ شریعت کا بنیادی حکم یہ ہے کہ ہر شخص صرف اپنی مملوکہ چیزوں میں کوئی تصرف یا معاملہ کر سکتا ہے، دوسرے کی مملوکہ چیزوں میں تصرف کرنا منع ہے۔ ہر انسان کے ہاتھ دوسرے شخص کے مال میں تصرف کرنے کے

^(۱) المعاملات المأبىة المعاصرة في ضوء الإسلام، ص: ۲۲

حوالے سے شرعاً بندھے ہوتے ہیں، لیکن جب اصل مالک کسی کو اجازت دے دیتا ہے تو گویا کہ اس کے ہاتھ کھل گئے، اسی کو ”اطلاق“ کہتے ہیں۔ جیسے کسی کو کسی کام کا وکیل بنانا، کسی کو وصی و نگران بنانا، سمجھ دار بچے کو تجارت کی اجازت دے دینا، امارت اور قضاء بھی اسی میں داخل ہیں، بعض حضرات نے طلاق اور عتاق کو بھی اسی میں شامل کیا ہے۔

۵۔ تفسیحات:

یہ ”تفسید“ کی جمع ہے، اس کے معنی ہے روکنا اور منع کرنا۔ ان میں وہ معاملات شامل ہیں جن میں ایک انسان دوسرے کو کسی ایسے کام سے روکتا اور منع کرتا ہے جس کے کرنے کا اسے پہلے اختیار ہوتا ہے، لیکن منع کرنے کے بعد وہ اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی وکیل یا وصی کو معزول کر دینا، جس بچے کو تجارت کی اجازت ہو، اسے تجارت سے روکنا، یا کسی کا مجنون ہو جانا۔

۶۔ مشارکات:

یہ ”مشارکہ“ کی جمع ہے۔ اس کا مطلب ہے دو یا دو سے زیادہ افراد کا کسی چیز یا حق میں شریک ہونا۔ شرکت اور مشارکہ کی تمام اقسام اسی میں داخل ہیں، جیسے شرکتِ اباحت، شرکتِ ملک اور اس کی قسمیں، شرکتِ عقد مع اقسام، مزارعت وغیرہ۔

۷۔ توفیقات:

ان میں وہ معاملات شامل ہیں جن کے ذریعے صاحبِ حق اپنے حق کو پختہ اور مضبوط کر کے اپنے حق کی وصولی کے سلسلے میں مطمئن ہو جاتا ہے۔ ان کو فقہ میں ”ضمانات“ بھی کہتے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد حقوق و اموال کی حفاظت ہوتا ہے۔ ان کی بنیادی طور پر تین اقسام ہیں:

الف۔ تحریری توثیق: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی پر کوئی قرض یا حق لازم ہوتے وقت باقاعدہ دستاویز تیار کی جائے، تاکہ جس شخص پر حق لازم ہے وہ بعد میں انکار نہ کر سکے۔

ب۔ معنی توثیق: اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے حق کو پختہ کرنے اور وصولی کو آسان بنانے کے لیے مقروض (یا جس پر حق لازم ہے اس) کی کوئی عین / چیز لے کر اپنے پاس بطور رہن رکھ لی جائے، تاکہ اگر وہ انکار کرے تو اس کی چیز بیچ کر اس سے اپنا حق وصول کیا جائے۔

ج۔ شخصی توثیق: اپنے حق کو پختہ اور قابل وصول بنانے کے لیے کسی تیسرے شخص کو (اس کی رضامندی سے) بھی ذمہ دار بنانا یا دین / حق کو کسی تیسرے کی طرف منتقل کر دینا ”شخصی توثیق“ کہلاتا ہے۔ پہلی قسم کو ”عقد کفالتہ“ اور

دوسری قسم کو ”عقدِ حوالہ“ کہتے ہیں۔

۸۔ استحقاقات:

یہ ”حفظ“ سے بنا ہے، جس کے معنی ہے کسی چیز کو ضائع ہونے سے بچانا۔ ان میں وہ عقود و معاملات شامل ہیں جن میں کوئی شخص اپنی کوئی چیز دوسرے کے پاس بطورِ حفاظت رکھتا ہے۔ ان کو ”عقود الامانات“ بھی کہتے ہیں۔ ان میں ”امانت“ اور ”ودیعت“ شامل ہیں۔^(۱)

۴۔ معاملات کے مصادر

چونکہ معاملات کے مباحث بھی فقہ کا حصہ ہے، اس لیے ان کے ماخذ و مصادر بھی وہی ہیں، جو فقہ کے ہیں، یعنی قرآن، سنت، اجماع، قیاس/اجتہاد (یعنی تراث فقہی) اور ان کے علاوہ اختلافی/اذلیلی ماخذ، جیسے استحسان، مصالح، سدذرائع وغیرہ۔

^(۱) المدخل إلى فقه المعاملات المالية، ص: ۵۷

سرفہ معاملات کا مطالعاتی نصاب

اگر کوئی شخص، جو درس نظامی مکمل کر چکا ہو، یا جس کو کم از کم نصابی فقہی مباحث کا علم ہو، وہ اگر ذاتی طور پر فقہ معاملات کا مطالعہ کرنا چاہے تو اُسے کن کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے؟ میرا اس موضوع سے پچھلے چند سالوں سے تعلق رہا ہے، اس لیے اس موضوع پر جو کتب میری نظر میں مناسب ہیں، ان کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ یہ نصابی خاکہ ان اہل علم کے لیے ہے جنہوں نے کتب فقہ و اصول فقہ کسی استاد سے پڑھی ہوں اور ان کو فقہاء کے اجتہادات سے کچھ واقفیت حاصل ہو، تاہم اس میں موجود اردو کتب سے عوام بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ معاملات مالیہ میں ایک بنیادی موضوع ”بیوع“ (خرید و فروخت) کا ہے۔ ہمارے خیال میں اس موضوع کے لیے حضرت استاد محترم مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی کتاب ”فقہ البیوع“ دو جلدیں ہی کافی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں مکمل کتاب کا خلاصہ ہے، جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، وہ بہت اہم ہے۔ اس کے ساتھ شیخ مصطفیٰ الزرقاء رحمہ اللہ کی کتاب ”عقد البیع“ دیکھنا بھی بہت اہم ہے، جو مختصر اور جامع ہے۔ اس کے علاوہ مزید مطالعہ اور تحقیق کے لیے شیخ علی سالوس کی کتاب ”فقہ البیع والاستیثاق والتطبیق المعاصر“ کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ شرکت و مضاربت کے لیے اردو میں استاد محترم ڈاکٹر عمران اشرف صاحب کی کتاب ”شرکت و مضاربت عصر حاضر میں“ اور اس کے ساتھ عربی میں ڈاکٹر محمد تاویل کی ”الشركات وأحكامها“ بھی دیکھی جائے۔ مزید تحقیق کے لیے شیخ علی الحقیف کی ”الشركات في الفقه الإسلامي“، اور شیخ عبدالعزیز الخياط کی ”الشركات في الشريعة الإسلامية والقانون الوضعي“ کا مطالعہ مفید ہے۔

۳۔ اجارہ کے مباحث کے لیے اردو میں ڈاکٹر زبیر اشرف صاحب کا پی ایچ ڈی مقالہ ”جدید معاشی نظام میں اسلامی قانون اجارہ“ اور اس کے ساتھ شیخ عبدالستار ابو غدہ کی ”الإجارة“ بھی دیکھنی چاہیے۔ اس کے علاوہ ”المعايير الشرعية“ کا وہ معیار دیکھ لیا جائے جس میں اجارہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔

۴۔ بروکری، کمیشن اور دلال کے شرعی احکام کے لیے ڈاکٹر اعجاز صدیقی صاحب کا مرتب کردہ رسالہ ”اسٹیٹ ایجنسی سے متعلق شرعی احکام“ اور عربی میں ڈاکٹر عبداللہ سیف کی ”الوساطة العقارية“، ڈاکٹر عبداللہ کی ”نظریة

السمسرة وتطبيقاتها المعاصرة“ اور ڈاکٹر عبدالرحمن کی کتاب ”الوساطة التجارية في المعاملات المالية“ انہم ہے۔

۵۔ معاملات مالیہ کے عمومی موضوعات کے لیے اردو میں مفتی حسین خلیل صاحب کی ”آسان فقہ المعاملات“، ڈاکٹر عمران اشرف صاحب کی ”کتاب المعاملات“ اور ڈاکٹر اعجاز صدیقی صاحب کی دو کتابیں (”غرر کی صورتیں“ اور ”مالی معاملات پر غرر کے اثرات“) بہت مفید ہیں، ان میں بہت سے معاصر معاملات اور ان کی تحقیق موجود ہے۔

عربی زبان میں معاملات کے عمومی موضوعات کے لیے شیخ علی الخفیف کی ”احکام المعاملات الشرعية“ بہت ہی اہم کتاب ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ مصلح اور ڈاکٹر صلاح الصادی کی کتاب ”ما لا یسع التاجر جہلہ“، شیخ فہد المحمودی ”رتاج المعاملات“ اور ڈاکٹر عبدالوہاب کی ”فقہ المعاملات الحدیثہ“ بھی مفید ہیں۔

۶۔ اسلامی بینکاری کو سمجھنے کے لیے ابتدائی طور پر اردو میں استاد محترم مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتاب ”اسلامی بینکاری کی بنیادیں“، اور ”غیر سودی بینکاری“، ڈاکٹر اعجاز صدیقی صاحب کے رسائل (”اسلامی بینکاری ایک حقیقت پسندانہ جائزہ“، ”اسلامی بینکاری میں رائج اجارہ“، ”اسلامی بینکاری میں رائج مباحہ“ وغیرہ) ڈاکٹر عمران اشرف صاحب کی ”اسلامی بینکاری ایک تعارف“، اور عربی میں شیخ مصطفی الزرقاء کی کتاب ”المصارف: معاملاتها وفوائدها“ اور شیخ نایف بن نہار کی مختصر کتاب ”مقدمة في الصيرفة الإسلامية“ بہت اہم ہیں۔

۷۔ انشورنس اور کفائل کے موضوع کے لیے مفتی محمد شفیع رح کارسالہ ”بیمہ زندگی“، ڈاکٹر اعجاز صدیقی صاحب کی کتاب ”کفائل: انشورنس کا اسلامی تباہل“، ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب کی کتاب ”کفائل کی شرعی حیثیت“، اور عربی میں مفتی تقی عثمانی صاحب کا کفائل کے موضوع پر مقالہ دیکھنا اہم ہے جو ان کی کتاب ”بحوث في قضايا فقهية معاصرة“ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر علی محی الدین کی ”التأمين الإسلامي“ بھی مفید ہے۔

۸۔ ربا اور سود کے مباحث کے لیے اردو میں مفتی محمد شفیع کی کتاب ”مسئلہ سود“ اور استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی ”سود پر تاریخی فیصلہ“ اہم ہے، ان کے علاوہ کئی اردو کتب میں اس پر ضنا بحث کی گئی ہے، جن کا تذکرہ پیچھے ہو چکا ہے۔ اور عربی میں دکتور عبدالعظیم جلال کی کتاب ”فقہ الربا“ بہت اہم ہے۔ اس کے علاوہ شیخ عمر المتراک کی کتاب ”الربا والمعاملات المصرفية في نظر الشريعة الإسلامية“ اور شیخ عبداللہ سعیدی کی ”الربا في المعاملات المصرفية المعاصرة“ بھی اہم ہے۔

۹۔ قمار (جوئے) کے مباحث کے لیے شیخ رفیق یونس کی ”المیسر والقمار“، شیخ سلیمان اللامح کی ”القمار وحقیقته وأحكامه“، اور شیخ صدیق الضریحی کی ”الغرر وأثره في العقود“ اہم کتابیں۔ اردو میں ڈاکٹر اعجاز صمدانی صاحب کی کتاب ”غرر کی صورتیں“ میں اس پر ضمناً بحث کی گئی ہے۔

۱۰۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے تو یہ باقاعدہ ایک الگ موضوع ہے، اس کے لیے بنیادی اور ابتدائی مرحلہ میں شیخ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ اور ڈاکٹر اوصاف احمد صاحب کی ”علم معاشیات اور اسلامی معاشیات“ اہم ہے۔

۱۱۔ فقہ المعاملات کے دیگر متفرق موضوعات، جیسے حوالہ، کفالہ، انشورنس اور معاصر صورتیں جیسے ایل سی، کارڈز، اوراق مالیہ وغیرہ اور تجارتی کمپنیوں کے معاملات وغیرہ کے لیے اردو میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہم کی کتاب ”جدید مالیاتی ادارے“، استاد محترم شیخ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی ”فقہی مقالات“، اور عربی میں ”بحوث في قضايا فقهية معاصرة“، ڈاکٹر اعجاز صمدانی صاحب کی ”تجارتی کمپنیوں کا لائحہ عمل“ دیکھنی چاہیے۔ اور عربی میں ڈاکٹر عثمان شبیر کی ”المعاملات المالية المعاصرة في الفقه الإسلامي“، اور انہی کی ”المدخل إلى فقه المعاملات“ اہم ہے۔ اس کے علاوہ شیخ علی احمد السالوس کی ”الاقتصاد الإسلامي والقضايا الفقهية المعاصرة“ کے بعض مباحث بھی اہم ہیں۔

آخری گزارش!

اسلامی فقہی اکیڈمیز، جیسے مجمع الفقہ الاسلامی جدہ وغیرہ، جن میں دنیائے اسلام کے بڑے بڑے علماء و فقہاء کی تحقیقات پیش کی جاتی ہیں، ایسی اکیڈمیز کی تحقیقات اور خاص کر ان کی منظور شدہ قراردادیں انتہائی اہم ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ان میں سے چند اہم مندرجہ ذیل ہیں:

- مجمع الفقہ الاسلامی، جدہ کی قراردادیں ”قرارات مجمع الفقہ الاسلامی“ اور ”مجلد مجمع الفقہ الاسلامی“۔
- ایونی کی ”المعايير الشرعية“ اور چار جلدوں میں ”الملتقيات الدورية“۔ اور مجمع البحوث الاسلامیہ، مصر
- قرارات الهيئة الشرعية والضوابط المستخلصة من تلك القرارات، لہیئة شرعیة لمصرف الراجحی۔
- فتاویٰ هیئۃ کبار العلماء اور فتاویٰ اللجنة الدائمة

- أعمال ندوات بیت التمويل الكويتي، وبنك البركة
- قرارات وتوصيات، ندوات البركة للاقتصاد الإسلامي
- ان کے علاوہ مختلف رسائل و مجلات جیسے ”مجلة البحوث الإسلامية“، ”مجلة الاقتصاد الإسلامي“، ”مجلة البحوث الفقهية“ ریاض، ”مجلة أبحاث الاقتصاد الإسلامي“ جدہ، وغیرہ بھی اہم ہیں۔

• اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کی تحقیقات ”جدید فقہی مباحث“ اور ان کی قرادادیں اور فیصلے۔

فقہ المعاملات سے دلچسپی رکھنے والوں کو چاہیے کہ مندرجہ ذیل معاصر فقہاء کی کتابیں اور تحقیقی مقالات کو بھی ضرور مطالعہ میں رکھیں، جن کی کچھ اہم کتب اور مقالات کے نام بھی یہاں دیے جا رہے ہیں۔

• مفتی محمد تقی عثمانی صاحب:

- ۱- فقہ البيوع
- ۲- توثيق الدينون
- ۳- بحوث في قضايا فقهية معاصرة
- ۴- فقہی مقالات
- ۵- اسلام اور جدید معاشی مسائل
- ۶- اسلام اور جدید معیشت و تجارت

• شیخ مصطفیٰ الزرقاء:

- ۱- المدخل الفقهي العام
- ۲- الفعل الضار والضمان فيه
- ۳- نظام التأمين
- ۴- عقد الاستصناع وأثره في نشاط البنوك الإسلامية
- ۵- صياغة شرعية لنظرية التعسف في استعمال الحق

• ڈاکٹر صدیق الضریح:

- ۱- الغرر في العقود وأثاره في التطبيقات المعاصرة
- ۲- مقالات، جیسے فسخ الدين بالدين- هل يجوز شراء أسهم الشركات والمصارف؟- خطاب الضمان في الشريعة الإسلامية- مدى مسئولية المضارب ومجالس الإدارة عما يحدث من الخسارة- القبض وصوره- عقود الصيانة وتكليفها الشرعي- بطاقة الائتمان وغيره-

• ڈاکٹر عثمان شبیر:

- ۱- المعاملات المالية المعاصرة في الفقه الإسلامي
- ۲- المدخل إلى فقه المعاملات المالية
- ۳- فقه النوازل الاقتصادية للمسلمين المقيمين في الغرب
- ۴- بحوث فقهية في قضايا اقتصادية معاصرة
- ۵- التكيف الفقهي للوقائع المستجدة وتطبيقاته الفقهية

• دكتور وهب الزحيلي:

- ١- موسوعة الفقه الإسلامي والقضايا المعاصرة ٢- المعاملات المالية المعاصرة
 ٣- نظرية الضرورة الشرعية ٣- نظرية الضمان ٥- المصارف الإسلامية
 ٦- الاقتصاد الإسلامي ٤- العقود المساة في قانون المعاملات المدنية الإماراتي
 والقانون المدني الأردني

• دكتور يوسف الشيبلي:

- ١- الخدمات الاستثمارية في المصارف وأحكامها في الفقه الإسلامي (٥ مجلدات) ٢- فقه
 المعاملات المصرفية ٣- الأسهم والمعاملات المعاصرة ٣- حكم تداول أسهم
 الشركات التي في مرحلة التأسيس ٥- بحث في التأمين

• دكتور عبد الستار الوند:

- ١- التأمين الإسلامي ٢- ضوابط وتطوير المشتقات المالية في العمل المالي ٣- أوفوا
 بالعقود ٣- التعليق في عقود المعاوضات ٥- التحوط ٢- البيع المؤجل ٤- الإجارة
 ٨- الديون: الزكوة فيها وتداولها ٩- عقد التمليك الزمني ١٠- تصنيف المصارف
 الإسلامية ١١- بحوث في المعاملات

• دكتور فتيح يونس المصري:

- ١- الإعجاز الاقتصادي للقرآن الكريم ٢- فقه المعاملات المالية ٣- أصول الاقتصاد
 الإسلامي ٣- الجامع في أصول الربا ٥- بيع التقسيط ٦- الميسر
 والقمار، المسابقات والجوائز ٤- أحكام بيع وشراء حلي الذهب والفضة ٨- الخطر
 والتأمين ٩- بحوث في فقه المعاملات المالية ١٠- بحوث اقتصادية ١١- بيع
 العربون ١٢- شركة الوجوه ١٣- الفكر الاقتصادي الإسلامي ١٣- الإسلام
 والنقود ١٥- النظام المصرفي الإسلامي، وغيره

• دكتور عبد الله السلي:

- ١- الغش وأثره في العقود ٢- عقد التصريف: توصيفه وحكمه ٣- التفرير في

- المضاربات في بورصة الأوراق المالية ٣- أحكام الخطاء في المعاوضات المالية
 ٥- المماثلة: أسبابها، أنواعها، مظاهرها، والسبل الوقائية لتفاديها ٢- نظرية العقد في
 الفقه الإسلامي ٤- غرفة المقاصة وأحكامها الفقهية

• ذاكتر نزيه حماد:

- ١- بيع الكالئ بالكالئ ٢- قضايا فقهية معاصرة في المال والاقتصاد ٣- في فقه
 المعاملات المالية والمصرفية المعاصرة ٤- معجم المصطلحات المالية والاقتصادية في
 لغة الفقهاء ٥- عيون المستجدات الفقهية في صناعة المصرفية الإسلامية
 ٦- المعاوضة عن الالتزام في الفقه الإسلامي ٧- نظرية الوعد الملزم في المعاملات المالية
 ٨- العقود المركبة في الفقه الإسلامي ٩- التحوط لصرف العملات ١٠- عقد
 السلم في الشريعة الإسلامية ١١- مقالات، حبي المشاركة المتناقصة- التكييف الفقهي
 لأسهم شركة المساهمة- تأجير العين المشترية لمن باعها، وغيره

۳۔ معاملات کے مسائل کیسے حل کریں؟

وہ حضرات جنہوں نے شرعی علوم کی کتابیں باقاعدہ استاذ سے پڑھی ہیں اور اس کے بعد افتاء اور جدید مسائل کے حل کے لیے اساتذہ اور ماہرین افتاء کی صحبت میں کچھ عرصہ گزار کر تمرین اور مشق بھی کر لی ہے، ان کے لیے جدید مسائل کو شرعی و فقہی اصولوں کی روشنی حل کرنا اتنا مشکل نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود کچھ حضرات زیادہ مشق و تمرین نہ کرنے یا کسی اور وجہ سے اس سلسلے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ اپنے اساتذہ سے پڑھا، سیکھا اور جدید مسائل کے حل میں ان کا منہج دیکھا، اس کی روشنی میں چند باتیں ترتیب وار بیان کر دی جاتی ہیں، امید ہے ان سے کئی اہل علم کو فائدہ ہوگا۔

واضح رہے کہ یہ ہدایات صرف فن افتاء سے تعلق رکھنے والے اہل علم کے لیے ہیں، عوام کے لیے یا ان دوستوں کے لیے نہیں ہیں جنہوں نے شرعی علوم کی فقط رسمی اور سطحی تکمیل کی ہو اور باقاعدہ کسی ماہر افتاء کی صحبت میں رہ کر تمرین نہ کی ہو۔

یہ ہدایات / امور حسب ترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

- | | |
|--------------------------------------|---------------------------------------|
| ۱۔ توجہ الی اللہ | ۳۔ فقہی کتب میں جواب کی تلاش |
| ۲۔ سوال کا فہم، تحلیل اور فقہی تکلیف | ۵۔ فتاویٰ میں جواب کی تلاش |
| الف۔ معلومات | ۶۔ قواعد کی روشنی میں جواب |
| ب۔ ماہرین سے رابطہ | ۷۔ فقہی اکیڈمی کی قراردادیں اور مجالس |
| ج۔ تحلیل و تجزیہ | ۸۔ معاصر فقہاء کی تحقیقات و بحوث |
| د۔ فقہی تکلیف | ۹۔ پی ایچ ڈی و ایم فل مقالات |
| ۳۔ کتاب و سنت سے جواب | |

۱۔ توجہ الی اللہ

جب بھی کوئی سوال / استفتاء یا نیا مسئلہ پیش آئے تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ علم اور خاص

اس مسئلہ میں درست جواب کے الہام کی دعا کریں۔ ایسے موقع کے لیے اہل علم نے مختلف دعائیں بتائی ہیں، ان کا ورد کریں۔ جیسے "لاحول ولا قوۃ إلا باللہ" اور "أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" (سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ)^(۱)۔ اور (قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي (-) وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي (-) وَاخْلُكْ عُقْدَةَ مِن لِسَانِي)^(۲) اور "یا معلمہ ابراہیم! علمنی" وغیرہ۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "جب مفتی کے سامنے مسئلہ پیش ہو تو اسے چاہیے کہ صرف اپنے علم پر اکتفاء نہ کرے، بلکہ پوری لجاجت اور حاجت کے ساتھ اللہ سے درست جواب کی توفیق طلب کرے اور اللہ سے درستی اور خاص اس مسئلہ میں ایسے شرعی حکم کی راہنمائی طلب کرے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے مشروع کیا ہے۔"^(۳)

۲۔ سوال کا فہم، تحلیل اور فقہی تکلیف

اس کے بعد سوال شروع سے آخر تک پورے غور و فکر سے پڑھیں اور سوال کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ سرسری طور پر سوال دیکھ کر جواب میں ہر گز جلدی نہ کریں، کیونکہ سوال اچھی طرح سمجھ میں آنے سے ہی آدھا جواب سمجھ میں آجاتا ہے اور فقہی اصول ہے کہ: "الحکم علی الشیء فرع عن تصورہ"^(۴)، سوال اچھی طرح سمجھنے کے بعد اگر کوئی بات مبہم اور قابل تنقیح ہو تو مسائل سے اس کے بارے میں تفصیل پوچھی جائے اور اس تفصیل کو سوال میں شامل کر لیا جائے۔ سوال اور مسئلہ کی تحقیق کے لیے چار کام کرنا ضروری ہیں:

الف۔ معلومات:

سوال اور اس کی تفصیلات سے متعلق جہاں سے ممکن ہو سکے، معلومات اکٹھی جائیں، تاکہ جس صورت/واقعه یا معاملہ سے متعلق سوال کیا گیا ہے اس کی مکمل حقیقت سمجھ میں آجائے۔ اگر اس معاملہ/صورت کی کئی اقسام یا ذیلی صورتیں ہیں تو سب کو دیکھ لیا جائے۔ اس کی تاریخ اور اسباب پر نظر دوڑائی جائے۔ موجودہ زمانے میں اس صورت/معاملہ کی اہمیت اور حاجت و ضرورت کو پرکھ لیا جائے۔

(۱) البقرة: ۳۲

(۲) طہ: ۲۵ - ۲۶

(۳) اعلام الموقعین ۱۷۲/۳

(۴) الإبھاج فی شرح المنہاج ۱۷۲/۱

ب- ماہرین سے رابطہ:

سوال میں جس صورت / معاملہ کے بارے میں پوچھا گیا ہو، اس سے متعلق صرف ذاتی معلومات پر ہرگز اکتفاء نہ کیا جائے، بلکہ اس فن کے ماہرین سے رابطہ یا ملاقات کر کے ان سے بھی مشورہ اور معلومات لی جائیں۔ اس سلسلے میں بہتر یہ ہے کہ پہلے سے ہی غور و فکر کر کے چند سوالات تیار کیے جائیں اور ماہرین سے ان سوالات کی تفصیل پوچھی جائے۔ ہر معاملہ / صورت کے لیے اسی کے ماہرین سے رابطہ کیا جائے، جیسے اگر مسئلہ کا تعلق اقتصاد و معیشت سے ہے تو ماہرین اقتصاد سے رابطہ کیا جائے۔ اگر مسئلہ کا تعلق طب سے ہے تو اطباء اور ڈاکٹرز سے، اگر مسئلہ کا تعلق فلکیات سے ہے تو ماہرین فلکیات سے رابطہ کیا جائے۔

ج- تحلیل و تجزیہ:

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی سوال میں شرعی و فقہی اعتبار سے کئی قسم کے حل طلب امور جمع ہوتے ہیں۔ سوال میں غور کر کے ہر اہم بات / امر کو الگ الگ کر کے ان کا تجزیہ و تحلیل کریں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی مفتی کے سامنے ”مراہحہ للامر بالشراء“ سے متعلق سوال آجائے تو اس پر لازم ہے کہ سوال کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہوئے اس کو ان امور میں تقسیم کر دیں:

- (۱)۔ کسٹمر اور بینک کے درمیان ہونے والا وعدہ۔ (۲)۔ بینک کا اس چیز کو اپنے لیے خرید کر اس پر قبضہ کرنا۔
- (۳)۔ مراہحہ مؤجلہ۔ (۴)۔ اجل / ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ۔ (۵)۔ بینک کا اپنے کسٹمر کو چیز خریدنے کے لیے وکیل بنانا وغیرہ۔

د- فقہی تکلیف:

تحلیل و تجزیہ کے بعد سوال کے تمام نکات و امور کی الگ الگ فقہی حیثیت متعین کریں۔ فقہاء نے مختلف احکام کے لیے مختلف حقیقت اور ماہیت طے کر کے بعض کو عبادات، بعض کو مناکحات، بعض کو معاوضات مالیہ، بعض کو خصامات اور بعض کو الگ نام دیے ہیں۔ اس لیے سوال کے ہر نکتہ میں غور و فکر کر کے، اس کی اوصاف و حقیقت معلوم کر کے یہ طے کریں کہ اس سوال کا تعلق فقہ کے کس باب یا کس قسم کے مسائل کے ساتھ ہیں، مثلاً سوال کا تعلق عبادات کے ساتھ ہے یا مناکحات یا معاملات کے ساتھ؟ اگر معاملات کے ساتھ ہے تو سوال بیع سے متعلق ہے یا شرکت وغیرہ سے متعلق؟ اگر بیع سے متعلق ہے تو بیع کی کس قسم کے ساتھ؟ اسی کو ”فقہی تکلیف“ کہتے ہیں۔

فقہی تکلیف کی تعریف یوں کی گئی ہے:

إعطاء الوصف الفقہی للتصرفات محل البحث، ویكون ذلك بالنظر إلى حقیقتها ومجانستها لما یماثلها من التصرفات التي منحت أوصافا فقہیة.^(۱)

فقہی تکلیف: محل بحث معاملات/تصرفات (سوال/واقعہ) کو فقہی صفت دینے کا نام ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب ان معاملات/تصرفات کی حقیقت کو دیکھ کر ان کو ان کے ایسے ہم مثل معاملات/تصرفات کے ساتھ ہم آہنگ و ملحق کیا جائے جن کو فقہی اوصاف دیے گئے ہیں۔

۳۔ کتاب وسنت سے جواب

سوال کے فہم اور تجزیہ کے بعد اس سوال کا جواب قرآن وسنت کی نصوص میں تلاش کریں۔ اگر قرآن مجید کی کسی آیت سے یا سرور دو عالم ﷺ کی کسی قولی یا فعلی حدیث سے جواب کی طرف راہنمائی مل جائے تو اسے ضرور لیں اور اس سے کیسی راہنمائی یا استنباط کیا گیا ہے اس کی بھی وضاحت کریں۔ قرآن وحدیث سے استنباط کرتے ہوئے اصول فقہ کے قواعد کو مد نظر رکھیں، جیسے خاص، عام، یا دلالة المنطوق، دلالة المفہوم یا اگر علت مشترکہ کی بنیاد پر کوئی مسئلہ مستنبط کیا ہے تو قیاس کے اصولوں کی رعایت رکھیں اور ”تنقیح المناط“ پر خصوصی توجہ دیں۔

۴۔ فقہی کتب میں جواب کی تلاش

قرآن وسنت سے سوال کا جواب ملے یا نہ ملے، بہر صورت اس سوال کا جواب فقہاء کی معتمد کتب میں تلاش کریں، کیونکہ فقہاء نے بھی اجتہاد کر کے قرآن وسنت سے ہی مسائل کا استنباط کیا ہے، جن کے مقابلے میں ہمارا اجتہاد ناقص، بلکہ عدم کے درجے میں ہے، اس لیے اپنے ذہن اور اجتہاد کو معیار بنانے سے بہتر ہے کہ فقہاء ومجتہدین کے اجتہاد کو معیار بنایا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جب ہر مسئلہ میں فقہاء کے اجتہاد کو معیار بنایا جاتا ہے تو ہم قرآن وسنت سے استنباط کی کوشش ہی نہ کریں، کیونکہ اس کے بغیر فقہی ملکہ کا حصول ناممکن ہے اور مفتی کی پہلی ذمہ داری ہی یہی ہے کہ سوال کا جواب قرآن وسنت کی نصوص میں تلاش کریں اور اس کے بعد اپنے فہم کو فقہاء ومجتہدین کے فہم پر پیش کر کے اس کی جانچ پڑتال کرے کہ میرے استنباط واجتہاد میں کہاں نقص یا کمی آئی ہے۔

اس سلسلے میں مقلد مفتی کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے مسلک کی معتمد کتب میں جواب تلاش کریں، اس کے بعد دیگر ائمہ کی آراء بھی دیکھیں۔ معاملات کے مسائل میں خصوصی طور پر اس بات پر توجہ دیں کہ اگر کسی مسئلہ میں اپنے

(۱) التکلیف الفقہی، ص: ۲۹

مسک میں لوگوں کے لیے حرج و مشقت ہے تو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اور سہولت کے لیے دوسرے ائمہ کی رائے کو اختیار کریں اور اصولِ افتاء کے اصول و ضوابط کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔
فقہی کتب سے جواب لینے کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں:

۱۔ صریح جزئیہ:

اکثر سوال/واقعہ سے متعلق فقہی کتب میں واضح اور صریح عبارت موجود ہوتی ہے، اس لیے مفتی کو چاہیے کہ خوب محنت اور جستجو سے کام لے کر صریح جزئیہ تلاش کریں اور اس کے مطابق جواب دیں۔

۲۔ تخریج:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی سوال/واقعہ کا جواب فقہی کتب میں واضح اور صریح طور پر موجود نہیں ہوتا، البتہ اس سے ملتے جلتے اور مشابہ مسائل موجود ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ”تنقیح مناط“ اور ”تطبیق“ پر خوب غور و فکر کریں اور نظائر و مشابہ مسائل سے استدلال کر کے سوال/واقعہ کا جواب دیں۔

۵۔ فتاویٰ میں جواب کی تلاش

اس کے بعد متعلقہ سوال کا جواب فتاویٰ کی کتب میں تلاش کریں۔ اس سلسلے میں قدیم فتاویٰ ہوں یا جدید، عربی زبان میں ہوں یا اردو یا کسی اور زبان میں، سب کو دیکھنا چاہیے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اگر متعلقہ مسئلہ سابقہ فقہاء یا معاصر فقہاء کے سامنے آیا ہے تو انہوں نے اس کا کیا جواب دیا ہے اور کس دلیل و بنیاد پر جواب دیا ہے۔ جیسے حکیم الامت شرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ ”امداد الفتاویٰ“ اور استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے فتاویٰ ”فتاویٰ عثمانی“ وغیرہ، جن میں معاصر مسائل، خصوصاً معاملات کے اہم مسائل کے فتاویٰ موجود ہیں۔

۶۔ قواعد کی روشنی میں جواب

عمومی طور پر فقہی قواعد و ضوابط سے جواب نہیں دینا چاہیے، کیونکہ قواعد، کلیہ نہیں ہوتے، بلکہ اکثر یہ ہوتے ہیں اور ممکن ہے متعلقہ سوال کو کسی قاعدہ کے ضمن میں لایا جائے، جبکہ حقیقت میں وہ صورت قاعدہ سے مستثنیٰ ہو۔ اسی طرح قواعد اجمالی اور بہت مختصر ہوتے ہیں، ان کی شرائط و قیودات ہوتی ہیں، جن کو مد نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ البتہ اگر سابقہ مراحل میں کسی کو سوال کا جواب نہ ملے تو ماہر و تجربہ کار مفتی قواعد کی روشنی میں جواب دیکر مسائل کو اس بات کا مشورہ دیں کہ وہ کسی اور مفتی یا فقیہ سے بھی متعلقہ سوال کا جواب معلوم کرے اور اگر ان کا جواب مختلف ہو تو ہمیں بھی مطلع کرے، تاکہ اختلاف کی وجہ معلوم ہو سکے۔

زیر نظر کتاب میں بھی بعض اہم ابواب سے متعلق قواعد و ضوابط اور ان کا مختصر مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ مالی معاملات کے قواعد و ضوابط فقہیہ پر عصر حاضر میں باقاعدہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس سلسلے میں ان کو ضرور دیکھنا چاہیے۔ مثلاً شیخ عطیہ عدلان کی ”موسوعة القواعد الفقهية المنظمة للمعاملات المالية الإسلامية“۔ شیخ احمد بن عبد الرحمن کی ”القواعد الفقهية في المعاملات المالية“۔ شیخ ڈاکٹر صالح حمدی کی ”القواعد الفقهية والمعاملات المالية“۔ شیخ ڈاکٹر الیاس دررور کی ”تطبيقات القواعد الفقهية على المعاملات المالية المعاصرة“۔ شیخ احمد ندوی کی ”القواعد والضوابط الفقهية الحاكمة للمعاملات المالية في الفقه الإسلامي“۔ شیخ فواز بن محمد کی ”القواعد والضوابط الفقهية المؤثرة في المعاملات المصرفية الإسلامية“۔ اس کے علاوہ معاملات کے خاص خاص ابواب کے فقہی قواعد پر بھی مستقل کتابیں موجود ہیں، جیسے ڈاکٹر سلیمان الرحیلی کی ”القواعد الفقهية المتعلقة بالبيع“، ”ضوابط الربا“ اور شیخ بدر جابر علی المری کے ایم فل کا مقالہ ”القواعد والضوابط الفقهية في باب الإجارة“ وغیرہ۔ اس موضوع کی مزید تفصیلات ہم نے اپنی کتاب ”فقہی قواعد کا تحقیقی مطالعہ“ کے پہلے حصے میں بیان کر دی ہیں، وہاں دیکھ لی جائیں۔

قواعد و ضوابط سے جواب دینے کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے:

۱۔ سب سے پہلے متعلقہ سوال کی ”اصل“ اور بنیاد معلوم کریں کہ اس کی اصل جواز/اباحت ہے یا ممانعت و حرمت؟ مثلاً ”تمام اشیاء میں اصل اباحت ہے“، لیکن گوشت اس سے مستثنیٰ ہے، جس کی اصل حرمت ہے۔ اسی طرح اگر معاملات سے متعلق سوال ہے تو ”معاملات میں اصل جواز ہے“، بشرطیکہ کسی شرعی اصول کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔

۲۔ متعلقہ سوال کی ”اصل“ طے کرنے کے بعد اس کی تمام جزئیات و امور کو غور سے دیکھیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس میں کہیں بھی کسی شرعی اصول کی خلاف ورزی تو نہیں پائی جا رہی ہے۔ مثلاً اگر سوال کا تعلق معاملات کے ساتھ ہے تو اس کی اصل، جواز ہے، لیکن اگر اس میں سود، یا جوئے یا غرر وغیرہ کا کوئی عنصر شامل ہو تو اسے منع کر دیا جائے گا۔

۳۔ اگر متعلقہ سوال کی اصل، اباحت یا جواز ہے۔ اس میں کسی شرعی اصول کی خلاف ورزی بھی نہیں پائی جا رہی ہے تو اس کے بعد متعلقہ سوال کے مصالح و مفاسد پر غور کیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ اس سے معاشرے میں کسی قسم کا فتنہ، فساد، خرابی یا کسی کو ضرر کا اندیشہ تو نہیں ہے؟ اگر کسی قسم کے مفسدہ کا اندیشہ ہو تو بھی اسے منع کرنا چاہیے، اگرچہ

”حرام“ نہ کہا جائے، لیکن مناسب تعبیر میں اس سے منع کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اصول فقہ کی بحث ”سد ذرائع“ کو اچھی طرح سمجھ کر اس کا دائرہ کار اور تطبیقات کو دیکھنا چاہیے۔

۷۔ فقہی اکیڈمیز کی قراردادیں

جب بھی کوئی نیا سوال / مسئلہ پیش آئے تو اسے معاصر فقہی اکیڈمیز کی تحقیقات اور قراردادوں میں دیکھنا چاہیے۔ عصر حاضر میں جدید فقہی مسائل کے حل کے لیے مختلف ممالک میں اسلامی و فقہی اکیڈمیز بنی ہیں، جو مختلف مسائل پر بحث و مناقشہ کرنے کے بعد حتمی رائے کو قراردادوں (قرارات) کی شکل میں پیش کرتی ہیں۔ ان اکیڈمیز میں مختلف ممالک سے علمی شخصیات اپنی تحقیقات پیش کرتی اور ان پر مناقشہ کرتی ہیں۔ ان قراردادوں، بحوث و تحقیقات اور مناقشات کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ اس سے کئی معاصر مسائل کے حل میں مدد اور فقہی ملکہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسی چند اکیڈمیز اور قراردادوں کا تذکرہ ”فقہ المعاملات کا مطالعاتی نصاب“ کے تحت ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں ایونی کی ”المعايير الشرعية“ اور مجمع الفقہ الاسلامی کی ”قرارات و توصیات“ بہت اہم ہیں۔

۸۔ معاصر فقہاء کی تحقیقات و بحوث

فقہی اکیڈمیز میں پیش ہونے والی تحقیقات کے علاوہ، انفرادی طور پر بھی عصر حاضر کے کئی محققین اور فقہاء کی تحقیقات و بحوث کتابی شکل میں سامنے آئی ہیں، ان کو بھی دیکھنا چاہیے۔ اس کی تفصیل بھی ”فقہ المعاملات کا مطالعاتی نصاب“ کے تحت بیان کی جا چکی ہے۔

۹۔ پی ایچ ڈی و ایم فل مقالات

مختلف جامعات اور یونیورسٹیز میں عصر حاضر کے کئی مسائل پر مقالات لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں، متعلقہ سوال / موضوع میں ان سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے، کیونکہ ان مقالات میں عموماً موضوع / سوال / مسئلہ کی تمام جہات پر توجہ دی جاتی ہے اور ان کے مطالعہ سے کئی ایسی جہات ہمارے سامنے آسکتی ہیں جو ممکن ہے کہ انفرادی غور و فکر سے ہمارے سامنے نہ آئی ہوں۔ ان کے لیے مختلف جامعات کے پی ایچ ڈی اور ایم فل مقالات کی فہرستیں حاصل کر کے انہیں دیکھ کر اپنے موضوع سے متعلق مقالات کو دیکھنا چاہیے۔

پہلا باب

بیوع اور ربا کے اصولی مباحث اور معاصر صورتیں (Sale and Interest)

باب اول میں بیوع (خرید و فروخت) اور ربا (سود) کے بنیادی اصول اور

معاصر صورتوں کو بیان کیا جائے گا۔ اس باب میں دو فصول ہیں:

پہلی فصل: بیوع کے اصولی مباحث و احکام

دوسری فصل: ربا کے اصولی مباحث و احکام

پہلی فصل

بیوع کے اصولی مباحث و احکام

پہلی فصل کا خاکہ حسبِ ذیل ہے:

۱۔ بیوع کا تعارف، ارکان، شرائط اور اقسام

۲۔ بیوع کی اقسام کا تفصیلی تعارف و احکام

۳۔ خیارات کا تعارف و احکام

۴۔ بیوع کی معاصر و جدید مباحث

۵۔ خرید و فروخت میں اضافی شرط لگانا

۶۔ خرید و فروخت کے اہم جدید مسائل

۷۔ بیوع کے عمومی ضوابط

۱۔ بیوع کا تعارف، ارکان، شرائط اور اقسام

اس حصے میں بیوع سے متعلق چار اہم امور کی تفصیل بیان کی جائے گی:

۱۔ بیع (خرید و فروخت) کا تعارف ۲۔ بیع کے ارکان

۳۔ بیع کی شرائط ۴۔ بیع کی اقسام

۱۔ بیع (خرید و فروخت) کا تعارف

خرید و فروخت کے تعارف میں مندرجہ ذیل پانچ اہم باتوں کی وضاحت کی جائے گی:

الف۔ بیع کی تعریف ب۔ اہم اصطلاحات

ج۔ مال کیا ہے؟ د۔ مقنوم کسے کہتے ہیں؟

ھ۔ مال کی اقسام

الف۔ بیع کی تعریف:

خرید و فروخت کو عربی زبان میں ”بیع“ اور انگریزی میں ”sale“ کہا جاتا ہے۔ لغوی طور پر بیع و شراء ہر قسم کے تبادلہ کو کہتے ہیں، یعنی ”مبادلة شیئ بشیئ“، خواہ مال کا تبادلہ ہو یا مال کے علاوہ کسی چیز کا تبادلہ ہو، لیکن شریعت نے اس کو مال کے تبادلہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے، لہذا اس کی تعریف اب یوں کی جاتی ہے:

مبادلة المال بالمال بالتراضي.^(۱)

کسی مالیت والی چیز کا کسی دوسری مالیت والی چیز سے باہمی رضامندی سے تبادلہ کرنا۔

ب۔ اہم اصطلاحات:

ہر باب سے متعلق خاص اصطلاحات اسی باب کے ضمن میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم یہاں چند عام

اور اہم اصطلاحات کا مفہوم مختصر بیان کر دیا جاتا ہے۔

۱۔ عقد (Contract)

جب دو فریق آپس میں کوئی لین دین کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کو عقد کہتے ہیں۔

۲۔ مجلس عقد (Place of Contract)

وہ جگہ یا مقام جہاں دو فریق آپس میں خرید و فروخت کا معاملہ کرتے ہیں۔ فقہی نقطہ نظر سے اتحاد مجلس کا دار و مدار فریقین کی گفتگو اور موضوع کے اتحاد پر موقوف ہے، اگر بیع کا موضوع بدل جائے یا کوئی فریق کسی ایسے کام میں لگ جائے جسے اعراض سمجھا جاتا ہو تو مجلس بدل جائے گی، اگرچہ دونوں ایک ہی جگہ بیٹھے ہوں۔

۳۔ عاقد، متعاقدین:

”عاقد“ معاملہ کے کسی ایک فریق کو کہتے ہیں۔ دونوں فریقین کو ”متعاقدین“ کہتے ہیں۔

۴۔ بائع اور مشتری:

جو دو فریق آپس میں خرید و فروخت کا معاملہ کرتے ہیں ان میں سے ایک ”فروخت کنندہ (بیچنے والا)“ جبکہ دوسرا ”خریدار“ ہوتا ہے۔ لہذا ”بائع“ اس کو کہتے ہیں جو شخص مطلوبہ چیز بیچ رہا ہوتا ہے، اسے انگریزی میں ”seller“ یا ”supplier“ کہتے ہیں۔ اردو میں اسے ”بیچنے والا شخص“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور ”مشتری“ اس کو کہتے ہیں جو مطلوبہ چیز خرید رہا ہوتا ہے، اسے انگریزی میں ”buyer“ اور اردو میں ”خریدار“ کہتے ہیں۔

۵۔ بیع (The Subject Matter)

جن دو مالیت والی چیزوں کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے، ان میں سے ایک وہ چیز ہوتی ہے جسے بیچنا مقصود ہوتا ہے اسے اردو میں ”بیچ جانے والی چیز“ کہہ سکتے ہیں، جبکہ عربی میں اسے ”بیع“ کہتے ہیں۔

۶۔ ثمن (Price)

دوسری وہ چیز ہوتی ہے جس کے بدلے بیچنا مقصود ہوتا ہے، اسے ”طے شدہ قیمت“ کہا جاتا ہے۔ عربی میں اسے ”ثمن“ اور انگریزی میں اسے ”price“ کہتے ہیں۔ اور ”قیمت“ عربی زبان میں کسی بھی چیز کی مارکیٹ ویلو کو کہتے ہیں۔

۷۔ مثل اشیاء (Fungible)

اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی مثل، یعنی بالکل انہی جیسی چیزیں بازار میں ملتی ہیں اور ان میں کوئی خاص فرق

نہیں ہوتا۔ جیسے وزنی اشیاء مثلاً گندم وغیرہ، اسی طرح کیلی چیزیں یا عددی چیزیں وغیرہ۔^(۱)

۸۔ قسمی اشیاء (Non-Fungible)

وہ اشیاء جن کی مثل بازار میں نہیں ملتی، اگر ملتی ہے تو ان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے حیوانات وغیرہ۔^(۲)

۹۔ منقولی اشیاء (Moveable)

وہ چیزیں جن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہو۔

۱۰۔ غیر منقولی اشیاء (Immoveable)

وہ چیزیں جن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کیا جاسکے، جیسے زمین۔

۱۱۔ کمیلیات:

”کیل“ ایک خاص قسم کا پیمانہ ہوتا تھا، جس کے ذریعے پہلے زمانے میں چیزوں کو ماپتے تھے۔ جن اشیاء کو کیل کے ساتھ ماپا جاتا تھا، ان کو ”کمیلی“ یا ”کمیلیات“ کہتے ہیں۔

۱۲۔ موزونات (Weight able)

جن چیزوں کو وزن کر کے بیچا جاتا ہے ان کو موزونی اشیاء یا ”موزونات“ کہتے ہیں۔

۱۳۔ عددیات (Countable)

جن اشیاء کو عدد کی بنیاد پر، یعنی گن کر بیچا جاتا ہے، ان کو عددیات کہتے ہیں۔ جیسے انڈے وغیرہ۔ جن عددیات کی اکائیاں ایک جیسی ہوتی ہیں اور ان میں زیادہ فرق نہیں ہوتا، ان کو ”عددیات متقارہ“ کہتے ہیں اور جن کی اکائیوں میں فرق ہوتا ہے، ان کو ”عددیات متفاوتہ“ کہتے ہیں۔

۱۴۔ ذرعیات (Measure able)

جن چیزوں کو ذراع یعنی گز کے ساتھ ناپ کر بیچا جاتا ہے، ان کو ذرعیات یا مذروعات کہتے ہیں۔ جیسے کپڑا

وغیرہ۔^(۳)

(۱) مجلة الأحكام العدلیة ص: ۳۲، (المآذۃ ۱۴۵)

(۲) حوالہ بالا ص: ۳۳، (المآذۃ ۱۳۶)

(۳) حوالہ بالا ص: ۳۲، (المآذۃ ۱۳۳) (المآذۃ ۱۳۴) (المآذۃ ۱۳۵) (المآذۃ ۱۳۶)

۱۵۔ قرض، عین اور دین (Loan, Commodity, Debt)

”قرض“ (loan) کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں ہی کسی کو بطور احسان کوئی مثل چیز (گندم یا کرنسی وغیرہ) دی جائے۔ اس کی واپس وصولی کے لیے کوئی مدت طے نہیں کی جاسکتی، بلکہ قرض خواہ کسی بھی وقت اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

”عین“ (commodity) سے مراد ایسی چیز ہے جس کی تعیین و تخصیص ممکن ہو۔ جیسے آپ نے دکاندار سے پانچ کلو چینی خرید لی اور اسے تول کر متعین کر کے الگ رکھ لیا۔ اب اس خاص حصے کے ساتھ آپ کا حق متعین ہو گیا۔ دکاندار اس کو چھوڑ کوئی اور چیز آپ کو نہیں دے سکتا۔ اس کو ”عین“ کہتے ہیں۔

”دین“ (debt) سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کے ذمہ لازم ہو جائے اور وہ متعین و خاص نہ ہو۔ جیسے دکاندار سے چیز خریدنے کی وجہ سے آپ پر جو قیمت لازم ہو جائے وہ دین ہے، آپ کوئی بھی نوٹ دے سکتے ہیں۔ لہذا دین کا مفہوم عام ہے، جبکہ قرض ایک خاص صورت کا نام ہے، یا بالفاظ دیگر قرض، دین کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔^(۱)

۱۶۔ تصرف (Authority to Use)

”تصرف“ کے لغوی معنی ہے کسی چیز کو پلٹنا۔ فقہی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے کسی انسان سے صادر ہونے والا وہ قول یا فعل جس پر کوئی شرعی حکم مرتب اور لاگو ہو سکے۔

۱۷۔ غرر (Uncertainty)

”غرر“ کے لغوی معنی دھوکہ دینے، اور نامعلوم ہونے کے آتے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے ہر وہ معاملہ جس کا انجام نامعلوم ہو۔ اسی میں فقہاء نے مبیعہ کی جہالت، ثمن کی جہالت، مدت کی جہالت وغیرہ کو بھی شامل کیا ہے۔

ج۔ مال کیا ہے؟

فقہاء کرامؒ نے ”مال“ کی مختلف تعریفات کی ہیں، بعض کی تعریف کی رو سے مال صرف ”اعیان“ یعنی مادی اور محسوس چیزوں میں منحصر ہو جاتا ہے، جبکہ اکثر فقہاء مال کی تعریف میں ”منافع اور حقوق“ کو بھی داخل کرتے ہیں، چنانچہ بعض حنفیہ نے مال کی تعریف یوں کی ہے ”مال وہ چیز ہے جو عین (یعنی مادی اور محسوس) ہو اور جس کے بارے میں

^(۱) درر الحکام فی شرح مجلة الأحكام ۱/ ۱۲۸

لوگوں کے اندر رغبت اور حرص پائی جاتی ہو اور حاجت و ضرورت کے لیے اس کا ذخیرہ کرنا ممکن ہو۔“
علامہ خضکیؒ لکھتے ہیں:

المراد بالمال عین یجری فیہ التنافس والابتدال۔^(۱)

مال سے مراد وہ مادی اور محسوس چیز ہے جس کے بارے میں لوگوں کے اندر حرص و رغبت پائی جائے اور اُسے خرچ کیا جاتا ہو۔

اس تعریف کی رو سے مالیت صرف مادی اور محسوس چیزوں میں منحصر ہے اور حقوق چونکہ مادی اور محسوس چیز نہیں، اس لیے وہ مال بھی نہیں ہیں، لہذا ان کی خرید و فروخت جائز نہیں ہوگی، علامہ خضکیؒ لکھتے ہیں:

وأفاد تعریفنا لمال بعین أن المنفعة لیست بمال۔^(۲)

ہم نے جو مال کی تعریف ”عین“ سے کر دی اس سے معلوم ہوا کہ ”منفعت“ مال نہیں ہے۔
لیکن اس سلسلے میں چند باتیں قابل غور ہیں:

پہلی بات:

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

المُرَادُ بِالْمَالِ مَا يَمِيلُ إِلَيْهِ الطَّبَعُ وَيُمْكِنُ ادِّخَارُهُ لَوْفَتِ الْحَاجَةُ، وَالْمَالِيَّةُ تَنْبُتُ
بِنَمَوْلِ النَّاسِ كَأَقْلَى أَوْ بَعْضِهِمْ۔^(۳)

ترجمہ: مال سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور اسے ضرورت کے وقت کے لیے ذخیرہ کیا جاسکے، اور مالیت تمام لوگوں یا بعض لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے۔

اس تعریف میں مال کو صرف اعیان اور مادی اشیاء میں منحصر نہیں کیا گیا، بلکہ اس کو عام رکھا ہے، لہذا اس میں ان حقوق و منافع کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جن کو لوگوں کے عرف میں مال سمجھا جانے لگے۔

دوسری بات:

خود فقہاء حنفیہ کے ہاں بھی بعض فروعات میں منافع کو، عین کے ساتھ متعلق قرار دیکر ان کی بیع کو جائز قرار دیا گیا

^(۱) الدر المنتنقى حاشیہ علی الملتقى الأبحر ۴/۳

^(۲) حوالہ بالا ۴/۳

^(۳) حاشیہ ابن عابدین ۴/۰۱

ہے، جیسے راستہ پر گزرنے کا حق اور حق المسیل وغیرہ۔

تیسری بات:

فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں بیع کی تعریف میں ”مباح منافع“ بھی داخل ہیں، بشرطیکہ وہ ”منافع مؤبدہ ہوں“ عارضی نہ ہوں، ورنہ عارضی منافع پر اجارہ ہوتا ہے۔

چوتھی بات:

”مال“ کی تعریف قرآن و سنت میں صراحت کے ساتھ نہیں کی گئی، اور شریعت کا ایک ماخذ ”عرف و عادت“ بھی ہے اور عرف میں کئی ایسی چیزوں کو بھی مال کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے جو کہ ”اعیان“ میں سے نہیں ہیں، بلکہ خود علامہ شامی کے قول سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء کو مال بنانے میں عرف کو بھی دخل ہے، اس لیے جو چیز مادی اور محسوس نہ ہو، لیکن عرف میں اس کے ساتھ مال والا معاملہ کیا جاتا ہو اسے بھی مال ہی سمجھا جائے گا، اور بعض حقوق عرفیہ بھی مال میں داخل ہو جائیں گے۔ جیسے آج کل بجلی اور گیس وغیرہ جو اعیان نہیں ہیں، لیکن عرف میں ان کو مال سمجھا جاتا ہے۔ ایسی چیزوں کو مال میں شمار کیا جائے گا۔

د۔ متقوم کسے کہتے ہیں؟ (Thing of Value)

”متقوم“ کے دو مفہوم ہیں:

۱۔ متقوم شرعی

۲۔ متقوم عرفی

۱۔ متقوم شرعی: کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے اس چیز سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیا ہو۔ چنانچہ علامہ خضکیؒ

فرماتے ہیں:

فإن أبيع الانتفاع به شرعا، فمتقوم. ^(۱)

۲۔ متقوم عرفی: کا مطلب ہے ”مال محرز“ یعنی وہ مال جو محفوظ ہو اور اس تک آسانی سے رسائی ممکن ہو۔

علامہ علی حیدر فرماتے ہیں:

والثاني: بمعنى المال المحرز فالسمك في البحر غير متقوم وإذا اصطيد صار

متموما بالإحراز. فالمعنى الأولي هو معنى المال الشرعي والثاني معناه العرفي.^(۱)

اگر بیع یا ثمن میں سے کوئی چیز ایسی ہو کہ جو کسی نہ کسی کے ہاں مال سمجھی جاتی ہو، لیکن وہ ”مستوم“ نہ ہو، یعنی شریعت نے اس سے انتفاع حاصل کرنے کو منع فرمایا ہو، جیسے: خنزیر اور شراب، یہ دونوں ذمیوں کے ہاں مال ہیں، لیکن شرعاً ان سے نفع کا حصول ممنوع ہے، اس قسم کی بیع کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ غیر مستوم چیز کو ”بیع“ بنایا جائے اور کسی ایسی چیز کو ثمن بنایا جائے جو کہ ذین ہو، یعنی واجب فی الذمہ ہو سکتی ہو، جیسے: نقود اور کرنسی کے ذریعے شراب خریدنا۔ خرید و فروخت کی اس صورت کو فقہاء حنفیہ نے ”بیع باطل“ قرار دیا ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مستوم چیز کا تبادلہ کسی عین اور سامان سے کیا جائے، جیسے: خنزیر یا شراب کا تبادلہ کپڑے سے کرنا، اس صورت میں کپڑے کی بیع کو ”بیع فاسد“ کہا جاتا ہے، لہذا کپڑے کا خریدار قبضہ کرنے کے بعد کپڑے کا مالک بن جائے گا، لیکن شراب اور خنزیر کی بیع اس صورت میں بھی باطل ہی کہلائے گی، ان کا خریدار قبضہ کر لینے سے بھی ان کا مالک نہیں بنے گا۔^(۲)

یہ عام فقہاء حنفیہ کی رائے ہے، جہاں تک علامہ ابن ہمام کی رائے ہے تو ان کے ہاں سابقہ دونوں صورتیں بیع باطل کی ہیں، خواہ غیر مستوم چیز (جیسے شراب، خنزیر) کا تبادلہ کسی ثمن سے کیا جائے یا کسی عین اور سامان سے کیا جائے۔ یہی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

هَذَا إِلَّا أَنِّي أَقُولُ وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ مَعَ ذَلِكَ: إِنَّ الْخَمْرَ وَالْخَنزِيرَ لَيْسَا بِمَالٍ فِي شَرِيعَتِنَا، فَإِنَّ الشَّارِعَ أَهَاتَهُمَا بِكُلِّ وَجْهِ حَتَّى لَعَنَ حَامِلَتَهَا وَمُعْتَصِرَهَا مَعَ أَهْتَا مَقْصُودَةً حَالَ الْإِعْتِصَارِ، بَلِ الْمَوْجُودُ حِينَئِذٍ نَبِيَّهُ أَنْ يَصِيرَ خَمْرًا وَبِأَعْتَابِهَا وَأَكَلِ نَمَتِهَا وَهِيَ مَالٌ فِي شَرْعِ أَهْلِ الْكِتَابِ عَلَى زَعْمِهِمْ، وَحِينَئِذٍ أَمَرْنَا أَنْ نَتْرَكَهُمْ وَمَا يَدِينُونَ فَقَدْ أَمَرْنَا بِإِعْتِبَارِ بَيْعِهِمْ إِيَّاهَا وَبَيْعِهِمْ بِهَا، فَإِذَا كَانَ أَحَدُ الْعَوْضَيْنِ خَمْرًا أَوْ خَنزِيرًا فِي بَيْعِ الْمُسْلِمِ فَهُوَ بَاطِلٌ لَا يُفِيدُ الْمَلِكُ فِي التَّبَدُّلِ الْآخَرَ وَإِنْ كَانَ ثَمَنًا، وَإِنْ كَانَ فِي بَيْعِهِمْ فَصَحِيحٌ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ.^(۳)

(۱) درر الحکام فی شرح مجلة الأحكام ۱۱۶/۱

(۲) حوالہ بالا ۱۸۶/۱

(۳) فتح القدیر ۱۵۲/۱۵

ھ۔ مال کی اقسام:

فقہاء نے فقہی کتب میں مختلف حیثیت اور اعتبارات سے مال کی کئی اقسام بیان کی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

- ۱۔ مالِ مثلی اور مالِ قیسی
- ۲۔ مالِ منقول اور مالِ غیر منقول
- ۳۔ مالِ متقوم اور مالِ غیر متقوم
- ۴۔ دین اور عین
- ۵۔ مالِ استعالی اور مالِ استہلاکی
- ۶۔ مالِ مملوک، مالِ مباح، مالِ مجبور
- ۷۔ مالِ ظاہر اور مالِ باطن
- ۸۔ مالِ نامی اور مالِ غیر نامی
- ۹۔ قابلِ تقسیم مال اور غیر قابلِ تقسیم مال

ان اقسام میں پہلی تین تقسیمات (مثلی و قیسی، منقول و غیر منقول، متقوم اور غیر متقوم) کی کچھ وضاحت سابقہ اصطلاحات میں کی جا چکی ہے۔ ”دین“ اس مال کو کہتے ہیں جو متعین و مشخص نہ ہو اور کسی کے ذمہ لازم ہو سکتا ہو، جیسے گندم، کرنسی وغیرہ، جبکہ ”عین“ سے ایسی چیز مراد ہے جو متعین و مشخص ہو سکے اور کسی کے ذمہ لازم نہ ہو سکے، جیسے بکری وغیرہ۔

”مالِ استعالی“ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو استعمال کرنے سے ختم نہ ہو، بلکہ استعمال کے باوجود ان کی ذات باقی و برقرار رہے، جیسے زمین، کپڑے اور برتن وغیرہ۔ ان کو بیچنا بھی جائز ہے اور ان کو کرایہ پر دینا بھی جائز ہے۔ جبکہ ”مالِ استہلاکی“ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو استعمال کرنے سے ختم ہو جاتی ہیں، جیسے کھانے، پینے کی اشیاء اور گھاس وغیرہ۔ ان کو بیچا جاسکتا ہے، لیکن ان کو کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا۔

”مالِ مملوک“ سے مراد وہ مال یا وہ چیزیں ہیں جو لوگوں کی ملکیت کے تحت داخل ہو سکتی ہیں، جبکہ ”مالِ مباح“ وہ مال یا اشیاء ہیں جو کسی کی ملکیت نہیں ہیں، بلکہ مباح عام ہیں، ہر شخص ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، جیسے دریا اور بارش کا پانی، شکار وغیرہ۔ اس کی مکمل تفصیل ”شرکتِ اباحت“ کے تحت آئے گی۔ ”مالِ مجبور“ سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں عوام کی مصلحت کے لیے ملکیت میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہو، جیسے وقف، مثلاً مسجد، مسافر خانہ وغیرہ۔

”مالِ ظاہر“ سے مراد ایسا مال ہے جس کو لوگ چھپا کر نہ رکھتے ہوں، بلکہ مالک کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس پر مطلع ہو سکتے ہوں، جیسے حیوانات، کھیتی وغیرہ۔ ”مالِ باطن“ سے مراد وہ مال ہے جسے عموماً لوگ چھپا کر رکھتے ہوں جیسے نقد اور سونا چاندی وغیرہ۔ یہ تقسیم فقہاء اس لیے کرتے ہیں کہ اکثر فقہاء کے ہاں حکومتِ وقت کو صرف انسان کے ”مالِ ظاہر“ سے زکوٰۃ وصول کرنے کی ولایت اور اختیار حاصل ہے، ”مالِ باطن“ سے زکوٰۃ خود مالک ادا کرے گا۔

”مال نامی“ اس مال کو کہتے ہیں جس میں مالک کے لیے اضافہ، نفع اور بڑھوتری ہوتی رہے، جیسے حیوانات جو بچے دیتے ہیں، مال تجارت، کرنسی اور سونا، چاندی وغیرہ۔ ”مال غیر نامی“ وہ مال ہے جس میں بڑھوتری اور اضافہ نہ ہو، جیسے گھریلو استعمال کی اشیاء، استعمال کا گھر، زمین یا ذاتی گاڑی وغیرہ۔ یہ تقسیم بھی فقہاء زکوٰۃ کے باب میں کرتے ہیں، کیونکہ زکوٰۃ صرف ”مال نامی“ پر واجب ہوتی ہے۔^(۱)

۲۔ بیع کے ارکان

بیع کے ارکان کے عنوان کے تحت مندرجہ ذیل سات امور کی وضاحت کی جائے گی:

الف- بیع کے ارکان کون سے ہیں؟

ب- ایجاب و قبول کی تعریف

ج- ایجاب و قبول کی صورتیں

د- ایجاب و قبول معتبر ہونے کی شرائط

ھ- خیار مجلس

و- ایجاب کب ساقط ہوگا؟

ز- ایجاب و قبول بذریعہ آلات جدیدہ

الف- بیع کے ارکان کون سے ہیں؟

حنفیہ کے ہاں بیع کے ارکان صرف ایجاب و قبول ہیں، جبکہ ائمہ ثلاثہ کے ہاں خریدار، فروخت کنندہ، بیع (چیز)، قیمت اور ایجاب و قبول یہ سب بیع کے ارکان ہیں، کیونکہ رکن وہ ہوتا ہے جس پر کسی چیز کا وجود موقوف ہو، اور بیع اس وقت تک وجود میں نہیں آتی، جب تک یہ تمام چیزیں موجود نہ ہوں۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں بیع کے منعقد ہونے کے لیے ان تمام چیزوں کا ہونا ضروری تو ہیں، لیکن رکن صرف ایجاب و قبول ہیں، کیونکہ رکن کسی بھی چیز کی حقیقت اور ماہیت کا جزء ہوتا ہے، جبکہ متعاقدین اور معقود علیہ وغیرہ یہ بیع کی حقیقت کا حصہ نہیں ہے، یہ زیادہ سے زیادہ ”مقومات“ ہیں۔

ب- ایجاب و قبول کی تعریف:

جس عمل کے ذریعے فریقین معاملہ طے کرنے کے لیے رضامندی کا اظہار کرتے ہیں اسے ایجاب و قبول

(offer & acceptance) کہا جاتا ہے۔

حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ جس فریق کی طرف سے پہلے اظہارِ رضامندی ہو، اس کی پیشکش کو ”ایجاب“

(offer) کہتے ہیں، خواہ یہ فروخت کنندہ کی طرف سے ہو یا خریدار کی طرف سے۔ پہلے فریق کی پیشکش پر دوسرے فریق

(۱) المدخل الفقہی العام ۱۴۶/۳، مقدمات فی المال والملکۃ والعقد، علی محی الدین، ص: ۴۱

کی طرف سے رضامندی کے اظہار کو ”قبول“ (acceptance) کہتے ہیں۔ حاصل یہ کہ ایجاب کسی بھی طرف سے ہو سکتا ہے، بیچنے والے کی طرف سے بھی اور خریدار کی طرف سے بھی۔

ائمہ ثلاثہ کی رائے یہ ہے کہ ایجاب اس قول یا جملے / عمل کو کہتے ہیں جو فروخت کنندہ یعنی بائع استعمال کرتا ہے، جبکہ قبول اس جملے / عمل کو کہیں گے جو مشتری یعنی خریدار استعمال کرتا ہے۔ ان کے ہاں پہلے یا بعد والے قول کو نہیں دیکھا جاتا ہے، بلکہ ایجاب، بائع کے ساتھ اور قبول، مشتری کے ساتھ خاص ہے۔^(۱)

یہ محض اصطلاحی اختلاف ہے، احکام میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ج۔ ایجاب و قبول کی صورتیں:

ایجاب و قبول صرف بولنے ہی کی صورت میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کی بنیادی طور پر تین قسمیں ہیں:

۱۔ زبانی الفاظ کے ذریعے (By words)

۲۔ تحریر کے ذریعے (In writing)

۳۔ عمل کے ذریعے (By Act)

۲، ۱۔ زبانی الفاظ اور تحریر کے ذریعے:

اصولی طور پر شریعت نے ایجاب و قبول کے لیے کوئی مخصوص و متعین الفاظ مقرر نہیں کئے، اور نہ ہی شریعت میں اس سلسلے میں لغت کا اعتبار ہے، بلکہ لسانی عرف کا اعتبار ہے، یعنی عرف میں خرید و فروخت کے لیے رضامندی کا اظہار جن الفاظ میں کیا جاتا ہے یا وہ الفاظ جن سے کسی شخص کو کسی چیز کا مالک بنانا سمجھ میں آتا ہے وہ الفاظ استعمال کرنے سے بیع ہو جائے گی۔

مثلاً فروخت کنندہ یہ کہے کہ میں نے (۱۰۰۰) روپے میں فلاں چیز آپ کو بیچ دی، خریدار نے کہا میں نے لے لی، یا فروخت کنندہ کہے میں نے (۱۰۰۰) روپے میں یہ چیز آپ کو دے دی، اور خریدار کہے کہ میں نے رکھ لی وغیرہ۔

البتہ زبانی یا تحریری الفاظ میں ان امور کو مد نظر رکھنا ضروری ہیں:

۱۔ وعدہ کے الفاظ استعمال نہ ہوں، مثلاً بائع یہ کہے کہ میں سو روپے میں بیچنے کا وعدہ کرتا ہوں، خریدار اسے قبول

کر لے تو اس سے بیع منعقد نہ ہوگی، بلکہ بیع کا وعدہ ہوگا۔

۲۔ مستقبل کا صیغہ استعمال نہ کیا جائے، اگر کسی ایک نے بھی مستقبل کا صیغہ استعمال کیا تو بیع منعقد نہ ہوگی، جیسے فروخت کنندہ کہے کہ میں فلاں چیز سو روپے میں آپ کو بیچ دوں گا یا فروخت کنندہ نے تو یہ کہا کہ فلاں چیز آپ کو سو روپے میں بیچ دوں، لیکن خریدار نے کہا کہ خرید لوں گا تو بھی بیع منعقد نہ ہوگی۔

۳۔ ماضی کے صیغہ میں خبر نہ ہو یعنی فروخت کنندہ یوں نہ کہے کہ میں نے فلاں چیز بیچی تھی، بلکہ انشاء ہو یعنی یوں کہے کہ میں نے فلاں چیز بیچی۔ ماضی مطلق کا محاورہ ہو یا حال کا، جیسے بیچتا ہوں۔ ان دو کے علاوہ کوئی اور محاورہ نہ ہو۔

۴۔ اقرار کے الفاظ بھی نہ ہوں، جیسے فروخت کنندہ کہے کہ میں بیچنے کا اقرار کرتا ہوں۔

۵۔ سوالیہ جملہ اور امر کا صیغہ نہ ہو۔ جیسے کیا آپ فلاں چیز بیچ رہے ہیں؟

• سکوت:

واضح رہے کہ محض سکوت اور خاموشی کو بیع میں قبول نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ زبانی وضاحت یا عملی طور پر بیع کو قبول کرنا ضروری ہے، کیونکہ فقہی اصول ہے کہ: "لا ینسب الی ساکت قول"۔

• اشارہ:

جو شخص کلام پر قادر نہ ہو، یعنی گونگا ہو، اس کے اشارے سے بیع منعقد ہو سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اشارہ معروف ہو اور سمجھ میں آنے والا ہو۔ جو شخص کلام پر قادر ہو، اس کے اشارہ سے بیع منعقد نہ ہوگی۔

۳۔ عمل کے ذریعے:

زبانی یا تحریری الفاظ کے بغیر اگر فریقین کوئی ایسا عمل کر دیں جس سے دونوں کی خرید و فروخت پر رضامندی سمجھ میں آتی ہو تو اس سے بھی بیع ہو جاتی ہے، فقہی اصطلاح میں اس بیع کو "تعاطی" کہا جاتا ہے۔ جیسے کسی نے دکان کے کاؤنٹر پر ایک روپیہ رکھا اور ڈبہ سے ایک ٹائی اٹھالی، دکاندار نے روپیہ لے لیا۔ یہاں عمل کے ذریعے ایجاب و قبول ہوا۔ کبھی تو دونوں طرف سے ہی عمل ہوتا ہے اور کبھی ایک طرف سے الفاظ اور دوسری طرف سے عمل ہوتا ہے،

البتہ بیع تعاطی کے لیے چند امور ضروری ہیں:

۱۔ قیمت پہلے سے معلوم ہو، یا تو عرف اور بازار کی وجہ سے یا دونوں نے پہلے کسی دن قیمت طے کر دی ہو۔

۲۔ رضامندی سے معاملہ ہو، کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ ہو۔

۳۔ بیع فاسد پر مبنی، تعاطی نہ ہو، کیونکہ اس عمل یا تعاطی کو بیع فاسد کا ہی حصہ سمجھا جائے گا، البتہ بیع فاسد کو ختم

کر کے تعاطی کر سکتے ہیں۔

۴۔ فقہاء شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ عمل کے ذریعے ایجاب و قبول (تعاظمی) نہیں ہو سکتا، بلکہ الفاظ ضروری ہیں۔ بعض شافعیہ نے صرف خسیں اور کم قیمت والی اشیاء میں بیع تعاظمی کی اجازت دی ہے۔ لیکن جمہور علماء کے ہاں ہر قسم کی اشیاء میں عمل کے ذریعے بیع ہو سکتی ہے۔

۵۔ بعض فقہاء کے ہاں بیع تعاظمی میں دونوں جانب سے باقاعدہ عطاء (یعنی دینے کا عمل) ضروری ہے، صرف ایک جانب سے عطاء اور عمل کافی نہیں ہے۔ لیکن جمہور علماء کے ہاں ایک جانب سے بھی عمل کافی ہے، بشرطیکہ اس سے معاملہ مکمل سمجھا جاتا ہو۔^(۱)

د۔ ایجاب و قبول معتبر ہونے کی شرائط:

ایجاب و قبول کے معتبر ہونے کے لیے کچھ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، اگر یہ شرائط موجود ہوں تو بیع منعقد ہوگی، ورنہ نہیں۔

یہ شرائط درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلی شرط: ایجاب و قبول میں مطابقت ہو جس کی درج ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ جس چیز پر ایجاب ہو جائے، اسی کو قبول کیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بیع منعقد نہ ہوگی۔ جیسے دکاندار نے کہا کہ میں پچاس روپے فی کلو سب بیچتا ہوں، خریدار نے کہا کہ میں اس ریٹ پر آم خریدتا ہوں تو اس طرح نہ آم کی بیع ہوئی نہ سب کی، بلکہ خریدار کی طرف سے آم کی خریداری کے لیے نئی پیشکش (ایجاب) ہوئی، اگر فروخت کنندہ اسے قبول کرے گا تو آم کی بیع ہو جائے گی، ورنہ کسی چیز کی بھی بیع نہ ہوگی۔

۲۔ جس قیمت پر ایجاب ہو جائے، اسی پر قبول ہو، اگر کم پر قبول ہو تو یہ معتبر نہیں۔ مثلاً دکاندار نے کہا کہ سو روپے میٹر کے حساب سے کپڑا بیچتا ہوں، خریدار نے اسی روپے لگائے تو خریدار کا یہ عمل قبول نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ نیا ایجاب ہوگا، اگر دکاندار اسے قبول کر لے، خواہ زبان سے یا عمل سے، تو اس طرح (۸۰) روپے پر بیع ہو جائے گی، ورنہ نہیں۔ البتہ اگر خریدار نے ایجاب سے زیادہ قیمت پر قبول کر لیا تو اس سے بیع منعقد ہو جائے گی اور اسے ایجاب کے خلاف نہیں سمجھا جائے گا۔

۳۔ اگر ایجاب نقد پر ہو تو قبول بھی نقد پر ہو، قبول ادھار پر ہو تو یہ معتبر نہ ہوگا۔ مثلاً دکاندار نے کہا میں یہ چیز

نقداً سو روپے میں بیچتا ہوں، خریدار نے کہا کہ میں یہ چیز ایک ماہ کے ادھار پر خریدتا ہوں تو خریدار کا جواب قبول نہیں کہلائے گا، بلکہ نیا ایجاب ہوگا، اگر دکاندار قبول کر لے تو بیع ہوگی، ورنہ نہیں۔

۲۔ جتنی چیز پر ایجاب ہو، اتنی چیز پر قبول ہو، اگر اس سے مختلف ہو تو وہ قبول نہیں سمجھا جائے گا۔ جیسے دکاندار نے کہا کہ بیس کلو آنا، ہزار روپے میں بیچتا ہوں، خریدار نے دس کلو کا آنا پانچ سو میں قبول کیا تو اس کا یہ قبول مفید نہ ہوگا، بلکہ یہ نیا ایجاب ہوگا، البتہ اگر دکاندار یہ کہہ دے کہ فی کلو آنا پچاس روپے کا بیچتا ہوں، تو پھر خریدار آزاد ہے کہ، جتنا چاہے لے لے اور اسی کے حساب سے پیسے دو دکاندار کو دیدے، کیونکہ اس صورت میں ہر کلو کے لیے الگ الگ ایجاب کیا گیا ہے۔

۲۔ دوسری شرط: قبول سے پہلے ایجاب واپس نہ لیا گیا ہو، اگر پہلے فریق نے قبول سے پہلے ایجاب واپس لے لیا تو اب قبول مفید نہ ہوگا۔ جیسے کسی نے کہا کہ میں اپنا یہ موبائل دس ہزار میں بیچتا ہوں، ابھی خریدار سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل والے نے اپنی بات واپس لی اور کہا کہ بارہ ہزار سے کم میں نہیں بیچ سکتا۔ اب اگر خریدار موبائل خریدنا چاہتا ہے تو بارہ ہزار کا بی خرید سکتا ہے۔

۳۔ تیسری شرط: ایجاب و قبول فریقین کی رضامندی سے ہو، کسی فریق پر کسی قسم کا کوئی دباؤ یا جبر و زبردستی نہ ہو۔ اگر زبردستی کے تحت کسی سے کوئی چیز بیچی یا خریدی گئی تو اس کے بعد اسے اختیار ہوگا کہ اس بیع کو باقی رکھے یا ختم کر دے۔

۴۔ چوتھی شرط: ایجاب و قبول ایک ہی مجلس میں ہو، اگر قبول سے پہلے مجلس بدل گئی تو وہ قبول مفید نہ ہوگا۔ مجلس بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی فریق ایسا کام کرے جس سے گذشتہ ایجاب سے اعراض سمجھا جا رہا ہو، البتہ اگر وہ دوسرا کام اسی خرید و فروخت سے متعلق ہو تو ایسی صورت میں کوئی فریق ایسے کام میں اگر مشغول ہو بھی جائے تو اس کا یہ عمل اعراض نہیں سمجھا جائے گا۔

۵۔ خیاری مجلس:

فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں ایجاب کے بعد اور قبول سے پہلے ایجاب کرنے والا اپنے ایجاب سے رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ایجاب و قبول دونوں ہو جائے تو اس کے بعد کوئی بھی فریق رجوع نہیں کر سکتا۔ خواہ دونوں اسی مجلس میں ہو، جو دونوں یا مجلس ختم ہو چکی ہو۔

فقہاء شافعیہ اور حنبلیہ کے ہاں اگر ایجاب و قبول ہو چکے ہیں، لیکن مجلس عقد ابھی قائم ہے تو دونوں میں سے ہر فریق اس معاملہ کو ختم کر سکتا ہے۔ اس کو فقہی اصطلاح میں ”خیاری مجلس“ کہتے ہیں۔ تفصیل اور دلائل کے لیے فقہی کتب

کی طرف مراجعت کریں۔^(۱)

و- ایجاب کب ساقط ہوگا؟

ایجاب کے بعد، قبول سے پہلے اگر ایجاب ساقط ہو جائے تو اب قبول کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ایجاب کے ساقط ہونے کی تین بنیادی صورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱- ایجاب کرنے والا خود ہی قبول کرنے سے پہلے ایجاب سے رجوع کر لے۔

۲- قبول کرنے سے پہلے مجلس بدل گئی۔ مثلاً ایجاب کرنے والا یا قبول کرنے والا قبول کرنے سے پہلے ہی مجلس

سے اٹھ جائے۔ یا کوئی بھی ایسا عمل کرنے لگ جائے جس سے اعراض سمجھ میں آئے۔

۳- یا ایجاب کے بعد دوسرے فریق نے واضح طور پر ایجاب کو رد کر کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ز- ایجاب و قبول بذریعہ آلات جدیدہ:

مواصلات و روابط کے جدید ذرائع کو دیکھا جائے تو مندرجہ ذیل دو بنیادی صورتیں ہیں، جن کے ذریعے ایجاب

و قبول کیا جاسکتا ہے:

۱- ایجاب و قبول بذریعہ فون:

جس طرح آمنے سامنے گفتگو وغیرہ کے ذریعے ایجاب و قبول کرنے سے بیع منعقد ہو جاتی ہے، اسی طرح فون پر

ایجاب و قبول کرنے سے بھی بیع ہو جاتی ہے اور ایسی صورت میں جب تک فریقین اسی موضوع سے متعلق گفتگو کرتے

رہیں گے، ایک ہی مجلس سمجھی جائے گی، دوسرے موضوع پر گفتگو کرنے اور اسی طرح کال / رابطہ ختم ہو جانے کو مجلس کا

بدلنا سمجھا جائے گا۔

۲- ایجاب و قبول بذریعہ تحریر:

اگر ایجاب و قبول تحریر کے ذریعے ہو تو جس مجلس میں خط یا فیکس، یا ای میل یا میج دوسرے فریق نے پڑھا، وہ

مجلس عقد (meeting of contract) ہے اگر اس مجلس کے ختم ہونے کے بعد اس نے قبول کیا تو معتبر نہ ہوگا۔

یہ فقہاء کی عمومی رائے ہے، لیکن اس میں آج کل بہت حرج ہے۔ چونکہ مجلس کے آخر تک قبول کا اختیار دینا غور

و فکر کے لیے ہوتا ہے، جبکہ یہ ضروری نہیں کہ جس مجلس میں خط وغیرہ پہنچ جائے اسی مجلس میں غور و فکر آسانی سے کیا

^(۱) الفقه على المذاهب الأربعة ۱۲۵/۲

جاسکے، اس لیے استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے لکھا ہے کہ جس کو خط یا میل وغیرہ موصول ہوئی تو وہ آدمی درج ذیل حالات یا اوقات تک جواب دینے میں تاخیر کر سکتا ہے، اس کے بعد نہیں:

۱۔ جس کو خط لکھا گیا ہے، اس نے صراحت کے ساتھ انکار کر دیا تو ایجاب باطل ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ قبول نہیں کر سکتا۔

۲۔ اگر ایجاب میں قبول کی مدت بیان کی گئی تھی، تو اس مدت کے اندر اندر اسے قبول کیا جاسکتا ہے، اگر وہ مدت ختم ہو گئی تو اب قبول نہیں ہو سکتا۔ اس کو ”ایجاب موقت“ یا ”ایجاب محدود“ کہتے ہیں۔

۳۔ قبول سے پہلے ہی ایجاب کرنے والے نے اپنے ایجاب سے رجوع کر کے اسے باطل کر دیا۔ تو اس کے بعد بھی اس ایجاب کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ یا جس کو خط لکھا گیا ہے وہ اتنی مدت تک خاموش رہا کہ عرف میں اس کو انکار سمجھا جاتا ہو۔ واضح رہے کہ جس کو خط یا میسج یا فیکس وغیرہ ملا ہے، اگر اس نے زبانی قبول کر لیا یا تحریری طور پر قبول کر لیا، لیکن ابھی خط یا میسج وغیرہ آگے ارسال نہیں کیا تو اس کے حق میں یہ بیع دیانہ منعقد ہو جائے گی، اس کے بعد اگر وہ انکار کرتا ہے تو گناہ گار ہوگا، البتہ ایجاب کرنے والے کے حق میں اس وقت یہ معاملہ لازم ہوگا جب اسے خط وغیرہ کے ذریعے قبول کا علم ہو جائے گا۔^(۱)

دو باتیں:

پہلی بات: فیکس، میسج، ای میل وغیرہ کے ذریعے جب ایجاب ہو جائے اور دوسرے فریق کے پاس ایجاب کی خبر پہنچ جائے تو سوال یہ سامنے آتا ہے کہ یہ معاملہ کب مکمل سمجھا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے فریق کے قبول کی دو صورتیں ہیں:

الف۔ دوسرا فریق صرف زبانی طور پر فی الحال قبول کر لے تو ایسی صورت میں دوسرے فریق کے حق میں دیانہ یہ معاملہ مکمل سمجھا جائے گا، کیونکہ اس نے قبول کر لیا ہے، اب اس کے بعد اگر وہ انکار کرتا ہے تو گناہ گار ہوگا، لیکن جس نے ایجاب کیا ہے، چونکہ اس کو علم نہیں ہے، اس لیے اس کے حق میں ابھی معاملہ مکمل نہیں ہے۔

ب۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دوسرا فریق باقاعدہ قبول کو لکھ کر پہلے فریق کو ارسال کر دے اور قبول کا پیغام پہلے فریق کو پہنچ جائے تو دونوں کے حق میں معاملہ قضاء دیانہ مکمل سمجھا جائے گا۔

دوسری بات: خریدار اور فروخت کنندہ اگر ایک دوسرے سے دور ہوں اور بذریعہ فون یا خط و کتابت بیع کرنا چاہتے ہوں تو یہ بیع صرف ان چیزوں میں ہو سکتی ہے جہاں دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ ضروری نہ ہو۔ اگر ایسا معاملہ ہے جہاں دونوں جانب کی چیزوں پر فی الفور قبضہ ضروری ہے، جیسے بیع صرف، تو ایسا معاملہ فون یا خط وغیرہ کے ذریعے نہیں ہو سکتا۔

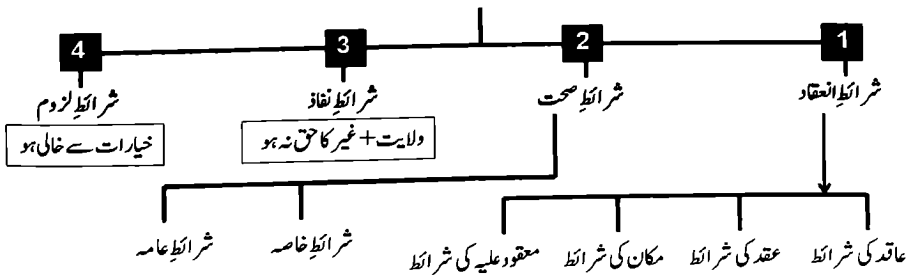
اس کی صورت یہ ممکن ہے کہ دونوں کے وکیل ایک دوسرے کے پاس موجود ہیں اور معاملہ کی مجلس میں ہی دونوں کے وکیل چیز پر قبضہ بھی کر لیں تو اس صورت میں بیع صرف منعقد ہو جائے گی۔

۳۔ بیع کی شرائط

بیع (خرید و فروخت) کے لیے چار قسم کی شرائط کا پایا جانا ضروری ہیں، تاکہ عقد مکمل اور نافذ ہو کر اس پر احکام و آثار مرتب ہو سکے۔ پہلے ان چار اقسام کی شرائط کو بیان کیا جائے گا، اس کے بعد چند اہم شرائط کی تفصیل عرض کی جائے گی۔

- ۱۔ شرائط انعقاد
۲۔ شرائط صحت
۳۔ شرائط نفاذ
۴۔ شرائط لزوم
۵۔ اہم شرائط کی تفصیل

بیوع کی شرائط



۱۔ شرائط انعقاد:

اس قسم سے ایسی شرائط مراد ہیں جن کا پایا جانا اس لیے ضروری ہے تاکہ عقد منعقد ہو جائے۔ ان میں سے کسی بھی شرط کے نہ ہونے کی صورت میں عقد کالعدم ہو گا اور باطل سمجھا جائے گا اور اس پر کسی بھی قسم کا اثر مرتب نہ ہو گا۔ یہ شرائط چار قسم کی ہیں:

الف- عاقد کی شرائط:

جو آدمی معاملہ اور عقد کرتا ہے، اس کے لیے دو بنیادی شرائط ہیں:

۱- عقد کرنے والا عقلمند اور ممیز ہو۔

۲- عقد کرنے والے متعدد ہوں، کیونکہ عموماً ایک ہی شخص بائع و مشتری نہیں ہو سکتا۔ جیسے کسی کا وکیل اس کی چیز کو خود پر فروخت کر دے تو یہ درست نہیں ہے۔

ب- عقد کی شرائط:

عقد کی درستی کی ایک ہی شرط ہے کہ بیع کی جنس، مقدار، صفات اور قیمت وغیرہ میں ایجاب و قبول ایک دوسرے کے موافق ہوں۔

ج- مکانِ عقد کی شرائط:

مکانِ عقد کے لیے یہ شرط ہے کہ ایجاب و قبول دونوں ایک ہی مجلس میں ہوں، جس کو فقہی اصطلاح میں "اتحادِ مجلس" کہتے ہیں۔

د- معقود علیہ (بیع) کی شرائط:

جس چیز کو بیچا جا رہا ہے، اس کے لیے درج ذیل چار شرائط ضروری ہیں:

۱- بیع موجود ہو۔

۲- بیع مال، متقوم ہو۔ مال اور متقوم کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ شراب، خنزیر، مردار، خون، نجاسات اور انسانی بدن کے اجزاء شریعت کی نظر میں مال نہیں ہے۔ ان کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

۳- وہ چیز فی نفسہ کسی کی مملوک ہو، مباحات عامہ میں سے نہ ہو۔

۴- وہ چیز مقدور التسلیم ہو، یعنی فروخت کنندہ اس چیز کو خریدار کے حوالے کرنے پر قادر ہو۔

۲- شرائطِ صحت:

یہ ایسی شرائط ہیں جن کا پایا جانا اس لیے ضروری ہے تاکہ عقد فساد سے بچ جائے، اگر ان میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو عقد فاسد ہو جاتا ہے۔

شرائطِ العقد اور شرائطِ صحت میں بنیادی فرق یہی ہے کہ پہلی قسم کی شرائط کے مفقود ہونے کی صورت میں عقد باطل اور دوسری قسم کی شرائط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے عقد فاسد ہو جاتا ہے۔ اس فرق کو کچھ فقہاء نے یوں بھی سمجھایا

ہے کہ شرائط انعقاد باقاعدہ اساس و بنیادیں ہیں، جن کے نہ ہونے کی وجہ سے عقد کا بنیہ اور ڈھانچہ ہی معدوم قرار دیا جاتا ہے، جبکہ شرائط صحت کو فرعی و اضافی نواحی یا اطراف کہا جاسکتا ہے، جن کے نہ ہونے سے عقد کے وجود میں تو خلل نہیں آتا، لیکن اس میں نقص و فساد ضرور آتا ہے اور پھر اس پر بیع فاسد والا حکم لاگو ہوتا ہے۔

شرائط صحت دو قسم کی ہیں:

۱۔ شرائط عامہ

۲۔ شرائط خاصہ

۱۔ شرائط عامہ:

وہ شرائط جو ہر قسم کی بیع کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ کل چھ ہیں، بالفاظ دیگر چھ عیوب یا موانع ایسے

ہیں جن سے ہر بیع کا سالم و خالی ہونا ضروری ہے، ورنہ بیع فاسد ہوگی:

۱۔ جہالتِ فاحشہ نہ ہو۔ یعنی بیع، ثمن، وقت ادائیگی یا وسائل توثیق میں جہالت نہ ہو۔

بیع اور ثمن میں جہالت کی تین قسمیں ہیں:

الف۔ کبھی چیز کی جنس میں جہالت ہوتی ہے۔ یعنی یہ معلوم ہی نہ ہو کہ کیا چیز بیچی جا رہی ہے۔

ب۔ مقدار میں جہالت، یعنی چیز یا قیمت کی مقدار معلوم نہ ہو۔

ج۔ تعیین میں جہالت، یعنی چیز یا قیمت کئی انواع کی ہے، لیکن متعین طور پر معلوم و متعین نہ ہو کہ کس متعین چیز

پر عقد ہو رہا ہے۔

۲۔ اکراہ، یعنی جبر و بردستی نہ ہو۔

البتہ چند صورتیں اس شرط سے مستثنیٰ ہیں:

الف۔ اگر کوئی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، جس سے عوام کو شدید ضرر و تکلیف ہو تو حکومت ایسے شخص کی چیز

زبردستی کوا سکتی ہے یا اسی کو حکم دے سکتی ہے کہ چیز بیچ دو۔

ب۔ دورانِ جنگ مسلمانوں کو ضرورت پڑ جائے تو حاکم کسی کی چیز زبردستی خرید سکتا ہے، لیکن مالک کو مارکیٹ

میں رائج قیمت دینا ضروری ہے۔

ج۔ شفع بھی اس سے خارج ہے، کیونکہ شفع کرنے والا زبردستی زمین لیتا ہے۔

۳۔ توقیت بیع نہ ہو۔ یعنی عقد کو کسی مدت تک موقت و منحصر نہ کیا جائے۔ بالفاظ دیگر سلم و استصناع کے علاوہ

صورتوں میں بیع کی وصولی کو مستقبل کی کسی تاریخ تک مؤخر نہ کیا جائے۔

۴۔ غرر نہ ہو، یعنی غیر یقینی کیفیت نہ ہو۔

۵۔ ضرر نہ ہو، یعنی بیع کی حوالگی میں بائع کو ضرر نہ ہو۔

۶۔ شروطِ فاسدہ سے خالی ہو۔ شرائطِ فاسدہ سے مراد ایسی شرائط ہیں جن میں کسی فریق کا فائدہ ہو، ان کا عرف نہ

ہو، نہ عقد ان کا قاضا کرے اور نہ عقد کے ملائم و مناسب ہوں۔

۲۔ شرائطِ خاصہ:

وہ شرائط جن کا تعلق بعض بیوع کے ساتھ ہیں، مثلاً:

۱۔ منقولی اشیاء کو قبضہ سے پہلے نہ بیچا جائے۔

۲۔ بیع صرف میں تقابض ضروری ہے۔

۳۔ بیع سلم کی اپنی تمام شرائط کا ضروری ہونا۔

۴۔ استصناع کی اپنی تمام شرائط کا ضروری ہونا۔

۵۔ اموال ربویہ میں جب جنس ایک ہو تو دونوں جانب سے تماثل و برابری ضروری ہے۔

۶۔ بیوع الامانہ (مراہمہ، تولیہ، وضیعہ) میں سابقہ شمن کا معلوم ہونا ضروری ہے۔

۳۔ شرائطِ نفاذ:

ایسی شرائط جو اگر نہ پائی جائیں تو عقد نافذ اور مکمل نہیں ہوتا، بلکہ موقوف رہتا ہے، ممکن ہے کہ مستقبل میں نافذ

ہو جائے اور یہ بھی امکان ہے کہ نافذ نہ ہو۔

شریعت کی نظر میں عقد کے نافذ و تام ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو شخص عقد کر رہا ہے، اسے عقد کی

مکمل ولایت و اختیار حاصل ہو۔ یہ اختیار تین حالات میں حاصل ہو سکتا ہے:

الف۔ فروخت کنندہ جس چیز کو بیچ رہا ہے، وہ اس چیز کا مالک ہو، اس لیے اس کو اختیار حاصل ہے۔

ب۔ یا فروخت کنندہ کو کسی کی شخصی نیابت اور وکالت حاصل ہو، یعنی کسی نے اسے اپنی چیز بیچنے کے لیے وکیل

بنایا ہو۔

ج۔ کسی کو شرعی نیابت حاصل ہو، یعنی شریعت نے اسے یہ اجازت دی ہو کہ وہ کسی دوسرے کی چیز بیچ سکتا ہے،

جیسے یتیم کا نگران اور قاضی وغیرہ۔

حاصل یہ ہے کہ شرائط نفاذ دو ہیں:

۱۔ ملکیت ہونا یا ولایت (شخصی / شرعی) ہونا۔

۲۔ بیع میں کسی دوسرے کا حق نہ ہونا۔

جہاں انسان کو ولایت اور اختیار حاصل نہ ہو، وہ عقد نافذ نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک / مجبز کی اجازت پر موقوف

ہوتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

الف۔ بیع (بیچی جانے والی چیز) کسی اور کی ہو، جیسے فضولی کی بیع ہوتی ہے۔ یہ بیع اصل مالک کی اجازت پر موقوف

ہوتی ہے۔

ب۔ چیز تو انسان کی اپنی ہو، لیکن وہ شخص تصرف کا اہل نہ ہو، جیسے مجنون یا چھوٹا بچہ۔ اگر ایسا شخص عقد کر لے تو

یہ عقد ولی کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے۔

۴۔ شرائط لزوم:

جب عقد میں سابقہ تینوں قسم کی شرائط پائی جائیں تو اس کے باوجود بھی ایسا ممکن ہوتا ہے کہ فریقین میں سے کسی ایک فریق کو یہ عقد ختم / فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہو، ایسا معاملہ لازم نہیں ہوتا، البتہ اگر کسی کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار حاصل نہ ہو تو یہ معاملہ لازم ہو جاتا ہے۔ اس اختیار پر ”باب الخیارات“ میں بحث کی جاتی ہے۔ یہ آٹھ قسم کے خیارات ہیں:

۱۔ خیار شرط ۲۔ خیار وصف ۳۔ خیار نقد ۴۔ خیار تعیین

۵۔ خیار رؤیت ۶۔ خیار عیب ۷۔ خیار مغبون ۸۔ خیار تغیر

جب عقد مکمل ہو جائے اور فریقین میں سے کسی کو ان خیارات میں سے کوئی خیار بھی حاصل نہ ہو تو عقد لازم ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ بیع کے لیے شرط لزوم یہ ہے کہ عقد، ان خیارات سے خالی ہو۔

تنبیہ:

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ”انقضاء“ کا مقابل بطلان ہے۔ ”صحّت“ کا مقابل فساد ہے۔ ”نفاذ“ کا مقابل توقف اور ”لزوم“ کا مقابل عدم لزوم ہے۔ اس لیے ان اصطلاحات کو ان کے مواقع پر ہی استعمال کیا جائے، چنانچہ اگر پہلی قسم کی شرائط موجود ہیں تو عقد ”منعقد“ ہوگا۔ دوسری قسم کی شرائط کی موجودگی میں عقد ”صحیح“، تیسری قسم کی شرائط کی موجودگی میں ”نافذ“ اور چوتھی قسم کی شرائط کے پائے جانے کی صورت میں عقد ”لازم“ ہوگا۔ اگر یہ شرائط

نہ پائی جائیں تو سابقہ ترتیب کے مطابق عقد ”باطل“ یا ”فاسد“ یا ”موقوف“ یا ”غیر لازم“ سمجھا جائے گا۔

لہذا یہ ممکن ہے کہ ایک عقد منعقد تو ہو، لیکن فاسد ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عقد منعقد بھی ہو، صحیح بھی ہو، لیکن نافذ نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک عقد منعقد ہو، صحیح ہو، نافذ بھی ہو، لیکن لازم نہ ہو۔^(۱)

۵۔ اہم شرائط کی تفصیل:

اجمالی شرائط کے بعد یہاں چند اہم شرائط کی مثالوں کے ساتھ کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے:

• بیع کی شرائط:

پہلی شرط: جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ جو چیز بیچی جا رہی ہے وہ چیز بیع کے وقت وجود میں آچکی ہو یہ ضروری ہے۔ لہذا جو چیز ابھی تک وجود میں نہ آئی ہو، اس کا بیچنا جائز نہیں۔ مثلاً:

۱۔ پھل دار باغات کو ایسے وقت میں بیچنا کہ ابھی تک ان پر پھل نہ آئے ہوں، جائز نہیں ہے۔

۲۔ اگر باغ کے اکثر درختوں کے پھل ظاہر ہو چکے ہوں، البتہ کچھ پھل نہ نکلے ہوں تو ایسے باغ کے پھلوں کی خرید و فروخت کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ معدوم پھلوں کو موجود پھلوں کا تابع قرار دیا جائے گا۔

۳۔ باغ کے پھل کو کئی سالوں کے لیے ٹھیکے پر دینا (فروخت کرنا) جائز نہیں، کیونکہ اگلے سالوں کے پھل ابھی نہیں لگے۔

۴۔ اگر پھل اس حالت میں ہوں کہ کسی کام آسکتے ہیں، اور ان کی بازار میں قیمت بھی ہے تو انہیں بیچنے اور خریدنے کی گنجائش ہے، لیکن خریدار کے لیے یہ شرط لگانا درست نہیں کہ جب تک پھل پک نہ جائیں وہ انہیں درخت سے نہیں اتارے گا، البتہ اگر مالک اپنی خوشی سے اجازت دیدے اور خریدار کو پھل توڑنے پر مجبور نہ کرے تو پھر پھلوں کے درخت پر رہنے میں حرج نہیں۔

دوسری شرط: وہ چیز بیچنے والے کی ملکیت میں ہو، اگر بیچنے والا ابھی تک اس کا مالک نہیں بنا تو اس کے لیے اسے آگے بیچنا جائز نہیں۔ جیسے کچھ لوگ کوئی چیز خریدنے سے پہلے آگے فروخت کر دیتے ہیں۔ پہلے اپنے خریدار سے سودا پکا کر کے اس سے بیعانہ لے لیتے ہیں اور پھر مارکیٹ سے مطلوبہ چیز خرید کر اس کے حوالے کرتے ہیں، ایسا کرنا جائز نہیں، البتہ مال خریدنے سے پہلے گاہک سے وعدہ کیا جاسکتا ہے۔

تیسری شرط: تیسری شرط یہ ہے کہ بیع کے وقت بیچی جانے والی چیز بیچنے والے کے قبضہ میں ہو، اگر وہ چیز بیچنے والے کے قبضہ میں نہیں تو اسے آگے بیچنا جائز نہیں۔ قبضے میں آنے کے لیے دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے: ۱۔ وہ چیز خریدنے والے کے ضمان (risk) میں آجائے یعنی اگر وہ ہلاک ہو یا اسے جزوی نقصان پہنچے تو وہ نقصان خریدار کا ہو۔

۲۔ خریدار کے پاس اس چیز کو ہر طرح استعمال کرنے کا پورا اختیار ہو۔

چوتھی شرط: چوتھی شرط یہ ہے کہ بیچی جانے والی چیز ایسی ہو جس کی کاروباری عرف یا شریعت کی نظر میں کوئی قیمت ہو، اگر چیز ایسی نہیں ہے تو اس کی بیع درست نہیں ہے۔ مثلاً زمین پر گرے ہوئے کسی بے کار تنکے کو اٹھا کر بیچنا یا خنزیر اور شراب کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

پانچویں شرط: پانچویں شرط یہ ہے کہ بیچی جانے والی چیز متعین اور معلوم ہو، اگر وہ متعین اور معلوم نہیں تو اس کی بیع جائز نہیں۔ اشیاء کو درج ذیل ذرائع سے متعین کیا جاسکتا ہے:

۱۔ خریدی جانے والی چیز کی مقدار بیان کی جائے۔

۲۔ یا اس کی طرف اشارہ کیا جائے۔

۳۔ یا گنتی کے ذریعے متعین کیا جائے۔

۴۔ یا بیچی گئی چیز کو دیگر چیزوں سے الگ کیا جائے۔

۵۔ یا پیسوں کے ذریعے متعین کیا جائے، جیسے یوں کہا جاتا ہے کہ ایک ہزار کا پٹرول ڈال دو۔

چھٹی شرط: بیچی جانے والی چیز کے اندر کوئی عیب ہو تو اسے بھی بیان کرنا ضروری ہے تاکہ خریدار کو دھوکہ نہ ہو، البتہ اگر دوکاندار نے خریدار سے یہ کہہ دیا کہ: ”اسے اچھی طرح دیکھ لو، اگر بعد میں کوئی خرابی نکل آئی تو میری ذمہ داری نہیں“ تو یہ بھی جائز ہے اور بعد میں خریدار کسی عیب کی بنیاد پر چیز واپس نہیں کر سکتا۔

ساتویں شرط: بیچی جانے والی چیز مقدور التسليم ہو، یعنی اس پر بیع کے وقت قبضہ کرنا ممکن ہو، مثلاً زید کی کوئی چیز گم ہوگئی۔ اس نے عمر کو وہی گم شدہ چیز اس شرط پر بیچ دی کہ اسے خود ہی ڈھونڈ لو تو یہ بیع جائز نہیں ہے۔

• قیمت سے متعلق شرائط:

خرید و فروخت کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ بیع کے وقت بیچی گئی چیز کی قیمت دونوں فریقین (یعنی فروخت کنندہ اور خریدار) کو معلوم ہو، لہذا اگر بیع کے وقت دونوں یا کسی ایک کو قیمت معلوم نہ ہوئی تو وہ بیع جائز نہ ہوگی۔

مثلاً:

۱۔ یا تو قیمت کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کیا۔

۲۔ یا چیز پر قیمت لکھی ہے، لیکن خریدار کو معلوم نہیں، نہ وہ پڑھ سکتا ہے، اور فروخت کنندہ یوں کہہ دے کہ میں اس کو لکھی ہوئی قیمت پر یا بازاری قیمت پر بیچتا ہوں، یہ بھی درست نہیں۔ البتہ اگر بازاری قیمت دونوں کو متعین طور پر معلوم ہے تو پھر جائز ہے۔

• وقتِ ادائیگی سے متعلق شرائط:

جب کوئی چیز ادھار بیچی جائے تو اس کی ادائیگی کا وقت معلوم ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی وقت نہ بتائے تو اکثر صورتوں میں معاملہ ناجائز ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ اگر چیز خریدتے وقت خریدار نے کہا کہ میں اس شرط پر خریدتا ہوں کہ جب پیسے آگئے، دے دوں گا اور یہ معلوم نہیں کہ پیسے کب آئیں گے، تو یہ معاملہ جائز نہیں۔

۲۔ اگر شرط نہیں لگائی، بلکہ چیز خریدنے کے بعد کہا کہ ابھی پیسے نہیں ہیں، بعد میں دے دوں گا تو یہ معاملہ صحیح ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر پہلے سے دونوں کا کھاتہ ہے تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا، ورنہ یہ نقد معاملہ سمجھا جائے گا، لہذا دوکاندار کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ ابھی رقم دو تو چیز لے جاسکتے ہو، ورنہ نہیں۔ ایسا معاملہ ادھار نہیں ہوتا، بلکہ یہ بیع حال ہی ہے، تاہم دوکاندار، خریدار کو کچھ ڈھیل دے دیتا ہے۔

۳۔ ادائیگی کی مدت واضح طور پر متعین ہونی چاہیے۔

• رضامندی کی شرط اور اس میں خلل ڈالنے والی چیزیں:

عقود و معاملات میں فریقین کی رضامندی ایک بنیادی شرط ہے۔ اس پر قرآن و حدیث کی صریح نصوص موجود ہیں۔ اگر کسی معاملہ پر فریقین یا کوئی ایک فریق راضی نہ ہو تو اس پر حکم لگانے سے قبل عدم رضا کا سبب معلوم کرنا ضروری ہے کہ یہ فریق معاملہ پر کس وجہ سے راضی نہیں ہے، کیونکہ یہاں اسباب کے مختلف ہونے سے حکم میں تھوڑا بہت فرق آتا ہے۔ ایسے اسباب کو ”مخلاتِ رضا“ کہتے ہیں، یہ چھ (۶) ہیں:

۱۔ اکراہ (Coercion)

کسی پر اکراہ و زبردستی کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا جائے تو یہ معاملہ ”فاسد“ ہے۔ جس پر زبردستی کی گئی ہے، شرعاً اس کو یہ اختیار ہے کہ اس معاملہ کو ختم کر دے یا اپنی رضامندی سے اسے نافذ قرار دے۔ اس کے بغیر جبر کرنے

والے کے تصرفات باطل سمجھے جائیں گے۔ واضح رہے کہ یہاں جبر عام ہے، خواہ اکراہ طمعی ہو یا اکراہ غیر طمعی، بہر صورت یہی حکم ہے۔

۲۔ اضطراب (Dire Need)

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی مجبوری کے تحت کوئی معاملہ کرے۔ اس کی درج ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:

الف۔ اضطراب کسی دوسرے کی جانب سے اکراہ و جبر کی وجہ سے پیدا ہوا ہو تو اس کا حکم ”اکراہ“ کے تحت بیان ہو چکا ہے۔

ب۔ ایسی شدید بھوک کی وجہ سے انسان اپنی کوئی چیز بہت کم قیمت میں بیچ دے یا کوئی چیز بہت زیادہ قیمت پر خرید لے کہ بیچ نہ کرنے کی صورت میں اس کو اپنی یا اپنے اہل و عیال کی جان کا خوف ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس نے ٹخن مثل (مارکیٹ ویلو) پر معاملہ کیا ہے تو یہ صحیح ہے، لیکن اگر غبن فاحش (بہت زیادہ دھوکہ) کے ساتھ معاملہ کیا ہے تو یہ بیچ فاسد ہے۔ البتہ جو چیز اس نے خریدی ہے اس کو استعمال کرنا جائز ہوگا اور اس کے بدلے اس پر بازاری قیمت لازم ہوگی۔

ج۔ اپنی غربت و فقر یا قرض خواہوں کے مطالبہ کی وجہ سے انسان بیچ پر مجبور ہو جائے۔ یہ صورت اصطلاحی اضطراب میں داخل نہیں ہے۔ لہذا جو بیچ کی ہے، وہ درست ہوگی، اگرچہ غبن فاحش کے ساتھ کی ہو۔

۳۔ تغریر (Misrepresentation)

اس کو عربی میں ”الخداع القـولی“ بھی کہتے ہیں۔ اردو میں اس کو ”غلط بیانی“ اور انگریزی میں ”misrepresentation“ کہتے ہیں۔ یعنی کوئی ایک فریق دوسرے کو آمادہ کرنے کے لیے کوئی بات کہہ دے، جس پر اعتماد کرتے ہوئے دوسرا فریق عقد کر لے۔ بعد میں حقیقت اس کے خلاف ہو۔ اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

الف۔ جنس ہی غلط بیان کرنا۔ یہ بیچ باطل ہے۔

ب۔ وصف اور کوالٹی میں غلط بیانی کرنا۔ یہ خیار فوات الوصف کے تحت آتا ہے، جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ اس میں دوسرے فریق کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

ج۔ مارکیٹ ریٹ اور قیمت بتانے میں غلط بیانی کرنا۔ اس میں بھی دوسرے فریق کو معاملہ ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۴۔ تدلیس (Fraud)

اس کو عربی میں ”الخداع الفعلی“ بھی کہتے ہیں۔ اردو میں ”دھوکہ“ اور انگریزی میں اس کو ”fraud“

کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فروخت کرنے والا چیز میں ایسا عمل کر لے جس سے اس چیز کی غیر حقیقی خوبی نمایاں ہو۔ مثلاً پرانے کپڑے کو رنگ کرنا کہ نیا معلوم ہو۔ اس کا حکم بھی ”تغیر“ والا ہے۔ اگرغبین فاحش پایا جائے یا وہ وصف موجود نہ ہو تو دوسرا فریق معاملہ ختم کر سکتا ہے۔

۵۔ خطا (Mistake)

اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

الف۔ بیع کے وجود میں خطا ہو جائے، مثلاً غلطی سے ایسی چیز بیچ دی جو موجود ہی نہ ہو اور بیچنے والے نے سمجھا کہ چیز موجود ہے۔ اس صورت میں بیع باطل ہے۔

ب۔ ملکیت میں خطا ہو جائے، مثلاً غلطی سے کسی اور چیز کو اپنی سمجھ کر بیچ دیا۔ یہ بھی باطل ہے۔

ج۔ بیع کی جنس، نوع یا مقدار کی معرفت میں خطا ہو جائے۔ اگر یہ خطا جانین سے ہو تو عقد باطل ہے، اگر ایک جانب سے ہو تو اس پر تدریس و تغیر کے احکام جاری ہوں گے۔

۶۔ ہزل (Joke)

اس کو اردو میں ”دکھاوے کی بیع“ اور عربی میں ”بیع التلجئة“ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فریقین حقیقت میں بیع نہ کرنے پر مفاہمت کر لیں اور پھر سابقہ مفاہمت کی بنیاد پر محض کسی کو دکھانے کے لیے بیع کر دے، جبکہ حقیقت میں بیع اور تملیک مقصود نہ ہو۔ معاملہ کرنے کے بعد اگر فریقین سابقہ مفاہمت پر متفق ہیں تو یہ عقد باطل ہے۔ اگر اختلاف ہو جائے، ایک فریق بیع کے درست ہونے کا دعویٰ کرے اور دوسرا فریق انکار کرے تو جو تلجہ اور سابقہ مفاہمت کا مدعی ہے وہ گواہ پیش کر دے، ورنہ عقد درست سمجھا جائے گا۔^(۱)

۴۔ بیع کی اقسام

فقہاء نے بیع (خرید و فروخت) کی مختلف اعتبارات سے کئی اقسام بیان کی ہیں، یہاں ان اقسام کو لکھا جاتا ہے۔ ان اقسام کا تفصیلی تعارف اور احکام اگلے حصے میں بیان کیے جائیں گے۔

فقہاء نے چار اعتبارات سے بیع کو تقسیم کیا ہے، اور ہر تقسیم کے تحت چند اقسام بیان کی ہیں، یہ کل سولہ (۱۶)

اقسام ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں:

^(۱) فقہ البیوع ۱/۱۸۸

۱۔ بد لین (ٹمن اور میج) کی نوعیت کے اعتبار سے بیج کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ بیج مطلق: جس میں ایک طرف عین / سامان ہو اور دوسری طرف ٹمن / قیمت ہو۔

۲۔ بیج صرف: جس میں دونوں طرف سے سونا، یا دونوں طرف سے چاندی، یا ایک طرف سے سونا، اور دوسری طرف سے چاندی ہو۔

۳۔ مقابلہ: جس میں دونوں طرف سے عین / سامان ہو۔

۲۔ قیمت اور میج کی ادائیگی کے اعتبار سے بیج کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ بیج حال: یعنی نقد معاملہ، جس میں قیمت فوری طور پر اداء کی جاتی ہے۔

۲۔ بیج مؤجل: ادھار معاملہ، جس میں قیمت بعد کی کسی تاریخ میں اداء کی جاتی ہے۔ اسی قسم میں ”بیج بالتسبیط“ یعنی قسطوں پر کوئی چیز بیچنا، بھی داخل ہے۔

۳۔ سلم: جس میں مکمل قیمت فوری طور پر ادا کر کے چیز (بیج) بعد کی کسی متعین تاریخ میں وصول کی جاتی ہے۔

۴۔ استصناع: جس میں آرڈر پر چیز بنوائی جاتی ہے، خواہ قیمت فوری طور پر اداء کی جائے، یا بعد میں۔

۳۔ نفع و نقصان کے اعتبار سے بیج کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ مرابحہ: سابقہ قیمت بتا کر، اس پر اپنا نفع رکھ کر کسی چیز کو آگے فروخت کرنا۔

۲۔ تولیہ: سابقہ قیمت بتا کر، اسی قیمت پر، بغیر کسی نفع کے کسی چیز کو فروخت کرنا۔

۳۔ وضعیہ: سابقہ قیمت بتا کر، اس سے کم قیمت، یعنی نقصان کے ساتھ کسی چیز کو آگے بیچنا۔

۴۔ مساومہ: جس میں چیز کی سابقہ قیمت (جس پر چیز خریدی ہے وہ) نہ بتائی جائے، بلکہ مطلق معاملہ کر کے کوئی بھی قیمت آپس میں طے کر دی جائے۔

۴۔ بیج پر مرتب ہونے والے اثر کے اعتبار سے بیج کی پانچ قسمیں ہیں:

۱۔ بیج صحیح: جس میں تمام شرائط پائی جائیں اور خریدار فوراً چیز کا، اور فروخت کنندہ، قیمت کا مالک ہو جائے۔

۲۔ بیج باطل: وہ معاملہ جو شریعت کی نظر میں بالکل کالعدم ہے۔

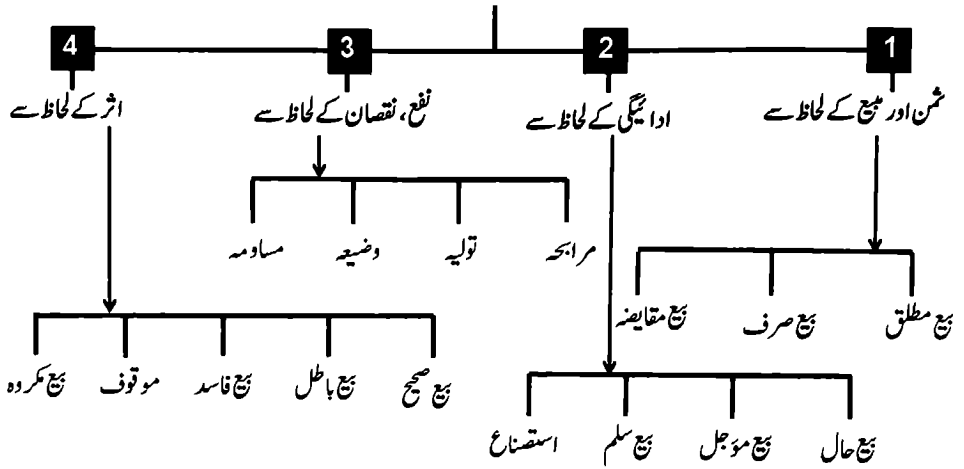
۳۔ بیج فاسد: وہ معاملہ جو اصلاً تو درست ہو، لیکن کسی خارجی خرابی کی وجہ سے فاسد ہو جائے۔

۴۔ بیج موقوف: وہ معاملہ جو کسی دوسرے کی اجازت پر موقوف ہو۔

۵۔ بیع مکروہ: وہ معاملہ جو اصلاً تو درست ہو، لیکن اس میں کسی درجہ کی کراہت و ناپسند امر کو اختیار کیا گیا ہو۔

ان تمام اقسام کا تعارف و تفصیلی احکام آگے بیان کیے جائیں گے۔

بیوع کی اقسام



۲۔ بیوع کی اقسام کا تفصیلی تعارف و احکام

اس فصل کے دوسرے حصے میں بیوع (خرید و فروخت) کی اقسام کا تفصیلی تعارف و احکام کو بیان کیا جائے گا۔ بیوع کی سولہ اقسام ہیں، جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے، یہاں ان میں سے صرف ان اقسام کی تفصیل بیان کی جائے گی، جن کے لیے فقہاء نے کچھ خاص احکام و شرائط بیان کیے ہیں اور ان کے علاوہ ان ممنوع معاملات کو بھی یہاں شامل کیا جا رہا ہے، جن کا تذکرہ احادیث و فقہی کتب میں ملتا ہے۔

بیوع کی اقسام کو دو بنیادی قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر قسم کے تحت کئی اقسام ہیں:

۱۔ بیوع کی جائز اقسام

۲۔ بیوع کی ممنوع اقسام

۱۔ بیوع کی جائز اقسام:

اس قسم کے تحت مندرجہ ذیل اقسام داخل ہیں:

۱۔ بیع صحیح	۲۔ بیع موقوف	۳۔ بیع صرف	۴۔ بیع مقایضہ
۵۔ بیع الحال	۶۔ بیع الموجب	۷۔ بیع سلم	۸۔ استقناع
۹۔ مراءحہ	۱۰۔ تولیہ	۱۱۔ وضعیہ	۱۲۔ مسامحہ

۲۔ بیوع کی ممنوع اقسام:

۱۔ بیع باطل	۲۔ بیع فاسد	۳۔ بیع مکروہ	۴۔ بیع الحصاصۃ
۵۔ بیع الملامہ	۶۔ بیع المناذہ	۷۔ بیع المزاینہ	۸۔ بیع المحاققہ
۹۔ بیع الجازفہ	۱۰۔ صفقہ فی صفقہ		

۱۔ بیوع کی جائز اقسام

۱۔ بیع صحیح	۲۔ بیع موقوف	۳۔ بیع صرف	۴۔ بیع مقایضہ
۵۔ بیع الحمال	۶۔ بیع الموبل	۷۔ بیع سلم	۸۔ استصناع
۹۔ مراسمہ	۱۰۔ تولیہ	۱۱۔ وضعیہ	۱۲۔ مساومہ

۱۔ بیع صحیح (Valid Sale)

بیع کی جائز اقسام کے تحت ایک قسم ”بیع صحیح“ بھی ذکر کی گئی تھی، اس سے متعلق چند اہم امور کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اس کے لیے چار باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

- ۱۔ بیع صحیح کا مفہوم
- ۲۔ بیع صحیح کے احکام
- ۳۔ ضمان کے مسائل
- ۴۔ کونسی چیزیں بیع میں داخل ہوں گی؟

۱۔ بیع صحیح کا مفہوم:

بیع صحیح وہ ہے جس میں بیع کے درست ہونے کی تمام شرائط پائی جائیں اور اس میں کسی قسم کی شرعی خرابی نہ ہو۔
البيع الصحيح: هو بيع المال المتقوم الحائز على جميع أوصافه الشرعية المقبول شرعا.^(۱)

بیع صحیح وہ بیع ہے جس میں ایسے مال کو بیجا جائے جو مستقوم ہو، تمام شرعی اوصاف کا جامع ہو اور شرعاً مقبول ہو۔

۲۔ بیع صحیح کے احکام:

اس سے پہلے عام بیع کے جتنے احکام لکھے گئے ہیں، وہ سب بیع صحیح کے احکام ہیں، مثلاً:

- ۱۔ بیع سلم و استصناع کے علاوہ جیسے ہی بیع ہو جائے تو خریدار چیز کا مالک ہو جاتا ہے۔
- ۲۔ اگر بیع نقد ہے تو خریدار پر فوراً قیمت دینا لازم ہے۔ اگر ادھار ہے تو وقت آنے پر ادائیگی لازم ہے۔

۳۔ بیع صرف، یا مقایضہ ہے تو دونوں طرف سے ایک ساتھ حوالگی ہوگی۔ بیع مطلق ہے تو پہلے قیمت اور پھر بیع

کی ادا ہوگی۔

۴۔ اگر بیع نقد ہے تو قیمت کی وصولی تک فروخت کنندہ کو بیع روکنے کا حق حاصل ہے۔ بیع مؤجل و ادھار میں

اسے یہ حق حاصل نہیں ہے، وغیرہ۔

۳۔ ضمان کے مسائل:

بیع کب خریدار کے ضمان / رسک میں داخل ہوگی؟ اس سوال کا جواب تفصیل طلب ہے، کیونکہ خریدار جب

چیز پر قبضہ کرتا ہے تو اس کی مختلف صورتیں ہیں، ہر صورت کا حکم الگ ہے۔ یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ المقبوض علی سوم النظر:

اس کا مطلب یہ ہے کہ خریدار نے فروخت کنندہ سے قیمت سے متعلق کوئی بات نہیں کی، نہ بھاؤ تاؤ کیا، بلکہ

فروخت کنندہ کی اجازت سے صرف چیز دیکھنے کے لیے ہاتھ میں لی اور اس سے ضائع ہوگئی۔ اس صورت میں اگر اس نے

قصدا، جان بوجھ کر چیز ضائع کی ہے تو ضمان / تاؤ ان لازم ہے، ورنہ نہیں، کیونکہ وہ امین کے حکم میں ہے۔

۲۔ المقبوض علی سوم الشراء:

اس کا مفہوم یہ ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ نے آپس میں قیمت کا تذکرہ کیا، بھاؤ تاؤ بھی ہوا، قیمت کی وضاحت

کے بعد خریدار نے خریدنے کی نیت سے چیز ہاتھ میں لی، لیکن ابھی بیع (ایجاب و قبول) نہیں ہوئی تھی کہ وہ چیز خریدار کے

ہاتھ میں ضائع ہوگئی۔

مالکیہ کے ہاں اس صورت کا بھی وہی حکم ہے جو پچھلی صورت کا ہے، تاہم دیگر تمام ائمہ کے ہاں خریدار اس چیز کا

ضامن ہو جائے گا۔ اگر باقاعدہ استعمال کر کے چیز کو ضائع کیا ہے تو آپس میں جس قیمت پر اتفاق ہوا تھا، اس کی ادا ہوگی لازم

ہوگی۔ اور اگر بغیر استعمال کے کسی اور طرح چیز ضائع ہوگئی ہے تو بازاری قیمت لازم ہوگی۔^(۱)

۳۔ المقبوض للتجربة:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فروخت کنندہ اپنی چیز خریدار کو تجربہ اور چیک کرنے کے لیے دیتا ہے، جیسے گاڑی خریدنے

والے کو کچھ دیر کے لیے گاڑی چلانے کے لیے دے دی جاتی ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر دونوں کا آپس میں قیمت پر اتفاق

ہو گیا تھا، اور خریدار نے خریدنے کی نیت سے گاڑی وغیرہ پر قبضہ کیا ہے، تو اس کا حکم مقبوض علی سوم الشراء کی طرح ہے۔ اور اگر قیمت پر اتفاق کے بغیر محض دیکھنے کے لیے گاڑی وغیرہ پر قبضہ کیا تھا تو اس کا حکم مقبوض علی سوم النظر جیسا ہوگا۔^(۱)

۴۔ بیع کے بعد ضمان:

بیع مکمل ہو جانے کے بعد بیع کب خریدار کے ضمان میں آئے گی؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، البتہ حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ خریدار جب چیز پر قبضہ کرے گا، اس وقت چیز اس کے ضمان میں آئے گی۔ محض عقد کرنے سے چیز اس کے ضمان میں نہیں آئے گی۔ اسی لیے:

۱۔ قبضہ کے بعد چیز ضائع ہوئی تو خریدار کا نقصان سمجھا جائے گا۔

۲۔ قبضہ سے پہلے بائع کے پاس چیز کسی آسانی آفت سے یا بائع کے فعل سے ضائع ہوئی تو بیع کا عدم سمجھی جائے گی۔ البتہ اگر خریدار نے جا کر اس کے پاس چیز ضائع کر دی تو اس پر قیمت لازم ہو جائے گی۔

۳۔ قبضہ کے بعد چیز میں نیا عیب پیدا ہو تو خریدار کسی پرانے عیب کی وجہ سے چیز واپس نہیں کر سکتا، البتہ اس کی قیمت لے سکتا ہے۔

۴۔ قبضہ سے پہلے چیز میں عیب پیدا ہو گیا تو خریدار کو چیز واپس کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

۵۔ اگر عقد کے بعد، اور قبضہ سے پہلے چیز میں اضافہ ہو گیا، جیسے حیوان نے بچہ دے دیا تو اس اضافے کا مالک خریدار ہوگا، کیونکہ اگرچہ ضمان اس کا نہیں ہے، لیکن ملکیت اسی کی ہے۔

۴۔ کونسی چیزیں بیع میں داخل ہوں گی؟

استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے ”فقہ البیوع“ میں اس بات کے لیے چار اصول تحریر فرمائے ہیں کہ کونسی چیز تابع ہو کر بیع میں شامل ہوگی اور کونسی چیز نہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ ہر وہ چیز بیع میں داخل سمجھی جائے گی جو عرف میں بیع کے اسم کے تحت آتی ہو، یعنی عرف میں ان چیزوں سمیت بیع پر ایک ہی نام بولا جاتا ہو، جیسے ”دار“ کے لفظ میں عرفا گھر کے تمام کمرے، کچن، بیت الخلاء وغیرہ شامل سمجھے جاتے ہیں۔

۲۔ وہ چیز بھی بیع میں شامل سمجھی جائے گی جس کو بیع کے ساتھ اتصال قرار حاصل ہو، یعنی بیع کے ساتھ اس

مقصد کے لیے متصل نہ ہو کہ بعد میں اسے بیچ سے جدا کر لیا جائے گا، جیسے زمین میں درخت اور عمارت اس مقصد کے لیے نہیں ہوتے کہ انہیں الگ کرنا مقصود ہو۔ اسی میں گھر کا پائپ لائن، بجلی اور ٹیلی فون کے تار بھی شامل ہیں، لہذا یہ چیزیں گھر کے توابع ہیں اور گھر کی بیع میں یہ سب چیزیں شامل ہو کر خریدار کو ملیں گی۔ البتہ کھیتی کا اتصال "اتصال قرار" نہیں ہے، کیونکہ اس کا مقصد اس کو زمین سے جدا کرنا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح گھر کے پینکھے، اے سی، ایگزاسٹ، ٹیلی فون اور گھر کا دیگر سامان، یہ گھر کے توابع نہیں ہیں، لہذا گھر بیچتے ہوئے یہ چیزیں، خود خود گھر میں شامل ہو کر خریدار کو نہیں ملیں گی۔

۳۔ جس چیز کو عرف میں بیع کا تابع سمجھا جاتا ہو وہ بھی بیع میں داخل ہوگی، جیسے تالے کی چابی اور جانور کی لگام اس کے توابع میں سے ہے۔ اسی طرح اگر گاڑی فروخت کی جائے تو جیک اور نار چڑھانے کے آلات وغیرہ سب اس میں داخل ہوں گے۔ اسی طرح موبائل کی فروختگی کی صورت میں اس کی بیٹری اور چارجر بھی اس میں داخل ہوگا۔
۴۔ وہ چیز جس کو دوسری چیز کی ضروریات اور منافع میں سے سمجھا جاتا ہو، وہ اس کی تابع ہوگی، جیسے گھر کا راستہ اور پانی کی باری کا حق وغیرہ۔^(۱)

۲۔ بیع موقوف کا تعارف و احکام (Suspended Sale)

بیع موقوف کے تعارف و احکام کے لیے مندرجہ ذیل تین نکات کو سمجھنا ضروری ہے:

۲۔ بیع موقوف کی صورتیں

۱۔ بیع موقوف کا مفہوم

۳۔ فضولی کی بیع کے احکام

۱۔ بیع موقوف کا مفہوم:

بیع موقوف ایسی بیع ہے جو اپنی ذات (رکن و محل) کے اعتبار سے بھی درست ہو، وصف کے اعتبار سے بھی درست ہو، لیکن اس پر بیع کے اثرات و احکام کا لاگو ہونا کسی دوسرے کی اجازت پر موقوف ہو، کیونکہ اس میں دوسرے کا حق ہوتا ہے۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کئی گئی ہے:

الْبَيْعُ الْمَوْقُوفُ بَيْعٌ يَتَعَلَّقُ بِهِ حَقُّ الْغَيْرِ.^(۲)

بیع موقوف ایسی بیع ہے جس کے ساتھ کسی اور کا حق متعلق ہو۔

^(۱) فقہ البیوع ۱/۲۹۹

^(۲) مجلة الأحكام العدلیة، ص: ۳۰ (المأذة ۱۱۱)

۲۔ بیع موقوف کی صورتیں:

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے ”البحر الرائق“ میں اس کی تقریباً تیس قسمیں / صورتیں لکھی ہیں، مثلاً:

۱۔ جس بچے پر معاملات کی پابندی ہو، اس کی بیع ولی کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے۔

۲۔ مرہونہ چیز کو بیچا جائے تو وہ مرتبہ کی اجازت پر موقوف ہوگی۔

۳۔ کرایہ کی چیز کو بیچا جائے تو وہ کرایہ دار کی اجازت پر موقوف ہوگی۔

۴۔ مرض الموت میں اپنی کوئی چیز کسی وارث کو بیچنا، یہ بیع دیگر ورثہ کی اجازت پر موقوف ہے۔

۵۔ معتوہ کی بیع بھی ولی کی اجازت پر موقوف ہے۔

بیع موقوف کی ایک مشہور قسم ”بیع الفضولی“ ہے، یہاں اس کی تفصیل عرض کرنا ضروری ہے:

۳۔ فضولی کی بیع کے احکام:

۱۔ فضولی کی تعریف:

فضولی اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی اور کی مملوکہ چیز کو مالک کی اجازت کے بغیر فروخت کر دے۔

الْفُضُولِيُّ: هُوَ مَنْ يَتَصَرَّفُ بِحَقِّ الْغَيْرِ بِدُونِ إِذْنِ شَرْعِيٍّ.^(۱)

فضولی وہ ہے جو کسی دوسرے کے حق میں شرعی اجازت کے بغیر کوئی تصرف / عمل کرے۔

۲۔ بیع فضولی کا حکم:

فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں ایسے شخص کی بیع باطل اور کالعدم ہے، جبکہ فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں یہ بیع

باطل نہیں ہے، بلکہ چند شرائط کے ساتھ اصل مالک کی اجازت پر موقوف رہے گی۔ ان حضرات نے حضرت عروہ بن ابی

جعدر رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کے دینار سے دو بکریاں خرید کر ایک بکری کو

آپ کی اجازت کے بغیر بیچ دیا تھا اور آپ ﷺ نے اس کی تحسین فرمائی تھی۔^(۲)

۳۔ شرائط:

حنفیہ کے ہاں فضولی کی بیع درج ذیل شرائط کے پائے جانے کے بعد ہی موقوف رہے گی، ورنہ باطل ہوگی:

۱۔ فضولی کی بیع کے وقت اس بیع کا کوئی میجر (اجازت دینے والا) ہو۔ اگر بیع کی اجازت دینے والا کوئی نہ ہو تو یہ بیع

^(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۳۰ (المأذنة ۱۱۲)

^(۲) صحيح البخاري، ص: ۴۲۷، حديث نمبر: ۳۶۴۲

باطل ہوگی۔ مثلاً غیر ممیز بچہ اپنا مال محابات فاحشہ یعنی بہت زیادہ نقصان کے ساتھ فروخت کر دے تو یہ باطل ہے، کیونکہ بچے کے تصرفات ولی کی اجازت پر موقوف ہوتے ہیں، لیکن اس بیع کی اجازت ولی بھی نہیں دے سکتا، کیونکہ اس میں بچے کا محض نقصان ہے، لہذا بوقت بیع کوئی مجبر نہ پایا گیا۔

۲۔ اصل مالک کی اجازت کے وقت خریدار، فضولی (بائع) اور بیع موجود ہوں، اور اگر ثمن کوئی عین / عروض میں سے ہے تو اس کی بقاء بھی ضروری ہے، ورنہ اجازت در سب نہ ہوگی، کیونکہ اصل مالک کی طرف سے اجازت در حقیقت تصرف و عقد ہے اور عقد کے لیے یہ چیزیں ضروری ہیں۔

۳۔ فضولی نے یہ چیز اصل مالک کے لیے بیچی ہو۔ اگر اس نے بیچتے وقت اپنے لیے فروخت کرنے کی تصریح کر دی تو بیع باطل ہوگی۔

۴۔ خریدار یا فضولی نے اصل مالک کی اجازت سے پہلے پہلے اس عقد کو فسخ نہ کیا ہو۔^(۱)

۴۔ مالک کی اجازت:

۱۔ مالک کی اجازت دو قسم کی ہیں: یا تو قول سے صراحت کے ساتھ اجازت دیدے۔ یا فعلاً اجازت دیدے، مثلاً فضولی سے اپنی چیز کی قیمت وصول کر لے تو اجازت سمجھی جائے گی۔ لیکن مالک کا محض خاموش ہونا حنفیہ کے ہاں اجازت نہیں ہے، کیونکہ ضابطہ ہے کہ خاموش شخص کی طرف کسی قول کی نسبت نہیں کی جائے گی۔ (لاینسب الی ساکت قول) البتہ مالک کے ہاں مالک نے بیع کو دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی تو یہ اجازت ہے۔

۲۔ جب مالک نے فضولی کی بیع کی اجازت دے دی تو اب یہی فضولی، مالک کا وکیل ہو جائے گا اور اس پر وکالت کے احکام جاری ہوں گے، لہذا اگر اجازت کے بعد فضولی کے پاس اس چیز کی قیمت فضولی کی تعدی و کوتاہی کے بغیر ضائع ہوگئی تو وہ ضامن نہیں ہوگا، کیونکہ وکیل، امین کے حکم میں ہوتا ہے۔

۳۔ اگر مالک نے فضولی کی بیع کی اجازت نہ دی تو یہ بیع باطل سمجھی جائے گی۔ اگر فضولی نے خریدار سے قیمت لے لی ہے تو واپس کر دے۔ اگر فضولی کے پاس خریدار کی قیمت ضائع ہو چکی ہے تو اب:

الف۔ اگر خریدار کو قیمت دیتے وقت یہ معلوم تھا کہ یہ شخص فضولی ہے تو فضولی اس کی قیمت کا ضامن نہیں ہوگا، بشرطیکہ تعدی / جان بوجھ کر ضائع نہ کی ہو۔ (لأنه وکیل للمشتري في قبض الثمن ودفعه إلى مالك المبيع)

ب۔ اگر خریدار کو قیمت دیتے وقت یہ معلوم نہ تھا کہ یہ شخص فضولی ہے تو فضولی اس کی قیمت کا ضامن ہوگا۔^(۱)

۳۔ بیع صرف کا تعارف و احکام (Exchange of Gold and Silver)

سونا چاندی کی خرید و فروخت کو فقہی اصطلاح میں ”بیع صرف“ کہتے ہیں۔ بیع صرف کے مباحث کا خلاصہ آسان زبان میں یہاں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم بعض اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنا ممکن نہیں تھا، اس لیے انہیں اسی طرح ہی لکھا گیا ہے۔ بیع صرف کے مباحث کو درج ذیل گیارہ عنوانات میں جمع کیا گیا ہے:

- ۱۔ عمومی ضوابط
- ۲۔ بیع صرف کا مفہوم
- ۳۔ بیع صرف کی خاص شرائط
- ۴۔ صرف مافی الذمہ
- ۵۔ کونسی صورت بیع صرف کی ہے کونسی نہیں؟
- ۶۔ سونا/چاندی کے علاوہ اثمان کا حکم
- ۷۔ موجودہ کرنسی / نقد کی حیثیت
- ۸۔ چیک پر قبضہ
- ۹۔ سفتجہ اور اس کا حکم
- ۱۰۔ کرنسی کے ذریعے سونا خریدنا
- ۱۱۔ تماثل / مساوات کا مطلب

۱۔ عمومی ضوابط:

بیع صرف کے احکام سمجھنے سے پہلے، اس سے متعلقہ چند ضوابط کو سمجھ کر یاد کیا جائے تو اس سے کئی مباحث کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

۱- القبض فی مجلس الصرف شرط لصحته: بیع صرف میں مجلس عقد کے اندر ہی قبضہ کرنا، بیع صرف کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے۔

۲- التقابض فی الصرف شرط لبقاء العقد لانعقاده: بیع صرف میں دونوں عوضین پر قبضہ کرنا بقاء عقد کے لیے شرط ہے، عقد کے منعقد ہونے کے لیے یہ شرط نہیں ہے، لہذا دونوں عوضین کے قبضہ کے بغیر بھی عقد منعقد ہو جائے گا، لیکن مجلس عقد کے ختم ہونے سے پہلے تقابض (دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ) ضروری ہے، تاکہ عقد نافذ ہو کر مکمل ہو سکے۔

۳- ما يجوز فيه التفاضل، جاز فيه الخرص، وما لا فلا: جن اشیاء میں تفاضل (کمی بیشی) جائز ہے،

ان میں تخمینہ و اندازہ کی بنیاد پر بیع بھی جائز ہے، جن میں تقاضل جائز نہیں، ان میں تخمینہ کی بنیاد پر بیع بھی جائز نہیں ہے۔ لہذا سونے کا تبادلہ سونے سے یا چاندی کا چاندی سے ہو تو تقاضل و تخمینہ جائز نہیں۔ اگر سونے کا چاندی سے تبادلہ ہو تو تقاضل و تخمینہ جائز ہے۔

۴۔ العبرة للغالب في المغشوش: مغشوش یعنی کھوٹے سونے اور چاندی میں غالب کا اعتبار ہے، اگر زیادہ سونا یا چاندی ہے تو اس پر سونا/چاندی کا حکم لاگو ہوگا، اگر غلبہ غش اور کھوٹ کا ہے تو عروض/سامان کے حکم میں داخل ہوگا۔

۵۔ ”مسئلہ مدعجہ“ ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بیع میں ایک جانب مخلوط مال ہو، یعنی مال ربوی اور غیر ربوی (جیسے تلوار میں سونا/چاندی کے ساتھ لوہا وغیرہ) دونوں ہوں، ان کا تبادلہ خالص سونا/چاندی یا مال ربوی سے کیا جائے تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، لیکن حنفیہ کے ہاں یہ جائز ہے، بشرطیکہ خالص مال ربوی (سونا/چاندی) اس مال ربوی سے زیادہ ہو جو مخلوط مال میں ہے۔ اس کو ”الجارية المطوقة“، ”السيف المحلى“ اور ”القدح المفضض“ کا نام بھی دیا گیا ہے۔

۲۔ بیع صرف کا مفہوم:

”صرف“ کے لغوی معنی پھیرنے/خرچ کرنے کے آتے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ”ایسا عقد جس میں ثمن کے مقابلے میں ثمن کی خرید و فروخت ہو، خواہ دونوں کی جنس ایک ہو، یا الگ الگ، جیسے سونے کا تبادلہ سونے سے، یا چاندی کا تبادلہ چاندی سے یا سونے کا تبادلہ چاندی سے کیا جائے۔“ تعریف میں ”ثمن“ سے مراد ثمن حقیقی یعنی سونا، چاندی ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

صرف في متعارف الشرع: اسم لبيع الأثمان المطلقة بعضها ببعض، وهو بيع

الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، وأحد الجنسين بالآخر.^(۱)

شرعی اصطلاح میں صرف کا مطلب ہے ثمن مطلق میں سے بعض کو بعض کے بدلے بیچنا۔ اور وہ یہ ہے کہ سونے کو سونے کے بدلے، چاندی کو چاندی کے بدلے یا ایک جنس کو دوسری جنس کے بدلے بیچا جائے۔

۳۔ بیع صرف کی خاص شرائط:

چونکہ صرف بھی ایک بیع ہے، لہذا بیع کی دیگر ضروری اور عام شرائط یہاں بھی ضروری ہیں، تاہم بیع صرف کی کچھ خاص شرائط بھی ہیں۔ بیع صرف کی چار خاص شرائط ہیں، ان میں سے پہلی دو شرائط وجودی ہیں، اور آخری دو عدی ہیں:

۱۔ مجلس عقد میں عوضین پر قبضہ:

یہ وجودی شرط ہے، یعنی مجلس عقد کے اندر ہی دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ ضروری ہے، ورنہ عقد درست نہ ہوگا۔ یہاں تین نکات سمجھنا ضروری ہیں:

الف۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں عموماً تخلیہ (قبضہ کرنے والے اور چیز کے درمیان ہر قسم کی رکاوٹ کو دور کر کے اس کو قبضہ کا مکمل اختیار و قدرت دے دینا) بھی قبضہ کے لیے کافی ہے، لیکن بیع صرف میں تخلیہ کافی نہیں ہے، بلکہ یہاں حسی قبضہ ضروری ہے جس کو ”القبض بالبراجم“ کے الفاظ سے ذکر کیا جاتا ہے۔

ب۔ عام بیوع میں بیع کی تعیین کافی ہو جاتی ہے کہ اس کی طرف اشارہ کر دیا یا مالک کی طرف نسبت کر کے اس چیز کی ذات کو متعین کر دیا، لیکن یہاں فقط تعیین کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ہر عوض کو ہاتھ میں لے کر قبضہ کرنا ضروری ہے۔

ج۔ عام بیوع میں بائع قبضہ کرنے سے پہلے ہی ثمن میں تصرف کر سکتا ہے، لیکن بیع صرف میں ایسا کرنا درست نہیں ہے، بلکہ بیع صرف میں کسی بھی عوض کا قبضہ سے پہلے استبدال بھی درست نہیں ہے۔

۲۔ تماثل / برابری:

دونوں جانب کی چیزوں کا مقدار میں برابر ہونا۔ یہ بھی وجودی شرط ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ بیع صرف کے دونوں عوضین کی جنس ایک ہو، مثلاً سونے کا سونے سے یا چاندی کا چاندی سے تبادلہ ہو رہا ہو، تو وہاں برابری ضروری ہے، کمی بیشی جائز نہیں ہے۔ برابری سے مراد مقدار میں برابری ہے، اس میں کوالٹی، جید یا ردی ہونے کا اعتبار نہیں ہے۔

۳۔ خیاری شرط:

یہ عدی شرط ہے۔ بیع صرف میں کسی بھی فریق کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے خیاری شرط (ایک خاص مدت تک معاملہ ختم کرنے کی شرط) رکھے، تاہم خیاری عیب ہر فریق کو حاصل ہوگا۔ جہاں تک خیاری رؤیت کی بات ہے تو حنفیہ کے ہاں دراہم و دنانیر (یعنی اثمان) میں خیاری رؤیت نہیں ہے، تاہم سونے / چاندی کی بنی ہوئی اشیاء جیسے برتن، زیور وغیرہ میں خیاری رؤیت حاصل ہوگا۔

۳۔ اجل:

یہ بھی عدی شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی فریق عوض حوالے کرنے کے لیے اجل / مدت طے نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ تقابض کے منافی ہے، جبکہ بیع صرف کے لیے تقابض فی المجلس ضروری ہے۔

۴۔ صرف مافی الذمہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ بیع صرف کا کوئی ایک عوض یا دونوں عوضین پہلے سے ہی ذمہ میں لازم ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ عمر کے ذمہ زید کے دس دینار دین (قرض) ہے۔ عمر اس کو دس دینار کے بدلے دراہم دیکر تبادلہ کرنا چاہتا ہے تو یہ صرف مافی الذمہ ہے۔ یہ جمہور کے ہاں جائز ہے، تاہم اس کے جواز کی دو شرائط ہیں:

الف۔ تبادلہ والے دن کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا کہ اس دن دس دینار کے بدلے کتنے دراہم آتے ہیں۔

ب۔ مکمل دراہم پر مجلس عقد میں قبضہ کر لیا جائے۔ اگر کچھ دراہم پر قبضہ نہ کیا تو چونکہ دینار پہلے سے دین ہیں، دراہم بھی دین ہو جائیں گے تو ”بیع الدین بالدين“ لازم آئے گا جو جائز نہیں ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عمر کے ذمہ زید کے دس دینار ہیں، اور زید کے ذمہ عمر کے دراہم ہیں۔ دونوں اس کا تبادلہ / مقاصد کرنا چاہتے ہیں تو حنفیہ کے ہاں یہ جائز ہے، خواہ دونوں دیون کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو یا نہیں۔ حضرات شافعیہ اس کو ممنوع لکھتے ہیں، جبکہ مالکیہ اس صورت کو اس شرط پر جائز کہتے ہیں کہ دونوں دیون کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو، تاہم حنفیہ کے ہاں یہاں بھی تبادلہ والے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اس سے کم یا زیادہ پر معاملہ کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۵۔ کوئی صورت بیع صرف ہے کوئی نہیں؟

اس پر تو علماء کا اتفاق ہے کہ سونا / چاندی خواہ سکوں کی شکل میں ہوں یا ڈھلی / اینٹ کی شکل میں ہو، ان کا تبادلہ بیع صرف ہے۔ لہذا اگر عوضین ہم جنس ہیں تو کسی بیشی ناجائز اور مجلس عقد میں قبضہ بھی ضروری ہے، اگر خلاف جنس ہیں تو قبضہ تب بھی ضروری ہے، تاہم کسی بیشی جائز ہے، خواہ یہ تبادلہ سکوں کا سکوں سے کیا جائے، ڈھلی کا ڈھلی سے یا سکوں کا ڈھلی سے کیا جائے۔

اگر سونا / چاندی مصوغ (کسی برتن، زیورات وغیرہ کی شکل میں) ہو اور اس کا تبادلہ سونا / چاندی کے سکوں یا ڈھلی، یا زیورات سے ہو تو ائمہ اربعہ کے ہاں یہ بھی بیع صرف ہی ہے، تاہم امام مالک و امام احمد کا ایک قول یہ ہے کہ مصوغ کی بناوٹ و کارگیری کی اضافی قیمت لی جاسکتی ہے۔ علامہ ابن قیم اس صورت میں مطلقاً کسی بیشی کی اجازت دیتے ہیں۔

۲۔ سونا/چاندی کے علاوہ اثمان کا حکم:

سونا/چاندی کے علاوہ دیگر کسی دھات کے ثمن، جیسے فلوس وغیرہ پر بھی بیع صرف کا حکم لاگو ہوگا یا نہیں؟ اس کو ”ثمن اصطلاحی یا عرنی“ کہتے ہیں۔ مالکیہ کے ہاں ثمن اصطلاحی بھی مطلقاً سونا/چاندی کے ہی حکم میں ہے، اس پر بیع صرف کے تمام احکام لاگو ہوں گے۔ شافعیہ کے ہاں بیع صرف کے لیے ثمن خلقی (سونا/چاندی) ہونا شرط ہے، لہذا ثمن اصطلاحی پر بیع صرف کا حکم لاگو نہیں ہوگا، بلکہ کسی بیشی اور ادھار جائز ہے۔ امام احمدؒ سے دونوں اقوال منقول ہیں۔

حنفیہ کے ہاں سونا/چاندی کے علاوہ کسی دھات کے ثمن کا تبادلہ بیع صرف نہیں ہے۔ اسی طرح حنفیہ کے ہاں ربا کی علت وزن ہے، عدد نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلوس کے تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہو، کیونکہ یہ عددی ہوتے ہیں، لیکن حنفیہ فلوس میں کمی بیشی کو ایک اور وجہ سے ناجائز سمجھتے ہیں، وہ یہ کہ فلوس جب تک ثمن ہیں تو یہ متعین ہونے سے متعین نہیں ہوتے، اور یہ امثال متساویہ ہیں اور دیگر مثلیات (وزنی اور کیلی چیزوں) کی طرح ہیں، بلکہ ان فلوس کا مثلی ہونا، دیگر مثلیات سے زیادہ قوی ہے۔ جب یہ مثلیات کی طرح ہے تو اس کے مثلی ہونے کی وجہ سے اسے بھی ”قدر“ کے زمرے میں شامل کیا جائے گا، اس لیے اگر اس میں کمی بیشی ہوگی تو یہ بغیر کسی عوض کے ہوگی جو کہ ربا اور سود ہے، البتہ اگر فریقین نے فلوس کو باقاعدہ متعین کر دیا تو پھر امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسفؒ کے ہاں اس میں کمی بیشی جائز ہے، کیونکہ ثمنیت باطل ہو کر اب فلوس، عروض بن گئے، جبکہ امام محمدؒ کے ہاں اس صورت میں بھی کمی بیشی جائز نہیں، کیونکہ محض فریقین کی تعیین سے فلوس کی ثمنیت باطل نہیں ہوتی، لہذا وہ تعیین سے متعین بھی نہیں ہوتے۔ معاصر فقہاء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

۱۔ موجودہ کرنسی / نقد کی حیثیت:

موجودہ کرنسی / نقد کے بارے میں علماء کی مختلف آراء ہیں، ان میں مشہور آراء یہ ہیں:

۱۔ موجودہ کرنسی / نوٹ حقیقت میں اس دین (قرض) کی سند ہے جو حامل نوٹ کے لیے جاری کنندہ کے ذمہ واجب ہے۔ لہذا اس سے سونا/چاندی خریدنا، بیع سلم میں اس المال بنانا، نوٹ کا تبادلہ نوٹ سے کرنا جائز نہیں، اس سے زکوٰۃ بھی ادا نہ ہوگی۔

۲۔ کرنسی / نوٹ، عروض یعنی دیگر کاغذات کی طرح ایک کاغذ ہے۔ لہذا اس میں کمی بیشی، ادھار جائز ہے۔

۳۔ آج کل کی کرنسی اور نوٹ بالکل سونا/چاندی کا بدل اور قائم مقام ہے، لہذا اس پر بیع صرف ہی کے تمام احکام

لاگو ہوں گے۔ اس سے زکوٰۃ بھی ادا ہوگی۔

۴۔ کرنسی/نوٹ بذات خود شمن عرفی ہے اور فلوس کے حکم میں ہے۔ لہذا اس کے ذریعے زکوٰۃ ادا کی جائے اور اس کا تبادلہ بیع صرف نہیں ہے، کیونکہ بیع صرف کے لیے شمن خلتی (سونا/چاندی) ہونا ضروری ہے، جبکہ نوٹ، فلوس کے حکم میں ہے۔ لیکن اگر آج کل کی کرنسی پر فقہاء شافعیہ یا امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف کی رائے کے مطابق احکام لاگو کیے جائیں گے تو اس سے سود کا دروازہ کھل سکتا ہے، کیونکہ ان کی رائے میں بہر صورت کمی بیشی جائز ہے، اس لیے یہاں امام محمدؒ کی رائے کو اختیار کیا جائے گا، کیونکہ مجتہدین کے زمانے میں فلوس کا استعمال اتنا زیادہ نہیں تھا، جتنا آج کل کی کرنسیوں کا استعمال و رواج ہے، لہذا اگر اس میں کمی بیشی کی اجازت دی گئی تو سود کی بہتات ہو جائے گی۔ اگر وہ مجتہدین آج کے زمانے میں ہوتے تو تقریباً اتفاقاً طور پر اس رائے کو اختیار کرتے، جیسا کہ فقہاء نے عدالی اور غطارفہ کی کرنسیوں میں کمی بیشی پر سود کا حکم لگایا تھا۔ چنانچہ نوٹ اور کرنسی کے تبادلہ کی دو صورتیں ہیں:

الف۔ ایک ہی ملک کی کرنسی کا تبادلہ ہو رہا ہے تو چونکہ دونوں کی جنس ایک ہے، اس لیے یہاں نسیئہ (ادھار) جائز نہیں ہے، بلکہ دونوں جانب کی کرنسیوں پر قبضہ ضروری ہے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ بیع صرف ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں چونکہ جنس ایک ہے، لہذا رہا کی دو علتوں (قدر و جنس) میں سے ایک علت پائی گئی اور اس کی وجہ سے ادھار ناجائز ہوتا ہے۔ اسی طرح کمی بیشی بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ امثال متساویہ ہیں، اس سے سود لازم آئے گا۔

ب۔ دو مختلف ممالک کی کرنسیوں کا تبادلہ ہو رہا ہے تو ایک جانب ادھار بھی جائز ہے، اور کمی بیشی بھی جائز ہے، کیونکہ الگ ممالک کی کرنسیوں کی جنس مختلف ہے، لہذا ادھار اور تفاضل دونوں جائز ہیں، لیکن ایک جانب قبضہ کرنا ضروری ہے، تاکہ ”بیع الدین بالدین“ لازم نہ آئے۔ ادھار کی صورت میں یہ بھی شرط ہے کہ معاملہ مارکیٹ ریٹ کے مطابق کیا جائے، مثلاً اگر سوڈا لرنز کا پاکستانی روپے کے ساتھ ادھار معاملہ ہو رہا ہے تو ڈالر کی مارکیٹ ویلیو کے مطابق ہی معاملہ کرنا جائز ہے، اس سے کم یا زیادہ پر جائز نہیں ہے، کیونکہ اس صورت کو سود کے لیے بطور حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۸۔ چیک پر قبضہ:

اگر کرنسی کا تبادلہ ہو رہا ہے اور ایک جانب سے چیک دے دیا جائے تو کیا محض چیک پر قبضہ کرنا اس پر درج شدہ رقم پر قبضہ سمجھا جائے گا؟ اس سلسلے میں علماء عصر کی آراء مختلف ہیں:

الف۔ کئی معاصر علماء نے یہ عمومی رائے اختیار کی ہے کہ چیک پر قبضہ کرنا، اس کے اندر درج شدہ رقم پر قبضہ کرنے کے حکم میں ہے۔

ب۔ ایونی نے معاصر شرعیہ میں چند شرائط کے ساتھ اس کو قبضہ کا حکم دیا ہے، مثلاً بینک کا چیک ہو، نقد چیک ہو،

اکاؤنٹ میں رقم بھی ہو، رقم نکالنا ممکن بھی ہو اور کراس چیک ہو وغیرہ۔

ج۔ استاد محترم مفتی تقی عثمانی صاحب نے ”تکملہ فتح الملسم“ میں چیک کا قبضہ ناکافی قرار دیا ہے کہ یہ محض ایک سند در سید ہے، لیکن ”فقہ البیوع“ میں اس پر تفصیلی کلام ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر بینک چیک ہے یا بینک کا تصدیق شدہ چیک (certified) ہے تو اس کا قبضہ کافی ہے، تاہم شخصی چیک کا قبضہ کافی نہیں ہے۔ مزید تفصیل و دلائل ”فقہ البیوع“ میں دیکھ لیں۔ چیک پر باقاعدہ ایک تفصیلی مقالہ کتاب کے آخری باب میں موجود ہے۔

۹۔ سفتجہ اور اس کا حکم:

الف۔ سفتجہ کا مفہوم:

سفتجہ (سین پر ضمہ) کے لغوی معنی مضبوطی و احکام کے آتے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کسی شہر میں اس شرط کے ساتھ قرض دیتا ہے کہ وہ (مقروض) فلاں دوسرے شہر یا جگہ میں خود قرض خواہ کو یا اس کے کسی نائب کو یہ قرض واپس کرے گا۔ مثلاً زید نے کراچی میں عمر کو اس شرط کے ساتھ ایک لاکھ روپے قرض دیے کہ عمر یہ رقم اسلام آباد میں زید کو یا اس کے گھر والوں کو دے گا۔

معاملۃ مالیۃ یقرض فیہا شخص قرضاً لأخر فی بلد، لیوفیہ المقترض أو نائبہ أو

مدینہ إلی المقرض نفسہ أو نائبہ أو دائنہ فی بلد آخر معین^(۱)۔

ب۔ فقہی تکلیف:

جمہور علماء نے اس معاملہ کو قرض ہی قرار دیا ہے، تاہم بعض علماء نے اسے عقدِ حوالہ اور بعض نے اسے عقدِ اجارہ قرار دیا ہے۔

ج۔ حکم شرعی:

اس معاملہ کے جواز و عدم جواز میں تابعین سے لے کر بعد کے فقہاء تک کا اختلاف رہا ہے۔ بعض حضرات اس کو مکروہ یا ناجائز سمجھتے ہیں، جیسے امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام مالک۔ تاہم مالکیہ نے خوف والے مقامات میں ضرورت کی وجہ سے اس کی گنجائش دی ہے۔

جو حضرات اس کو ناجائز سمجھتے ہیں، ان کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ اصول ہے کہ: ”کل قرض جر نفعاً فهو ربا“ یعنی جو قرض نفع کھینچ لائے وہ سود ہے اور یہاں بھی قرض سے یوں نفع مل رہا ہے کہ راستے کا خطرہ اور رسک ختم ہو جاتا ہے،

جسے فقہی اصطلاح میں ”سقوط خطر الطريق“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
امام احمد اور بعض تابعین سفتجہ کو جائز سمجھتے ہیں۔

د- منی آرڈر / ایزی پیسہ:

سفتجہ سے ملتی جلتی صورت آج کل منی آرڈر اور ایزی پیسہ کی صورتیں بھی ہیں۔ ان میں:

الف- ایک بات تو یہی ہے کہ یہ سفتجہ میں داخل ہیں، جس کو کئی فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے۔

ب- دوسری اہم بات یہ ہے کہ منی آرڈر / ایزی پیسہ وغیرہ میں باقاعدہ فیس ادا کرنی پڑتی ہے، اشکال یہ ہو گا کہ زیادہ قرض (یعنی فیس سمیت) دیکر، کم قرض (بغیر فیس) کے واپس وصول کرنا درست نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ سود میں آتا ہے۔

لیکن علماء نے دونوں باتوں کا یوں جواب دیا ہے کہ:

الف- یہ صورتیں سفتجہ میں داخل نہیں ہیں، کیونکہ سفتجہ کا اصل مقصد راستے کا رسک ختم کرنا (سقوط خطر الطريق) تھا، جبکہ ان صورتوں کا اصل مقصد محض رقوم کی ترسیل ہوتا ہے۔ اور اگر اس کو سفتجہ بھی قرار دیا جائے تو بھی ضرورت کی وجہ سے امام احمد کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

ب- جہاں تک فیس اور قرض میں کمی بیشی کی بات ہے تو اس معاملہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو الگ معاملے ہیں: ایک معاملہ قرض کا ہے، دوسرا اجارہ کا (کہ رقم دوسری جگہ پہنچائی جائے) اور فیس اس اجارہ کی اجرت یعنی منی آرڈر / ایزی پیسہ کرنے والوں کے عمل کا معاوضہ ہے، لہذا اس کی گنجائش ہے۔

۱۰۔ کرنسی کے ذریعے سونا خریدنا:

جن حضرات کے ہاں موجودہ کرنسی کا حکم بھی بعینہ سونا/ چاندی کا ہے ان کے ہاں کرنسی کے ذریعے سونا/ چاندی خریدنے کی صورت میں دونوں جانب کی چیزوں (کرنسی اور سونا/ چاندی) پر مجلس عقد میں ہی قبضہ کرنا ضروری ہے، ادھار یا قبضہ کے بغیر مجلس برخواست کرنے سے معاملہ باطل ہو جائے گا، کیونکہ یہ بیع صرف ہے۔

تاہم جن حضرات کے ہاں موجودہ کرنسی کا حکم سونا/ چاندی کے بجائے فلوس والا ہے ان کے ہاں کرنسی کے ذریعے ادھار سونا خریدنا جائز ہے، بشرطیکہ کسی ایک چیز (صرف کرنسی یا صرف سونا، چاندی) پر مجلس عقد میں قبضہ کر لیا جائے۔ بلکہ اگر قیمت (کرنسی) ادھار ہو اور سونا/ چاندی کو مجلس عقد میں محض اشارہ یا اضافت وغیرہ کے ذریعے متعین کر دیا جائے تو یہ بھی کافی ہے، اگرچہ مجلس عقد میں قبضہ نہ کیا جائے، لیکن اس صورت میں شرط یہ ہے کہ سونا/ چاندی کی

وصول کی کوئی مدت طے نہ ہو، ورنہ ”بیع الدین بالدين“ لازم آجائے گا۔

۱۱۔ تماثل / مساوات کا مطلب:

بیع صرف میں اگر دونوں جانب کی چیزیں ہم جنس ہیں تو برابری / تماثل شرط ہے، لیکن تماثل کا مطلب قیمت، عمدگی یا رداوت میں برابری نہیں ہے، بلکہ مقدار اور وزن میں برابری ضروری ہے۔ چنانچہ اگر کم کوالٹی کے سونا کا تبادلہ اعلیٰ کوالٹی کے سونے کے ساتھ ہو رہا ہے تو وزن کا اعتبار کیا جائے گا، قیمت کا نہیں۔ اسی طرح اگر کسی نے دوسرے کو دس سال پہلے ایک لاکھ قرض دیا ہے (جس کی ویلیو اور قیمت اس وقت بہت زیادہ تھی) تو آج بھی وہ وہی مقدار (دس لاکھ) ہی اداء کرے گا، اگرچہ اس رقم کی ویلیو آج کم ہو چکی ہے، کیونکہ احادیث میں تماثل کے لیے ”وزنا بوزن“ جیسے الفاظ اس بات پر صریح ہیں۔^(۱)

۱۲۔ مقایضہ کا تعارف و احکام (Barter Sale)

بیع کی ایک قسم، جس سے متعلق کچھ تفصیل عرض کی جائے گی، بیع مقایضہ ہے۔ اس سے متعلق تین امور کی تفصیل بیان کی جائے گی:

۱۔ مقایضہ کی تعریف

۲۔ مقایضہ کا حکم

۳۔ مقایضہ اور عام بیع میں فرق

۱۔ مقایضہ کی تعریف:

مقایضہ کا لفظ ”قیض“ سے بنا ہے، جس کے لغوی معنی عوض کے آتے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے خرید و فروخت کا ایسا معاملہ جس میں دونوں طرف اشیاء / سامان ہو۔ جیسے کپڑے کا کپڑے کا ساتھ تبادلہ کرنا۔ حیوان کا حیوان کے ساتھ یا زمین کا زمین کے ساتھ تبادلہ کرنا۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

بِیْعِ الْمُقَايِضَةِ بَيْنَ الْعَيْنِ بِالْعَيْنِ أَيْ مُبَادَلَةُ مَالٍ بِمَالٍ غَيْرِ النَّقْدَيْنِ.^(۲)

عین کا عین کے ساتھ تبادلہ کرنا۔ یعنی نقدین (سونا، چاندی) کے علاوہ کسی چیز / سامان کا تبادلہ

دوسری چیز / سامان سے کرنا۔

^(۱) بیع صرف کی مکمل تفصیلات کچھ تبدیلی اور اضافہ کے ساتھ ”فقد الیسوع“ سے لی گئی ہیں۔

^(۲) مجلة الأحكام العدلیة، ص: ۳۱ (المأذنة ۱۲۲)

۲۔ مقایضہ کا حکم:

مقایضہ کی دو صورتیں ہیں اور دونوں کا حکم الگ الگ ہے:

۱۔ ایک یہ کہ جن دو چیزوں کا تبادلہ ہو رہا ہے وہ ”اموال ربویہ“ میں سے نہ ہوں، یعنی ایسی چیزیں یا مال نہ ہو جس پر سود کے احکامات لاگو ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں دونوں چیزوں کا برابر ہونا ضروری نہیں ہیں، اور نقد ہونا یا فی الفور دونوں پر قبضہ کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ ادھار بھی معاملہ ہو سکتا ہے اور کمی بیشی کے ساتھ بھی معاملہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک کپڑے کا تبادلہ دوسرے کپڑے کے ساتھ کرنا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جن دو چیزوں کا تبادلہ ہو رہا ہے ان کا تعلق ”اموال ربویہ“ کے ساتھ ہوں تو ان پر ربا اور سود کے احکامات لاگو ہوں گے۔ جیسے سونا، چاندی کا تبادلہ یا گندم اور چاول وغیرہ کا تبادلہ کرنا۔ اس کی تفصیل دوسری فصل میں آئے گی۔

۳۔ عام بیع اور بیع مقایضہ میں فروق:

خرید و فروخت کے عام معاملات اور مقایضہ میں چار فروق ہیں:

۱۔ چونکہ اس میں دونوں طرف کی چیز ”بیع“ بن سکتی ہے، اس لیے دونوں طرف کی چیزوں کو متعین کرنا ضروری ہے۔

۲۔ چونکہ بیع مقایضہ میں دونوں طرف عین / سامان ہے، اس لیے عقد کے بعد حوالگی میں دونوں ایک ساتھ حوالے کیے جائیں گے، کسی ایک پر یہ لازم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ پہلے چیز حوالے کرے گا۔ جبکہ دیگر معاملات میں جہاں ایک طرف چیز، دوسری طرف قیمت ہوتی ہے، وہاں پہلے قیمت ادا کی جاتی ہے۔

۳۔ عام بیوع میں اگر بیع ضائع ہو جائے تو پھر اقالہ درست نہیں ہوتا، لیکن اس صورت میں اگر ایک طرف کی چیز ضائع ہو گئی تو بھی اقالہ درست ہے، کیونکہ دوسری طرف کی چیز کو بیع بنایا جاسکتا ہے۔

۴۔ فضولی نے اگر کسی کی چیز اجازت کے بغیر بیچ دی اور مقایضہ کا معاملہ کر دیا تو اب مالک کی اجازت ضروری ہے، لیکن مالک کی اجازت کے درست ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بیع کی طرح ثمن بھی موجود ہو، ورنہ مالک کی اجازت درست نہ ہوگی۔^(۱)

۵۔ بیع الحال (Cash/Spot Sale)

بیع کی اس قسم سے متعلق مندرجہ ذیل چھ امور کی وضاحت کی جائے گی:

- ۱۔ بیع حال کی تعریف
- ۲۔ بیع حال کا حکم
- ۳۔ بیان مدت کے بغیر خریداری
- ۴۔ پہلے چیز حوالہ کی جائے گی یا قیمت؟
- ۵۔ قیمت کی وصولی کے لیے چیز کو روکنا
- ۶۔ بیعانہ (Token Money)

۱۔ بیع حال کی تعریف:

بیع الحال کا مطلب ہے نقد معاملہ کرنا۔ یعنی کوئی چیز خریدتے وقت آپس میں باقاعدہ شرط لگا کر یہ طے نہ ہو کہ قیمت مستقبل کی کسی متعین تاریخ کو اداء کی جائے گی۔ اس کو ”بیع منجز“ بھی کہتے ہیں۔

بیع منجز الثمن: البیع منجز الثمن هو ما لا يشترط فيه تأجيل الثمن، ویسمی بیع النقد، أو البیع بالثمن الحال.^(۱)

بیع منجز الثمن: وہ معاملہ ہے جس میں ثمن (قیمت) کے لیے کسی مستقبل کے وقت کی شرط نہ لگائی جائے، اس کو ”بیع النقد“ یا ”بیع بالثمن الحال“ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

۲۔ بیع حال کا حکم:

اس معاملہ کا حکم یہ ہے کہ جیسے ہی معاملہ ہو جائے تو خریدار کو چیز وصول کرنے اور فروخت کنندہ کو قیمت کے مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اگر دونوں فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے کو کچھ دیر کی مہلت دیتا ہے تو یہ محض اس کا احسان اور تبرع ہوگا۔ جیسے آج کل بعض دکاندار اپنی پہچان والوں سے کہہ دیتے ہیں کہ قیمت بعد میں دے دینا۔ یہ بھی درحقیقت بیع الحال ہے۔ فروخت کنندہ کو اس صورت میں ہر وقت اپنی قیمت کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

۳۔ بیان مدت کے بغیر خریداری:

آج کل خریداری کی ایک صورت رائج ہے کہ بعض مرتبہ کوئی شخص کسی دکاندار سے کوئی چیز خریدتا ہے اور ادائیگی نہ تو فوراً کرتا ہے اور نہ ہی ادائیگی کی کوئی مدت مقرر کی جاتی ہے، بلکہ یوں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کی قیمت بعد میں دے دوں گا اور عموماً دکاندار بھی اس پر خاموش ہو جاتا ہے۔ کیا ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے؟ کیا اس سے مدت ادائیگی

^(۱) فقہ المعاملات ۱۵/۱

میں جہالت پیدا ہوگی کہ جس کی وجہ سے یہ عقد فاسد ہو جائے؟

بیع کی اس صورت کی بھی دو صورتیں ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ دکاندار اور خریدار کے درمیان پہلے سے ادھار اور مدت کا کوئی خاص معمول نہ چل رہا ہو۔ ایسی صورت میں چونکہ اس میں مدت بیان نہیں ہوئی، اس لیے یہ ”بیع حال“ یعنی نقد معاملہ ہے اور دکاندار کے مطالبہ پر قیمت کی ادائیگی فوری ضروری ہوگی، یہ الگ بات ہے کہ اگر دکاندار اپنی طرف سے خوش دلی کے ساتھ کچھ وقت کی مہلت دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن اسے ہر وقت قیمت کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دکاندار اور خریدار کے درمیان پہلے سے ادھار کا ایک معمول چل رہا ہے، جیسے بہت سے لوگ مخصوص دکانداروں سے ادھار کی بنیاد پر خریداری کرتے ہیں اور دکاندار کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون کون سے گاہک کس وقت (جیسے عموماً تنخواہ ملنے پر) ادائیگی کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگرچہ ادائیگی کی مدت بیان نہ کی گئی ہو، لیکن آپس کے سابقہ معمول کی وجہ سے اس معاملہ کو ادھار سمجھا جائے گا اور خریدار سے اس وقت قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جائے گا جس وقت خریدار عموماً ادائیگی کرتا ہے۔ چونکہ اس صورت میں کوئی نزاع اور جھگڑے کا اندیشہ نہیں ہے، اس لیے مدت کی ایسی جہالت باعثِ فساد یا معاملہ کو خراب کرنے والی نہیں ہے۔

۳۔ پہلے چیز حوالہ کی جائے گی یا قیمت؟

بیع صرف اور مقایضہ کا حکم تو یہ ہے کہ دونوں طرف کی چیزیں ایک ساتھ حوالہ کی جائیں۔ عام معاملات میں پہلے قیمت ادا کی جائے گی، اس کے بعد چیز حوالے کی جائے گی۔ یہی حنفیہ اور مالکیہ کی رائے ہے، کیونکہ جیسے ہی عقد ہو جاتا ہے تو بیع متعین ہو کر اس کے ساتھ خریدار کا حق متعلق ہو جاتا ہے، جبکہ فروخت کنندہ کا حق ابھی تک قیمت کے ساتھ متعلق نہیں ہوتا، لہذا پہلے قیمت ادا کی جائے تاکہ اس کا حق بھی متعین ہو جائے۔ البتہ شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ پہلے چیز حوالہ کی جائے اس کے بعد قیمت اداء کی جائے گی۔

واضح رہے کہ یہ کوئی وجوہی حکم نہیں ہے کہ اس کی خلاف ورزی کرنے سے معاملہ خراب ہو، بلکہ فریقین آپس کی رضامندی کے ساتھ کوئی بھی چیز پہلے دیکر دوسری چیز بعد میں دے سکتے ہیں۔ اس اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ اگر دونوں میں جھگڑا ہو جائے تو پھر پہلے کیا دیا جائے گا؟ اس حوالے سے فقہاء کا اختلاف ہے۔^(۱)

۵۔ قیمت کی وصولی کے لیے چیز کو روکنا:

بیع الحال، یعنی نقد معاملہ کا ایک حکم یہ ہے کہ فروخت کنندہ کو یہ حق حاصل ہے کہ جب تک قیمت وصول نہ ہو، اس وقت تک وہ چیز اپنے پاس روکھے، اور حوالے نہ کرے۔ البتہ ادھار معاملہ میں فروخت کنندہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ اس کو فقہی اصطلاح میں ”حبس المبیع لاستفیاء الثمن“ کہتے ہیں۔^(۱)

۶۔ بیعانہ (Token Money)

بعض اوقات سامان خریدتے وقت خریدار، فروخت کنندہ کو کچھ رقم ابتداء میں اس طور پر دیتا ہے کہ اگر اس نے سامان خرید لیا تو یہ رقم قیمت کا حصہ بن جائے گی۔ اس رقم کو عام عرف میں بیعانہ کہا جاتا ہے۔ بیعانہ یا ٹوکن منی سے متعلق مختلف علاقوں اور تاجروں میں مختلف صورتیں رائج ہیں، بعض دفعہ تو بیعانہ کی ادائیگی باقاعدہ خرید و فروخت کے معاملے کے مکمل ہونے کے بعد ہوتی ہے اور بعض دفعہ خرید و فروخت سے پہلے، محض خریداری کے وعدہ کے بعد بیعانہ کی ادائیگی کر دی جاتی ہے۔ بیعانہ کی ان دونوں صورتوں کی شرعی حیثیت مختلف ہے۔ اگر بیعانہ کی ادائیگی خرید و فروخت مکمل ہونے کے بعد کی جائے تو یہ رقم شرعاً قیمت کا ایک حصہ ہے، اور دوسری صورت میں (کہ محض خریداری کے وعدہ کے بعد بیعانہ کی ادائیگی کی جائے) اس رقم کی حیثیت امانت کی ہے۔ بیعانہ کی یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔

بیعانہ کی ادائیگی خواہ عقد بیع کے مکمل ہونے بعد کی گئی ہو یا پہلے، دونوں صورتوں میں وہ سامان کسی اور شخص کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ پہلی صورت میں تو اس لیے کہ فروختگی کا معاملہ مکمل ہو چکا ہے، اب فروخت کنندہ اس سامان کا مالک ہی نہیں رہا، بلکہ وہ سامان خریدار کا ہو چکا ہے، لہذا اس کی اجازت کے بغیر اسے آگے فروخت کرنا جائز نہیں۔ اور دوسری صورت میں اگرچہ فروختگی کا معاملہ مکمل نہیں ہوا اور اس سامان کا مالک ابھی تک فروخت کرنے والا ہی ہے، تاہم چونکہ اس نے خریدار کو سامان فروخت کرنے کا وعدہ کر لیا ہے، لہذا کسی معتبر عذر کے بغیر یہ سامان کسی اور کو فروخت کرنا وعدہ خلافی ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

خریدار کا بیعانہ ضبط کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ رقم خریدار کو واپس کرنا ضروری ہے، البتہ اگر خریداری کا وعدہ کرنے والا شخص بعد میں خریدنے سے مکر جائے اور فروخت کنندہ کو وہ چیز کسی دوسری جگہ بیچنی پڑے تو اس کو جو حقیقی نقصان (actual loss) ہو جائے، بیعانہ سے صرف اس کو پورا کیا جاسکتا ہے، بقیہ رقم واپس وعدہ کرنے والے کے

^(۱) مجلة الأحكام العدلیة، ص: ۵۶ (المأذنة ۲۷۸)

حوالے کر دی جائے گی۔ مثلاً زید نے عمر سے دس لاکھ کی گاڑی خریدی یا خریدنے کا وعدہ کیا اور ایڈوانس میں پچاس ہزار روپے دے دیے۔ عمر نے وہ گاڑی نو لاکھ کی خریدی تھی۔ بعد میں زید نے گاڑی لینے سے انکار کر دیا اور عمر کو وہ گاڑی کسی اور کو فروخت کرنی پڑی۔ اگر عمر نے یہ گاڑی کسی اور کو نو لاکھ یا اس سے زیادہ میں بیچی ہے تو وہ زید کا مکمل بیعانہ واپس کرے گا اور اگر عمر کو یہ گاڑی اصل قیمت یعنی نو لاکھ سے کم مثلاً آٹھ لاکھ اور ستر ہزار میں فروخت کرنی پڑی تو وہ زید کے بیعانہ سے تیس ہزار لے کر بقیہ رقم واپس کرے گا۔^(۱)

۲۔ بیع الموجل (Deferred Sale)

بیع الموجل سے متعلق مندرجہ ذیل چار امور کی وضاحت کی جائے گی:

- ۱۔ بیع الموجل کی تعریف
- ۲۔ اہم شرائط و احکام
- ۳۔ بیع الکالی بالکالی
- ۴۔ ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا

۱۔ بیع الموجل کی تعریف:

”بیع الموجل“ ادھار خرید و فروخت کو کہتے ہیں، جس میں قیمت کی ادائیگی کو مستقبل کی کسی متعین تاریخ میں ادا کرنے کی شرط لگائی جاتی ہے۔ ایسے ادھار معاملہ کو ”بیع مؤجل الثمن“ اور ”بیع بالنسیئة“ بھی کہتے ہیں اور اس طرح تاریخ طے کرنے کو ”تأجیل“ کہتے ہیں۔

البيع مؤجل الثمن: هو ما يشترط فيه تأجيل الثمن.^(۲)

بیع مؤجل الثمن: ایسا معاملہ ہے جس میں قیمت کی ادائیگی کو مؤخر کرنے کی شرط لگائی جائے۔

اسی میں ”بیع بالتقسیت“ کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے، جس میں قسطوں چیز کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ مجملہ الاحکام

العدلیہ میں تأجیل اور تقسیت کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

التَّأجِيلُ: تَغْلِيْقُ الدَّيْنِ وَتَأْخِيْرُهُ إِلَى وَفْتِ مُعَيَّنٍ. التَّقْسِيْمُ: تَأْجِيلُ أَدَاءِ الدَّيْنِ مُفْرَقًا إِلَى أَوْقَاتٍ مُتَعَدِّدَةٍ مُعَيَّنَةٍ.^(۳)

”تأجیل“ کا مطلب ہے دین (قرض) کو کسی متعین وقت تک مؤخر کر دینا۔ ”تقسیت“ کا مطلب ہے

^(۱) المعايير الشرعية ص: ۲۲، رقم المعيار: ۵

^(۲) فقه المعاملات ۱/ ۱۵

^(۳) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۲۳ (المأذة ۱۵۶) و (المأذة ۱۵۷)

دین کی ادائیگی کو مختلف معلوم اوقات میں تقسیم کر کے مؤخر کر دینا۔

۲۔ اہم شرائط و احکام:

ادھار خرید و فروخت کی اہم و بنیادی شرائط و احکام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ادائیگی کا دن متعین و معلوم ہو۔ اگر ادائیگی کا وقت متعین طور پر معلوم نہ ہو، بلکہ اس طور پر نامعلوم ہو کہ جس میں جھگڑے کا اندیشہ ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔

۲۔ قسطوں پر بیع میں ہر قسط کی مقدار بھی معلوم ہونا ضروری ہے اور ہر قسط کا وقت بھی معلوم ہونا ضروری ہے۔

۳۔ ادھار بیع میں تاخیر سے ادائیگی کرنا خریدار کا حق ہے، یہی وجہ ہے کہ فروخت کنندہ وقت مقرر سے پہلے خریدار سے رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۴۔ فروخت کنندہ کو یہ بھی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قیمت کی وصولی تک بیع کو اپنے پاس روکے رکھے۔

۳۔ بیع الکاوی بالکالی:

اس کو ”بیع الدین بالدين“ بھی کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دونوں طرف کی چیز کے حوالے کرنے کو ادھار رکھا جائے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں جو چوتھے باب میں تفصیلی مقالہ ”بیع الدیون“ کے ضمن میں آئیں گی۔ یہاں صرف اس کی ایک مثال ذکر کی جاتی ہے۔ مثلاً زید نے عمر سے ایک ہزار روپے کی گندم خریدی۔ دونوں نے یہ شرط لگالی کہ قیمت بھی ایک ماہ بعد اداء کی جائے گی اور گندم بھی۔ دونوں طرف کی چیز کو ادھار رکھا گیا۔ تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ اس کی ممانعت پر واضح احادیث موجود ہیں۔^(۱)

۴۔ ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا:

نقد چیز کو کم قیمت پر بیچنا اور ادھار چیز کو مہنگی قیمت پر فروخت کرنا تمام علماء کے ہاں جائز ہے، کیونکہ ہر چیز کے مہنگا ہونے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، ان میں ایک سبب ادھار بھی ہے، لہذا اس صورت میں ادھار یعنی اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کیا جاتا ہے، اور حقیقت میں مکمل قیمت ہی اصل بیع/چیز کے بدلے ہوتی ہے۔^(۲) لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ اسی مجلس میں یہ متعین طور پر طے کیا جائے کہ خریدار، چیز کو ادھار لے رہا ہے یا نقد۔ اگر نقد یا ادھار میں سے کسی ایک جانب کو طے کیے بغیر معاملہ لٹکا ہوا چھوڑ دیا تو یہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً فروخت کنندہ نے یوں کہہ دیا کہ چیز لے

(۱) السنن الکبریٰ للبخاری ۵/ ۲۹۰، حدیث نمبر: ۱۰۸۴۲

(۲) الهدایة فی شرح بدایة المبتدی ۳/ ۵۸

جاو، اگر تم نے قیمت آج ہی دے دی تو دس ہزار دے دینا، اور اگر ادھار، ایک ماہ بعد قیمت دینی ہے تو بارہ ہزار دے دینا۔ یہ

صورت درست نہیں ہے۔

یہ صورت بھی جائز نہیں ہے کہ ایک بار ایک قیمت پر معاملہ ہو جائے، پھر خریدار وقت مقرر پر ادا کیگی نہ کر سکے اور فروخت کنندہ، خریدار کو مزید وقت اور مہلت دے کر اس پر اضافی رقم یا جرمانہ عائد کر دے، کیونکہ اس صورت میں یقینی طور پر یہ اضافی رقم / جرمانہ وقت کے مقابلے میں ہے جو کہ سود ہے۔ اس کی مزید تفصیل ”ضع و تعجل“ کے عنوان کے تحت آئے گی۔

۷۔ بیع سلم کا تعارف و احکام (Forward Sale)

خرید و فروخت کی ایک قسم ”بیع سلم“ کہلاتی ہے، اس کے مباحث کو بطور خلاصہ درج ذیل آٹھ نکات میں جمع

کیا گیا ہے:

- | | |
|------------------------|---------------------------------|
| ۱۔ بیع سلم کی تعریف | ۲۔ بیع سلم کی مشروعیت |
| ۳۔ بیع سلم کی شرائط | ۴۔ عوضین / بدلین کے دو اہم اصول |
| ۵۔ ثمن / کرنسی میں سلم | ۶۔ شیرز میں سلم |
| ۷۔ متوازی سلم | ۸۔ سونا، چاندی میں سلم |

۱۔ بیع سلم کی تعریف:

بیع سلم ایسی بیع کو کہتے ہیں جس میں مکمل ثمن (قیمت) فی الفور ادا کی جاتی ہے اور چیز (بیع) بعد میں کسی متعین

تاریخ کو وصول کی جاتی ہے۔ اس کو ”بیع الاجل بالعاجل“ اور ”مَوْجَلٌ بِمُعَجَّلٍ“ بھی کہتے ہیں۔

السلم: هو شراء مئتمن آجل وهو المسلم فيه بئتمن عاجل وهو رأس المال.^(۱)

بیع سلم کا مطلب ہے کسی ایسی چیز / بیع (جس کو مسلم فیہ کہتے ہیں) کو خریدنا جس کی وصولی مؤخر ہو،

ایسی قیمت (جس کو اس المال کہتے ہیں) کے بدلے خریدنا جسے فوراً اداء کیا جاتا ہے۔

اس بیع میں خریدار کو ”رب السلم“، فروخت کنندہ کو ”مسلم الیہ“، قیمت کو ”راس المال“ اور خریدی ہوئی چیز

یعنی بیع کو ”مسلم فیہ“ کہتے ہیں۔

(۱) مرشد الحیران الی معرفة أحوال الإنسان. ص: ۷۱ (مادة ۴۴۳)

۲۔ بیع سلم کی مشروعیت:

چونکہ اس بیع میں خریدی ہوئی چیز فی الحال وصول نہیں کی جاتی، یا تو فروخت کنندہ کے پاس نہیں ہوتی، یا سرے سے ہی معدوم ہوتی ہے، اس لیے یہ معاملات کے عام اصول کے خلاف ہے۔ شریعت نے اس بیع کو عام اصولوں سے حاجت کی وجہ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، لہذا اس کا جواز خلاف قیاس نص (قرآن و حدیث) اور اجماع سے ثابت ہے۔

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے اس کا ثبوت ملتا ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ} ^(۱)

اے ایمان والو! جب تم کسی وقت مقررہ تک آپس میں ادھار معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

اس کا جواز درج ذیل حدیث سے بھی ثابت ہے:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ - وَهُمْ يُسْلِفُونَ فِي التَّمْرِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ وَالثَّلَاثَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: - مَنْ أَسْلَفَ فِي تَمْرٍ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَّعْلُومٍ وَوَزْنٍ مَّعْلُومٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مَّعْلُومٍ. ^(۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ ایک سال اور دو سال کے لیے پھلوں میں بیع سلم کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص بھی کھجور میں بیع سلم کرے، اسے مقررہ و معلوم بیمانے، اور معلوم وزن کے ساتھ، معلوم وقت کے لیے کرنی چاہیے۔

۳۔ بیع سلم کی شرائط:

بیع سلم کے صحیح ہونے کے لیے بیع کی عام شرائط کے علاوہ کچھ خاص شرائط بھی ہیں، جو اس بیع کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ ایسی شرائط کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ عقد کی شرائط:

الف۔ شافعیہ کے ایک قول اور امام زفری کے رائے کے مطابق لفظ ”سلم“، یا ”سلف“ کا استعمال ضروری ہے، ورنہ بیع سلم درست نہ ہوگی، کیونکہ یہ خلاف قیاس نص سے ثابت ہے اور نص میں یہی دو لفظ آئے ہیں۔ جمہور علماء کی رائے یہ

^(۱) البقرة: ۲۸۲

^(۲) سنن ابن داود ۳/۲۹۲۔ حدیث نمبر: ۳۴۶۵

ہے کہ یہ الفاظ ضروری نہیں ہیں، بلکہ بیع سلم کا مفہوم کسی بھی لفظ کے ذریعے ادا ہو جائے تو کافی ہے، کیونکہ دیگر بیوع میں بھی یہی کافی ہوتا ہے، بیع سلم صرف ایک، دو اصولوں میں دیگر بیوع سے مستثنیٰ ہے۔

ب۔ جمہور کے ہاں دوسری شرط یہ ہے کہ بیع سلم میں کسی کے لیے خیار شرط رکھنا درست نہیں، بلکہ عقد بلا خیار ہونا ضروری ہے، جبکہ مالکیہ کے ہاں خیار شرط رکھنے کی گنجائش ہے۔ اسی طرح خریدار کو خیار رؤیت بھی حاصل نہ ہوگی، بشرطیکہ بیع تمام طے شدہ صفات کی حامل ہو۔

۲۔ راس المال (ثمن) کی شرائط:

بیع سلم میں ثمن (قیمت) کے لیے دو بنیادی شرائط ہیں، پہلی شرط کے تحت تقریباً چار نکات آتے ہیں، جبکہ دوسری شرط کے تحت دو نکات آتے ہیں:

پہلی شرط: علم

۱۔ قیمت / ثمن کی جنس بیان کرنا ضروری ہے، اگر کرنسی ہے تو اسے متعین کرنا ضروری ہے۔

۲۔ اگر علاقے میں مختلف النوع ثمن رائج ہوں تو اس کی نوع بھی متعین کرنا ضروری ہے۔

۳۔ اگر ثمن، صفات کے متفاوت و مختلف ہونے سے مختلف ہوتا ہے تو صفات بیان کرنا بھی ضروری ہے۔

۴۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر ثمن، کیلی، موزونی (جیسے گندم وغیرہ) یا عددیات متقاربہ (جیسے انڈے) میں

سے ہے تو مقدار بیان کرنا ضروری ہے، اشارہ کافی نہیں، البتہ ذریعات (جو چیز گز کے حساب سے بچی جاتی ہے) اور

عددیات متفاوتہ میں اشارہ بھی کافی ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے ہاں دونوں صورتوں میں اشارہ کافی ہے۔

دوسری شرط: قبضہ

۱۔ مکمل ثمن کو مجلس عقد میں ہی فروخت کنندہ کے حوالے کیا جائے، البتہ مالکیہ کے ہاں:

الف۔ اگر ثمن، عروض (سامان) کی شکل میں ہے تو مطلقاً تاخیر کی گنجائش ہے۔

ب۔ اگر ثمن نقد / کرنسی میں سے ہے تو تین دن تک تاخیر کی گنجائش ہے۔

۲۔ راس المال دین نہ ہو۔ اگر فروخت کنندہ کے ذمہ خریدار کا دین (قرض) ہے تو اس کو راس المال نہیں بنایا

جاسکتا، ورنہ ”بیع الدین بالدین“ لازم آئے گا، البتہ اگر بوقت عقد مطلق ثمن طے کیا، دین کو راس المال نہ بنایا، پھر مجلس

برخاست ہونے سے قبل ثمن کی ادائیگی کے وقت الگ معاملہ کر کے راس المال (جو خریدار کے ذمہ ہے) میں اور دین (جو

باع کے ذمہ تھا) میں مقاصد کر لیا جائے تو یہ جائز ہے۔^(۱)

س۔ مسلم فیہ (بیع) کی شرائط:

بیع مسلم میں بیع (چیز) کے لیے بنیادی طور پر تین شرائط ہیں، پہلی شرط کے تحت تین نکات، دوسری شرط کے تحت ایک نکتہ اور تیسری شرط کے تحت دو نکات شامل ہیں:

پہلی شرط: علم

۱۔ جو چیز خریدی جا رہی ہے، اس کی جنس معلوم ہو۔

۲۔ اس کی نوع اور صفت بھی معلوم ہو۔

۳۔ اس کی مقدار بھی معلوم ہو۔ اگر مقدار کے آلات متعدد ہیں تو جس آلہ میں نزاع کا اندیشہ نہ ہو، اسی کے مطابق تعین ضروری ہے، مثلاً تربوز میں وزن کے اعتبار سے سلم کیا جائے، عدد اور گنتی کے لحاظ سے نہ کیا جائے۔

دوسری شرط: مثلی ہونا

۱۔ جو چیز خریدی جا رہی ہے وہ مثلی ہو۔ یعنی کیلی ہو یا وزنی چیز ہو یا ایسی چیز ہو جسے گز کے حساب سے بچا جاتا ہے یا عددیات متقاربہ میں سے ہو۔ ایک ہی کمپنی کی گاڑیاں، اے سی، فریج وغیرہ عددیات متقاربہ میں داخل ہیں۔ قیمی اور عددیات متفاوتہ میں بیع سلم درست نہیں۔ حنفیہ کے ہاں حیوانات میں بھی بیع سلم درست نہیں ہے۔

تیسری شرط: مقدور التسليم ہونا

۱۔ جو چیز خریدی جا رہی ہے اس کو کسی متعین مقام کے ساتھ خاص نہ کیا جائے، مثلاً متعین درخت کے پھل وغیرہ، کیونکہ اس صورت میں فروخت کنندہ کے لیے اس چیز کو حوالے کرنے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ اسی طرح کسی کمپنی کی ایسی چیز پر بیع سلم نہ کرے جس کے ختم ہونے کا اندیشہ ہو، البتہ:

الف۔ بڑی کمپنی ہو جس کی مصنوعات کے ختم ہونے کا عموماً اندیشہ نہ ہو تو اس کو متعین کیا جاسکتا ہے، جیسے فقہاء

نے بڑی بستی یا شہر کی تعین کی اجازت دی ہے۔ (کما جوز الفقہاء تعین القرية الكبيرة)

ب۔ یا بطور صفت کسی جگہ کو ذکر کیا جائے کہ اس جگہ کی چیز میں جو صفات ہیں، ان صفات کی حامل چیز چاہیے، تو

بھی جائز ہے۔

۲۔ حنفیہ کے ہاں وقت عقد سے لے کر چیز حوالے کرنے کی تاریخ تک وہ چیز (بیع) آس پاس کے کسی علاقہ میں موجود ہو۔ اگر عقد کے وقت، یا حوالے کرنے کے وقت، یا اس دوران چیز ختم ہو گئی تو بیع مسلم درست نہیں۔ جمہور کے ہاں یہ ضروری نہیں، صرف حوالے کرتے وقت چیز موجود ہو تو کافی ہے۔ ضرورت کی وجہ سے معاصر علماء نے جمہور کی رائے کو اختیار کیا ہے۔^(۱)

۳۔ تسلیم کی شرائط:

جو چیز خریدی جا رہی ہے، اس کے حوالے کرنے سے متعلق تین شرائط ہیں۔ پہلی شرط کے تحت تین نکات، دوسری شرط کے تحت ایک نکتہ اور تیسری شرط کے تحت دو نکات شامل ہیں:

پہلی شرط: ادھار

۱۔ حنفیہ کے ہاں بیع مؤجل (بعد کی کسی تاریخ میں وصولی) ہونا ضروری ہے، شافعیہ کے ہاں بیع مسلم حالاً بھی درست ہے کہ کچھ لمحوں میں چیز حوالے کر دی جائے۔

۲۔ اجل (وہ وقت جس میں چیز/بیع حوالے کی جائے گی وہ) متعین و معلوم ہو۔

۳۔ اقل مدت تسلیم: امام محمد کے ہاں چیز کی وصولی کے لیے کم از کم ایک مہینہ ہونا ضروری ہے۔ امام کرنفی کے ہاں عرف کو دیکھا جائے، لوگ جتنی مدت بھی طے کرتے ہوں تو وہ درست ہے۔ تین دن، ایک دن، نصف دن کے اقوال بھی ہیں۔ بہر حال! کوئی متعین مدت لازم نہیں ہے، کوئی بھی مدت طے کی جاسکتی ہے۔

دوسری شرط: مقام کا علم

۱۔ امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ اگر بیع کے حوالے کرنے میں مؤنت و مشقت ہو تو عقد میں محل تسلیم ذکر کرنا ضروری ہے کہ چیز کہاں پر خریدار کے حوالے کی جائے گی۔ صاحبین کے ہاں ضروری نہیں، بلکہ جس جگہ معاملہ کیا ہے، اسی جگہ چیز کو حوالے کیا جائے تو کافی ہے۔

تیسری شرط: چیز میں تبدیلی نہ ہو

۱۔ جس چیز پر بیع مسلم ہوئی ہے، وہی دی جائے، اس کو تبدیل کرنا یعنی ”استبدال قبل القبض“ جائز نہیں ہے۔

۲۔ جن صفات کی بنیاد پر بیع ہوئی ہے، ان صفات کی حامل چیز ہی دی جائے۔

۳۔ عوضین/بدلین کے دو اہم اصول:

پہلا اصول: عوضین/بدلین حسی و مادی ہوں:

حقیقہ کے ہاں راس المال (قیمت) اور مسلم فیہ (بیع) دونوں کا حسی اشیاء میں سے ہونا ضروری ہیں، کسی منفعت (services) کو راس المال یا مسلم فیہ بنانا درست نہیں ہے۔ مثلاً مکان کی رہائش کو قیمت بنا کر کوئی ادھار چیز خریدنا، یا فوری قیمت دیکر آئندہ کی کسی تاریخ کے لیے مکان کی منفعت (رہائش) کو بیع مسلم کے طور پر خریدنا منع ہے، تاہم دیگر ائمہ کے ہاں اس کی گنجائش ہے۔^(۱)

البتہ جہاں منفعت کو راس المال یا مسلم فیہ بنایا گیا اور اس معاملے میں اجارہ کی شرائط (مثلاً مدت کا تعین وغیرہ) پائی جاتی ہیں تو اسے عقد اجارہ قرار دیکر جائز کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً کسی نے فوری قیمت دیکر آئندہ کی کسی متعین تاریخ میں مکان کی رہائش متعین مدت کے لیے خرید لی تو یہ اجارہ ہے، کیونکہ اجارہ کو مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہاں الفاظ مسلم یا بیع کے استعمال ہو جائے، لیکن چونکہ اصل مقصد و معنی اجارہ کا پایا جا رہا ہے تو اجارہ ہی منعقد ہوگا، کیونکہ فقہی قاعدہ ہے کہ: (العبرة في العقود للمقاصد والمعاني، لا للألفاظ والمباني)۔

دوسرا اصول: عوضین/بدلین میں رہا کی کوئی ایک علت نہ پائی جائے:

فقہی کتب میں بیع مسلم کے حوالے سے اس اصول کی تفصیلات کو سامنے رکھا جائے تو اسے مندرجہ ذیل دو شکلوں میں لکھا جاسکتا ہے:

۱۔ لا يجوز أن يكون في البدلين إحدي علتي الربا

۲۔ كل ما جاز فيه النساء، جاز فيه السلم، وإلا فلا

اس کا مطلب یہ ہے کہ بیع مسلم کے درست ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قیمت (راس المال) اور بیع (مسلم فیہ) دونوں کی جنس ایک نہ ہو اور دونوں کی قدر (آلہ پیمائش) بھی ایک نہ ہو۔ اگر دونوں کی جنس یا قدر ایک ہے تو ان دونوں چیزوں میں بیع مسلم کرنا جائز نہیں ہے۔

مزید تفصیل کے لیے مندرجہ ذیل صورتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں۔ بیع مسلم کی قیمت اور بیع کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں:

۱۔ دونوں کی جنس ایک ہو۔ مثلاً قیمت اور بیع دونوں گندم کی شکل میں ہیں، یا دونوں کھجور کی شکل میں ہیں۔ اس

^(۱) المعايير الشرعية (ص: ۹۶) رقم امعبار: ۱۰

صورت میں بیع سلم جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے ”ربالنسیئہ“ لازم آ رہا ہے، جس کی تفصیل اس باب کی دوسری فصل میں موجود ہے۔

۲۔ قیمت اور بیع کی جنس تو مختلف ہے، لیکن دونوں کی قدر (آلہ پیمائش) ایک ہے۔ جیسے قیمت، گندم کی شکل میں ہے اور بیع، چاول کی شکل میں ہے، چنانچہ دونوں کی جنس مختلف ہے، لیکن دونوں وزنی اشیاء ہیں، اس لیے قدر یکساں ہے۔ اس صورت میں بھی بیع سلم جائز نہیں ہے، تاہم اس دوسری صورت کی بھی چار صورتیں بنتی ہیں:

الف۔ دونوں چیزیں مکملی ہیں، یعنی دونوں کو بذریعہ کیل ماپا جاتا ہے۔ اس صورت میں بیع سلم جائز نہیں ہے۔
ب۔ دونوں چیزیں وزنی ہیں اور دونوں ایسی ہیں کہ جو متعین کرنے سے متعین ہو جاتی ہیں، جیسے لوہا اور پتیل وغیرہ۔ اس صورت میں بھی بیع سلم جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے بھی ”ربالنسیئہ“ لازم آ رہا ہے۔

ج۔ دونوں چیزیں وزنی ہیں، لیکن دونوں ایسی ہیں کہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتی، جیسے درہم و دینار وغیرہ۔ یا صرف بیع ایسی چیز ہے جو متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتی، جیسے قیمت لوہا کی شکل میں ہے اور بیع درہم یا دینار کی شکل میں ہے۔ یہ صورت بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ بیع کے لیے ضروری ہے کہ وہ قابل تعین ہو۔

د۔ دونوں چیزیں وزنی ہیں اور قیمت اگرچہ قابل تعین نہیں ہے، لیکن بیع (مسلم فیہ) ایسی چیز ہے جو متعین کرنے سے متعین ہو جاتی ہے، جیسے قیمت درہم یا دینار کی شکل میں ہے اور بیع، گندم وغیرہ کی شکل میں ہے۔ اس صورت میں بیع سلم درست ہے، کیونکہ دونوں چیزوں کی نہ جنس ایک ہے اور نہ ہی دونوں کی قدر اور آلہ پیمائش ایک ہے۔^(۱)

۵۔ ثمن / کرنسی میں سلم:

بیع سلم میں مسلم فیہ کے لیے بیع یعنی عین ہونا ضروری ہے، اگر کسی ایسی چیز کو مسلم فیہ بنایا گیا جو کہ خلقی طور پر ثمن ہو جیسے چاندی کے درہم یا سونے کے دینار، تو اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ درہم یا دینار کو مسلم فیہ (بیع) بنا کر اس کی وصولی کو مؤخر کر دیا گیا اور اس کے مقابلے میں بھی ثمن (درہم، دینار) ہو تو یہ بیع باطل ہے، کیونکہ یہ بیع صرف ہے، جہاں تقابض ضروری ہے۔

۲۔ درہم یا دینار کو مسلم فیہ بنا کر اس کی وصولی کو مؤخر کر دیا گیا اور اس کے مقابلے میں کوئی عین / عرض یا سامان ہو جو فی الفور دے دیا گیا، تو اس صورت کو بعض علماء نے باطل قرار دیا ہے اور بعض نے اس کو عام بیع مؤجل (ادھار) قرار دیا ہے، کیونکہ درہم یا دینار کو ادھار قیمت قرار دیا جائے گا۔

آج کل کی کرنسی کو بعض علماء نے فلوس کا حکم دیکر اس میں بیع سلم کو جائز قرار دیا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ دو الگ الگ ملکوں کی کرنسیوں میں بیع سلم ہو، کیونکہ اگر ایک ہی ملک کی کرنسی میں بیع سلم کیا جائے تو اتحاد جنس چونکہ ادھار کے لیے مانع ہے، اس لیے یہ ناجائز ہے۔ جبکہ دیگر بعض علماء نے موجودہ کرنسی کو سونا، چاندی کا حکم دیا ہے، اس لیے ان کے ہاں کرنسی میں بیع سلم جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کے ناجائز ہونے کی دو مزید وجوہات بیان کی ہیں:

۱۔ ایک تو اس لیے کہ فلوس میں بیع سلم کا جواز شیخین کا مسلک ہے، امام محمدؒ اس میں بیع سلم کو ناجائز سمجھتے ہیں۔
۲۔ دوسرا اس لیے کہ شیخین نے فلوس میں بیع سلم تب جائز قرار دیا تھا کہ وہ بطور عین/سامان ہو، جبکہ موجودہ کرنسی میں معاملہ اسے عین/سامان سمجھ کر نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ ثمن ہے۔

۲۔ شئیرز میں سلم:

شئیرز میں بیع سلم دو وجوہات کی بنیاد پر جائز نہیں ہے:

الف۔ کمپنیوں کے شئیرز میں نقد و ختم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ب۔ شئیرز مختلف چیزوں کی سند ہوتی ہے، جن کی پشت پر جو اشیاء ہوتی ہیں ان میں نفوذ، دیون، اشیاء منقولہ، غیر منقولہ، عداویات متفاوۃ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزوں میں بیع سلم درست نہیں ہے۔

۷۔ متوازی سلم:

اس کو عربی میں ”السلم الموازی“ اور انگریزی میں (parallel salam) کہتے ہیں۔ یہ آج کل کی ایک جدید اصطلاح ہے۔ اس میں سلم کے دو الگ الگ معاملے کیے جاتے ہیں، لیکن ایک ہی شخص ایک معاملے میں رب السلم (خریدار) اور دوسرے میں مسلم الیہ (فروخت کنندہ) ہوتا ہے۔ مثلاً زید نے فیکٹری والے سے کچھ کپڑوں کی خریداری سلم کی بنیاد پر کر دی، جو ایک ماہ بعد وصول ہوں گے۔ اس میں زید، رب السلم ہے۔ جس تاریخ کو کپڑے ملنے والے ہیں، زید نے اسی تاریخ کے لیے آگے بیع سلم کر کے کپڑے کسی اور کو فروخت کر دیے۔ یہاں زید مسلم الیہ (فروخت کنندہ) ہے۔ اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس کے لیے دو شرائط ضروری ہیں:

۱۔ ایک بیع سلم کو دوسری بیع سلم کے لیے شرط نہ قرار دیا جائے، یا ایک کو دوسرے پر معلق نہ کیا جائے۔
۲۔ اگر پہلی بیع کسی وجہ سے ختم بھی ہوگئی تو دوسری بیع بدستور برقرار رہے گی اور زید پر کپڑے فراہم کرنا لازم

ہوگا۔^(۱)

۸۔ سونا، چاندی میں سلم:

کیا سونا، چاندی میں بیع سلم جائز ہے؟ بالفاظ دیگر کرنسی کے بدلے ادھار سونا خریدنا کیسا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ثمن (قیمت) بھی سونا یا چاندی ہی کی شکل میں ہے تو یہ بیع صرف ہے اور اس میں ادھار یا بیع سلم جائز نہیں ہے، البتہ اگر ثمن (قیمت) کوئی کرنسی ہے تو اس میں دورائے ہیں:

۱۔ بعض علماء کے ہاں یہ جائز ہے، بشرطیکہ سونا یا چاندی کی مقدار و صفات اور ذات وغیرہ متعین طور پر طے ہو جائے، کیونکہ یہ بیع صرف نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کرنسی، ثمن عرفی ہے، بیع صرف کے لیے عوضین کا ثمن خلقی (سونا، چاندی) ہونا ضروری ہے۔

۲۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ سونا، چاندی میں بیع سلم جائز نہیں ہے، کیونکہ کرنسی بھی سونا، چاندی ہی کے حکم میں ہے، لہذا یہ بیع صرف ہے، جس میں ادھار / سلم جائز نہیں ہے۔^(۱)

۸۔ استصناع کا تعارف و احکام (Manufacturing Contract)

آج کل آرڈر پر چیزیں بنوائی جاتی ہیں۔ ایسے معاملات کو فقہی اصطلاح میں ”استصناع“ کہتے ہیں۔ ذیل میں اس موضوع کو نو اہم نکات میں بیان کیا گیا ہے:

۱۔ استصناع کی تعریف

۲۔ بیع سلم اور استصناع میں فرق

۳۔ استصناع کی مشروعیت

۴۔ استصناع کا لزوم

۵۔ مصنوع کے احکام

۶۔ ثمن کے احکام

۷۔ معاصر صورتیں

۸۔ استصناع کی تعریف:

استصناع (manufacturing contract) کا لفظ ”صنع“ سے بنا ہے، اس کے لغوی معنی ہیں کوئی چیز بنانا۔ فقہی اصطلاح میں اس سے مراد ”آرڈر پر کوئی چیز تیار کرانا“ ہے۔ یعنی ایک انسان کسی دوسرے کو مخصوص رقم — عوض متعین و صفات پر مشتمل کسی ایسی چیز بنانے کا آرڈر دے جو ابھی تک تیار نہیں ہے۔

^(۱) بیع سلم کی اصطلاحات پچھاننا اور تبدیلی کے ساتھ ”فقد البیوع“ سے لگی ہیں۔

اس عقد میں چیز بنوانے والے (خریدار) کو ”مستضع“؛ چیز بنانے والے (فروخت کنندہ) کو ”صانع“ اور جو چیز بنوائی جاتی ہے اس کو ”مصنوع“ کہتے ہیں۔

الْإِسْتِصْنَاعُ عَقْدٌ مَّفَاوَلَةٌ مَعَ أَهْلِ الصَّنْعَةِ عَلَى أَنْ يَعْْمَلُوا شَيْئًا فَالْعَامِلُ صَانِعٌ
وَالْمُشْتَرِي مُسْتَضْعٌ وَالشَّيْءُ مَصْنُوعٌ^(۱)

اہل صنعت سے کسی چیز کے بنوانے کا معاملہ کیا جائے تو اسے استصناع کہتے ہیں۔ اس میں بنانے والا ”صانع“، خریدار ”مستضع“ اور جو چیز خریدی جاتی ہے، وہ ”مصنوع“ کہلاتی ہے۔

۲۔ بیع سلم اور استصناع میں فرق:

ایک اہم سوال ہے کہ بیع سلم اور بیع استصناع میں کیا فرق ہے؟ کیونکہ باسواقات جو صورت حال بیع سلم پر منطبق ہوتی ہے وہی استصناع پر بھی فٹ آتی ہے، ایسی صورت میں بیع کو سلم قرار دیکر اس کی شرائط کو ضروری قرار دیا جائے یا اسے استصناع کہا جائے گا اور استصناع کی شرائط لازم ہوں گی؟

اس سلسلے میں سلم اور استصناع میں فقہاء حنفیہ کی تفصیلات دیکھ کر مندرجہ ذیل فروق سامنے آتے ہیں:

۱۔ بیع سلم میں بیع (خریدی جانے والی چیز) دین ہوتی ہے، جبکہ استصناع میں بیع عین ہوتی ہے۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ بیع سلم صرف مثلی اشیاء (کیل، وزنی، عددیات متقاربہ، جیسے گندم، کئی، انڈے وغیرہ) میں ہوتی ہے، جبکہ استصناع مثلی وغیر مثلی دونوں قسم کی اشیاء میں ہو سکتی ہے۔

۲۔ استصناع میں بیع ایسی چیز ہونا ضروری ہے جو صنعت / مینوفیکچرنگ کی محتاج ہو، جسے باقاعدہ بنایا جاتا ہو،

جبکہ بیع سلم میں بیع کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں ہے، لہذا جو چیز صنعت کی محتاج نہ ہو، اس میں بھی بیع سلم جائز ہے۔

۳۔ بیع سلم میں خریدی ہوئی چیز کی وصولی کے لیے متعین مدت طے کرنا ضروری ہے، جبکہ استصناع میں اس

کے لیے مدت بیان نہ کرنا ضروری ہے۔ اسے یوں بھی کہا گیا ہے کہ سلم میں استعمال / مہلت کے لیے مدت طے کی جاتی ہے جو کہ ضروری ہے، جبکہ استصناع میں مہلت کے لیے مدت طے نہیں کی جاسکتی، البتہ استعمال کے لیے مدت بیان کی جاسکتی ہے، یعنی صرف اتنی مدت طے کی جاسکتی ہے جس میں چیز بن کر تیار ہو سکے، اس سے زیادہ مدت طے کرنا درست نہیں ہے۔

۴۔ بیع سلم میں ضروری ہے کہ مکمل ثمن / قیمت فی الفور ادا کر دی جائے، جبکہ استصناع میں ایسی کوئی شرط نہیں

^(۱) مجلة الأحكام العدلية. ص: ۳۱ (المأذنة ۱۲۴)

ہے، اس میں ساری رقم فی الفور دینا بھی درست ہے، بعد میں دینا بھی درست اور قسطوں کی شکل میں دینا بھی درست ہے۔

۵۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں بیع سلم میں یہ بھی ضروری ہے کہ معاملہ کرنے کے وقت سے لے کر چیز کی وصولی کی مدت تک بیع بازار میں یا کسی ایسی جگہ میسر ہو جہاں سے مہیا کی جاسکے، استمناع میں ایسی کوئی شرط لازم نہیں ہے۔

۳۔ استمناع کی مشروعیت:

ائمہ ثلاثہ کے ہاں استمناع کے عقد میں اگر سلم کی شرائط پائی جائیں تو یہ بیع سلم ہے، ورنہ سرے سے یہ عقد ہی جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں جو چیز بنوائی جاتی ہے وہ فی الحال موجود نہیں ہوتی، لہذا یہ خلاف قیاس اور بیوع کے اصولوں کے خلاف ہے جو کہ صرف ایک صورت (سلم) میں جائز ہے۔

حنفیہ کے ہاں استمناع کا عقد جائز ہے۔ ایک تو اس لیے کہ آپ ﷺ کے زمانے سے اس کا تعامل چلا آ رہا ہے، لہذا اس تعامل کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا جاسکتا ہے اور اسی کی وجہ سے آثار (جن میں بیع کا موجود، مقبوض، مملوک ہونا وغیرہ ضروری قرار دیا گیا ہے) میں تخصیص کی جاسکتی ہے۔ دوسرا حنفیہ بطور استیناس ان آثار کو بھی ذکر کرتے ہیں جن میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک منبر اور انگوٹھی بنوائی تھی۔ اگرچہ ان میں وضاحت نہیں ہے کہ وہ استمناع کا عقد تھا یا کوئی اور، لیکن استیناس اور تائید کے لیے ان کو لیا جاسکتا ہے۔^(۱)

۴۔ استمناع کی فقہی تکلیف:

بعض حنفیہ کے ہاں اس عقد کی فقہی تکلیف / حیثیت یہ ہے کہ یہ شروع سے ہی بیع ہے اور اس میں بیع وہ چیز ہے جو بنوائی جا رہی ہے، جو کہ حقیقت میں موجود نہیں ہے، لیکن حکماً موجود ہے۔ صالح کا عمل، بیع نہیں ہے۔ بعض حنفیہ کے ہاں یہ ابتداء اجارہ ہے اور انتہاء بیع ہے، جیسے ہبہ بشرط العوض ابتداء تبرع ہے اور انتہاء بیع ہے۔

۵۔ استمناع کا لزوم:

حنفیہ کے ہاں استمناع کا عقد شرکت و مضاربت کی طرح غیر لازم ہے، لہذا کوئی بھی فریق اس کو بلا عذر فسخ کر سکتا ہے، البتہ امام ابو یوسفؒ کی طرف یہ رائے منسوب کی جاتی ہے کہ ان کے ہاں عقد استمناع لازم عقد ہے، کوئی بھی فریق یکطرفہ طور پر اس کو منسوخ نہیں کر سکتا۔^(۲)

امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ جب چیز بن کر آجائے تو خریدار کو اختیارِ رؤیت حاصل ہے، وہ

(۱) الفقہ الإسلامی وأدلته ۵/ ۳۰۰

(۲) درر الحکام فی شرح مجلة الأحکام ۱/ ۴۲۴

محض اس بنیاد پر چیز لینے سے انکار کر سکتا ہے کہ اس نے چیز پہلے دیکھی نہیں تھی۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر چیز طے شدہ صفات کے مطابق ہے تو خریدار کو نہ لینے کا یا خریدار رؤیت حاصل نہیں ہے۔

متاخرین نے بہر صورت اس عقد کو لازم قرار دیا ہے، اور خیار رؤیت میں بھی امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دینا چاہیے، کیونکہ یہی قول حالات زمانہ کے زیادہ اوفقی ہے۔

وَإِذَا انْعَقَدَ الِاسْتِصْنَاعُ فَلَيْسَ لِأَحَدٍ الْعَاقِدَيْنِ الرَّجُوعُ، وَإِذَا لَمْ يَكُنْ الْمَصْنُوعُ عَلَى الْأَوْصَافِ الْمَطْلُوبَةِ الْمُبَيَّنَةِ كَانَ الْمُسْتَصْنَعُ مُخَيَّرًا.^(۱)

جب استصناع کا عقد ہو جائے تو اس کے بعد کسی ایک فریق کو رجوع کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اور جب مصنوع (مبیع) مطلوبہ صفات کے مطابق نہ ہو تو خریدار کو (چیز نہ لینے کا) اختیار حاصل ہوگا۔

۲۔ استصناع کی شرائط:

عقد استصناع کی عمومی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

- ۱۔ صنعت: معقود علیہ (مبیع/جو چیز خریدی جا رہی ہے وہ) ایسی چیز ہو جو صنعت کی محتاج ہو۔
- ۲۔ تعیین بالوصف: مبیع کی جنس، نوع اور صفات کے ذریعے اس کی تحدید کر دی جائے، لیکن وہ کوئی متعین بالذات چیز نہیں ہونی چاہیے۔

۳۔ تا جمل للاستعمال: مبیع کی وصولی کے لیے ”اجل مہلت“ طے نہ ہو۔ یعنی اتنی مدت طے نہیں کی جاسکتی جو چیز بنانے پر خرچ ہونے والی مدت سے زیادہ ہو۔ اگر اجل مہلت (مہلت کی مدت) طے نہ ہو، بلکہ اجل استعمال طے ہو جائے تو اس سے استصناع پر کوئی فرق نہیں پڑتا، عقد درست ہی رہے گا۔ اگر اجل مہلت طے کر دی گئی تو:

الف۔ اگر مبیع ایسی چیز ہے جس میں استصناع کا تعامل نہ ہو تو یہ عقد بالاتفاق بیع سلم بن جائے گا۔ لہذا اس کی شرائط ضروری ہیں، ورنہ عقد فاسد ہو جائے گا۔

ب۔ اگر مبیع ایسی چیز ہے جس میں استصناع کا تعامل ہے تو امام ابو حنیفہؒ کے ہاں تب بھی یہ معاملہ سلم ہو جائے گا، صاحبین کے ہاں سلم نہیں بنے گا۔

اجل مہلت اور اجل استعمال میں علماء نے مختلف فروق بیان کیے ہیں۔ مندرجہ ذیل نکات سے ان کے درمیان

^(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۷۶ (المأذؤة ۳۹۲)

فرق معلوم کیا جاسکتا ہے:

الف۔ ”اجل مہلت“ میں اتنی مدت واجل کی شرط لگائی جاتی ہے جو بیع کی تیاری سے زیادہ ہو، جس میں بائع و قیمت سے انتفاع کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ ”اجل استعجال“ یہ ہے کہ صرف اتنی مدت طے کی جائے جس میں فقط بیع تیار ہو سکے، مزید کسی سہولت کے لیے نہ ہو۔

ب۔ اگر خریدار کی طرف سے مدت کی شرط لگائی جائے تو یہ ”اجل استعجال“ ہے اور اگر فروخت کنندہ (صانع) کی طرف سے مدت کی شرط لگائی جائے تو یہ ”اجل مہلت“ ہے۔

ج۔ اگر ایسی مدت طے کر دی گئی جو لازم ہو تو یہ ”اجل مہلت“ ہے اور اگر مدت لازم نہ ہو، بلکہ کسی بھی وقت چیز تیار کر کے دی جاسکتی ہو تو یہ ”اجل استعجال“ ہے۔^(۱)

۴۔ تعال: بیع ایسی چیز ہو جس میں استصناع کا تعال ہو۔ اگر عدم تعال والی چیز ہو اور اس میں اجل مہلت بھی ہو تو یہ عقد، بیع سلم ہو جائے گا۔ اور اگر اجل طے نہ ہو یا اجل استعجال ہو تو یہ عقد فاسد ہوگا، مگر مکمل ہونے کے بعد اس پر صحت کا حکم لاگو ہوگا۔ تعال میں عرف حادث اور موجودہ تعال بھی معتبر ہے۔^(۲)

۵۔ مصنوع کے احکام:

جو چیز بنائی جائے اس کے بنیادی احکام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بیع طے شدہ صفات کے موافق ہو۔ اگر صفات کے خلاف ہو تو خریدار کو نہ لینے کا اختیار حاصل ہے۔

۲۔ اگر صانع (فروخت کنندہ) نے پہلے سے تیار شدہ چیز حوالے کر دی تو یہ بھی درست ہے، بشرطیکہ عقد کے وقت اس چیز کی تعیین نہ کی ہو، بلکہ صرف صفات متعین ہوئی ہوں۔

۳۔ بیع جب تک حوالے نہ کی جائے وہ صانع (فروخت کنندہ) کی ملک ہے۔ اسی پر ضمان وغیرہ آئے گا اور وہ اس کو کسی اور کو بیچ سکتا ہے۔

۴۔ اگر صانع (فروخت کنندہ) نے چیز مستصنع (خریدار) یا اس کے وکیل کے حوالے کر دی یا تخلیہ کر دیا تو صانع کا ذمہ بری ہو جائے گا۔

۵۔ اگر وقت سے پہلے بیع تیار ہو جائے اور حوالے کی جائے تو خریدار پر لینا لازم ہے۔

(۱) مشروع لقانون اسلامی للبیوع والدیون، ص: ۹۰۔

(۲) بدائع الصنائع ۳/۵

۱۔ ثمن کے احکام:

عقد استصناع میں جو قیمت دی جاتی ہے، اس کے بنیادی احکام حسب ذیل ہیں:

۱۔ ثمن (قیمت) معلوم ہو۔

۲۔ ثمن کی فی الفور ادائیگی ضروری نہیں ہے۔ ادھار بھی جائز ہے اور قسطوں کی شکل میں بھی۔

۳۔ اگر قیمت، شروع میں صانع (فروخت کنندہ) کو دے دی تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا، وہ اس سے انتفاع حاصل

کر سکتا ہے۔

۴۔ کسی منفعت (services) کو بھی ثمن بنایا جاسکتا ہے۔

۵۔ اگر شروع میں ایک قیمت طے کر دی گئی اور بعد میں ایسے حالات پیش آئے کہ قیمت میں کچھ تبدیلی اور کمی

بیشی ضروری ہو تو دونوں فریقین باہمی رضامندی سے تبدیلی کر سکتے ہیں۔

۶۔ فریقین باہمی رضامندی سے یہ شرط طے کر سکتے ہیں کہ اگر فروخت کنندہ (صانع) نے چیز تیار کرنے یا

حوالے کرنے میں تاخیر کر دی تو جو قیمت طے کی گئی ہے، اس میں ایک خاص مقدار کی کمی کی جائے گی۔ اس کو معاصر علماء

”الشرط الجزائي“ کہتے ہیں اور انگریزی میں اس کو (penalty clause) کہتے ہیں۔ اس قسم کی شرط کے جائز

ہونے کی معاصر علماء نے دو وجوہات بیان کی ہیں:

الف۔ اس شرط کا عرف ہو چکا ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے، جبکہ اس کی ممانعت پر قرآن و سنت کی کوئی واضح

ممانعت بھی موجود نہیں ہے۔

ب۔ اکثر علماء نے استصناع میں اس شرط کو ”اجارہ“ پر قیاس کیا ہے۔ مثلاً کوئی شخص درزی کو کپڑا دیکریوں کہہ

دے کہ: اگر تم نے ایک دن میں کپڑا سی کر دے دیا تو ایک ہزار روپے اجرت دی جائے گی اور اگر دو دن لگا دیے تو پانچ سو

روپے اجرت دی جائے گی۔ یہ شرط امام ابو یوسف، امام محمد اور امام احمد رحمہم اللہ کی رائے میں جائز ہے۔ اسی طرح کی شرط

استصناع میں بھی جائز ہے، کیونکہ استصناع کی اجارہ کے ساتھ مشابہت ہے۔ معاصر علماء نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔^(۱)

۹۔ معاصر صورتیں:

• تعمیراتی کام:

آج کل تعمیراتی کاموں اور مکانات وغیرہ میں استصناع پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کی دو صورتیں زیادہ رائج ہیں:

(۱) المعاییر الشرعية ص: ۲۰، رقم المعیار: ۳

۱۔ زید کی زمین ہے اور وہ کسی ٹھیکہ دار سے کہہ دے کہ اس زمین پر میرے لیے گھر بناؤ۔ اس صورت میں اگر مکان کا سارا میٹریل زید ہی کی طرف سے ہے تو یہ اجارہ ہے اور اگر میٹریل عمر (کام کرنے والے) کی طرف سے تو یہ استمضاع ہے۔ اس کو آج کل ”مقاولة“ بھی کہتے ہیں۔

۲۔ زمین عمر کی ہے اور زید اس سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اپنی اتنی متعین زمین پر میرے لیے اس قسم کا گھر، مکان، فلیٹ بناؤ۔ جیسا کہ آج کل بڑے پلازوں میں دکانیں بننے سے پہلے بنگلہ ہوتی ہے، اسی طرح مکانات اور فلیٹس کی بھی بننے سے پہلے بنگلہ ہوتی ہے۔ یہ بھی استمضاع ہے۔ لہذا دکان یا فلیٹ تیار ہونے اور قبضہ میں لینے سے پہلے آگے کسی اور کو بیچنا درست نہیں، کیونکہ یہ غیر مملوک چیز کی بیع ہے۔

• فلیٹوں کی خرید و فروخت:

آج کل ریل اسٹیٹ (real estate) کے معاملات میں فلیٹوں کی بنگلہ اور خرید و فروخت کا رواج بہت عام ہے، اس کی اکثر صورتیں استمضاع کے اندر آتی ہیں، لہذا ان کا اصولی حکم سمجھنا ضروری ہے کہ عقد استمضاع میں محض معاملہ ہونے (مثلاً بنگلہ کرانے) سے خریدار مطلوبہ چیز کا مالک نہیں بنتا، بلکہ مطلوبہ چیز اس وقت خریدار کی ملکیت میں آتی ہے جب وہ اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔ قبضہ سے پہلے وہ چیز بیچنے والے شخص کی ملکیت میں رہتی ہے۔

لہذا جو فلیٹ بک کرایا جائے جب تک تعمیر ہو کر خریدار کے حوالے نہ کر دیا جائے، خریدار کے لیے اسے آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، لہذا اگر وہ فلیٹ تعمیر ہی نہیں ہوا۔ یا تعمیر تو ہوا، لیکن تیاری کے مراحل میں ہے اور ابھی تک بلڈر (builder) کے پاس ہے۔ یا صرف خریدار کو اس کا قبضہ نہیں دیا گیا۔ ان تمام صورتوں میں خریدار کے لیے اس فلیٹ کو آگے بیچنا جائز نہیں، کیونکہ جب تک فلیٹ قبضہ میں نہ آئے، خریدار اس کا مالک نہیں بنتا، لہذا یہاں ملکیت میں آنے سے پہلے چیز کو بیچنا جاہل ہے جو کہ شرعاً باطل ہے۔

البتہ اس معاملے کی متبادل صورت یہ ہو سکتی ہے کہ فلیٹ کا قبضہ حاصل ہونے سے پہلے اسے آگے بیچنے کے بجائے بیچنے کا صرف وعدہ کیا جائے، پھر کچھ عرصہ بعد جب بیچنے والے کو واقعہ اس فلیٹ کا قبضہ مل جائے تو پہلے سے طے شدہ قیمت پر یا باہمی رضامندی سے کسی نئی قیمت پر باقاعدہ ایجاب و قبول (offer & acceptance) کر کے بیچا جائے، اس طرح کرنے سے یہ معاملہ جائز ہوگا۔

• گاڑیوں کی بنگلہ:

نئی گاڑی خریدنے کے لیے اس کی بنگلہ کرنا بھی استمضاع میں داخل ہے۔ اس صورت میں بعض دفعہ گاڑی بک

کرانے والا شخص اسے آگے بیچ دیتا ہے اس مرحلے پر آگے بیچنے کے لیے قبضہ کرنا ضروری ہے، چنانچہ:
۱۔ شوروم سے کار وصول کرنے کے بعد اسے آگے بیچنا جائز ہے خواہ نفع کے ساتھ ہو یا بغیر نفع کے۔

اس صورت میں حقیقی قبضہ تو یہ ہے کہ بک کرانے والا گاڑی شوروم سے نکال کر اپنے ہاں لے آئے اور پھر فروخت کرے اور حکمی قبضہ یہ ہے کہ شوروم سے وہ اپنی گاڑی کی چابی وصول کر لے اور اسے اشارہ وغیرہ کے ذریعے یا انجن اور چیسز (chassis) نمبر وغیرہ بتلا کر متعین کر کے بتلا دیا جائے کہ فلاں گاڑی آپ کی ہے۔ دونوں میں سے جو قبضہ بھی حاصل ہو اس کے بعد اسے آگے فروخت کرنا جائز ہے۔

۲۔ لیکن گاڑی تیار ہونے کے بعد اسے شوروم سے وصول کرنے سے پہلے بنگ کی رسید پر آگے بیچنا جائز نہیں، خواہ نفع کے ساتھ بیچی جائے یا بغیر نفع کے۔^(۱)

۹۔ مرابحہ (Cost plus Profit)

خرید و فروخت کی ایک قسم ”مرابحہ“ ہے، جس کو دس اہم نکات میں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ مرابحہ کی تعریف

۲۔ مرابحہ کا ثبوت

۳۔ مرابحہ وعام بیع میں فرق

۴۔ مرابحة للامر بالشراء

۵۔ مرابحہ کی شرائط

۶۔ اصل قیمت کا مطلب

۷۔ امپورٹڈ چیزوں میں مرابحہ

۸۔ قیمت میں اخراجات کو شامل کرنا

۹۔ عقد مرابحہ میں خیانت

۱۰۔ آخری دو باتیں

۱۔ مرابحہ کی تعریف:

مرابحہ کا لفظ ”ربح“ سے بنا ہے، جس کے لغوی معنی نفع اور پرافٹ کے آتے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں اس کا مفہوم ہے کسی چیز کو اس کی اصل قیمت بتا کر اور اس پر معلوم نفع رکھ کر بیچنا۔ یعنی ایک شخص کسی چیز کو فروخت کرتے وقت خریدنے والے کو چیز کی اصل قیمت، اس پر جو خرچہ آیا ہے وہ بھی بتائے اور اپنا منافع بیان کر کے فروخت کر دے۔ مثلاً فروخت کنندہ یوں کہہ دے کہ یہ چیز مجھے ایک ہزار میں پڑی ہے، میں آپ کو دس فیصد (سوروپے) نفع کے ساتھ گیارہ سو میں بیچتا ہوں۔

^(۱) استقناع کے مباحث اور تفصیلات کچھ اضافہ اور تبدیلی کے ساتھ ”فہم البیوع“ سے لی گئی ہیں۔

علامہ کاسائیؒ اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

- (۱) مبادلة المبیع بمثل الثمن الأول وزيادة ربح.
بیع کو سابقہ قیمت اور اضافی نفع کے ساتھ بیچنا۔

۲۔ مرابحہ کا ثبوت:

مرابحہ کے ثبوت کے لیے دو بنیادی نکات کافی ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَإِخْلَ اللَّهُ النَّبِيعَ وَحَرَّمَ الزَّيْتَا) ^(۲) یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو

حرام کر دیا ہے۔ لہذا ہر وہ معاملہ جو بیع کے زمرے میں آتا ہے وہ حلال ہے، اور مرابحہ بھی بیع کی ایک قسم ہے۔

۲۔ علماء نے یہ قاعدہ ذکر کیا ہے کہ: "الأصل في المعاملات الإباحة" تجارتی و مالی معاملات میں اصل یہ ہے

کہ وہ مباح و حلال ہیں، سوائے ان معاملات کے جنہیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ چونکہ بیع مرابحہ بھی معاملات سے متعلق ہے اور قرآن و حدیث میں کوئی ایسی نص نہیں ہے جس میں اس کی حرمت کا تذکرہ ہو، نہ اس میں شریعت کے کسی اصول کی خلاف ورزی ہے، لہذا یہ بیع حلال ہے۔

۳۔ مرابحہ و عام بیع میں فرق:

عام بیع میں بھی اگرچہ بیچنے والا اپنا منافع رکھ کر چیز بیچتا ہے، لیکن اس میں اور بیع مرابحہ میں یہ فرق ہے کہ بیع

مرابحہ میں فروخت کرنے والا اپنی چیز کی اصل قیمت اور اپنا منافع دونوں بیان کرتا ہے۔ خرید و فروخت کے عام معاملہ میں دونوں کو الگ بیان کرنا ضروری نہیں، صرف مجموعی قیمت بتائی جاتی ہے۔

۴۔ مرابحہ للآمر بالشراء:

یہ جدید اصطلاح ہے جو اسلامی بینکوں میں رائج ہے۔ اس کی بنیادی صورت یوں ہوتی ہے کہ کوئی شخص بینک

سے مخصوص چیز خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے، جسے وہ خود خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ بینک مطلوبہ سامان

صاف کے کہنے پر خرید کر مرابحہ کی صورت میں یعنی نفع کے ساتھ کسٹمر کو فروخت کر دیتا ہے، اور کسٹمر اس کی قیمت

قسطوں میں ادا کرتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل کتاب کے آخری باب میں اسلامی بینکاری سے متعلق مضمون میں ہے۔

(۱) بدائع الصنائع ۵/ ۱۳۵

(۲) البقرة: ۲۷۵

۵۔ مراحمہ کی شرائط:

مراحمہ بھی دیگر بیوعات کی طرح ایک بیع ہے، اس لیے اس میں بھی بیوع کی عام شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، البتہ مراحمہ کی اپنی خاص شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سابقہ بیع کی قیمت مثلی اشیاء میں سے ہونا ضروری ہے، جیسے نقدی ہو، گندم ہو یا کئی وغیرہ۔ اگر سابقہ بیع کی قیمت کوئی قیمی چیز ہو جیسے بکری وغیرہ تو چونکہ اس کی متعین قیمت معلوم نہیں ہے، اس لیے اب اس ضمن پر مراحمہ درست نہیں، مراحمہ میں سابقہ بیع کی اصل قیمت معلوم ہونا ضروری ہے۔

۲۔ سابقہ بیع کی قیمت اور اگلی بیع میں رکھا گیا نفع دونوں معلوم و متعین ہوں۔

۳۔ نفع معلوم ہونے میں یہ بھی کافی ہے کہ سابقہ بیع کی قیمت کی کوئی متعین فیصد کو نفع مقرر کیا جائے۔ مثلاً فروخت کنندہ کہتا ہے کہ یہ چیز مجھے ایک سو روپے میں پڑی ہے، میں آپ کو اسی قیمت پر دس فیصد نفع کے ساتھ بیچتا ہوں۔

۴۔ سابقہ بیع کی قیمت اور مبیع دونوں اموال ربویہ اور متحدہ الجنس نہ ہوں، ورنہ مراحمہ درست نہ ہوگا۔ مثلاً کسی نے ایک کلو گندم کے بدلے ایک کلو گندم لے لی، اب وہ یہ گندم آگے مراحمہ کے طور پر فروخت نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر ایسا کرے گا تو ایک کلو گندم کے بدلے ایک کلو گندم مع نفع لے گا اور یہ سود ہے۔

۵۔ یہ بھی ضروری ہے کہ سابقہ بیع، بیع فاسد نہ ہو، ورنہ مراحمہ درست نہ ہوگا۔^(۱)

۲۔ اصل قیمت کا مطلب:

فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ کسی چیز کو جس قیمت پر خریداجائے اسی قیمت پر نفع رکھ کر آگے مراحمہ کیا جائے گا، اور اگر ایک مرتبہ معاملہ مکمل ہو گیا، اس کے بعد خریدار و فروخت کنندہ کے اتفاق سے مقررہ قیمت کے بجائے کسی اور جنس کی قیمت دے دی گئی تو اس کا اعتبار نہیں ہے۔ مثلاً زید نے عمر سے سو ڈالرز کی کوئی چیز خریدی، لیکن بعد میں قیمت کی ادائیگی پاکستانی روپیوں میں کی گئی تو اب اگر زید اس چیز کو آگے مراحمہ پر بیچتا ہے تو اصل قیمت ڈالرز کی شکل میں ہی بتائے گا۔ اس کو اصول کی شکل میں یوں ذکر کیا جاتا ہے:

رأس المال: ما لزم المشتري بالعقد، لا ما نقده بعد العقد.^(۲)

اس المال وہ ہے جو عقد کی وجہ سے خریدار پر لازم ہو، نہ کہ وہ جو عقد کے بعد دیا جائے۔

(۱) بدائع الصنائع ۵ / ۲۲۰

(۲) حوالہ بالا ۵ / ۲۲۲

اسی طرح اگر معاملہ کرنے کے بعد قیمت میں کمی بیشی کی گئی تو اس کو بھی اصل عقد کے ساتھ ملایا جائے گا، لہذا آگے مرادھ کرتے ہوئے وہی قیمت بتائی جائے گی جو فروخت کنندہ کی طرف سے کمی کے بعد اس کو دی گئی ہے یا اضافہ کے بعد جو قیمت دی گئی ہے۔ مثلاً زید نے عمر سے ایک موبائل دس ہزار میں خریدا۔ بعد میں عمر نے زید کو ڈسکاؤنٹ دیکر ایک ہزار روپے معاف کر دیے اور اس سے نو ہزار روپے لے لیے۔ اب اگر زید اس موبائل کو آگے مرادھ کے ساتھ بیچتا ہے تو اصل قیمت نو ہزار بتائے گا۔

البتہ دیگر ائمہ کی رائے یہ ہے کہ خیار مجلس یا خیار شرط کے دوران اگر قیمت میں تبدیلی یا کمی بیشی کی گئی ہے تو اسے اصل قیمت کے ساتھ ملایا جائے گا، ورنہ نہیں۔

۷۔ اپورٹڈ چیزوں میں مرادھ:

اگر باہر کسی ملک سے کوئی چیز خرید کر اپورٹ کی گئی اور فروخت کنندہ کو قیمت ڈالر کی شکل میں ادا کی گئی، اب خریدار اس چیز کو اپنے ملک میں بطور مرادھ بیچنا چاہتا ہے تو اس کی درج ذیل صورتیں ممکن ہیں:

الف۔ اصل قیمت ڈالر کی صورت میں بتا کر اس پر متعین نفع بھی بتادیں، خواہ نفع ڈالر کی شکل میں طے کیا جائے، یا کسی اور کرنسی کی شکل میں یا کسی چیز یا منفعت کی شکل میں طے کیا جائے، ہر صورت درست ہے۔ مثلاً یوں کہہ دے کہ یہ چیز مجھے سو ڈالر میں پڑی ہے، میں آپ کو سو ڈالر اور پانچ سو پاکستانی روپے کے بدلے فروخت کرتا ہوں۔ تو یہ جائز ہے اور خریدار پر سو ڈالر اور پانچ سو پاکستانی روپے لازم ہو جائیں گے۔

ب۔ اصل قیمت ڈالر کی صورت میں بتا کر اس پر فیصدی نفع رکھے، مثلاً یوں کہہ دے کہ یہ چیز مجھے سو ڈالر میں پڑی ہے، میں آپ کو اصل قیمت پر دس فیصد نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہوں۔ یہ بھی جائز ہے اور خریدار پر ایک سو دس ڈالر کی ادائیگی لازم ہو جائے گی۔

ج۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اصل قیمت اس کرنسی میں نہ بتائی جائے جس کرنسی میں چیز خریدی ہے، بلکہ کسی دوسری کرنسی میں بتائی جائے، مثلاً کسی نے باہر سے سو ڈالر کی چیز منگوائی اور پاکستان میں کسی کو بطور مرادھ بیچتے ہوئے ساری رقم ہی پاکستانی کرنسی میں بتادی، مثلاً یوں کہہ دے کہ یہ چیز مجھے پندرہ ہزار روپے میں پڑی ہے، میں آپ کو سولہ ہزار میں بیچتا ہوں۔ یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ مرادھ میں سابقہ بیع کی اصل قیمت بتانا ضروری ہے جو کہ ڈالر ہے، نہ کہ روپے۔ البتہ اس صورت میں مرادھ کے بجائے عام بیع کی جاسکتی ہے۔

د۔ اگر باہر سے منگوانے والا یہ چاہتا ہے کہ اپنی چیز اپنے ملک کی کرنسی میں آگے کو کسی کو بطور مرادھ فروخت

کرے تو اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ چیز بیچتے ہوئے اصل قیمت تو اسی کرنسی میں بتائے جس پر چیز باہر سے منگوائی ہے، مثلاً ڈالر، لیکن خریدار جب قیمت کی ادائیگی کرے تو اس وقت دونوں کی باہمی رضامندی سے ڈالر کے بجائے پاکستانی کرنسی ادا کر دی جائے، اس کو ”صرف فی الذمہ“ کہتے ہیں، گویا کہ خریدار پر جو ڈالر لازم تھے، دونوں نے اس کا تبادلہ پاکستانی کرنسی کے ساتھ کر دیا، لیکن اس صورت کے جواز کے لیے تین شرائط ہیں:

- ۱۔ جس وقت عقد مراہمہ کر رہے ہوں اس وقت یہ شرط نہ لگائی جائے کہ ابھی تو ڈالر زیر بیع ہو رہی ہے، لیکن خریدار ادائیگی پاکستانی کرنسی کی صورت میں کرے گا، ورنہ یہ ”صفقہ فی صفقہ“ ہو جائے گا جو کہ درست نہیں ہے۔
- ۲۔ قیمت کی ادائیگی کے وقت ڈالر کا وہ ریٹ معتبر ہو گا جو ڈالر کی ادائیگی کے دن مارکیٹ میں چل رہا ہو، اسی حساب سے پاکستانی کرنسی کی ادائیگی کی جائے گی۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے کہ سرورِ دو عالم ﷺ نے اس جیسی صورت کو جائز قرار دیتے ہوئے فرمایا: ”لا بأس، أن تأخذ بسعر يومها“^(۱)
- ۳۔ ادائیگی کرتے وقت مکمل ثمن کا تصفیہ کر دیا جائے، یعنی جتنے ڈالر لازم تھے، ان سب کی جتنی قیمت بنتی ہے وہ ادا کر دی جائے۔ ایسا نہ کرے کہ سو ڈالر لازم تھے تو ان کی ادائیگی پاکستانی کرنسی میں طے کر کے پچاس ڈالر کی قیمت ادا کر دی اور بقیہ پچاس کی ادائیگی مؤخر کر دی، یہ درست نہیں ہے، کیونکہ جتنے ڈالر کی قیمت مؤخر کی ہے اس میں ”بیع الدین بالدین“ لازم آ رہا ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔ یہ شرط بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اخذ کی گئی ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”الم تفترقا وبينكما شيء“۔

۸۔ قیمت میں اخراجات کو شامل کرنا:

انسان جب کوئی چیز خرید کر آگے بطور مراہمہ بیچنا چاہے تو وہ اصل قیمت میں وہ تمام اخراجات بھی شامل کر سکتا ہے جو اس چیز کی خریداری اور حصول پر آئے ہیں۔ اس قسم کے اخراجات کے لیے دو اصول طے کیے گئے ہیں:

- ۱۔ کل ما زاد في عين المبيع أو قيمته، يلحق برأس المال: ہر وہ عمل یا خرچہ جس کی وجہ سے بیع (چیز) کی ذات میں یا اس کی قیمت میں اضافہ ہو جائے، اس کو اصل قیمت میں شامل کیا جائے گا۔ جیسے بیع کے رنگ و روغن وغیرہ کا خرچہ۔

۲۔ کل ما جرى العرف بإلحاقه برأس المال في عادة التجار، يلحق برأس المال: ہر وہ خرچہ جسے

^(۱) سنن ابی داؤد ۳/۲۵۵، حدیث نمبر: ۳۳۵۶

تاجروں کے عام عرف میں کسی چیز کی قیمت و لاگت میں شامل کیا جاتا ہو، اس کو بھی چیز کی قیمت میں شامل کیا جائے گا۔ جیسے شپنگ کا خرچہ، حمل و نقل کا کرایہ، گودام کا کرایہ، دلال کا خرچہ۔ ٹیکس، ٹول پلازہ، کسٹم ڈیوٹی وغیرہ۔

ایسی صورت میں آگے خریدار کو یہ نہ کہے کہ یہ چیز میں نے اتنے میں خریدی ہے، بلکہ یوں کہے کہ: یہ چیز مجھے اتنے میں پڑی ہے، تاکہ جھوٹ سے بچا جاسکے۔

دو قسم کے اخراجات کو قیمت میں شامل نہیں کیا جائے گا:

۱۔ انسان نے خود بیع کے لیے کوئی عمل کیا ہو تو اس عمل کی کوئی قیمت اضافی طور پر بیع کی قیمت میں شامل نہیں

کی جائے گی، مثلاً بازار سے سر پر چیز رکھ کر گھر لایا، تو اپنے اس عمل کے بدلے میں قیمت میں اضافہ نہیں کرے گا۔

۲۔ ایسے مزدور کا خرچہ بھی بیع کی اصل قیمت میں شامل نہیں کرے گا جس مزدور کو اصلاً کسی دوسرے کام کے

لیے رکھا ہو، مثلاً گھر کا ڈرائیور ہے، اس کے ذریعے چیز منگوائی تو اس ڈرائیور کی تنخواہ کو بیع کی قیمت میں شامل نہیں کیا جائے گا۔^(۱)

۹۔ عقد مرابحہ میں خیانت:

عقد مرابحہ کے ذریعے چیز بیچنے والے پر لازم ہے کہ خریدار کو ہر وہ بات بتائے جو اس کی رغبت و انٹرسٹ میں مؤثر ہو، مثلاً اگر بائع نے چیز ادھار خریدی ہے اور آگے مرابحہ کر رہا ہے تو خریدار کو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ چیز میں نے ادھار خریدی تھی۔ اسی طرح خریدار کو اصل قیمت درست بتانا ضروری ہے۔ اگر عقد مرابحہ کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ بائع نے عقد مرابحہ میں غلط بیانی یا خیانت کی ہے یا کوئی بات چھپائی ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ قیمت کی صفت میں خیانت ظاہر ہوگئی، مثلاً بائع نے چیز ادھار خریدی تھی اور آگے مرابحہ کرتے ہوئے خریدار کو یہ نہیں بتایا، تو اب خریدار کو اختیار حاصل ہے، چاہے تو مرابحہ کا عقد ہی ختم کرے، یا چاہے تو اسی قیمت پر بیع رکھ لے۔

۲۔ قیمت کی مقدار میں خیانت ظاہر ہوگئی، مثلاً بائع نے کہا کہ یہ چیز مجھے سو ڈالرز میں پڑی ہے، بعد میں معلوم ہو جائے کہ اس نے جھوٹ بولا تھا، اس کو چیز نوے ڈالرز میں پڑی تھی تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں خریدار کو بیع ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، جبکہ امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ قیمت سے اتنی کمی کر دی جائے گی جو اس نے جھوٹ بول کر اضافہ کیا ہے، اور اسی تناسب سے نفع سے بھی کمی کر دی جائے گی۔

اگر ”عقدِ تولیہ“ کے اندر ایسی خیانت معلوم ہوگی تو حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے ہاں خریدار کو چیز واپس کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، بلکہ خریدار، بقدر خیانت قیمت میں کر کے اتنی قیمت فروخت کنندہ سے واپس وصول کرے۔ اور امام محمدؒ کی رائے وہی ہے جو مراہمہ میں تھی کہ قیمت میں کمی نہ کرے، بلکہ اگر چاہے تو مکمل قیمت پر چیز رکھ لے یا اگر چاہے تو چیز واپس کر کے معاملہ ختم کر دے۔^(۱)

آخری دو باتیں:

- ۱۔ اگر انسان کو چیز گفٹ میں ملی ہو یا وراثت میں ملی ہو، اور اس کی بازاری قیمت معلوم ہو تو اس کا مراہمہ کیا جاسکتا ہے، مثالیوں کہے کہ اس کی بازاری قیمت اتنی ہے، میں آپ کو اتنے نفع کے ساتھ بیچتا ہوں۔
- ۲۔ عقدِ مراہمہ جس طرح نقد جائز ہے، اسی طرح ادھار بھی جائز ہے، کیونکہ یہ بھی بقیہ احکام میں عام بیوع کی طرح ہے اور ادھار کی وجہ سے زیادہ نفع رکھنا بھی جائز ہے۔^(۲)

۱۱، ۱۰۔ تولیہ اور وضعیہ

تولیہ (Cost to Cost Sale) ایسی خرید و فروخت کو کہتے ہیں جس میں فروخت کنندہ اصل قیمت یا خرچہ بھی بتائے اور بغیر کسی نفع کے آگے فروخت کر دے۔

وضعیہ (Less than Cost) خرید و فروخت کا ایسا معاملہ ہے جس میں فروخت کنندہ اصل قیمت یا خرچہ بتا کر، چیز کو نقصان کے ساتھ، یعنی کوئی شخص کوئی چیز خرید کر اسے اصل قیمت سے کم میں آگے فروخت کر دے جس میں اس کو یہ چیز پڑی تھی۔

یہاں کچھ نکات ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

- ۱۔ سابقہ تینوں معاملات (مراہمہ، تولیہ، وضعیہ) کو ”بیوع الامانۃ“ کہتے ہیں۔ اور عمومی طور پر مراہمہ کا معاملہ ہوتا ہے، وضعیہ یا تولیہ کا معاملہ بہت کم ہوتا ہے۔ اسی لیے فقہاء نے مراہمہ کے احکام پر زیادہ توجہ دی ہے۔
- ۲۔ سابقہ تفصیلات میں جن احکام کا تعلق سابقہ قیمت یا خرچہ سے متعلق ہیں، وہ تقریباً تینوں کے لیے مشترک احکام ہیں۔ بقیہ احکام میں کچھ کچھ فرق ہے، جن کا ذکر پیچھے ہو گیا۔

۳۔ بعض علماء نے ”بیوع الامانۃ“ میں مزید مندرجہ ذیل تین قسموں کو بھی شمار کیا ہے:

^(۱) بدائع الصنائع ۲۲۵/۵

^(۲) مراہمہ کی تفصیلات کچھ اضافہ و تبدیلی کے ساتھ ”فقد السیوع“ سے لی گئی ہیں۔

الف- بیع الوفاء:

بیع کی ایسی صورت جس میں فروخت کنندہ یہ شرط لگاتا ہے کہ جب میں قیمت واپس کروں تو میری چیز مجھے واپس دے دی جائے گی۔

ب- بیع الاشتراک / الاشراک:

یہ بھی تولیہ ہی ہے، لیکن خریدی ہوئی چیز کے بعض حصے پر۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کو خرید کر اس کا بعض حصہ کسی کو اصل قیمت پر فروخت کر دے۔ مثلاً زید نے دس ہزار روپے دیکر دس من گندم خریدی اور پھر پانچ من گندم عمر کو پانچ ہزار پر یہ کہہ کر فروخت کر دی کہ جتنی قیمت میں مجھے پڑی ہے، آپ کو بھی اسی قیمت پر بیچتا ہوں۔ اس پر بھی تولیہ کا حکم لاگو ہوگا۔^(۱)

ج- بیع المسترسل:

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو یہ کہہ کر بیچنا کہ میں آپ کو بازاری قیمت پر بیچتا ہوں یا آج کے مارکیٹ ریٹ کے مطابق بیچتا ہوں، یا خریدار نے یوں کہہ دیا کہ جس قیمت پر آپ دیگر لوگوں کو بیچتے ہیں، اسی پر مجھے بھی دے دیں۔ چونکہ اس صورت میں بھی ایک فریق دوسرے کی بات پر اعتماد کرتا ہے، اس لیے یہ بھی ”بیع الامانۃ“ ہے۔ اس میں اگر فروخت کنندہ جھوٹ سے کام لے گا تو خریدار کو قیمت میں اتنی کمی کا حق حاصل ہوگا۔^(۲)

۱۲- مساومہ (Bargaining Price)

یہ عام خرید و فروخت کے معاملہ کو کہتے ہیں جس میں خریدار اور فروخت کنندہ آپس میں کسی بھی قیمت پر اتفاق کر لیتے ہیں اور اس میں سابقہ قیمت یا خرچہ کو نہیں دیکھا جاتا، نہ فروخت کنندہ یہ بتاتا ہے کہ یہ چیز میں نے کتنے میں خریدی یا مجھے کتنے میں پڑی ہے۔

عام طور پر جو معاملہ ہوتا ہے وہ اسی طرح ہی ہوتا ہے۔ اس بیع کے لیے الگ سے کوئی شرائط یا احکام نہیں ہیں۔ اس کی شرائط و احکام وہی ہیں جو ہم نے بیع کی شرائط کے تحت بیان کیے ہیں۔

هو البيع الذي لا يظهر فيه رأس ماله أي البيع بدون ذكر ثمنه الأول.^(۳)

(۱) بدائع الصنائع ۵/۲۶۶

(۲) المغنی ۴/۹۲

(۳) فقہ المعاملات ۱۳/۱

۲۔ بیوع کی ممنوع اقسام

اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل صورتیں داخل ہیں:

- ۱۔ بیع باطل ۲۔ بیع فاسد ۳۔ بیع مکروہ ۴۔ بیع الحصاصۃ
 ۵۔ بیع الملامسہ ۶۔ بیع المناہذہ ۷۔ بیع المزانیہ ۸۔ بیع الحاقلہ
 ۹۔ بیع المجازفہ ۱۰۔ صفقہ فی صفقہ

۱۔ بیع باطل کا تعارف و احکام (Void Sale)

بیع باطل کے تعارف و احکام کے لیے مندرجہ ذیل تین امور کی تفصیل ذکر کی جائے گی:

۱۔ بیع باطل کی تعریف

۲۔ حکم شرعی

۳۔ بیع باطل کی اقسام

۱۔ بیع باطل کی تعریف:

بیع باطل وہ بیع ہے جو اپنی ذات اور وصف دونوں کے اعتبار سے درست نہ ہو۔ یعنی بیع کے رکن (ایجاب و قبول) میں یا محل (بیچی جانے والی چیز یا قیمت) میں کوئی خلل واقع ہو یا ایسی شرعی خرابی پائی جائے جس کی وجہ سے شریعت کی نظر میں معاملہ بالکل کالعدم سمجھا جائے۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

النَّبِيعُ الْبَاطِلُ مَا لَا يَصِحُّ أَصْلًا يَعْني أَنَّهُ لَا يَكُونُ مَشْرُوعًا أَصْلًا.^(۱)

بیع باطل: وہ بیع ہے جو اصلاً صحیح نہ ہو، یعنی اصلاً ہی وہ مشروع و جائز نہ ہو۔

جبکہ مرشد الحیران میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

البيع الباطل هو ما أورث خللاً في ركن البيع أو في محله.^(۲)

^(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۳۰ (المادة ۱۱۰)

^(۲) مرشد الحیران إلى معرفة أحوال الإنسان، ص: ۵۴ (مادة ۳۳۹)

بیع باطل وہ بیع ہے جس کے رکن یا محل میں خلل پیدا ہو جائے۔

۲۔ حکم شرعی:

بیع باطل کا حکم یہ ہے کہ یہ بیع شریعت کی نظر میں بالکل غیر معتبر اور ناجائز ہے۔ اس طرح کا وجود میں آنے والا معاملہ کالعدم ہوتا ہے، لہذا اس کی وجہ سے خریدار خریدی ہوئی چیز کا مالک نہیں بنتا، نہ اُسے اپنے استعمال میں لاسکتا ہے اور نہ ہی آگے فروخت کر سکتا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اسی طرح فروخت کنندہ بھی نیچکی ہوئی چیز کے بدلے ملنے والی رقم کا مالک نہیں بنتا ہے۔ ایسے معاملے کو فوراً ختم کرنا ضروری ہے۔

إذا وقع البیع باطلاً فلا ینعقد أصلاً وإذا قبض المشتري المبیع فلا یكون مالکاً له وإن هلك فی یدہ ضمن مثله إن وجد أو قیمته. (۱)

جب بیع باطل ہو جائے تو وہ اصلاً ہی منعقد نہ ہوگی، اور جب خریدار، خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کرے گا تو وہ اس کا مالک نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر وہ چیز اس کے پاس ضائع ہوگئی تو اگر اس کی مثل ملتی ہے تو مثل واپس کرے گا، ورنہ اس کی قیمت ادا کرے گا۔

۳۔ بیع باطل کی اقسام:

بیع باطل کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کے تحت چند صورتیں ہیں:

پہلی قسم: رکن بیع میں خلل

معاملہ کرنے والوں کے ایجاب و قبول (offer and acceptance) میں کوئی خرابی پائی جائے، جس

کی وجہ سے عقد باطل قرار دیا جائے۔ اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱۔ عدم اہلیت: معاملہ کرنے والے دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک مجنون ہو یا ناسمجھ بچہ ہو۔

۲۔ تعلیق: بیع کو کسی شرط پر معلق کیا جائے۔ مثلاً یوں کہے کہ اگر فلاں آدمی آیا تو میں نے یہ چیز آپ کو بیچ دی یا

آپ سے خرید لی۔ یا یوں کہے کہ اگر مجھے آج یا کل تنخواہ مل گئی تو یہ چیز میں نے آپ سے خرید لی۔ بیع کو کسی شرط پر معلق کرنا درست نہیں ہے۔

۳۔ اضافت: بیع کو مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف منسوب کیا جائے۔ مثلاً یوں کہے کہ یہ چیز میں نے آپ کو آنے

والے جمعہ کو بیچ دی۔ یا یوں کہہ دے کہ یہ چیز میں نے آپ سے آنے والی دس تاریخ کو خرید لی۔ یہ جائز نہیں ہے، البتہ

(۱) حوالہ بالا، ص: ۵۴ (مادة ۳۲۸)

صرف وعدہ کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ عدم تعدد: ایک ہی شخص خریدار بھی ہو اور فروخت کنندہ بھی ہو تو یہ بیع باطل ہے۔ مثلاً زید نے عمر کو اپنی کوئی چیز بیچنے کے لیے وکیل بنا دیا۔ عمر نے وہ چیز اپنے آپ کو ہی بیچ دی تو یہ بیع باطل ہے۔

۵۔ عدم موافقت: ایجاب (پیشکش) کے بعد دوسرے فریق کا قبول، ایجاب کے موافق نہ ہو۔ مثلاً ایک فریق نے کہا کہ میں نے یہ چیز آپ کو سو روپے کے بدلے فروخت کی، دوسرا فریق کہے کہ میں نے یہ چیز آپ سے دس دینار میں خرید لی، یہ بیع منقذ نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر ایک فریق ایجاب کر لے اور دوسرا فریق وہاں سے چلے جانے کے بعد قبول کرے یا پہلا فریق اپنے ایجاب سے رجوع کر لے اور دوسرا فریق اس کے بعد قبول کر لے تو یہ بیع بھی منقذ نہ ہوگی۔

دوسری قسم: محل بیع میں خلل

وہ بیع جس میں کسی ایسی چیز کی خرید و فروخت کی جائے جو شریعت کی نظر میں قیمت والی چیز نہیں ہے۔ یا ثمن (قیمت) میں اس طرح کی چیز ادا کی جائے جو شریعت کی نظر میں قیمت والی نہیں ہے۔ اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱۔ عدم مال: شراب، خنزیر، مردار، ہنہ والا خون اور آزاد آدمی کو بیچنا شرعاً بیع باطل اور غیر معتبر ہے۔ اس صورت کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ جو چیز بیچی جا رہی ہے وہ مقوم نہ ہو، یعنی شریعت کی نظر میں یا عرف میں اس چیز کی کوئی بھی قیمت نہ ہو۔

۲۔ معدوم: کسی معدوم چیز کو بیچنا۔ مثلاً کسی باغ میں ابھی پھل بالکل ظاہر ہی نہیں ہوئے اور ان کو کسی پر فروخت کیا جائے۔ یا کسی جانور کے پیٹ میں موجود بچے کو پیدائش سے پہلے فروخت کرنا، وغیرہ۔

۳۔ غیر مملوک: ایسی چیز کو فروخت کرنا جس کا بیچنے والا ابھی تک مالک ہی نہیں بنا۔ جیسے ہوا میں اڑنے والے پرندے کو پکڑنے سے پہلے بیچنا۔ یا پانی میں موجود مچھلی کو پکڑنے سے پہلے بیچنا، وغیرہ۔

۴۔ اوصاف / توابع: جانور کی تھن میں موجود دودھ اور پشت پر موجود اون کو نکالنے سے پہلے بیچنا۔

۵۔ خلاف جنس: عقد اور ایجاب و قبول میں ایک چیز کا نام لے کر اسے بیچا جائے، لیکن حقیقت میں جو چیز خریدار کے سامنے ہو وہ مختلف ہو اور اس کی جنس بالکل الگ ہو۔ مثلاً فروخت کنندہ کہے کہ میں نے آپ کو یہ یا قوت ایک ہزار روپے کے بدلے بیچ دیا، جبکہ حقیقت میں وہ یا قوت نہ ہو، بلکہ کالج کا ٹکڑا ہو۔ یا یوں کہے کہ میں نے یہ ریشم کا کپڑا آپ کو بیچا، جبکہ وہ کٹن وغیرہ کا کپڑا تھا تو یہ بیع باطل ہے۔ البتہ اگر کپڑے کی جنس تو وہی ہو، لیکن صرف بناوٹ اور ڈیزائن میں فرق ہو تو یہ بیع درست ہے، لیکن خریدار کو بیع ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

تیسری قسم: صحیح و باطل کا اجتماع

ایک ہی عقد میں دو ایسی چیزوں کو ملا کر فروخت کیا جائے جن میں سے ایک کی بیع شریعت کی نظر میں درست ہو اور دوسری چیز کی بیع درست نہ ہو۔ اس معاملے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ دونوں چیزوں میں سے جس چیز کی بیع شریعت کی نظر میں درست نہیں ہے، اس کی وجہ اس کا غیر معلوم ہونا ہو، جیسے گھوڑی کا حمل۔ یا معدوم ہونے کی وجہ سے درست نہ ہو تو ایسی صورت میں بیعتی جانے والی دونوں چیزوں (جائز و ناجائز) کی بیع باطل ہو جائے گی۔

۲۔ جن دو چیزوں کو ملا کر فروخت کیا جا رہا ہے وہ دونوں موجود بھی ہوں اور معلوم و متعین بھی ہوں، لیکن اس کے باوجود ان میں سے ایک چیز کی بیع درست ہو اور دوسری چیز کی بیع شریعت کی نظر میں درست نہ ہو تو اس کی بھی مزید دو صورتیں بن سکتی ہیں:

الف۔ اس ایک چیز کی بیع کے درست نہ ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہو، جیسے آزاد انسان کو فروخت کرنا یا مردار یا خنزیر کو بیچنا وغیرہ۔ اس طرح کی چیز کو اگر دوسری جائز و حلال چیز (مثلاً مذبوہ بکری وغیرہ) کے ساتھ ملا کر بیچا جائے تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے:

اس صورت میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ دونوں چیزوں کی بیع درست نہیں ہوگی، خواہ دونوں کی قیمت الگ الگ بتائی ہو یا دونوں کی ایک ہی قیمت بتائی ہو، کیونکہ معاملہ ایک ہی ہے، محض الگ الگ قیمت بتانے سے عقد و معاملے دو نہیں ہوئے، لہذا جب ایک چیز کی بیع درست نہیں ہے تو دوسری چیز کی بھی درست نہ ہوگی، ورنہ ”تفریق الصفقة قبل التمام“ لازم آئے گا۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ اس صورت کے اندر اگر دونوں کے لیے ایک ہی قیمت طے کی جائے تو دونوں کی بیع باطل ہو جائے گی، البتہ اگر دونوں چیزوں کی قیمت الگ الگ مقرر کی جائے تو حلال چیز کی بیع درست ہو جائے گی اور دوسری چیز (جس کی بیع شرعاً درست نہیں ہے اس) کی بیع باطل ہو جائے گی، کیونکہ الگ الگ قیمت ذکر کرنے سے دونوں چیزوں کے عقد بھی الگ الگ ہو گئے، لہذا ایک چیز کے عقد کے خراب ہونے سے دوسری چیز کا عقد خراب نہ ہوگا اور یہ ”تفریق الصفقة قبل التمام“ بھی نہیں ہے۔

ب۔ دو ایسی چیزوں کو ملا کر بیچا جائے جن میں سے ایک کی بیع تو درست ہو، لیکن دوسری چیز کی بیع کے درست ہونے میں علماء کا اختلاف ہو۔ جیسے وقف شدہ چیز کی بیع یا جس جانور پر ذبح کے وقت جان بوجھ کر بسم اللہ نہ پڑھی گئی ہو اس

کی بیع وغیرہ۔ یا جس چیز کی بیع درست نہیں ہے، اس کے صحیح ہونے کا امکان ہو، مثلاً مالک کی اجازت کے بغیر اس کی چیز کو اپنی چیز کے ساتھ ملا کر بیچنا، اگر مالک نے اجازت دے دی تو اس کی بیع درست ہو سکتی ہے، یا ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے ہاں اس کی بیع کی گنجائش ہو، جیسے مدبر اور مکاتب وغیرہ کی بیع، قاضی کی اجازت سے اس کی بیع درست ہو سکتی ہے۔

اس صورت میں جس چیز کی بیع درست ہے اس کی بیع درست ہو جائے گی، دوسری چیز کی بیع مالک یا قاضی کی اجازت پر موقوف رہے گی۔

صاحبین کے ہاں تو دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن امام ابو حنیفہ کے ہاں دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں جس چیز کی بیع درست نہیں تھی، اس کے صحیح ہونے کا سرے سے امکان ہی نہیں تھا، اس لیے وہ ابتداء سے ہی عقد میں داخل نہیں تھی، اور عقد و چیزوں پر ہوا تھا تو اس میں بیع کو قبول کرنے کے لیے غیر بیع کو قبول کرنا ضروری ہوا جو کہ درست نہیں ہے۔ اسی کو ”بیع بالحصہ ابتداء“ کہتے ہیں۔ دوسری صورت میں جس چیز کی بیع درست نہیں ہے، وہ ایسی چیز ہے جس کی بیع کی صحت کا امکان ہے، اس لیے وہ ابتداء سے عقد میں داخل ہے، بعد میں اگر مالک نے یا قاضی نے اجازت دے دی تو دونوں کی بیع درست ہو جائے گی، ورنہ ایک چیز کو عقد سے نکال دیا جائے گا، لیکن دوسری چیز میں عقد اسی طرح درست ہی رہے گا۔ اسی کو ”بیع بالحصہ بقاء“ کہتے ہیں۔^(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر موجود وغیر موجود چیز کو ملا کر بیچا جائے یا معلوم وغیر معلوم کو ملا کر بیچا جائے تو دونوں کی بیع باطل ہے۔ اگر جائز چیز کے ساتھ ایسی چیز کو ملا کر بیچا جائے جس کی بیع کے صحیح ہونے کا امکان ہی نہ ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض کے ہاں دونوں چیزوں کی بیع باطل ہوگی اور بعض کے ہاں صرف جائز چیز کی بھی درست ہوگی۔ اگر جائز چیز کے ساتھ ایسی چیز کو ملا کر بیچا جائے جس کی بیع کے صحیح ہونے کا امکان ہے تو اس میں جائز چیز کی بیع صحیح اور دوسری چیز کی بیع موقوف ہوگی۔

۲۔ بیع فاسد کا تعارف و احکام (Irregular Sale)

بیع فاسد کے مباحث کو درج ذیل پانچ نکات میں بیان کیا جائے گا:

۱۔ بیع فاسد کا مفہوم

۲۔ بیع فاسد کے اسباب

۳۔ بیع فاسد کا شرعی حکم

۴۔ چیز واپسی کے قابل نہ رہے

۵۔ چیز میں نقصان ہو جائے

^(۱) بیع باطل کے احکام کی مزید تفصیل کے لیے ”فقہ البیوع“ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ بیع فاسد کا مفہوم:

وہ بیع ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے تو درست ہوتی ہے، لیکن کسی خارجی خرابی کی وجہ سے یہ بیع شریعت کی نظر میں ناجائز ہوتی ہے اور اسے ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے اعتبار سے درست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بیع کے رکن و محل میں کوئی خرابی نہ ہو، یعنی معاملہ کرنے والوں میں اہلیت بھی ہو، ایجاب و قبول میں بھی کوئی خرابی نہ ہو، بیعی جانے والی چیز اور قیمت بھی مال اور قیمت والی چیز ہو، اور وہ فروخت کنندہ کی ملکیت میں بھی ہو، لیکن ان کے علاوہ کوئی شرعی خرابی پائی جائے، مثلاً بیع میں کوئی خلاف شرع شرط لگانا وغیرہ۔

الْبَيْعُ الْفَاسِدُ: هُوَ الْمَشْرُوعُ أَصْلًا، لَا وَضْعًا يَعْني أَنَّهُ يَكُونُ صَحِيحًا بِاعْتِبَارِ ذَاتِهِ، فَاسِدًا بِاعْتِبَارِ بَعْضِ أَوْصَافِهِ الْخَارِجَةِ.^(۱)

بیع فاسد وہ بیع ہے جو اصل میں تو درست ہو، لیکن وصف کے اعتبار سے درست نہ ہو۔ یعنی اپنی ذات کے اعتبار سے درست ہو، لیکن اپنے بعض خارجی اوصاف کی وجہ سے فاسد ہو۔
مرشد الحیران میں ہے:

البيع الفاسد هو ما أوثق خلافاً في غير الركن والمحل.^(۲)

بیع فاسد وہ ہے جو رکن و محل کے علاوہ کسی چیز میں خلل پیدا کرے۔

یہ فقہاء حنفیہ کی رائے ہے۔ جہاں تک دیگر ائمہ کی رائے کی بات ہے تو ان کے ہاں بیع باطل اور بیع فاسد میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے۔ ان کے ہاں بیع باطل و فاسد کی تعریف یہ ہے کہ: ”وہ بیع جس پر کوئی اثر و حکم مرتب نہ ہو، اور نہ اس سے حصول ملک کا فائدہ ہو۔“^(۳)

۲۔ بیع فاسد کے اسباب:

بیع کے فاسد ہونے کے درج ذیل تین اسباب ہیں:

پہلا سبب: قیمت میں خرابی

بیع فاسد کا پہلا سبب یہ ہے کہ قیمت کے بیان میں کوئی خرابی ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

^(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۳۰ (المادة ۱۰۹)

^(۲) مرشد الحیران إلى معرفة أحوال الإنسان، ص: ۵۴ (مادة ۳۳۹)

^(۳) الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/۹۸

الف۔ جہالت: قیمت کے بیان میں ایسی جہالت پائی جائے جو جھگڑے کا سبب بن سکتی ہو۔ یہ جہالت کبھی قیمت کی جنس میں ہوتی ہے کہ اس کی جنس ہی معلوم نہ ہو۔ کبھی قیمت کی صفت میں ہوتی ہے، کبھی مقدار میں اور کبھی اس کی مدت میں جہالت ہوتی ہے۔

ب۔ سکوت: کسی چیز کی قیمت کو بیان کیے بغیر خرید لینا، جبکہ اس چیز کا کوئی مارکیٹ ریٹ رائج و متعین نہ ہو یا اس چیز کی ہر اکائی کی قیمت دوسری سے مختلف ہو۔ البتہ اگر کسی چیز کو قیمت بتائے بغیر خرید لیا اور اس کی بازاری قیمت معلوم و متعین ہے تو یہ جائز ہے اور خریدار پر بازاری قیمت لازم ہوگی۔

دوسرا سبب: بیع میں خرابی

بیع فاسد کا دوسرا سبب یہ ہے کہ بیچی جانے والی چیز میں کوئی شرعی خرابی ہو۔ اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

الف۔ جہالت: بیچی جانے والی چیز میں ایسی جہالت ہو جو جھگڑے کا سبب بن سکتی ہو۔ ایسی جہالت سے عموماً بیع فاسد ہو جاتی ہے، خواہ جنس میں جہالت ہو، تعیین بیع میں ہو یا مقدار میں جہالت ہو۔

ب۔ عدم قدرت: بیچی جانے والی چیز غیر مقدور التسلیم ہو، یعنی فروخت کنندہ اپنی بیچی جانے والی چیز کو خریدار کے قبضہ میں دینے پر قادر نہ ہو۔

اگر یہ قادر نہ ہو نا اس لیے ہو کہ فروخت کنندہ اس چیز کا مالک ہی نہیں ہے تو یہ بیع باطل ہے، البتہ اگر وہ اس چیز کا مالک ہے، لیکن اس کے باوجود خریدار کو چیز دینے پر قدرت نہیں رکھتا اور اس کو بیع دیا تو یہ بیع فاسد ہے۔ مثلاً کسی کی ملکیت میں پرندے ہوں اور انہیں پکڑ کر خریدار کے حوالے کرنا فروخت کنندہ کی قدرت میں نہ ہو تو ان کی بیع، بیع فاسد ہے۔

یہی حکم پانی کی مچھلی کا بھی ہے۔ علامہ ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ پانی کے اندر موجود مچھلی کو پکڑنے سے پہلے بیچنا تین شرائط کے ساتھ جائز ہیں:

۱۔ بیچنے والی کی ملکیت میں ہو۔

۲۔ پانی صاف اور رقیق ہو کہ مچھلیاں نظر آئے، اور معلوم ہو سکے کہ مچھلیاں موجود ہیں۔

۳۔ مچھلیوں کو آسانی سے پکڑنا ممکن ہو۔^(۱)

ج۔ قبل القبض: بیچی جانے والی چیز فروخت کنندہ کی ملکیت میں تو ہو، لیکن اس کے قبضہ میں نہ ہو، ایسی چیز کو فروخت کرنا بیع فاسد ہے۔

تیسرا سبب: عقد میں خرابی

بیع کے فاسد ہونے کا تیسرا سبب یہ ہے کہ عقد میں کوئی خلاف شرع شرط لگائی جائے۔ یعنی ایسی شرط ہو کہ شریعت نے اس کی اجازت نہ دی ہو، خود عقد بھی اس کا تقاضا نہ کرے، نیز عرف میں ایسی شرط عام اور مشہور بھی نہ ہو۔ خرید و فروخت میں مندرجہ ذیل چار قسم کی شرائط میں سے کوئی شرط لگانا جائز ہے۔ ان کے علاوہ کوئی ایسی شرط لگانا جس میں خریدار یا فروخت کنندہ کا فائدہ بھی ہو، اس کی وجہ سے عقد فاسد ہو جاتا ہے، البتہ اگر ان کے علاوہ کوئی ایسی شرط لگادی جس میں کسی کا کوئی فائدہ ہی نہیں تو وہ شرط لغو ہے، اس کی وجہ سے معاملہ فاسد نہ ہوگا:

۱۔ ایسی شرط لگانا جس کی شریعت نے وضاحت کے ساتھ اجازت دی ہے۔ جیسے خیار شرط یا خیار رؤیت وغیرہ۔ یہ

جائز ہے۔

۲۔ معاملہ میں ایسی شرط لگانا بھی جائز ہے جو عقد کے تقاضا کے مطابق ہو، یعنی اگر شرط نہ بھی لگائی جاتی تو بھی اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا۔ جیسے فروخت کنندہ یہ شرط عائد کر دے کہ نقد معاملہ میں جب تک قیمت نہیں ملے گی وہ چیز نہیں دے گا۔

۳۔ ایسی شرط لگانا بھی جائز ہے جو عقد کے لیے ملائم و مناسب ہو۔ ملائم یا مناسب شرط کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شرط کی وجہ سے عقد کے موجب اور مقتضیات میں مزید پختگی پیدا ہو جائے۔ مثلاً بیع یا قیمت میں کسی صفت کی شرط لگانا کہ فلاں رنگ کی چیز ہونی چاہیے یا قیمت فلاں کرنسی میں ہونی چاہیے۔ اسی طرح یہ شرط لگانا کہ خریدار جب تک قیمت نہیں دے گا، اس وقت تک وہ فروخت کنندہ کو کوئی چیز بطور رہن دے گا یا کوئی کفیل و ذمہ دار فراہم کرے گا تاکہ اگر خریدار قیمت ادا نہ کر سکے تو اس رہن یا ذمہ دار سے قیمت وصول کی جاسکے۔ اس قسم کی شرط سے قیمت کی وصولی (عقد کے موجب) میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ جائز ہے۔

۴۔ ایسی شرط لگانا بھی جائز ہے جس کا تاجروں کے ہاں عرف ہو چکا ہو۔ جیسے آج کل قالین خریدتے ہوئے یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ فروخت کنندہ خود جا کر خریدار کے ہاں اس کی فننگ کرے گا۔ یا فرتیج اور اے سی وغیرہ کی فننگ کی شرط اور گارنٹی کی شرط وغیرہ۔^(۱)

اس تفصیل کو اصول کی شکل میں یوں لکھا جاسکتا ہے:

كل شرط ورد الشرع بجوازہ، أو یقتضیہ العقد، أو هو یلائم العقد، أو جری بہ

التعامل، فهو جائز، وإلا، فلا.

۳۔ بیع فاسد کا شرعی حکم:

ایسی خرید و فروخت اس حد تک تو معتبر ہے کہ اگر خریدار نے خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کا مالک بن جاتا ہے، لیکن اس معاملہ میں ناجائز اور خلاف شریعت بات داخل ہونے کی وجہ سے ایسے معاملے کو ختم کرنا یا اس خرابی کو ختم کرنا ضروری ہوتا ہے جس کی وجہ سے عقد فاسد ہوا ہے۔

اس حکم پر درج ذیل مسائل منطبق ہوتے ہیں:

۱۔ یہ بیع شرعاً ناجائز ہے، اسے باقی رکھنا بھی درست نہیں ہے، بلکہ اس ختم کرنا ضروری ہے، ورنہ فریقین گناہ گار ہوں گے۔

۲۔ اگر خریدار نے خریدی ہوئی چیز پر قبضہ نہیں کیا تو وہ اس کا مالک نہیں بنے گا، لہذا قبضہ سے پہلے اس کے تصرفات درست نہ ہوں گے۔ مثلاً کسی کو بیع فاسد کے ذریعے خریدی ہوئی گندم کے پینے کا حکم دینا جائز نہیں۔

۳۔ اگر خریدار نے خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کا مالک تو بن جائے گا، لیکن اس کے باوجود اس معاملے کو ختم کرنا ضروری ہے۔

۴۔ خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کر لینے سے ملکیت خبیثہ ثابت ہوتی ہے، اس لیے خریدار کے لیے ایسی چیز کو کھانا، پینا، پہننا یا اس سے کوئی دوسرا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

۵۔ اگر خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کرنے کے بعد اسے کسی اور پر فروخت کر دیا تو یہ بیع درست ہو جائے گی، کیونکہ یہ مالکانہ تصرف ہے، لیکن چیز کو آگے بیچنے سے جو نفع حاصل ہوگا، وہ پاکیزہ نہیں ہے، لہذا اسے صدقہ کرنا ضروری ہے۔

۴۔ چیز واپسی کے قابل نہ رہے:

بیع فاسد کا اصل حکم تو یہی ہے کہ فروخت کنندہ کو چیز واپس کر کے اس سے قیمت لے لی جائے، لیکن کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ خریدی ہوئی چیز واپسی کے قابل ہی نہ رہے تو ایسی صورت میں کیا حکم ہوگا؟ اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱۔ ہلاکت / ضیاع: خریدی ہوئی چیز خریدار کے پاس ضائع ہو گئی۔

۲۔ تصرف: خریدار نے خریدی ہوئی چیز میں ایسا تصرف اور عمل کر دیا جس کی وجہ سے خریدار کی ملکیت ہی ختم ہو گئی۔ مثلاً اسے بغیر کسی اختیار کے آگے بیچ دیا۔ یا کسی کو گفٹ کر کے اس کے قبضہ میں دے دیا۔ یا اسے وقف کر دیا۔ یا اس کی وصیت کر کے انتقال کر گیا۔

۳۔ اضافہ: خریدار نے خریدی ہوئی چیز میں ایسا اضافہ کر دیا جو اس کے ساتھ بالکل متصل ہو اور اس سے جہاز ہو سکے۔ مثلاً کپڑا خرید کر اُسے سلوا دیا۔ زمین خرید کر اس پر تعمیر یا شجر کاری کر دی وغیرہ۔ ان سب صورتوں کا حکم یہ ہے کہ چونکہ اب خریدی ہوئی چیز کو واپس کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے اگر بالکل اسی طرح کی چیز (مثل) بازار میں ملتی ہے تو خریدار وہ لے کر فروخت کنندہ کو دیدے اور اس سے اپنی قیمت واپس لے۔ ورنہ اس چیز کی بازاری قیمت ادا کر کے اپنی اصل قیمت (جس پر بیع فاسد، موئی تھی وہ) واپس وصول کر لے۔

۵۔ چیز میں نقصان ہو جائے:

اگر کسی نے بیع فاسد کے ذریعے کوئی چیز خریدی اور خریدار نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کے قبضہ میں اس چیز میں نقصان ہو گیا تو اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ خریدار، مبیع یا آفتِ سماویہ کا سبب:

خریدار کے عمل سے اس میں نقصان ہو جائے، مثلاً کپڑا خرید کر اُسے کاٹ دیا۔ یا خریدی ہوئی چیز ہی کے عمل سے اس میں نقصان ہو جائے، مثلاً جانور خرید اور اس کی کسی حرکت سے اس میں عیب پیدا ہو گیا۔ یا کسی آفتِ سماوی سے خریدی ہوئی چیز میں نقصان ہو جائے، مثلاً جانور خرید اور اس میں کوئی بیماری پیدا ہو گئی۔

ان سب صورتوں کا حکم یہ ہے کہ خریدار پر لازم ہے کہ خریدی ہوئی چیز فروخت کنندہ کو واپس کرے اور اس کے ساتھ نقصان بھی ادا کرے۔۔۔ فروخت کنندہ پر بھی لازم ہو گا کہ وہ اپنی چیز واپس لے اور اس میں ہونے والا نقصان بھی خریدار سے وصول کر سکتا ہے۔

۲۔ فروخت کنندہ کا سبب:

دوسری قسم یہ ہے کہ خریدی ہوئی چیز میں فروخت کنندہ کے کسی عمل سے نقصان پیدا ہو جائے۔ ایسی صورت میں فروخت کنندہ اپنی چیز کو واپس لینے والا سمجھا جائے گا اور خریدار پر کوئی نقصان وغیرہ لازم نہ ہو گا، بلکہ اسی حالت میں چیز فروخت کنندہ کو واپس کی جائے گی اور اس سے قیمت واپس وصول کر لی جائے گی۔

۳۔ اجنبی کا سبب:

خریدی ہوئی چیز میں کسی اجنبی کے عمل سے نقصان ہو جائے۔ ایسی صورت میں فروخت کنندہ کو اختیار حاصل ہو گا کہ چاہے تو خریدار سے ہی نقصان وصول کرے اور خریدار جا کر اجنبی سے نقصان وصول کر لے، یا فروخت کنندہ خود

جا کر اس اجنبی شخص سے اپنا نقصان وصول کر لے جس نے نقصان کیا ہے۔^(۱)

۳۔ بیع مکروہ کا تعارف و احکام (Disliked Sale)

بیع مکروہ کے احکام کے لیے دو امور کی تفصیل ذکر کی جائے گی:

۱۔ بیع مکروہ کا مفہوم اور حکم

۲۔ بیع مکروہ کی صورتیں

۱۔ بیع مکروہ کا مفہوم اور حکم:

ایسی بیع جو اپنی اصل کے اعتبار سے تو درست ہو، لیکن کسی خارجی وجہ سے شریعت نے اس کو ممنوع قرار دیا ہو۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی بیع منعقد تو ہو جاتی ہے، لیکن یہ مکروہ تحریمی بیع ہے۔ دونوں فریقین گناہ گار ہوں گے اور دونوں پر لازم ہے کہ اس کو ختم کریں۔ لیکن اگر اس کو برقرار رکھا تو بیع وغیرہ کو استعمال کرنا یا اس سے نفع کمانا جائز ہے۔

هو ما كان مشروعا بأصله و وصفه، لكن نهي عنه لوصف مجاور غير لازم.^(۲)

یہ وہ بیع ہے جو اپنی اصل اور وصف کے لحاظ سے درست ہو، لیکن اس کے ساتھ کسی غیر لازم وصف

کے ملنے کی وجہ سے اس سے منع کیا گیا ہو۔

۲۔ بیع مکروہ کی صورتیں:

۱۔ دوسرے مسلمان کی بیع پر بیع کرنا:

اس کو فقہی اصطلاح میں ”بیع المسلم علی بیع آخیه“ کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان ایک متعین قیمت پر اتفاق ہو گیا، اور پھر کوئی تیسرا آدمی آکر ان کا سودا خراب کر کے خریدار کو کہے کہ میں اسی طرح کی چیز تمہیں کم قیمت پر دیتا ہوں۔ یا فروخت کنندہ سے کہے کہ میں تم سے یہی چیز زیادہ قیمت پر خریدتا ہوں۔^(۳)

اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بائع (فروخت کنندہ) اپنے لیے کچھ دنوں کا اختیار رکھ لے کہ مثلاً تین دنوں کے اندر اندر اگر میں چاہوں گا تو اس معاملہ کو ختم کر دوں گا۔ اب ان تین دنوں کے اندر اندر کوئی تیسرا شخص آکر فروخت کنندہ سے کہے کہ: تم اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اس معاملہ کو ختم کر دو، میں تم سے یہ چیز زیادہ قیمت پر خرید لوں گا۔

^(۱) بیع فاسد کے احکام کا خلاصہ کچھ تبدیلی و اضافہ کے ساتھ ”فقہ البیوع“ سے ماخوذ ہے۔

^(۲) الموسوعة الفقهية الكويتية ۵۳/۹

^(۳) فتح القدیر ۱۵/۱۸۰

یاد و آدمیوں کی باہمی رضامندی سے معاملہ طے ہو جائے، اور مشتری (خریدار) کو یہ اختیار دیا گیا کہ تین دنوں کے اندر اندر اگر وہ چاہے تو اس معاملہ کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اسی دوران کوئی تیسرا آدمی آکر خریدار کو یہ کہتا ہے کہ: تم اس معاملہ کو ختم کر دو، میں اسی طرح کی چیز تمہیں کم قیمت میں دے سکتا ہوں، یا اس سے اچھی چیز اسی قیمت پر یا اس سے کم پر تمہیں دے سکتا ہوں۔^(۱)

چونکہ شریعت کا اصل قانون یہ ہے کہ ہر وہ جائز معاہدہ جو فریقین کی رضامندی سے وجود میں آیا ہو، کسی تیسرے کی مداخلت کے بغیر اپنے منطقی انجام کو پہنچے، فریقین اس معاہدہ کے مطابق عمل کرے اور دوسرے لوگ اس کا احترام کرے، اس لیے احادیث مبارکہ میں گزری ہوئی صورتوں میں تیسرے شخص کی مداخلت کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

لَا يَبِيعُ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ أَخِيهِ.^(۲)

تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے۔

۲۔ دوسرے کی بھاؤتاؤ میں مداخلت کرنا:

اس کو فقہی اصطلاح میں ”السوم على سوم أخيه“ کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دو آدمی بھاؤتاؤ کر رہے ہوں اور کسی قیمت پر اتفاق کر کے معاملہ مکمل کرنے کی طرف رغبت رکھتے ہوں کہ اسی دوران کوئی تیسرا شخص آکر اپنے لیے بھاؤتاؤ شروع کر کے ان کا معاملہ خراب کرے، زیادہ قیمت کی پیش کش کر دے یا اپنی وجاہت استعمال کر کے معاملہ کو اپنی طرف کھینچے۔^(۳)

اس کی شرعاً ممانعت آئی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرور دو عالم ﷺ نے فرمایا:

لا يسم المسلم على سوم أخيه.^(۴)

کوئی مسلمان اپنے بھائی کے مول بھاؤتاؤ پر اپنا مول بھاؤتاؤ نہ کرے۔

سابقہ دونوں معاملات جمہور علماء کے ہاں ممنوع ہیں، بعض کے ہاں مکروہ اور بعض کے ہاں حرام، لیکن اگر کسی

^(۱) الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۱۴/۹

^(۲) صحيح البخاري ص: ۱۵۹، حديث نمبر: ۲۱۶۵

^(۳) فقه المعاملات ۷۷/۱

^(۴) صحيح مسلم ۱۰۲۳/۲، حديث نمبر: ۱۴۱۳

نے ایسا معاملہ کر لیا تو گناہ تو ہوگا، لیکن معاملہ منعقد ہو جائے گا۔

۳۔ اذانِ جمعہ کے بعد خرید و فروخت:

جمعہ کی پہلی اذان کے بعد خرید و فروخت کا ایسا معاملہ کرنا جو سعی میں خلل انداز ہو، شرعاً ممنوع ہے، کیونکہ سعی واجب ہے اور ترک واجب شرعاً ممنوع اور حرام ہے، البتہ اگر کسی معاملہ کی وجہ سے سعی میں خلل نہ پڑے تو جائز ہے، مثلاً: مسجد کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کوئی معاملہ کیا جائے۔^(۱) پہلی اذان کا مطلب محلہ کی مسجد کی اذان ہے، جس میں انسان نماز جمعہ پڑھتا ہے۔

البتہ ”مضطر“ کو شرعاً اجازت دی گئی ہے، یعنی اگر کسی کو کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کی ایسی سخت ضرورت پیش آجائے جس کے بغیر اس کی جان جانے یا کسی عضو کے تلف ہو جانے یا سخت قسم کی بیماری میں مبتلا ہونے یا بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کو اپنی ضرورت کی چیز خریدنے کی اجازت دی گئی ہے، اگرچہ جمعہ کی اذان ہو چکی ہو، اور دوسرا شخص جو ایسے مجبور کے ساتھ معاملہ کرتا ہے وہ بھی گناہ گار نہیں ہوگا، بلکہ ایسی اضطراری کیفیت میں اگر اس مجبور کی ضرورت کسی اور جگہ سے پوری نہیں ہو سکتی تو دوسرے شخص پر لازم ہے کہ اس کی ضرورت پوری کرے۔

اسی طرح فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ اذانِ جمعہ کے بعد بیع و شراء کا معاملہ کرنا ان لوگوں کے لیے ممنوع ہے جن پر نمازِ جمعہ واجب ہو۔ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ بائع (فروخت کرنے والے) اور مشتری (خریدنے والے) دونوں میں سے ہر ایک پر نمازِ جمعہ کی ادائیگی واجب ہو۔

۲۔ یادوں میں سے کسی ایک پر واجب ہو اور دوسرے پر واجب نہ ہو، یعنی ایک مسافر ہو یا شہر کے مضافات سے باہر کے دیہات سے تعلق رکھتا ہو۔

۳۔ جمعہ کی ادائیگی تو دونوں پر واجب ہو مگر ایک نے نمازِ جمعہ ادا کر لی ہو اور دوسرے نے (جس پر جمعہ واجب ہے) ابھی تک جمعہ ادا نہیں کیا۔

ان تینوں صورتوں میں ان کا آپس میں یہ معاملہ کرنا جائز نہیں، کیونکہ پہلی صورت میں چونکہ بائع اور مشتری دونوں پر جمعہ واجب ہے تو ان پر سعی بھی واجب ہے، اور ان کا اس طرح معاملہ کرنا کہ جس سے سعی میں خلل پڑے، شرعاً جائز نہیں ہے۔

۱۰۔ یہی صورت میں ایک جمعہ آدمی نے جمعہ کی ادائیگی واجب نہیں ہے، لیکن دوسرے آدمی کو جمعہ کی ادائیگی واجب ہے اور اس نے اتنی تک جمعہ ادا نہیں کیا، لہذا اگر یہ دونوں کوئی ایسا معاملہ کرتے ہیں جس سے دوسرے کی سعی میں خلل واقع ہو رہا ہے تو یہ جائز نہیں۔ لیکن پہلے آدمی کے معاملہ کرنے میں اگرچہ یہ خرابی تو نہیں پائی جارہی، لیکن وہ دوسرے آدمی کے سعی میں رکاوٹ اور خلل پیدا کر رہا ہے، یعنی اس رکاوٹ کے لیے سبب بن رہا ہے، اور کسی ناجائز امر کے لیے سبب بننا بھی ناجائز ہے، لہذا اس کا ایسے شخص کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔

تیسری صورت کا بھی یہی حکم ہے کہ ایک نے تو جمعہ ادا کر لیا ہے، لیکن وہ دوسرے کی سعی میں خلل اور رکاوٹ ڈال رہا ہے، اس لیے یہ بھی جائز نہیں ہے۔

البتہ اگر فروخت کنندہ اور خریدار میں سے کسی ایک پر بھی جمعہ کی ادائیگی واجب نہ ہو، یا دونوں نے نماز جمعہ ادا کر لی ہو اور کوئی اور شرعی خرابی بھی نہ ہو، تو اذان جمعہ کے بعد ان کا آپس میں معاملہ کرنا فی نفسہ جائز ہے، کیونکہ جمعہ کی اذان کے بعد معاملہ کرنا اسلماً تو جائز تھا، مگر ایک خارجی مانع اور عارض کی وجہ سے اسے ممنوع قرار دیا گیا، اور وہ عارض ”سعی میں خلل“ کا واقع ہونا ہے، لہذا جس صورت میں یہ مانع نہ پایا جائے وہاں اصل حکم لوٹ آئے گا اور معاملہ جائز ہو جائے گا، البتہ پسندیدہ پھر بھی نہیں ہے، بہتر یہ کہ نماز جمعہ کے بعد ہی خرید و فروخت وغیرہ معاملات شروع کرنے چاہیے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ حکم صرف معاملات کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اذان جمعہ کے بعد ہر وہ کام شرعاً ممنوع ہے جس کی وجہ سے سعی میں رکاوٹ بن رہی ہو۔ اسی طرح فقہاء کرام نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ جمعہ کے دن سعی سے سبکدوش ہونے کے بعد اور نماز جمعہ کی ادائیگی سے قبل مسجد کے آس پاس یا مسجد کے دروازے پر خرید و فروخت کرنا بھی ممنوع اور گناہ ہے۔

۱۱۔ نجش (False Bidding)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص سلمان خریدنا نہیں چاہتا، لیکن اس کی قیمت بڑھا کر بولتا ہے تاکہ دوسرا شخص دھوکہ کھنا کر اس چیز کو منگے داموں خرید لے۔

احادیث میں اس سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن ابن عمر - رضی اللہ عنہما - أن رسول الله - ﷺ - نهى عن النجش. (۱)

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ”نجش“ (نمائشی خریدار بن کر دوسروں کو دھوکہ

دینے کے لیے کسی چیز کی قیمت میں اضافہ کرنے) سے منع فرمایا ہے۔

اس پر تمام علماء کا اجماع ہے کہ نجش کا یہ عمل ناجائز ہے، اگر فروخت کنندہ نے ہی کسی کو اس کام کے لیے مقرر کر لیا تو اس نمائشی خریدار سمیت فروخت کنندہ بھی گناہ گار ہوگا، اور اگر فروخت کنندہ نے اُسے اس کام کے لیے مقرر نہیں کیا تو پھر صرف یہ نمائشی خریدار ہی گناہ گار ہوگا۔ البتہ اگر کوئی دیکھے کہ مثلاً لوگ زید کو دھوکہ دے کر اُس کا سامان بہت ہی سستے داموں خرید رہے ہیں تو ایسی صورت میں اگر کوئی نمائشی خریدار بن کر زید کے سامان میں اتنا اضافہ کرے کہ اس کا سامان اپنی اصلی قیمت میں فروخت ہو تو یہ جائز، بلکہ مستحسن اور نیکی ہے۔^(۱)

نجش کی صورت میں حنفیہ اور شافعیہ کے ہاں یہ بیع مکروہ ہونے کے باوجود منعقد ہو جائے گی۔ البتہ مالکیہ اور حنابلہ کے ہاں یہ بیع باطل ہے۔^(۲)

۵۔ تلقی رکبان یا تلقی جلب:

اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی تاجر شہر کے باہر سے سامان تجارت فروخت کرنے کے لیے شہر کے اندر لا رہا ہے، تو دوسرا آدمی شہر کے باہر جا کر اُس کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُس کے ساتھ ملاقات کر کے وہ سامان اُس سے خرید لے۔ سرور دو عالم ﷺ نے اس کو منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله -ﷺ- أن يتلقى الجلب.^(۳)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: سرور دو عالم ﷺ نے آنے والے قافلوں سے باہر ہی ملاقات کرنے سے منع فرمایا ہے۔

فقہاء کرام نے اس ممانعت کی دو وجوہات تحریر فرمائی ہیں:

الف۔ ”غرر“ یعنی باہر سے آنے والے تاجروں کو ضرر اور نقصان سے بچانے کے لیے اس قسم کے معاملہ کو منع کیا گیا ہے، لہذا باہر سے آنے والے تاجروں کو قیمت وغیرہ کے سلسلے میں دھوکہ دہی کو منع فرمایا ہے۔

ب۔ ”ضرر“ یعنی شہر کے لوگوں کو ضرر اور تکلیف سے بچانے کے لیے اس کو منع کیا گیا ہے، لہذا باہر جا کر تاجروں سے چیز خرید کر اس کا اجارہ دار بننا اور ذخیرہ اندوزی کر کے شہر میں مہنگے دام پر فروخت کرنا ممنوع ہے۔^(۴)

^(۱) الدر المختار وحاشیة ابن عابدین ۱/۵

^(۲) فقہ البیوع ۲/۲۰۴

^(۳) صحیح مسلم ۳/۱۱۵۷، حدیث نمبر: ۱۵۱۹

^(۴) الدر المختار وحاشیة ابن عابدین ۱/۵

اس کے برخلاف اگر باہر سے آنے والا تاجر خود شہر کے اندر جا کر اپنا مال فروخت کرتا تو اس صورت میں نہ تاجر کو نقصان اٹھانا پڑتا اور نہ لوگوں کو، کیونکہ ایسی صورت میں اُس کے لیے شہر کا نرخ معلوم کرنا بھی آسان ہو جاتا اور اسی ایک آدمی کی اجارہ داری قائم نہ ہوتی، بلکہ کئی لوگ اُس سے یہ سامان خرید کر اُس کو آگے فروخت کرنے کی کوشش کرتے، جس کے نتیجے میں عام لوگوں کو وہ چیز سستے داموں میں مل جاتی۔

فقہاء حنفیہؒ کے ہاں اس معاملہ کی ممانعت ان دونوں علتوں (غرر اور ضرر) سے بندھی ہوئی ہے، لہذا جس جگہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ پائی جائے، وہاں اس طرح شہر سے باہر جا کر آنے والے تاجروں کے ساتھ یہ معاملہ کرنا جائز ہے، مثلاً: کوئی شخص شہر سے باہر جا کر آنے والے تاجر سے ایسا سامان خرید لے جس کی شہر میں قلت بھی نہیں اور اس کی ذخیرہ اندوزی کے باوجود اہل شہر کو ضرر بھی لاحق نہیں ہوتا، اور وہ آنے والے تاجر کو دھوکہ بھی نہیں دے رہا، تو ایسی صورت میں یہ معاملہ کرنا جائز ہے۔ اس کی مثال آج کے دور میں ایجنٹ کی ہے کہ وہ منڈی سے باہر جا کر آنے والوں سے سارا مال خرید لیتے ہیں، لہذا اگر یہ لوگ آنے والوں کو دھوکہ دے یا اس مال کی قیمت میں اتنا اضافہ کرے جس کی وجہ سے اہل شہر کو ضرر پہنچے تو ان کا یہ معاملہ کرنا جائز نہیں، البتہ اگر یہ دونوں باتیں نہ پائی جائیں تو جائز ہے۔

ہاں! یہ بات ہے کہ جن صورتوں میں یہ معاملہ جائز نہیں ہے، ان میں اگر کسی نے یہ معاملہ کر دیا تو یہ معاملہ منعقد ہو جائے گا، اور خریدنے والا اس مال کا مالک بھی بن جائے گا، لیکن حدیث کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ گناہ گار ہوگا۔ فقہاء شافعیہ اور حنبلیہ کے ہاں اگر فروخت کنندہ کو بعد میں پتہ چلا کہ بازاری قیمت زیادہ ہے اور خریدار نے مجھ سے کم قیمت میں چیزی ہے تو اس کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، جبکہ حنفیہ کے ہاں فروخت کنندہ کو یہ حق حاصل نہ ہوگا۔ البتہ فقہاء حنفیہ کے متاخرین نے اسے معاملہ ختم کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اس کی مزید تفصیل ”بخیار تفریر“ میں آئے گی۔

۶۔ بیع الحاضر للبادی:

اکثر فقہاء کرام نے اس کی صورت یہ لکھی ہے کہ دیہاتی شخص اپنا سامان، کھیت کی پیداوار یا سبزی وغیرہ فروخت کرنے کے لیے شہر لائے تو کوئی شہری ان کو یوں کہے کہ: تم خود اپنی چیز فروخت نہ کرنا، بلکہ مجھے اپنا وکیل اور ایجنٹ بنا دینا، میں تمہارے لیے یہ چیز اتنے دام میں فروخت کر لوں گا۔ حدیث میں اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔^(۱)

بعض علماء نے ”بیع الحاضر للبادی“ کی تفسیر یہ کی ہے کہ کوئی شہری اپنی چیز بیگنے دام کی خاطر صرف دیہات کے

لوگوں پر ہی فروخت کرے، جبکہ شہر میں اس چیز کی کمی اور قلت ہو، اس کے باوجود وہ شہر میں اپنی چیز فروخت نہ کرے۔ چونکہ اس عمل سے اہل شہر کو ضرر پہنچ رہا ہے، اس لیے یہ صورت بھی ممنوع ہے۔^(۱)

فقہاء حنفیہ کے ہاں اس بیع کی ممانعت بھی لوگوں کے ضرر کی وجہ سے ہے، اگر لوگوں کو اس سے ضرر نہ ہو تو پھر یہ ممنوع نہیں ہے۔ جو صورت ممنوع ہے، اس میں اگرچہ گناہ ہے، لیکن یہ معاملہ فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے ہاں منعقد ہو جائے گا، البتہ فقہاء حنابلہ کی راجح روایت کے مطابق یہ معاملہ سرے سے منعقد ہی نہ ہوگا۔^(۲)

۷۔ احتکار (Hoarding/Monopoly)

احتکار کے معنی ذخیرہ اندوزی کے آتے ہیں، یعنی اشیاء ضروریہ کو اپنے پاس روکے رکھنا، انہیں اس غرض سے فروخت نہ کرنا کہ بازار میں ان کی رسد میں قلت پیدا ہو جائے اور ان کی قیمت میں اضافہ ہو جائے۔

الإحتکَارُ لُغَةً: اِخْتِبَاسُ الشَّيْءِ اِنْتِظَارًا لِفَلَائِهِ، وَشَرْعًا: اِشْتِرَاءُ طَعَامٍ وَنَحْوِهِ وَحَبْسُهُ إِلَى الْفَلَائِ.^(۳)

احتکار کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو مہنگا ہونے کے انتظار میں روکنا۔ شرعی اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کھانے کی اشیاء یا اس جیسی ضرورت کی دیگر اشیاء کو خرید کر اپنے پاس ذخیرہ کرنا روکنا تاکہ وہ مہنگی ہو جائے۔

اس سے احادیث میں منع کیا گیا ہے اور ذخیرہ کرنے والے پر لعنت کی گئی ہے۔

المحتکر ملعون.^(۴)

ذخیرہ اندوزی کرنے والے پر لعنت۔

اکثر فقہاء نے صرف کھانے، پینے کی چیزوں میں ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیا ہے، لیکن فقہاء مالکیہ اور امام ابو یوسف کے ہاں ہر اس چیز میں ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے، جس سے اہل شہر کو تکلیف و ضرر ہو۔ یہی قول راجح ہے۔

فقہاء حنابلہ، شافعیہ اور بعض حنفیہ کے ہاں ذخیرہ اندوزی اس وقت ممنوع ہے جب اسی شہر سے خرید کر وہاں

(۱) الہدایۃ ۵۲/۳

(۲) فقہ البیوع ۹۵۸/۲

(۳) حاشیۃ ابن عابدین ۳۹۸/۶

(۴) سنن ابن ماجہ ۷۲۸/۲، حدیث نمبر: ۲۱۵۳

ذخیرہ اندوزی کی جائے۔ اگر کسی نے خریدنا نہیں، بلکہ اپنی زمین کی فصل وغیرہ ہے یا اسی شہر سے نہیں خریدا، بلکہ کسی دوسرے شہر سے خریدا ہے تو پھر ذخیرہ اندوزی ممنوع نہیں ہے۔ لیکن علامہ ابن رشد اور امام ابو یوسف کے ہاں ان صورتوں میں بھی ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے۔ یہی راجح ہے۔^(۱)

بیوع کی آنے والی اقسام میں زیادہ تفصیلات نہیں ہیں، اس لیے ان کا صرف تعارف اور حکم شرعی مختصراً بیان کیا

جائے گا۔

۳۔ بیع الحصاة

حصاة، کنکر کو کہتے ہیں۔ فقہ حنفی میں اس کی دو تعریفات کی گئی ہیں:

۱۔ خریدار اور فروخت کنندہ آپس میں بھاؤ کر رہے ہوں، اسی دوران خریدار نے چیز پر پتھر رکھ دیا، جس کی وجہ

سے اب اس چیز کی بیع لازم قرار دی جائے گی۔^(۲)

۲۔ خریدار اور فروخت کنندہ بھاؤ کر رہے ہوں، وہاں بہت ساری چیزیں موجود ہوں۔ خریدار اس شرط کے ساتھ

پتھر پھینک دے کہ جس چیز پر پتھر لگ جائے گا، اس کی بیع لازم ہو جائے گی۔^(۳)

دوسری صورت کو ”بیع بالقاء الحجر“ بھی کہتے ہیں۔

بیع إلقاء الحجر: هو أن يرمي أحد العاقدین أمتعة الآخر بحجر فما أصابه

الحجر فقد وقع عليه البيع.^(۴)

بیع بالقاء الحجر یہ ہے کہ عقد کرنے والوں میں سے کوئی ایک دوسرے کی چیز کو پتھر مارے، جس چیز

کو پتھر لگ جائے، اسی پر بیع ہو جائے۔

یہ زمانہ جاہلیت کی ایک بیع تھی، چونکہ اس میں دوسرے فریق کی رضامندی کا خیال نہیں رکھا جاتا، اس لیے

اسلام نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بیع الحصاة اور غرر سے

منع فرمایا ہے۔^(۵)

^(۱) فقہ البیوع ۹۶۲/۲

^(۲) الهدایة فی شرح بدایة المبتدی ۲۵/۳

^(۳) فتح القدیر شرح الهدایة ۵۵/۶

^(۴) درر الحکام فی شرح مجلة الأحکام ۱۸۷/۱

^(۵) صحیح مسلم. حدیث نمبر: ۳۶۹۱

۵۔ بیع الملامہ

لامسہ کا مطلب ہے چھونا۔ اس بیع کا مفہوم بھی مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے اس کے تین مطالب بیان کیے ہیں:

۱۔ آپ نے امام شافعیؒ کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا مطلب ہے کوئی بیچنے والا شخص لپٹا ہوا کپڑا لے آئے یا ناندھیرے میں کپڑا لے آئے اور بولی لگانے والا اس پر بولی لگا دے تو بیچنے والا اس کو یوں کہہ دے کہ: یہ کپڑا میں آپ کو اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تمہارا اس کپڑے کو چھونا نہ دیکھنے کے قائم مقام ہو جائے گا اور جب تم بعد میں کپڑا دیکھو گے تو تمہیں کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔

۲۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ صرف چھونے کو ہی بیع قرار دیا جائے، مثلاً بیچنے والا یہ کہہ دے کہ تم نے میری جس چیز کو بھی چھوا تو وہی بیع ہے اور اس کی بیع لازم ہو جائے گی۔

۳۔ تیسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز اس شرط پر فروخت کر دے کہ اگر دوسرے فریق نے اسے چھوا تو قبول کے بغیر ہی بیع لازم ہو جائے گی اور اسے خیار مجلس حاصل نہ ہوگا۔^(۱)

سابقہ تعریفات میں سے جس کو بھی لیا جائے، ہر صورت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں بیع کو ناجائز شرط پر معلق کیا جاتا ہے اور دوسرے فریق کی رضامندی بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے احادیث میں اس کی بھی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دو معاملات سے منع فرمایا ہے: ایک ملامسہ اور دوسرا منابذہ۔^(۲)

۶۔ بیع المنابذہ

منابذہ کے لغوی معنی ہیں ایک دوسرے کو کوئی چیز پھینکنا۔ اس کی اصطلاحی تعریف یوں کہ جاتی ہے کہ معاملہ کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنی چیز دوسرے کو پھینکے اور ایک دوسرے کی چیز کو دیکھے بغیر، صرف اس پھینکنے کو ہی بیع قرار دیا جائے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

^(۱) البناية شرح الهداية ۸ / ۱۵۷

^(۲) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۳۷۷۸

وَالْمُتَابِدَةُ: أَنْ يَنْبِذَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا قَوْلَهُ إِلَى الْآخَرِ وَلَا يَنْظُرُ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا إِلَى ثَوْبِ

صَاحِبِهِ عَلَى جَعْلِ التَّنْبِذِ بِنَعَاءٍ. (۱)

منازبہ یہ ہے کہ عاقدین میں سے ہر ایک اپنا کپڑا دوسرے کی طرف پھینک دے اور کوئی ایک دوسرے کے کپڑے کی طرف نہ دیکھے، صرف کپڑا پھینکنے کو ہی بیع قرار دیا جائے۔

اس قسم کی بیع کے ناجائز ہونے پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے اور ملامتہ کے تحت جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں منازبہ کو بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

۷۔ بیع المزابنہ

مزابنہ کا لفظ ”زبن“ سے بنا ہے، جس کے معنی دفع اور دور کرنے کے آتے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں اس کی حقیقت فقہاء نے یوں بیان کی ہے:

وَالْمَزَابِنَةُ: هِيَ بَيْعُ الرُّطْبِ عَلَى النَّخْلِ بِتَمْرِ مَقْطُوعٍ مِثْلُ كَيْلِهِ تَقْدِيرًا. (۲)

مزابنہ یہ ہے کہ درخت پر لگی ہوئی کھجور کو کٹی ہوئی کھجوروں کے بدلے میں اندازے سے بیچنا۔

اس کی ممانعت پر بھی احادیث موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ سے منع فرمایا ہے۔ (۳)

اس کے ممانعت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس میں دو ہم جنس چیزوں کا اندازہ کے ساتھ تبادلہ کیا جاتا ہے، اس لیے اس میں کمی بیشی کا اندیشہ ہوتا ہے، اور دونوں جانب سے مقدار میں یقینی برابری نہ ہونے کی وجہ سے ربا (سود) کی خرابی لازم آتی ہے۔

۸۔ بیع الحاقلہ

حاقلہ کا لفظ ”حقل“ سے بنا ہے، جس کے معنی کھیت کے آتے ہیں۔ اس کے اصطلاحی مفہوم میں مختلف اقوال ہیں، تاہم راجح قول یہ ہے کہ حاقلہ اور مزابنہ کی حقیقت ایک ہی ہے، البتہ دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ مزابنہ کے عقد میں دونوں جانب سے کھجور ہوتی ہے، جبکہ حاقلہ میں دونوں جانب سے کھیتی، فصل ہوتی ہے۔ لہذا اس کی تعریف یوں کی

(۱) حاشیة ابن عابدین ۶۵/۵

(۲) حوالہ بالا ۶۵/۵

(۳) صحیح بخاری۔ حدیث نمبر: ۲۱۸۵

جاسکتی ہے کہ: کھیت میں لگی ہوئی کھیتی کو کٹی ہوئی ہم جنس فصل کے بدلے اندازے کے ساتھ بیچنا۔
علامہ کاسانی رحمہ اللہ محافلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بيع الحب في السنبل بمثل كيله من الحنطة خرصا لا يدري أهمها أكثر. ^(۱)

محافلہ یہ ہے کہ خوشہ میں لگے ہوئے دانوں کو کٹی ہوئی گندم کے بدلے اندازے سے بیچنا، جبکہ یہ معلوم نہ ہو کہ کونسی زیادہ ہے۔

محافلہ بھی شرعاً ممنوع ہے، کیونکہ مزابنہ کی طرح اس میں بھی سود کی خرابی پائی جاتی ہے۔ دوسرا اس کی ممانعت پر احادیث بھی موجود ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ اور محافلہ سے منع فرمایا ہے۔ ^(۲)

۹۔ بیع المجازفہ

مجازفہ کے معنی اندازہ لگانے کے آتے ہیں۔ اس کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ اشیاء کی خرید و فروخت اس طرح کی جائے کہ بیع کی مقدار متعین طور پر معلوم نہ ہو، بلکہ محض اندازہ کی بنیاد پر بیع کی جائے۔
مجلہ الاحکام العدلیہ میں ہے:

الْجُرَافُ وَالْمُجَازَفَةُ: بَيْعٌ مَجْمُوعٌ بِلَا تَقْدِيرٍ. ^(۳)

جراف اور مجازفہ کا مطلب ہے اشیاء کے مجموعہ کو اندازے (قول، ناپ کے بغیر) فروخت کرنا۔ جو چیز فروخت کی جا رہی ہے، اگر اس کی ذات معلوم ہے، لیکن اس کی مقدار معلوم نہیں ہے تو اس کا نام لے کر، یا اس کی طرف اشارہ کر کے اس کی ذات متعین کرنے کے بعد اسے بیچنا جائز ہے، اسی کو ”بیع المجازفہ“ کہتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کے زمانے میں لوگوں کو کھانے کی اشیاء میں بیع المجازفہ کرتے دیکھا ہے۔ ^(۴)

تاہم اس کے جواز کے لیے درج ذیل شرائط ضروری ہیں:

^(۱) بدائع الصنائع ۱۹۴/۵

^(۲) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۱۸۶

^(۳) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۳۲ (المأذة ۱۴۱)

^(۴) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۰۲۸

۱۔ بیع الجازفہ کی دونوں طرف کی چیزوں کی جنس ایک نہ ہو، ورنہ ربا اور سود کی خرابی لازم آئے گی۔ جیسا کہ مزید اور محالہ میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

۲۔ بیع سلم کے اندر اس المال کو اندازے سے دینا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کی مقدار کا یقینی طور پر معلوم ہونا ضروری ہے۔

۳۔ جس چیز کو بیجا جا رہا ہے اس کی ذات معلوم ہو، یا تو وہ نظر آرہی ہو اور اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے یا اس کا نام لے لیا جائے جس سے اس کی ذات متعین ہو جائے۔^(۱)

۱۰۔ صفقہ فی صفقہ

”صفقہ“ کے لغوی معنی ہاتھ پر ہاتھ مارنے کے آتے ہیں، بعد میں عقد اور معاملہ کو صفقہ کہا جانے لگا، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں معاملہ کرتے وقت لوگ ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے۔^(۲) احادیث میں ”بیعتان فی بیعة“ کا لفظ بھی آیا ہے۔ ان دونوں کی حقیقت کیا ہے اور کیا دونوں کا مفہوم بھی ایک ہے یا مختلف ہے؟

”بیعتان فی بیعة“ کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ ایک بیع میں دو خرید و فروخت کے معاملات کو جمع کرنا۔ اس کے مفہوم میں مختلف تشریحات ملتی ہیں^(۳)، تاہم زیادہ مشہور مفہام دو ہیں:

۱۔ ایک مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بیع کو دوسری بیع کے ساتھ مشروط کر کے عقد کرنا۔ مثلاً ایک شخص دوسرے سے کہے کہ میں تجھے اپنا یہ گھر اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تم مجھے اپنی فلاں چیز اتنی قیمت پر فروخت کرو گے۔

۲۔ دوسرا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص اپنی کوئی چیز فروخت کرتے ہوئے نقد کی صورت میں کم قیمت اور ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لگائے، لیکن کسی ایک قیمت کی تعیین کے بغیر ہی خریدار چیز لے کر روانہ ہو جائے اور اسے یہ اختیار دے دیا جائے کہ دونوں صورتوں (ادھار و نقد) میں جو صورت چاہے اختیار کر لے۔

درج بالا دونوں صورتیں شرعاً ممنوع ہیں، البتہ دوسری صورت میں اگر مجلس عقد کے اندر ہی ادھار یا نقد کو متعین کر کے عقد کر لیا جائے تو یہ درست ہے اور یہ ”بیعتان فی بیعة“ میں نہیں آئے گا۔

جہاں تک ”صفقہ فی صفقہ“ کا تعلق ہے تو بعض فقہاء نے اسے ”بیعتان فی بیعة“ کا مترادف قرار دیا

(۱) فتح القدیر ۷/۲۶

(۲) المصباح المنیر ۱/۳۴۳

(۳) دکتور زبیر مہار نے اس کی آٹھ تشریحات لکھی ہیں: قضایا فقہیہ معاصرہ فی المال والاقتصاد ص: ۱۹۳

ہے، لیکن درحقیقت دونوں میں تھوڑا فرق ہے۔ ”بیعتان فی بیعة“ میں ایک عقد میں بیع ہی کے دو معاملات جمع کیے جاتے ہیں، جبکہ ”صفقة فی صفقة“ کے اندر صرف دو معاملات کا پایا جانا کافی ہیں، خواہ دونوں معاملے بیع کے ہوں، یا ایک بیع کا ہو دوسرا بیع کے علاوہ، یا دونوں بیع کے علاوہ معاملات ہوں۔ جیسے ایک شخص دوسرے کو اپنی کوئی چیز اس شرط پر بیچے کہ تم مجھے اتنی رقم قرض دو گے یا کسی کو مکان کرایہ پر دیتے ہوئے یہی شرط لگا دی تو یہ ممنوع ہے، لیکن یہ صورتیں ”صفقة فی صفقة“ کے تحت آئیں گی، کیونکہ ایک معاہدے میں دو معاملات (خواہ دونوں معاملات بیع کے ہوں یا بیع کے علاوہ کوئی اور معاملات ہوں) کو یوں جمع کرنا کہ ایک معاملہ دوسرے کے ساتھ مشروط ہو، اگر پہلا معاملہ ہوگا تو دوسرا بھی ہوگا، ورنہ نہیں۔ یہ ”صفقة فی صفقة“ ہے۔

موسوع فقہیہ کو بیعتیہ میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

جمع صفقتین فی عقد واحد، كأن بیع بیتہ من فلان ویشتري منه دابته، علی أنه إذا وجبت هذه الصفقة الأخری، أو بیع بیتہ من فلان ویستأجر منه دابته، علی أنه إذا وجب البیع وجبت الإجارة.^(۱)

دو معاملات کو ایک عقد میں جمع کرنا۔ جیسے کوئی شخص اپنا گھر دوسرے کو اس شرط پر فروخت کرے کہ اس سے اس کا جانور بھی خریدے گا، اگر پہلا معاملہ ہوگا تو دوسرا بھی ہوگا۔ یا کسی کو اپنا گھر اس شرط پر بیچنا کہ اس سے اس کا جانور کرایہ پر لے گا، اگر بیع کا معاملہ ہوگا تو اجارہ کا معاملہ بھی ہوگا۔

حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عقد کے اندر دو معاملات جمع کرنے سے منع فرمایا ہے۔^(۲)

اقالہ (Rescission Contract)

اقالہ، بیع کی کوئی قسم نہیں ہے، بلکہ بیع کے ختم کرنے کا نام ہے، اس لیے بیوع کی اقسام کے آخر میں اس کے احکام ذکر کرنا مناسب ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل چار نکات سمجھنا کافی ہے:

۱۔ تعریف ۲۔ حکم شرعی

۳۔ اقالہ کی حقیقت ۴۔ شرائط

^(۱) الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۶۶/۹

^(۲) صحیح البخاری ۳۴۷/۱۱، حدیث نمبر: ۴۹۷۳

۱- تعریف:

اقالہ کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو ختم کرنا، زائل کر دینا۔ فقہی اصطلاح میں اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔
 سابقہ عقد کو باہمی رضامندی سے ختم کر کے اس کے آثار و احکام کو لغو کر دینا۔
 رفع العقد، والغاء حکمہ واثارہ بتراضي الطرفین.^(۱)
 کسی عقد کو اٹھا دینا، اس کے حکم اور آثار کو نثریقین کی رضامندی سے لغو کر دینا۔

۲- حکم شرعی:

اگر کوئی فریق اپنے معاملہ پر خوش نہ ہو اور معاملہ ختم کرنے کا مطالبہ کرے تو دوسرے فریق کے لیے مستحب ہے کہ اس کے مطالبہ کے مطابق معاملہ ختم کرے، لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ تاہم اقالہ کے لیے چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، جو آگے آرہی ہیں۔

۳- اقالہ کی حقیقت:

اقالہ کی حقیقت کیا ہے؟ بالفاظ دیگر جب فریقین کسی معاملہ کو باہمی رضامندی سے ختم کر دیں تو کیا اس کو نیا معاملہ سمجھا جائے گا یا صرف سابقہ معاملہ کا ختم ہونا تصور کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں:
 ۱- امام شافعی، امام احمد اور امام زفرؒ کے ہاں یہ معاملہ تمام لوگوں کے حق میں فسخ ہے۔ ایسا سمجھا جائے گا کہ جو معاملہ پہلے ہوا تھا، اب وہ فسخ اور ختم ہو گیا۔

۲- امام مالک کے ہاں اقالہ باقاعدہ نئی بیع اور نیا معاملہ ہے، لہذا اس کے لیے بھی بیع کی تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہیں، البتہ اگر بیع کھانے، پینے کی چیز ہے تو اس کو فسخ قرار دیا جائے گا۔

۳- امام محمدؒ کی رائے میں اقالہ اصلاً تو فسخ ہے، لیکن اگر اسے فسخ نہ قرار دیا جاسکے (مثلاً سابقہ قیمت میں کمی، بیشی کر دی گئی) تو اسے بیع جدید قرار دیا جائے گا۔

۴- امام ابو یوسفؒ کی رائے امام محمدؒ کی رائے کے برعکس ہے۔

۵- امام صاحبؒ کی رائے میں یہ متعاقبین کے حق میں فسخ ہے اور اجنبی کے حق میں بیع جدید ہے، اسی لیے شفع کدو بارہ شفع کا حق حاصل ہو جائے گا۔

^(۱) الموسوعة الفقهية الكويتية ۵ / ۳۲۴

یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب معاملہ کو لفظ اقالہ سے ختم کیا جائے۔ اگر کسی اور لفظ مثلاً فسخ یا ختم، یا ترک وغیرہ کے الفاظ بولے تو سب کے ہاں یہ فسخ عقد ہے اور اگر بیع کے الفاظ بولے تو یہ بیع جدید ہے۔^(۱)

۴۔ شرائط:

۱۔ سابقہ قیمت پر ہی اقالہ کیا جائے، البتہ اگر چیز میں کوئی کمی یا عیب یا نقص ہو اور تو اتنی کمی کی جاسکتی ہے۔

۲۔ بیع اور متعاقدین اقالہ کے وقت موجود ہوں۔ ثمن کا وجود ضروری نہیں، البتہ اگر ثمن بھی عین / سامان کی شکل میں ہے تو اس کا وجود بھی ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ عقد قابل فسخ ہو، نکاح، طلاق وغیرہ نہ ہو۔ اور اگر بیع صرف ہے تو دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ بھی ضروری ہے۔

۳۔ خیارات کا تعارف و احکام

(Options in Sale)

خرید و فروخت کے معاملے میں شریعت نے خریدنے والے کو کچھ اختیارات دیے ہیں۔ ان میں سے کچھ اختیارات دونوں کو حاصل ہوتے ہیں، اور کچھ صرف کسی ایک فریق کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس حصے میں ان اختیارات کا تعارف اور احکام کی تفصیل عرض کی جائے گی۔ اس موضوع کے لیے شیخ عبدالستار ابو غدہ کی کتاب ”الخيار وأثره في العقود“ بہترین ہے۔

تفصیل سے قبل ”خیارات“ کا مختصر مفہوم سمجھنا ضروری ہے:

خیارات عربی زبان میں جمع کا لفظ ہے، اس کا مفرد ”خيار“ ہے۔ اس کے لغوی معنی کسی چیز کو چھنے، منتخب کرنے اور اختیار کرنے کے آتے ہیں،۔ جہاں تک فقہی اصطلاح کی بات ہے تو عموماً فقہاء کے ہاں اس کی الگ تعریف نہیں ملتی، بلکہ خیارات کی اقسام میں سے کسی قسم کی تعرف ملتی ہے، البتہ معاصر علماء نے ”خيار“ کی تعریف یوں کی ہے:

هو حق العاقد في فسخ العقد أو امضائه، لظهور مسوغ شرعي أو بمقتضى اتفاق عقدي.^(۱)

معاملہ ختم کرنے یا جاری رکھنے کا وہ حق جو معاملہ کرنے والے کو کسی شرعی جواز کے ظہور کے وقت یا باہمی اتفاق سے طے کردہ معاہدہ کے تقاضے کے وقت ملتا ہے۔

یہ کل آٹھ اختیارات ہیں جو کہ مندرجہ ذیل دو اقسام کے تحت جمع کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ خیارات شریعیہ:

وہ خیارات جو شریعت نے فریقین کو دیے ہیں، ان کے ثبوت کے لیے کسی قسم کی شرط لگانے کی ضرورت نہیں

ہوتی۔ اس قسم کو بعض علماء نے ”الخيارات الحكمية“ کا نام بھی دیا ہے۔ ایسے اختیارات چار ہیں:

۱۔ خيار رؤیت ۲۔ خيار عیب

۳۔ خيار مغنوبون ۴۔ خيار تفریر

^(۱) الخیار وأثره في العقود، ص: ۴۳

عمیہ:

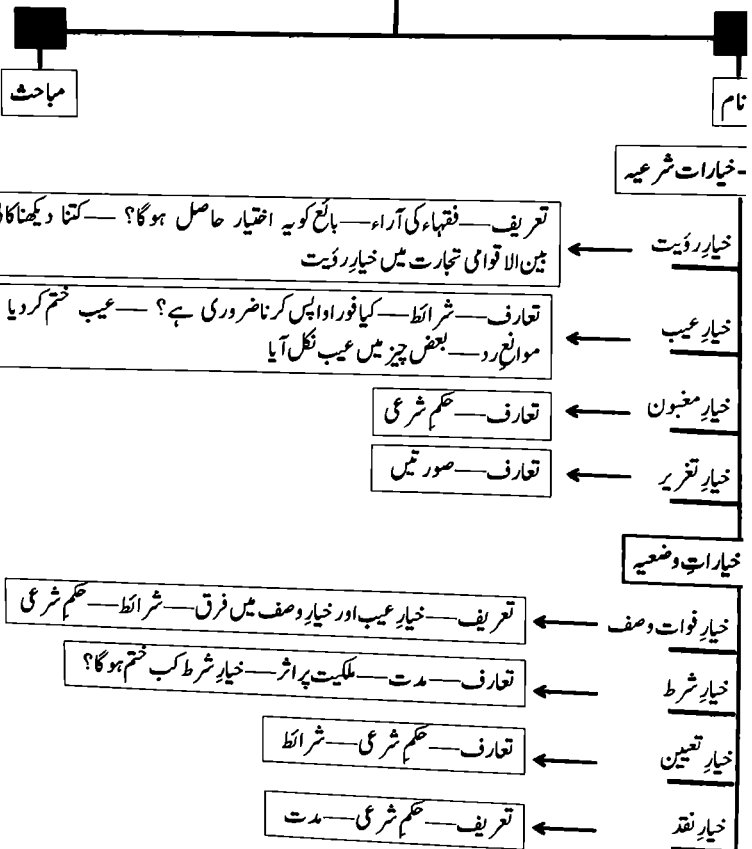
سے وہ خیارات مراد ہیں، جن کے ثبوت کے لیے باقاعدہ فریقین کا باہمی شرط لگانا اور اتفاق کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس قسم کو بعض علماء نے ”الخیارات الإیادیة“ کا نام بھی دیا ہے۔ اس قسم میں شامل ہیں:

یار فوات الوصف ۲۔ خیار شرط

خیار تعیین ۳۔ خیار نقد

میں خیارات کی آٹھ اقسام کے مباحث کا خاکہ دیا گیا ہے۔

خیارات



۱۔ خیارِ رؤیتِ شرعیہ

۱۔ خیارِ رؤیت (Option of Inspection)

خیارِ رؤیت کی تفصیلات کے لیے پانچ نکات سمجھنا ضروری ہے:

- ۱۔ خیارِ رؤیت کی تعریف
- ۲۔ فقہاء کی آراء
- ۳۔ کیا بائع کو یہ اختیار حاصل ہوگا؟
- ۴۔ کتنا دیکھنا کافی ہے؟
- ۵۔ بین الاقوامی تجارت میں خیارِ رؤیت

۱۔ خیارِ رؤیت کی تعریف:

اگر کسی نے کوئی چیز بغیر دیکھے خرید لی، بعد میں جب خریدار اس چیز کو دیکھے گا، اس وقت اسے یہ اختیار حاصل ہوگا کہ اگر چیز پسند آئے تو رکھ لے ورنہ بیچنے والے کو واپس کر دے۔ اس کو ”خیارِ رؤیت“ یعنی دیکھنے کا اختیار کہتے ہیں۔

هو حق ثبت به للمتملك الفسخ، أو الإمضاء عند رؤية محل العقد المعين الذي عقد عليه ولم يره. (۱)

یہ ایسا حق ہے جس کے ذریعے (خریدار کو) معاملہ ختم کرنے یا جاری رکھنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے جب وہ اس متعین چیز کو دیکھ لے جس پر عقد ہوا ہے اور اس نے وہ چیز پہلے دیکھی نہ ہو۔
مجله الاحکام العدلیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

مَنْ اشْتَرَى شَيْئًا وَلَمْ يَرَهُ كَانَ لَهُ الْخِيَارُ حَتَّى يَرَاهُ، فَإِذَا رَأَاهُ إِنْ شَاءَ قَبْلَهُ وَإِنْ شَاءَ فَسَخَّ الْبَيْعَ وَنَقَالَ لِهَذَا الْخِيَارُ خِيَارُ الرَّؤْيَةِ. (۲)

جس شخص نے کوئی چیز بغیر دیکھے خرید لی، جب وہ چیز دیکھے گا، اسے اختیار حاصل ہوگا، اگر چاہے تو اس معاملہ کو قبول کر لے، یا چاہے تو اس بیع کو فسخ کر دے۔ اس کو ”خیارِ رؤیت“ کہتے ہیں۔

۲۔ فقہاء کی آراء:

جن فقہاء کے ہاں غائب چیز کو بیچنا جائز نہیں ہے، ان کے ہاں خیارِ رؤیت کا تصور بھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں

فقہاء کی آراء، حسب ذیل ہیں:

(۱) الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۰ / ۶۴

(۲) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۶۴ (المأذؤ ۳۲۰)

۱۔ فقہاء شافعیہ کے ہاں غائب چیز کو بیچنا باطل ہے، خواہ صفات بیان کی گئی ہوں یا نہیں۔

۲۔ فقہاء حنابلہ اور ایک قول کے مطابق شافعیہ و مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ غائب چیز کی بیع اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس کی تمام صفات وغیرہ بیان کر دی جائیں۔ بعد میں اگر وہ چیز صفات کے مطابق ہو تو خریدار کو چیز واپس کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا، البتہ اگر صفات میں اختلاف یا کمی ہو تو واپس کر سکتا ہے۔

۳۔ فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ غائب چیز کو بیچنا بہر صورت جائز ہے، بشرطیکہ اس کی ذات معلوم ہو، خواہ نام لے کر اسے متعین کیا جائے یا اس کی طرف اشارہ کر کے یا اس کا مکان وغیرہ بیان کر کے اسے متعین کیا جائے، اگرچہ تمام صفات بیان نہ کی جائیں۔ اور خریدار جب چیز خریدے گا تو اسے بہر صورت چیز واپس کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، خواہ چیز صفات کے مطابق ہو یا نہ ہو۔^(۱)

۳۔ کیا بائع کو اختیار رویت اختیار حاصل ہوگا؟

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پہلی رائے تھی کہ فروخت کنندہ کو بھی یہ حق حاصل ہے، لیکن بعد میں انہوں نے رجوع کر لیا کہ بیچنے والے کو یہ اختیار حاصل نہیں، لہذا اگر فروخت کرنے والے نے دیکھے بغیر کوئی چیز بیچ ڈالی تو اسے دیکھنے کے بعد چیز واپس کرنے کا حق نہ ہوگا۔ یہ اختیار صرف خریدنے والے کے لیے ہے۔ دیگر ائمہ کی بھی یہی رائے ہے۔^(۲)

۳۔ کتنا دیکھنا کافی ہے؟

اگرچہ خریدار کو سامان خریدنے کے بعد دیکھنے کا اختیار ملتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تک خریدار اس چیز کو مکمل طور پر نہ دیکھے، اس کے پاس یہ اختیار رہتا ہے، بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے:

۱۔ اگر خریدار گیا سامان کئی چیزوں پر مشتمل ہے اور ہر چیز دوسری چیز سے مختلف ہے، جیسے سامان میں ایک میز ہے، دو کرسیاں ہیں، ایک ٹیبل لیپ ہے وغیرہ تو پھر ہر ایک کو دیکھنا ضروری ہے، اگر کسی ایک چیز کو بھی بغیر دیکھے خرید لیا تو خریدار کو اختیار رویت حاصل ہوگا۔

۲۔ اگر ایک ہی طرح کی کئی چیزوں کا مجموعہ ہے، مثلاً ایک ہی طرح کے سو پیکٹے ہیں یا سو کرسیاں ہیں تو کسی ایک کو دیکھنے سے یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گندم کا ڈھیر ہے یا آٹے کی بوری ہے تو بطور نمونہ اس کا کچھ حصہ چیک کر لینے سے یہ اختیار ختم ہو جائے گا۔

^(۱) فقہ البیوع ۷۸۲/۲

^(۲) بدائع الصنائع ۲۹۲/۵

اس سے معلوم ہوا کہ بعض دفعہ سودا ہونے سے پہلے نمونہ (sample) دیکھا جاتا ہے، تو نمونہ دیکھنے سے یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے، اور خریدار بعد میں ”دیکھنے کے اختیار“ کی بنیاد پر سودا ختم نہیں کر سکتا، ہاں البتہ بعد میں آنے والا سامان خریدار کی طے کردہ صفات کے مطابق نہ ہو تو اسے ”خیار عیب“ کے تحت واپس کیا جاسکتا ہے۔^(۱)

۵۔ بین الاقوامی تجارت میں خیار رویت:

اگر حنفیہ کی رائے کو لیا جائے تو دوسرے ممالک سے چیزیں برآمد کرنے والے کو بہر صورت چیز واپس کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے، خواہ منگوائی گئی چیز طے شدہ صفات کے مطابق ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں آج کل فروخت کنندہ کا ضرر ہے، کیونکہ چیز مہیا کرنا، پھر اسے ایکسپورٹ کرنا اور اتنی مدت تک انتظار کرنا کہ خریدار راضی ہو گا یا نہیں؟ یہ آج کل کی تجارت میں ایک ناقابل تحمل ضرر ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں حنابلہ کی رائے کو لینا چاہیے کہ اگر منگوائی ہوئی چیز طے شدہ صفات کے مطابق ہے تو خریدار کو بلا وجہ چیز واپس کرنے کا کوئی حق حاصل نہ ہو گا۔^(۲)

۲۔ خیار عیب (Option of Defect)

خیار عیب کے مباحث کو مندرجہ ذیل چھ نکات میں جمع کیا گیا ہے:

- ۱۔ خیار عیب کا تعارف
- ۲۔ شرائط
- ۳۔ کیا فوراً واپس کرنا ضروری ہے؟
- ۴۔ بائع نے عیب ختم کر دیا
- ۵۔ موانع رد
- ۶۔ بعض چیز میں عیب نکل آیا

۱۔ خیار عیب کا تعارف:

اصولی طور پر بیچنے والے پر شرعاً و اخلاقاً یہ لازم ہے کہ جب وہ کوئی چیز بیچ رہا ہو اور اس چیز میں کوئی عیب ہو تو خریدار کو بتادے کہ اس میں فلاں عیب ہے۔ جان بوجھ کر عیب کو چھپانا جائز نہیں، گناہ کی بات ہے۔ اگر کسی نے عیب بتائے بغیر کوئی چیز بیچ دی اور بکنے کے بعد خریدار کو پتہ چلا کہ اس میں فلاں عیب ہے تو اسے دو اختیارات حاصل ہوتے ہیں:

- ۱۔ وہ چیز واپس کر کے پوری قیمت واپس لے لے۔

- ۲۔ یا اسے اسی حال میں اپنے پاس رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے اور رکھنے کی صورت میں اگر فروخت کنندہ اپنی رضامندی و خوشی سے کچھ قیمت کم کر دے تو خریدار اتنی رقم واپس لے سکتا ہے، زبردستی کم نہیں کر سکتا۔

^(۱) بدائع الصنائع ۵/۲۹۳

^(۲) فقہ البیوع ۲/۷۸۸

خيار العيب: هو حق المشتري في فسخ العقد، لظهور عيب خفي لم يظهر للمشتري عند التعاقد. (۱)

خيار عيب: خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا وہ حق جو اسے کسی ایسے پوشیدہ عیب کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے جس کے بارے میں خریدار کو معاملہ کرتے وقت علم نہ ہو۔
مجلد الاحکام العدلیہ میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

الْبَيْعُ الْمَطْلُوقُ يَفْتَضِي سَلَامَةَ الْمَبِيعِ مِنَ الْعُيُوبِ يَعْنِي أَنَّ بَيْعَ الْمَالِ بِدُونِ الْبَرَاءَةِ مِنَ الْعُيُوبِ وَبِلا ذِكْرِ أَنَّهُ مَعِيْبٌ أَوْ سَالِمٌ يَفْتَضِي أَنْ يَكُونَ الْمَبِيعُ سَالِمًا خَالِيًا مِنَ الْعَيْبِ.

مَا بَيْعَ مُطْلَقًا إِذَا بَيْعَ وَفِيهِ عَيْبٌ قَدِيمٌ يَكُونُ الْمُشْتَرِي مُخَيَّرًا إِنْ شَاءَ رَدُّهُ وَإِنْ شَاءَ قَبْلَهُ بِتَمَنِيهِ الْمُسْتَعَى، وَلَيْسَ لَهُ أَنْ يُمَسِكَ الْمَبِيعَ وَيَأْخُذَ مَا نَقَصَهُ الْعَيْبُ وَهَذَا يُقَالُ لَهُ خِيَارُ الْعَيْبِ. (۲)

مطلق بیع کا تقاضا ہوتا ہے کہ بیع صحیح، سالم ہو۔ یعنی اگر کسی چیز کے عیب سے براءت کی شرط نہ لگائی جائے، یہ بھی ذکر نہ کیا جائے کہ اس میں عیب ہے یا صحیح ہے تو ایسی صورت میں ضروری ہے کہ بیع صحیح سالم اور ہر قسم کے عیب سے خالی ہو۔

جس چیز کو مطلقاً (بغیر کسی عیب سے براءت کی شرط کے) بیچا جائے اور اس میں کوئی پرانا عیب موجود ہو تو خریدار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اگر چاہے تو اس چیز کو واپس کر دے اور اگر چاہے تو طے شدہ قیمت پر اسے قبول کر لے۔ خریدار کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بیع کو اپنے پاس روک کر، عیب کی وجہ سے ہونے والا نقصان وصول کرے۔ اس کو خيار عیب کہتے ہیں۔

لیکن اگر خریدنے کے فوراً بعد خریدار نے کوئی ایسا عمل کر لیا جس کی وجہ سے پوری قیمت پر واپس کرنے میں دوکاندار کا نقصان ہے مثلاً کپڑا خریدا اور اسے قینچی وغیرہ سے کاٹ ڈالا، اور پھر عیب کا پتہ چلا تو ایسی صورتوں میں خریدار کو پوری قیمت پر واپس کرنے کا اختیار نہیں، البتہ عیب کی وجہ سے قیمت میں جتنی کمی آئی چاہیے اتنی قیمت واپس لے سکتا ہے۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

(۱) المعايير الشرعية، رقم المعيار: ۵۱

(۲) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۶۶ (المادة ۳۲۶) و (المادة ۳۲۷)

۲- شرائط:

خیار عیب کی بنیاد پر خریدار اس وقت چیز واپس کر سکتا ہے، جب وہاں مندرجہ ذیل شرائط موجود ہوں:

۱- عیب معتبر ہو:

خریدار کو ہر قسم کے عیب کی بنیاد پر چیز واپس کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، بلکہ عیب کا ایک خاص مفہوم ہے جس کی بنیاد پر چیز واپس کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایسا عیب جس سے کوئی بھی چیز اپنی اصل اور خلقت کے وقت خالی ہو اور اس عیب کی وجہ سے چیز کی قیمت میں تاجروں کے عرف میں کمی ہو رہی ہو۔ تاجروں کا مطلب اس چیز کی خرید و فروخت کے ماہرین ہیں۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں معتبر عیب کی تعریف یوں کی گئی ہے:

الْعَيْبُ هُوَ مَا يَنْقُصُ ثَمَنَ الْمَبِيعِ عِنْدَ التُّجَّارِ وَأَزْيَابِ الْخَيْزِرَةِ.^(۱)

عیب وہ ہے جو تجارت اور ماہرین کے ہاں بیع کی قیمت میں کمی کر دے۔

عیب معتبر کے عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

۱- نفس بیع میں عیب ہو۔

۲- عیب ایسا ہو کہ جو اس وقت بیع کے اندر پیدا ہو چکا ہو جس وقت چیز بائع کے پاس تھی۔

۳- بائع کے پاس عیب کی پیدائش کافی نہیں ہے، بلکہ خریدار کے پاس وہی عیب ظاہر ہونا بھی ضروری ہے۔

۲- خریدار کو عیب کا علم نہ ہو:

اگر خریداری کے وقت یا اس کے بعد خریدار کو عیب کا علم ہوا، اس کے باوجود اس نے چیز خرید لی یا اس پر قبضہ کر لیا تو اس کا خیار ساقط ہو جائے گا اور اسے چیز واپس کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ البتہ اگر اسے عیب کا علم تھا، لیکن یہ علم نہیں تھا کہ اس عیب کی بنیاد پر میں چیز واپس کر سکتا ہوں تو اس صورت میں اگر وہ واضح عیب تھا، جو عوام پر مخفی نہیں ہوتا تو خیار ساقط ہوگا، البتہ اگر مخفی عیب تھا، جسے ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ قابل نقصان عیب ہے تو پھر خیار ساقط نہیں ہوگا۔

۳- خریدار عیب پر راضی نہ ہو:

عیب کی بنیاد پر چیز واپس کرنے کا اختیار اس وقت ملتا ہے جب خریدار عیب والی چیز خریدنے پر راضی نہ ہو۔ اگر

خریداری کے وقت عیب سامنے ہو اور خریدار اسی حالت میں اسے لینے پر راضی ہو جائے تو بعد میں اسے یہ چیز واپس کرنے کا اختیار نہیں نہیں ملے گا، یا خریدار کو جب عیب کا علم ہو تو اس نے اس کے باوجود ایسا عمل کر لیا جو رضامندی پر دلالت کر رہا ہو تو اس کا حق ساقط ہو جائے گا، مثلاً اس نے عیب کے علم کے بعد چیز استعمال کر لی یا اسے بیچ دیا یا بیچنے کے لیے پیش کر دیا۔ تو ان صورتوں میں خریدار کا اختیار ختم ہو جائے گا۔

۴۔ بغیر عذر تاخیر نہ ہو:

خریدار کو جب چیز میں عیب کا علم ہو جائے تو وہ بغیر کسی عذر کے اتنے دنوں تک تاخیر نہ کرے، جس کو عرف میں رضامندی سمجھا جاتا ہو۔ اگر اس نے بہت زیادہ تاخیر کر دی اور معاملہ ختم نہ کیا تو اس کو رضامندی قرار دیا جائے گا۔

۵۔ عیب سے برائت کی شرط نہ لگائی ہو:

اگر فروخت کنندہ نے بیچتے وقت یہ کہہ دیا کہ ابھی خوب دیکھ لو، بعد میں کوئی عیب نکلا تو میں ذمہ دار نہیں۔ اس طرح کہنے پر بھی خریدار نے وہ چیز خرید لی تو بعد میں کتنے ہی عیب نکلیں، خریدار کو وہ چیز واپس کرنے کا اختیار نہیں۔ اگر متعین عیب سے برائت کی تھی تو اس کے پائے جانے پر چیز واپس کرنے کا حق نہ ہوگا، اس کے علاوہ کوئی عیب نکلا تو واپس کر سکتا ہے۔

یہ حنفیہ کی رائے ہے، دیگر ائمہ کے ہاں عیب سے برائت کی شرط لگانا جائز نہیں ہے۔^(۱)

۳۔ کیا فوراً واپس کرنا ضروری ہے؟

فقہاء حنفیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ جب خریدار کو یہ علم ہو جائے کہ اس چیز میں عیب ہے تو فوراً چیز واپس کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ تاخیر کے ساتھ واپس کر سکتا ہے، جب تک کوئی ایسا عمل نہ پایا جائے جو رضامندی پر دلالت کرے، ورنہ یہ اختیار ختم ہو جائے گا یا اگر اس نے اتنی تاخیر کر دی جس کو عرف میں رضامندی سمجھا جاتا ہو تو بھی خیار ساقط ہو جائے گا۔ فقہاء شافعیہ کی رائے اس کے برعکس ہے، ان کے ہاں خریدار کو عیب کا علم ہو جانے پر فوراً چیز واپس کرنا ضروری ہے، ورنہ خیار ساقط ہو جائے گا۔^(۲)

۴۔ بائع نے عیب ختم کر دیا

چیز میں عیب نکل آنے کے بعد فروخت کنندہ نے اگر اس چیز کا عیب ختم کر دیا تو کیا خریدار کو پھر بھی چیز واپس

(۱) بدائع الصنائع ۲۹۳/۵

(۲) فقہ البیوع ۸۰/۲

کرنے کا حق حاصل ہوگا یا نہیں؟ اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ فروخت کنندہ نے وہ چیز ہی بدل دی، یعنی کوئی دوسری اسی جیسی چیز خریدار کو دے دی جس میں عیب نہیں ہے۔ اس صورت میں بھی خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا، کیونکہ اس نے پہلی چیز خریدی تھی، دوسری نہیں۔ اس پر دوسری چیز لازم نہیں کی جاسکتی۔

۲۔ اگر فروخت کنندہ نے اسی چیز کی ایسی اصلاح و مرمت وغیرہ کر کے اس کا عیب ختم کر دیا جس سے چیز کی قیمت میں کمی نہ آئے، تو ایسی صورت میں اگر فریقین نے معاملہ ختم نہ کیا ہو تو خریدار کا حق خیار عیب ختم ہو جائے گا۔

۵۔ موانع رد:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چیز میں عیب نکل آنے کے بعد وہ چیز قابل واپسی نہیں ہوتی، ایسی صورت میں کیا حکم ہوگا؟ اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱۔ ہلاکت: اگر چیز میں عیب موجود ہو، پھر وہ چیز خریدار کے پاس کسی آسانی آفت سے ضائع ہو گئی تو خریدار، فروخت کنندہ سے اس چیز کے عیب کے بقدر نقصان وصول کر سکتا ہے، خواہ چیز اسی عیب سے ضائع ہوئی ہو یا کسی دوسری وجہ سے۔

۲۔ استعمال: عیب کے علم کے بعد خریدار نے اس چیز کو استعمال کر لیا۔ مثلاً کھانے کی چیز تھی، اس میں خریدار کو عیب معلوم ہوا، اس کے بعد اس نے وہ چیز کھالی۔ ایسی صورت میں خریدار کو کسی چیز کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۳۔ اگر عیب کے علم سے قبل خریدار نے چیز استعمال کر لی، اس کے بعد علم ہوا کہ اس چیز میں فلاں عیب تھا تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ خریدار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ فروخت کنندہ سے عیب کا نقصان وصول کرے۔ جبکہ صاحبین اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے ہاں خریدار کو نقصان وصول کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۴۔ اگر خریدار نے عام استعمال کے بجائے، چیز کو ویسے ہی ضائع کر دیا۔ مثلاً کھانے کی چیز کو پھینک دیا، یا جلادیا تو اب اس کو کسی قسم کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

۵۔ نیا عیب: اگر خریدار کے پاس بیع میں خود ہی نیا عیب پیدا ہو گیا، تو خریدار اس چیز کو واپس نہیں کر سکتا، البتہ پرانے عیب کا نقصان وصول کر سکتا ہے، لیکن اگر فروخت کنندہ نے کہہ دیا کہ مجھے چیز ہی دے دو تو پھر واپس کر سکتا ہے۔

۶۔ زیادہ/اضافہ: اگر خریدار کے پاس بیع میں اضافہ ہو گیا یا خریدار نے اس میں اضافہ کر دیا تو اس میں تفصیلات ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ اضافہ ”زیادۃ متصلۃ متولدة“ ہو (یعنی ایسا اضافہ ہو جو بیع کے ساتھ ملا ہوا ہو اور اسکا

یہ خریدار (Buyer) نے زوال کا وقت طے کرنا یا یہ اضافہ "برادہ" سے حاصل کیا ہے؟ (یعنی یہ اضافہ جو طے کرنے کے وقت طے ہوا ہے اور اس سے پیدا ہو گیا ہے) کیلئے کافی کا ایک وقت ہے۔ اگر وہ اس وقت سے پہلے اضافہ پیدا ہوا ہے تو اس کے لیے مانع نہیں ہے، لہذا خریدار عیب کی بنیاد پر چیز واپس لے سکتا ہے۔ اگر چیز میں یہ اضافہ ہو گیا ہے، تو اس سے پہلے اضافہ "برادہ" سے حاصل کیا ہے، لہذا خریدار چیز واپس نہیں لے سکتا، البتہ اس میں خریدار لوہا یا انسان و رسول لے جانے کا حق حاصل ہے۔ اگر یہ اضافہ "برادہ" سے حاصل کیا ہے، تو اس سے پہلے اضافہ "برادہ" سے حاصل کیا ہے، لہذا خریدار چیز واپس نہیں لے سکتا، البتہ اس میں خریدار لوہا یا انسان و رسول لے جانے کا حق حاصل ہے۔ اور نہ ہی۔

۱۔ اخراج عن الملك: اگر خریدار نے چیز آنے سے پہلے ہی یا اس کے بعد خرید کر لیا ہے، تو اس کا عیب علم ہو جانے کے بعد پہنچی ہو یا اس کے بعد ہی علم ہو گیا ہو تو خریدار کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ وہ ہائے عیب کی قیمت و رسول لے لے۔ البتہ اگر عیب کا علم نہیں تھا اور چیز بیچ دی یا اس کے بعد ہی علم ہو گیا ہے، تو اس کے بعد خریدار لے جانے کا حق حاصل ہے۔ (۱)

۲۔ بعض چیز میں عیب نکل آیا

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خریدار نے کئی چیزوں کا مجموعہ خرید لیا، اس کے بعد بعض چیزوں میں عیب ظاہر ہوا تو ایسی صورت میں کیا حکم ہو گا؟ اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

- ۱۔ تمام چیزوں کا مجموعہ ایک ہی چیز کے درجہ میں ہو۔ یعنی ایک چیز سے نفع حاصل کرنا دوسری چیز پر موقوف ہو، جیسے دو موزے، یا ایک ہی برتن کی وزنی چیزیں۔ اس صورت میں مکمل چیز واپس کرے یا رکھ لے۔ درست چیز رکھ کر خراب چیز واپس کر سکتا۔ البتہ اگر فروخت کنندہ راضی ہو تو پھر واپس کر سکتا ہے۔
- ۲۔ متعدد اشیاء ہوں، کسی ایک چیز سے نفع حاصل کرنا دوسری چیز پر موقوف نہ ہو، مثلاً دو بکریاں خریدی، ایک میں عیب نکل آیا۔ اس صورت میں صرف خراب چیز کو واپس کر سکتا ہے۔ (۲)

۳۔ خیاب مغبون (Option of De-fraud)

خیاب مغبون کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل دو بنیادی نکات کافی ہیں:

۱۔ خیاب مغبون کی تعریف

(۱) بدائع الصنائع ۵ / ۲۸۱

(۲) خیاب مغبون کی اکثر تعلیقات "فقہ الیوم" سے لی گئی ہیں۔

۲۔ حکم شرعی

۱۔ خیارِ مغبون کی تعریف:

جو شخص کسی چیز کو عام قیمت سے بہت زیادہ پر خرید لے، مثلاً سو روپے کی چیز پانچ سو روپے میں خرید لے۔ یا جو شخص کسی چیز کو عام قیمت سے بہت زیادہ کم قیمت پر بیچ دے، مثلاً پانچ سو روپے کی چیز کو سو روپے میں بیچ دے تو ایسے شخص کو ”مغبون“ کہتے ہیں۔

اس طرح کے شخص کو معاملہ ختم کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے جو آگے بیان کیا جائے گا۔ جن کے ہاں ایسے شخص کو معاملہ ختم کرنے کا حق ملتا ہے، ان کے ہاں اس کو ”خیارِ مغبون“ کہتے ہیں۔ یہاں غبن سے مراد ”غبنِ فاحش“ ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے ساتھ اتنا دھوکہ ہو جائے جس کو عموماً لوگ برداشت نہ کرے یا قیمت میں اتنی کمی یا اضافہ کیا جائے جو عموماً لوگ نہ کرتے ہوں۔

والغبن نوعان: غبن کثیر، وغبن یسیر. والغبن الکثیر ویسعی (غبننا فاحشاً) هو ما لم تجر به عادة الناس.^(۱)

غبن کی دو قسمیں ہیں: زیادہ غبن اور کم غبن۔ غبن کثیر کو ”غبنِ فاحش“ کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جو عموماً لوگوں کی عادت میں جاری نہ ہو۔

۳۔ حکم شرعی:

۱۔ اگر کوئی شخص بازار کے احوال سے واقف ہے اور مکمل بھاؤ تاؤ کر کے کوئی چیز خرید لے یا بیچ دے تو اس کے بعد اس کو اس بنیاد پر معاملہ ختم کرنے کا اختیار نہیں ہے کہ اس نے چیز عام قیمت سے بہت زیادہ مہنگی خرید لی ہے یا بہت زیادہ کم قیمت پر بیچ دی ہے۔ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

۲۔ اگر کوئی شخص بازار کے احوال سے واقف نہیں ہے اور ”مستر سل“ ہو کر چیز بہت زیادہ مہنگی خرید لی یا بہت زیادہ کم قیمت پر بیچ دی تو کیا اس شخص کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار حاصل ہو گا یا نہیں؟ مسٹر سل سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اس چیز کی قیمت سے واقف نہ ہو اور خرید و فروخت میں ماہر نہ ہو۔

فقہاء مالکیہ اور حنبلیہ کے ہاں اس کو معاملہ ختم کرنے کا حق حاصل ہے۔ مالکیہ کے ہاں یہ اختیار اسے اس وقت حاصل ہو گا جب دوسرے فریق نے جھوٹ بول کر قیمت بہت زیادہ یا بہت کم بتادی ہو۔ جبکہ فقہاء حنبلیہ کے ہاں

دوسرے فریق نے جھوٹ بولا ہو یا نہ بولا ہو، دونوں صورتوں میں اسے یہ حق حاصل ہے، بشرطیکہ اس نے چیز اتنی مہنگی خریدی ہو جس پر عموماً لوگ وہ چیز نہیں خریدتے۔ یا اتنی سستی بیچ دی ہو جس پر عموماً لوگ وہ چیز نہیں بیچتے۔
 حنفیہ اور شافعیہ کے ہاں ایسے شخص کو معاملہ ختم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ یہ اس کا اپنا قصور ہے کہ اس نے چیز کی قیمت معلوم نہیں کی اور بغیر غور و فکر بیچ دی یا خرید لی۔

متاخرین فقہاء حنفیہ نے ایک صورت میں یہ اختیار دیا ہے، وہ یہ کہ غبن کے ساتھ تغیر بھی ہو۔ یعنی دوسرے فریق نے زبان سے جھوٹ بول کر غلط قیمت بتادی، جس کی وجہ سے سامنے والے نے چیز بہت مہنگی خرید لی، یا بہت سستی بیچ دی۔ اس کی مزید تفصیل ”خیار تغیر“ میں آئے گی۔^(۱)

اسی طرح اگر فروخت کنندہ نے تدلیس (فعلی دھوکہ) سے کام لیا تو بھی خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ مثلاً کسی دکان میں ایک چیز کی کئی انواع ہیں۔ بعض اعلیٰ، بعض متوسط، بعض ادنیٰ۔ دکاندار نے ادنیٰ چیز، اعلیٰ والے خانے میں رکھ دی اور خریدار کو دھوکہ دیا کہ یہ اعلیٰ چیز ہے اور خرید لی تو اسے چیز واپس کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں لکھا ہے:

إِذَا وَجِدَ غَبْنٌ فَاجْحَشْ فِي الْبَيْعِ وَلَمْ يُوجَدْ تَغْرِيرٌ؛ فَلَيْسَ لِلْمَغْبُوتِ أَنْ يَفْسَخَ الْبَيْعَ إِلَّا أَنَّهُ إِذَا وَجَدَ الْغَبْنَ وَحْدَهُ فِي مَالِ الْيَتِيمِ لَا يَصِحُّ الْبَيْعُ وَمَالُ الْوَقْفِ وَيَبْتَ الْمَالَ حُكْمُهُ حُكْمُ مَالِ الْيَتِيمِ.^(۲)

جب بیع میں غبن فاحش (فحش دھوکہ) پایا جائے، لیکن تغیر (زبانی دھوکہ) نہ ہو تو جس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اس کو بیع ختم کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا، البتہ اگر یتیم کے مال میں غبن کے ساتھ بیع ہو جائے تو وہ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح وقف کے مال اور بیت المال کے مال کا بھی یہی حکم ہے۔

۴۔ خیار تغیر (Option of M isrepresentation)

خیار تغیر کے لیے دو نکات سمجھنا ضروری ہے:

۱۔ خیار تغیر کی تعریف

۲۔ خیار تغیر کی صورتیں

^(۱) فقہ البیوع ۲/۵۰۶

^(۲) مجلة الأحكام العدلیة، ص: ۷۰ (المأذة ۳۵۶)

۱۔ خیارِ تفریق کی تعریف:

تفریق کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایک فریق دوسرے کو زبانی طور پر دھوکہ دے دے۔ مثلاً خریدار جھوٹ بولے کہ اس چیز کی بازاری قیمت اتنی ہے اور دھوکہ دیکر چیز سستی قیمت میں خرید لے یا فروخت کنندہ جھوٹ بول کر چیز مہنگی قیمت پر بیچ دے۔ اس میں جس فریق کو دھوکہ دیا گیا ہے، اس کو معاملہ ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

مجلہ میں ہے:

إِذَا غَرَّ أَحَدُ الْمُتَبَاعِبَيْنِ الْآخَرَ وَتَحَقَّقَ أَنَّ فِي الْبَيْعِ غَبْنًا فَاحِشًا فَلِلْمَغْبُوبِ أَنْ يَفْسَخَ
الْبَيْعَ حِينَئِذٍ.^(۱)

اگر کسی ایک فریق نے دوسرے کو زبانی دھوکہ دے دیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ بیع میں غبنِ فاحش ہے تو جس کو دھوکہ دیا گیا ہے اس کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

۲۔ خیارِ تفریق کی صورتیں:

- ۱۔ فروخت کنندہ نے چیز کی جنس ہی غلط بتائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کوئی اور چیز ہے۔ جیسے چاندی پر سونے کا پانی چڑھا کر اسے سونا کہہ کر بیچنا۔ یہ بیع باطل ہے۔
- ۲۔ اگر فروخت کنندہ نے چیز کی صفت / کوالٹی میں غلط بیانی کر دی تو یہ صورت ”خیار فوات الوصف“ میں داخل ہے۔ خریدار کو چیز واپس کرنے کا حق حاصل ہوگا۔
- ۳۔ اگر فروخت کنندہ نے چیز کی قیمت میں غلط بیانی کر دی تو اس صورت میں بھی خریدار کو چیز واپس کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ جیسے ”خیار مغبون“ کے آخر میں گزر چکا ہے۔^(۲)

^(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۷۱ (المادة ۳۵۷)

^(۲) فقه البيوع ۸۶۱/۲

۲۔ خیارات وضعیہ

۱۔ خیارات الوصف (Option of Description)

خیارات الوصف کے احکام کو چار نکات میں جمع کیا گیا ہے:

- | | |
|----------|----------------------------------|
| ۱۔ تعریف | ۲۔ خیار وصف اور خیار عیب میں فرق |
| ۳۔ شرائط | ۴۔ حکم شرعی |

۱۔ تعریف:

عربی میں خیارات الوصف کو ”خیار الخلف“ بھی کہتے ہیں اور انگریزی میں اس کو (option due to breach of description) کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خریداری کے وقت اگر خریدار نے چیز کے اندر کسی خاص صفت / کوالٹی کی شرط لگائی اور بعد میں وہ صفت / کوالٹی اس چیز میں موجود نہیں تھی تو خریدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاملہ ختم کر کے چیز واپس کر دے۔

عصر حاضر میں اس کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی نے لیپ ٹاپ اس شرط پر خریدا کہ اس کی بیٹری کی ٹائمنگ تین گھنٹے ہوگی، لیکن بعد میں معلوم ہوا اس کی بیٹری ٹائمنگ کم ہے۔ یا کسی پروڈکٹ میں کسی خاص ماڈل کی شرط لگانا یا کسی خاص درجہ اور کٹیگری کی شرط لگانا یہ سب اسی قسم کے تحت آتے ہیں۔

معايير شرعية میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

هو حق المشتري في فسخ العقد لتخلف وصف وارد في العقد صراحة أو دلالة،

مثل اشتراط أن تكون السيارة من لون معين.^(۱)

یہ خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا وہ حق ہے جو اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جب بیع میں کوئی ایسی صفت موجود نہ ہو، جس کی موجودگی صراحت کے ساتھ یا دلالتاً ضروری قرار دی گئی ہو، مثلاً یہ شرط لگانا کہ گاڑی ایک متعین رنگ کی ہوگی۔

مجله الاحكام العدليه میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

إِذَا بَاعَ مَالًا بِوَصْفٍ مَرْغُوبٍ فَظَهَرَ الْمُبِيعُ خَالِيًا عَنْ ذَلِكَ الْوَصْفِ، كَانَ الْمُشْتَرِي

^(۱) المعايير الشرعية، ص: رقم المعيار: ۵۱

مُخَيَّرًا إِنْ شَاءَ فَسَخَ الْبَيْعَ وَإِنْ شَاءَ أَخَذَهُ بِجَمِيعِ الثَّمَنِ الْمُسَمَّى، وَوَسَّعَى هَذَا خِيَارَ
الْوَصْفِ، مَثَلًا لَوْ بَاعَ بَقْرَةً عَلَى أَهْتَا حَلُوبٍ، فَظَهَرَتْ غَيْرَ حَلُوبٍ، يَكُونُ الْمُشْتَرِي
مُخَيَّرًا.^(۱)

جب مال کو کسی رغبت والی صفت کی شرط کے ساتھ بیچا جائے، پھر معلوم ہو جائے کہ بیع میں وہ
صفت موجود نہیں ہے، تو خریدار کو اختیار حاصل ہوگا۔ اگر چاہے تو اس معاملہ کو ختم کر دے اور اگر
چاہے تو طے شدہ مکمل قیمت پر ہی چیز قبول کر لے۔ اس کو خیار وصف کہتے ہیں۔ مثلاً کسی نے گائے
اس شرط کے ساتھ بیچ دی کہ یہ دودھ والی ہے، پھر معلوم ہوا کہ وہ دودھ والی نہیں ہے تو خریدار کو یہ
اختیار حاصل ہوگا۔

۲۔ خیار وصف اور خیار عیب میں فرق:

خیار وصف اور خیار عیب میں باریک فروق تو زیادہ ہو سکتے ہیں، لیکن غور کرنے سے دونوں میں دو بنیادی فرق
سامنے آتے ہیں:

۱۔ خیار عیب شریعت کی طرف سے دیا گیا ہے، لہذا یہ خریدار کا شرعی حق ہے کہ اگر خریدی ہوئی چیز میں ایسا
عیب نکل آئے جس کی وجہ سے اس چیز کی قیمت میں کمی آتی ہے تو خریدار اس چیز کو واپس یا عیب کی وجہ سے ہونے والا
نقصان لے سکتا ہے۔ جبکہ خیار وصف کی شرط انسان اپنے لیے خود لگاتا ہے، اس کا تعلق وصف سلامتی کے علاوہ اضافی
اوصاف و خصائص کے ساتھ ہے، اگر معاملہ کرتے وقت خریدار نے کسی صفت کی شرط لگائی اور بعد میں چیز کے اندر وہ
صفت نہ پائی گئی تو وہ معاملہ ختم کر سکتا ہے، اگرچہ اس صفت کی وجہ سے چیز کی قیمت میں کمی نہ آئے۔ اور اگر اس نے ایسی
کسی صفت کی شرط نہ لگائی ہو تو شریعت کی طرف سے خیار وصف نہیں ملے گا۔

۲۔ دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ خیار عیب کی بنیاد پر انسان تب چیز واپس کر سکتا ہے جب وہ عیب ایسا ہو کہ تاجروں
کے عرف میں اس کی وجہ سے چیز کی قیمت میں کمی آتی ہو، جبکہ خیار وصف میں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ صفت ایسی ہو
جس کے نہ ہونے سے چیز کی قیمت میں کمی آتی ہو، بلکہ اگر اس صفت کے نہ ہونے سے بیع کی قیمت میں ذرا بھی کمی نہ آئے،
لیکن خریدار نے اس صفت کی شرط لگائی تھی تو اب اسے چیز واپس کرنے کا حق حاصل ہوگا۔^(۲)

^(۱) مجلة الأحكام العدلية. ص: ۶۲ (المأذنة ۳۱۰)

۳۔ شرائط:

اس خیاری کے ثبوت پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، البتہ اس کے لیے چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہیں:

۱۔ صفت / وصف مرغوب کی باقاعدہ شرط لگائی جائے۔ یعنی جس صفت کی بنیاد پر خریدار چیز خرید رہا ہے اور بعد میں اس صفت کی عدم موجودگی میں چیز واپس کر رہا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ خریدار نے باقاعدہ معاملہ میں اس صفت کی شرط لگائی ہو۔ یا دلالتِ حال سے اس صفت کا مشروط ہونا ثابت ہو جائے، یعنی صورتحال ایسی ہو کہ کسی خاص صفت کا تقاضا کرے تو ایسی صفت کو عقد میں مشروط مان لیا جائے گا۔ جیسے کسی نے قربانی کے جانوروں کے لیے لگی منڈی سے جانور خریدا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جانور قربانی کی صلاحیت نہیں رکھتا تو خریدار جانور کو واپس کر سکتا ہے۔

۲۔ جس مرغوب صفت کی شرط لگائی گئی ہے، اس کا کوئی صحیح مقصد و غرض بھی ہو، فضول شرط لگانا لغو ہے۔

۳۔ جس صفت کی شرط لگائی گئی ہے، اس کی غرض شرعاً جائز ہو، تلی و گناہ کی غرض نہ ہو۔ مثلاً باندی کو اس شرط کے ساتھ خریدنا کہ یہ گانا گاسکتی ہو۔ یا مرغاس شرط کے ساتھ خریدنا کہ یہ لڑاکو مرغابے۔

۴۔ جس صفت کی شرط لگائی گئی ہے، اس میں غرر و جہالت نہ ہو۔ مثلاً بکری اس شرط کے ساتھ خریدنا کہ یہ یومیہ اتنا کلو دودھ دے گی، یہ درست نہیں، کیونکہ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ بکری مستقبل میں کتنا دودھ دے گی۔

۵۔ چیز حوالہ کرتے وقت اس میں وہ وصف موجود نہ ہو۔ اگر حوالہ کرتے وقت چیز میں مطلوبہ صفت موجود

تھی، لیکن بعد میں خریدار کے پاس اس میں وہ صفت نہ رہی تو اب خریدار کو چیز واپس کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔^(۱)

۴۔ حکم شرعی:

اگر بیع میں وہ صفت نہ پائی جائے جس کی شرط لگائی گئی تھی تو خریدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاملہ ختم کر کے چیز واپس کر دے اور اپنی قیمت وصول کر لے۔ اگر چیز قابل واپسی ہے، لیکن خریدار یہ چاہتا ہے کہ چیز اپنے پاس روک کر صفت کی کمی کا نقصان فروخت کنندہ سے وصول کر لے تو اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ اگر چیز قابل واپسی نہ ہو، (جس کی تفصیل خیاریع میں گزر چکی ہے) تو خریدار اس صفت کی کمی کا نقصان وصول کر سکتا ہے جس کی شرط لگائی گئی تھی۔

اگر خریدار نے کسی خاص مقدار کی شرط لگائی تھی، بعد میں معلوم ہوا کہ اس چیز کی مقدار کم ہے تو ایسی صورت میں خریدار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ یا تو معاملہ ختم کر دے، یا جتنی چیز موجود ہے، صرف اس کی قیمت دیکر چیز خرید لے اور جتنی کمی ہوئی ہے، اس کی رقم ادا نہ کرے۔ اس کو ”خیار تفرق الصفقة“ کہتے ہیں۔

(۱) المعاییر الشرعية، رقم المعیار: ۵۱

۲۔ اختیار شرط (Option of Stipulation)

اختیار شرط کے مباحث کو چار نکات میں جمع کیا گیا ہے:

- ۱۔ اختیار شرط کا تعارف
- ۲۔ اختیار شرط کی مدت
- ۳۔ اختیار شرط کا ملکیت پر اثر
- ۴۔ اختیار شرط کب ختم ہوگا؟

۱۔ اختیار شرط کا تعارف:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چیز خریدنے کا فوری فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے، کسی اور کا مشورہ مطلوب ہوتا ہے یا گھر والوں کی رائے لینا ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں شریعت نے خریدار کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ کوئی چیز خریدتے وقت یہ کہہ دے کہ: ”میں بھی ہمارا سودا پکا نہیں، بلکہ ایک دن یا دو دن یا تین دن تک مجھے یہ چیز لینے یا نہ لینے کا اختیار ہے، اگر پسند آگئی تو رکھ لوں گا ورنہ واپس کر دوں گا۔“ اگر فروخت کنندہ اس پر راضی ہو جائے تو خریدار کو یہ اختیار حاصل ہو جائے گا اور جتنے دن کا اس نے اختیار لیا ہے، اتنے دنوں کے اندر چیز پسند نہ آنے کی صورت میں واپس کرنے کا اختیار ہوگا۔ یہی اختیار فروخت کنندہ کو بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

لہذا اختیار شرط کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ خریدار یا فروخت کنندہ یا دونوں عقد کے وقت اپنے لیے کسی خاص مدت تک معاملہ ختم کرنے کا اختیار رکھے کہ اگر اس مدت کے اندر چیز پسند نہ آئی یا معاملہ سمجھ میں نہ آیا تو وہ یہ معاملہ ختم کر دے گا۔ اگر اس مدت میں معاملہ ختم نہ کیا تو معاملہ مکمل سمجھا جائے گا۔ اس کو ”اختیار التروی“ بھی کہتے ہیں۔

اختیار الشرط: هو حق يثبت بالاشتراط لأحد المعاقدين أو لكليهما أو لطرف ثالث بالتخير بين إمضاء العقد أو فسخه خلال مدة معلومة.^(۱)

اختیار شرط ایسا حق ہے جو عقد کرنے والوں میں سے کسی ایک فریق، دونوں فریقین یا کسی فریق ثالث کے لیے شرط لگا کر طے کیا جاتا ہے۔ اس میں صاحب اختیار کو ایک طے شدہ معلوم مدت کے دوران معاملہ مکمل کرنے یا ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

جمله الاحکام العدلیہ میں لکھا ہے:

يَجُوزُ أَنْ يُشْرَطَ الْخِيَارُ بِفَسْخِ الْبَيْعِ أَوْ إِجَارَتِهِ مُدَّةً مَعْلُومَةً لِكُلٍِّ مِنَ الْبَائِعِ

وَالْمُشْتَرِي أَوْ لِأَحَدِهِمَا دُونَ الْآخَرِ. ^(۱)

یہ جائز ہے کہ بیع کے اندر فروخت کنندہ و خریدار دونوں کے لیے، یا کسی ایک کے لیے ایک متعین مدت کے اندر بیع کو ختم کرنے کا یا نافذ و مکمل کرنے کے اختیار کی شرط رکھی جائے۔

۲۔ خیار شرط کی مدت:

کتنے دنوں تک کے لیے یہ اختیار رکھا جاسکتا ہے؟ اس میں فقہاء کے تین اقوال ہیں:

۱۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام زفر رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اختیار تین دن تک کے لیے رکھنا صحیح ہے، اس سے زیادہ صحیح نہیں، البتہ اگر کسی نے تین دن سے زیادہ کے لیے اختیار مانگا اور پھر تین دن کے اندر ہاں یا ناں میں جواب دے دیا تو امام زفر کے علاوہ دیگر حضرات کے ہاں یہ معاملہ درست ہو جائے گا۔

۲۔ فقہاء حنابلہ، صاحبین اور چند دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مدت کا صرف معلوم و متعین ہونا ضروری ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ۔ لہذا تین دن سے زیادہ مدت کے لیے بھی خیار شرط رکھنا درست ہے۔

۳۔ فقہاء مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ چیزوں کے مختلف ہونے سے مدت مختلف ہوگی۔ مثلاً زمین کی خریداری میں خیار شرط چھتیس دن رکھ سکتے ہیں۔ سامان میں پندرہ دن، جانوروں میں دو دن وغیرہ۔ اس کا دار و مدار عرف پر ہے کہ کس چیز کے لیے کتنے دن اختیار رکھنا چاہیے۔ ^(۲) معاصر فقہاء، جیسے استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے اپنی کتاب ”فقہ البیوع“ میں دوسری رائے کو اختیار کیا ہے۔ ^(۳)

۳۔ خیار شرط کا ملکیت پر اثر:

چونکہ خریدار اور فروخت کنندہ دونوں اپنے لیے یہ اختیار رکھ سکتے ہیں، تو اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ خیار شرط رکھنے کے بعد بیع اور ثمن کس کی ملکیت سمجھے جائیں گے؟ اس میں فقہاء کا اختلاف و تفصیلات ہیں، تاہم مختصر فقہاء حنفیہ کی رائے کو ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ اگر صرف فروخت کنندہ نے اپنے لیے خیار شرط رکھا ہے تو بیع اس کی ملکیت سے نہیں نکلے گی۔ لہذا اگر خریدار نے بیع پر قبضہ کر لیا اور اس کے پاس وہ چیز / بیع ضائع ہو گئی تو اس پر اس چیز کی مثل یا بازاری قیمت لازم ہوگی۔

^(۱) مجلة الأحكام العدلیة، ص: ۶۰ (المأذة ۳۰۰)

^(۲) الفقه على المذاهب الأربعة ۱۲۹/۲

^(۳) فقه البیوع ۸۶۸/۲

۲۔ اگر صرف خریدار نے اپنے لیے خیار شرط رکھا ہے تو قیمت خریدار کی ملکیت سے خارج نہ ہوگی، نہ فروخت کنندہ اس میں تصرف کر سکتا ہے نہ مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور بیع، فروخت کنندہ کی ملکیت سے نکل جائے گی۔ اگر چیز فروخت کنندہ کے پاس ہی ضائع ہوگئی تو آپس میں طے شدہ قیمت پر ضائع ہوگی۔ اور اگر خریدار کے پاس ضائع ہوگئی تو اس سے طے شدہ قیمت کا مطالبہ کیا جائے گا۔

۳۔ اگر دونوں نے اپنے لیے خیار شرط رکھا ہے تو نہ بیع، فروخت کنندہ کی ملکیت سے نکلے گی اور نہ قیمت، خریدار کی ملکیت سے نکلے گی۔^(۱)

۴۔ خیار شرط کب ختم ہوگا؟

اگر کسی فریق نے اپنے لیے خیار شرط رکھا تو وہ اختیار درج ذیل صورتوں میں ختم ہو جائے گا:

۱۔ اجازتِ قولیہ: جس نے اپنے لیے خیار رکھا ہے، وہ فریق وضاحت کے ساتھ اپنا اختیار ختم کر کے معاملہ کو مکمل کر دے کہ میں اس عقد کو مکمل کرتا ہوں۔

۲۔ اجازتِ فعلیہ: جس فریق نے اپنے لیے خیار رکھا ہے وہ کوئی ایسا عمل کر دے جو اس کی رضامندی ظاہر کر دے کہ اس نے بیع کو مکمل کر دیا ہے۔ جیسے فروخت کنندہ نے اپنے لیے خیار رکھا اور پھر خیار کے دنوں میں شمن (جو عین کی صورت میں ہو) کو بیچ دیا وغیرہ یا خریدار کو قیمت سے بری کر دیا۔ اسی طرح اگر خریدار نے اپنے لیے خیار رکھا تھا اور پھر خیار کے دنوں میں اس چیز کو استعمال کر لیا یا آگے کسی کو بیچ دیا تو اس کا اختیار ختم ہو جائے گا۔ البتہ اگر صرف دیکھنے کے لیے استعمال کیا مثلاً ایک دفعہ چادر کو اوڑھا کہ کیسی لگتی ہے تو صرف اس قدر استعمال سے بیع یکمی نہ ہوگی اور اختیار باقی رہے گا۔

۳۔ مدت گزرنا: اگر وہ دن گذر گئے جتنے دن اپنے لیے خیار رکھا تھا اور وہ خاموش رہا تو معاملہ خود بخود پکا ہو جائے گا۔

۴۔ عیب: خریدار کے پاس بیع کے اندر کوئی ایسا عیب پیدا ہو گیا کہ جس کی وجہ سے اب اسے واپس کرنا ممکن نہیں رہا تو بھی خریدار کا اختیار ختم ہو جائے گا۔

۵۔ فروخت کنندہ نے اپنے لیے خیار رکھا تھا اور چیز پر خریدار نے قبضہ کر لیا اور خریدار کے پاس چیز ضائع ہوگئی یا کسی اجنبی نے چیز خراب کر دی تو فروخت کنندہ کو اب بھی خیار حاصل ہوگا۔ اگر اس نے معاملہ مکمل کر دیا تو خریدار سے مکمل وہ قیمت وصول کر دے جو دونوں نے آپس میں طے کی تھی۔ اگر فروخت کنندہ نے خیار استعمال کر کے بیع کو ختم کر دیا

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں: فقہ البیوع ۲/۸۷۱

تو چیز کی بازاری قیمت خریدار سے وصول کرے گا۔^(۱)

۳۔ خیار تعین (Option of Determination)

خیار تعین کے احکام کو مندرجہ ذیل تین نکات میں جمع کیا گیا ہے:

۱۔ خیار تعین کا تعارف

۲۔ حکم شرعی

۳۔ شرائط

۱۔ خیار تعین کا تعارف:

خیار تعین کا مطلب یہ ہے کہ خریدار کو کئی اشیاء کی قیمت بتا کر اسے یہ اختیار دے دینا کہ وہ ان اشیاء میں سے کسی ایک چیز کو پسند کر کے خرید سکتا ہے۔ مثلاً خریدار نے کوئی ایک چیز، کپڑا وغیرہ خریدنا ہے، لیکن وہ فروخت کنندہ سے کئی کپڑوں کی قیمت معلوم کر کے یہ کہہ دے کہ میں اتنے دن کے اندر ان میں سے کوئی ایک کپڑا منتخب کر کے لے لوں گا، بقیہ واپس کر دوں گا۔ اور فروخت کنندہ اس کو قبول کر لے۔

خیار التعین: هو حق المشتري في اختيار أحد الأشياء التي وقع العقد على واحد

منها خلال مدة معلومة ويثبت بالشرط.^(۲)

خیار تعین: یہ خریدار کو ملنے والا وہ حق ہوتا ہے جس کے تحت خریدار ان مختلف اشیاء میں سے کسی

ایک کو منتخب کرنے کا حق رکھتا ہے جن پر عقد ہوا ہے۔ یہ اختیار طے کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ اختیار جس طرح خریدار کو ملتا ہے، اسی طرح فروخت کنندہ کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً خریدار نے فروخت

کنندہ کی تین یا چار چیزوں کی الگ الگ قیمت بتا کر اسے یوں کہہ دیا کہ: ”ان میں سے کوئی بھی چیز میری بیان کردہ قیمت کے بدلے مجھے دے دو۔“ فروخت کنندہ کوئی ایک چیز منتخب کر کے دے سکتا ہے۔

مجملہ الاحکام العدلیہ میں ہے:

لَوْ بَيَّنَّ الْبَائِعُ أَمَّا نَ شَيْئَيْنِ أَوْ أَشْيَاءَ مِنَ الْقِيمِيَّاتِ كُلِّ عَلَى حِدَةٍ عَلَى أَنَّ الْمُشْتَرِيَّ
يَأْخُذُ أَيًّا شَاءَ بِالْتَّمَنِ الَّذِي بَيَّنَّهُ لَهُ أَوْ الْبَائِعُ يُعْطِي أَيًّا أَرَادَ كَذَلِكَ، صَحَّ الْبَيْعُ،

وَهَذَا يُقَالُ لَهُ: خِيَارُ التَّعْيِينِ.^(۳)

(۱) بدائع الصنائع ۵/۲۶۷

(۲) المعايير الشرعية، رقم المعيار: ۵۲

(۳) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۶۳ (المادة ۳۱۶)

اگر فروخت کنندہ نے دو چیزوں کی یا کئی قیمتی چیزوں کی علیحدہ علیحدہ قیمت بتائی کہ خریداران میں سے جس کو چاہے، بیان کردہ قیمت پر خرید لے۔ یا فروخت کنندہ جس چیز کو چاہے، بیان کردہ قیمت پر خریدار کو دے دے تو یہ بیع صحیح ہے۔ اس کو خیار تعین کہتے ہیں۔

۲۔ حکم شرعی:

یہ صورت فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں درست ہے، جبکہ فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں درست نہیں ہے، کیونکہ بیع (خریدی ہوئی چیز) متعین نہیں ہے، لیکن دیگر فقہاء نے اس کی اجازت اس لیے دی ہے کہ ایک تو اس کی ضرورت ہے، دوسرا ایسی جہالت سے عموماً جھگڑا پیدا نہیں ہوتا۔^(۱)

۳۔ شرائط:

عقد میں خیار تعین کی شرط لگانے کے لیے درج ذیل شرائط ضروری ہیں:

۱۔ صلہ عقد میں شرط: خریداری کے وقت یعنی ایجاب و قبول میں ہی تعین کا اختیار رکھا جائے۔ اگر ایجاب و قبول میں ایسی کوئی شرط نہیں رکھی اور دو چیزوں میں سے کوئی ایک غیر متعین چیز بیچ دی اور خیار کا ذکر نہیں کیا گیا تو یہ درست نہیں ہے۔

۲۔ محل خیار کی شرط: حنفیہ نے یہ شرط لگائی ہے جن اشیاء میں خیار تعین رکھا جائے، ضروری ہے کہ وہ قیمتی چیزیں ہوں یا ایسی مثلی چیزیں ہوں جن کے کئی اجناس ہوں۔ مثلاً گندم، چاول اور مکئی کے مجموعہ میں خیار تعین رکھنا۔ اگر ایسی اشیاء ہیں جو مثلیات میں سے ہیں اور جنس بھی ایک ہے تو وہاں خیار تعین رکھنا درست نہیں، کیونکہ اس کی کوئی حاجت ہی نہیں، لیکن انواع و صفات کے مختلف ہونے کی وجہ سے کئی فقہاء نے ایک ہی جنس کی مثلیات میں بھی خیار تعین کی اجازت دی ہے، جیسے کپڑے وغیرہ۔

۳۔ مدت کی شرط: مدت کو متعین / طے کرنا ضروری ہے۔ حنفیہ کے ہاں اس کی مدت وہی ہے جو خیار شرط کی ہے۔ دیگر فقہاء کے ہاں اس کی کوئی بھی مدت طے کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ متعین ہو۔

اگر مدت کے اندر خریدار نے کسی ایک چیز کو منتخب نہیں کیا تو بعض حضرات نے اس کو بیع باطل کہا ہے، لیکن اکثر فقہاء حنفیہ کے ہاں یہ بیع باطل نہیں ہے، بلکہ خریدار پر کوئی ایک چیز پسند کرنا لازم و ضروری ہے۔

۴۔ مقدار کی شرط: حنفیہ کے ہاں یہ ضروری ہے کہ جن اشیاء میں خیار تعین رکھا جائے، وہ تین سے زیادہ نہ

ہوں، کیونکہ ہر چیز میں تین قسم کی اشیاء ہوتی ہیں، یعنی عمدہ، متوسط اور ادنیٰ، اس لیے تین سے زیادہ اشیاء میں اختیار رکھنے کوئی ضرورت نہیں ہے، جبکہ دیگر فقہاء (جن کے ہاں اختیار تعیین جائز ہے ان) کے ہاں تین سے زیادہ اشیاء میں بھی اختیار تعیین رکھنا درست ہے۔ آج کل چونکہ ہر چیز میں صرف تین قسم کی اشیاء / کیٹیگریز نہیں ہوتی، بلکہ انواع و صفات کے لحاظ سے ایک ہی چیز کے اندر کئی ساری کو اٹیر ہوتی ہیں، اس لیے علماء نے تین سے زیادہ اشیاء میں اختیار تعیین کی اجازت دی ہے۔^(۱)

• اگر خریدار کے پاس کوئی ایک چیز عیب دار ہوگئی تو اسی کے اندر بیع مکمل سمجھی جائے گی اور اختیار تعیین ختم ہو جائے گا۔

• حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں اختیار تعیین میں وراثت جاری ہو سکتی ہے۔ یعنی اگر مرحوم نے کئی چیزیں اختیار تعیین کے ساتھ لی تھیں تو وراثت ان میں سے کوئی ایک چیز متعین کر کے خرید سکتے ہیں۔^(۲)

۴۔ اختیار نقد (Option due to Non-Payment)

اختیار نقد کے لیے تین نکات سمجھنا ضروری ہے:

۱۔ اختیار نقد کی تعریف

۲۔ حکم شرعی

۳۔ اختیار نقد کی مدت

۱۔ اختیار نقد کی تعریف:

ایسا اختیار جس میں فروخت کنندہ کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر خریدار نے فلاں متعین مدت کے اندر اندر قیمت کی ادائیگی نہیں کی تو فروخت کنندہ اس معاملہ کو ختم کر سکتا ہے۔ یہ اختیار اس وقت حاصل ہوگا جب اس کی باقاعدہ شرط لگادی جائے۔ مثلاً فروخت کنندہ یوں کہہ دے کہ: ”اگر تم نے دس دن کے اندر اندر قیمت ادا نہیں کی تو ہمارا معاملہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔“ اور خریداریوں کہہ دے کہ: ”اگر میں نے دس دن کے اندر اس چیز کی قیمت ادا نہیں کی تو ہمارے درمیان کا معاملہ ختم سمجھا جائے گا۔“

خيار النقد: هو خيار يشترطه البائع أو المؤجر للتمكن من الفسخ لعدم دفع

الثمن الحال أو الأجرة الحالة في الموعد، ولا يثبت إلا بالاشتراط.^(۳)

^(۱) فقه البيوع ۲/۸۹۴

^(۲) الفقه الإسلامي وأدلته ۴/۶۰۷

^(۳) المعايير الشرعية، رقم المعيار: ۵۲

خیار نقد: ایسا اختیار ہے جو بیچنے والا یا کرایہ پر دینے والا اس لیے نکالتا ہے تاکہ اگر خریدار، یا کرایہ دار طے شدہ مدت میں قیمت یا کرایہ کی ادائیگی نہ کر سکے تو وہ (باع یا موجر) معاملہ ختم کر سکے۔ یہ بھی صرف طے کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں ہے:

إِذَا تَبَايَعَا عَلَى أَنْ يُؤَدِّيَ الْمُشْتَرِي الثَّمَنَ فِي وَقْتٍ كَذَا وَإِنْ لَمْ يُؤَدِّهِ فَلَا بَيْعَ بَيْنَهُمَا صَحَّ الْبَيْعُ وَهَذَا يُقَالُ لَهُ خِيَارُ النَّقْدِ.^(۱)

اگر دو آدمیوں نے اس شرط پر بیع کر لی کہ خریدار ایک متعین وقت کے اندر اندر قیمت ادا کرے گا۔ اگر اس نے اس مدت کے اندر قیمت ادا نہیں کی تو دونوں کے درمیان کوئی معاملہ باقی نہیں رہے گا۔ یہ بیع درست ہے۔ اس کو خیار نقد کہتے ہیں۔

۲۔ حکم شرعی:

فقہاء حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں یہ صورت درست ہے۔ فقہاء شافعیہ کے ہاں یہ درست نہیں ہے، جبکہ مالکیہ سے

مختلف روایات منقول ہیں۔^(۲)

۳۔ خیار نقد کی مدت:

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسفؒ کے ہاں خیار نقد زیادہ سے زیادہ تین دن کے لیے رکھا جاسکتا ہے، جبکہ حنابلہ اور

امام محمدؒ کے ہاں خیار نقد کی مدت تین دن سے زیادہ بھی رکھی جاسکتی ہے، خواہ جتنی بھی ہو، بشرطیکہ معلوم و متعین ہو۔^(۳)

^(۱) مجلہ الاحکام العدلیہ، ص: ۶۳ (المأذنة ۳۱۳)

^(۲) الفقہ اسلامی وأدلته ۴/ ۶۲۶

^(۳) حوالہ بالا ۴/ ۶۲۶

۴۔ بیوع کی معاصر و جدیدبحاث

اس حصے میں بیوع (خرید و فروخت) کی چند جدیدبحاث اور ایسی معاصر اصطلاحات کی وضاحت کی جائے گی جن

کو بیوع میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کل گیارہ (۱۱) ہیں:

۱۔ بیع تعاطی	۲۔ بیع التجرار	۳۔ مزایدہ	۴۔ مناقضہ
۵۔ بیع عینہ	۶۔ تورق	۷۔ بیع بالتقصیط	۸۔ وضع و تعجل
۹۔ عربون	۱۰۔ ہامش الجدیۃ	۱۱۔ عقد البناء والتشغیل	

۱۔ بیع تعاطی (Sale by Act)

بیع تعاطی کے احکام کو چار نکات میں جمع کیا گیا ہے:

۱۔ بیع تعاطی کی تعریف

۲۔ حکم شرعی

۳۔ اقالہ و اجارہ میں تعاطی

۴۔ شرائط

۱۔ بیع تعاطی کی تعریف:

تعاطی باب تفاعل سے ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ”تناول الشيء في اليد“ یعنی کسی چیز کو ہاتھ میں لینا۔

اس کو فقہ کی اصطلاح میں ”معاطاة“ اور ”مراوضہ“ بھی کہتے ہیں۔

فقہاء اس کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ فروخت کرنے والا خریدار کو کوئی چیز دے دے اور خریدار اس چیز کی

قیمت دے کر وہ چیز لے لے، اور ان دونوں کے درمیان زبانی یا تحریری یا اشارۃ کوئی ایجاب و قبول نہ ہو۔ یعنی عمل سے

بیع کو مکمل کر لیا جائے۔

أن يأخذ المشتري المبيع ويدفع للبائع الثمن، أو يدفع البائع المبيع فيدفع له الآخر

الثمن، من غير تكلم ولا إشارة. ويكون التعاطي في البيع وغيره من المعاضات.^(۱)

(بیع تعاطی یہ ہے کہ) خریدار، چیز لے لے اور فروخت کنندہ کو قیمت دے دے، یا فروخت کنندہ

چیز دے دے اور دوسرا شخص اس کو قیمت دے دے، بغیر کسی گفتگو اور اشارہ کے۔ اور تعاطی، بیع

اور بیع کے علاوہ دیگر معاوضات میں ہوتا ہے۔

اس کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں۔

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ دونوں طرف سے ایجاب و قبول نہ ہو، بلکہ دونوں طرف سے عمل کے ذریعے معاملہ

تکمل کیا جائے۔ مثلاً قیمت دے دی اور چیز لے لی۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک طرف زبان سے الفاظ اداء ہو جائے، لیکن دوسری طرف سے خاموشی ہو اور

عمل کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اگرچہ فقہاء حنفیہ نے دوسری صورت کو بیع تعاطلی میں شمار نہیں کیا، لیکن اکثر فقہاء نے اس کو بھی تعاطلی میں شمار کیا ہے۔

۲۔ حکم شرعی:

بیع تعاطلی کے شرعی حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ فقہاء حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ کا راجح قول یہ ہے کہ یہ بیع جائز ہے۔

اس کی دو وجوہات ہیں:

۱۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ بیع میں بنیادی چیز رضامندی ہے، لہذا اس پر جو بھی چیز دلالت کرے، خواہ لفظ ہو یا فعل تو

اس سے بیع منعقد ہو جائے گی۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس طریقہ پر امت کا تعامل چلا آ رہا ہے، کسی سے اس پر رد ثابت نہیں۔

اکثر فقہاء شافعیہ کے ہاں بیع تعاطلی درست نہیں ہے، کیونکہ ان کے ہاں بیع کے درست ہونے کے لیے ایجاب

و قبول زبانی یا تحریری طور پر ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ فقہاء شافعیہ وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ بیع اور شراء میں اصل

چیز رضامندی ہے اور رضامندی انسان کے اندر ایک مخفی چیز ہے، اس مخفی چیز کے اظہار کے لیے الفاظ ضروری ہیں، صرف

عمل کافی نہیں ہے۔ لیکن بعض شافعیہ جیسے علامہ نوویؒ، علامہ بغوی کے ہاں بیع تعاطلی جائز ہے اور بعض شافعیہ کے ہاں

صرف لم قیمت والی اشیاء میں بیع تعاطلی جائز ہے، زیادہ قیمت والی اشیاء میں بیع تعاطلی جائز نہیں ہے۔^(۱)

۳۔ شرائط:

پہلی شرط: قیمت پہلے سے معلوم اور طے شدہ ہو۔ یا تو دونوں کے درمیان پہلے سے طے شدہ ہو یا اس چیز کی قیمت

بازار اور معاشرے میں سب کو معلوم ہو۔

دوسری شرط: دونوں کی رضامندی ہو۔

تیسری شرط: بیع تعاطی بیع فاسد پر مبنی نہ ہو۔ مثلاً فروخت کنندہ اور خریدار نے گزشتہ کل بیع فاسد کا معاہدہ کیا تھا، آج اسی بیع فاسد کی بنیاد پر بیع تعاطی کر رہے ہیں تو یہ درست نہیں ہے، کیونکہ یہ اسی بیع فاسد کا نتیجہ ہے اور بیع فاسد درست نہیں ہے، لہذا آج کی بیع تعاطی بھی درست نہیں ہے۔ البتہ اگر بیع فاسد ختم کر کے نئے سرے بیع تعاطی کر رہے ہیں تو پھر بیع تعاطی درست ہے۔^(۱)

۴۔ اقالہ و اجارہ میں تعاطی:

اقالہ اور اجارہ (کرایہ داری کا معاملہ) بھی بیع تعاطی کے طور پر درست ہے۔ مثلاً مالک مکان اپنا گھر کرایہ پر دینا چاہ رہا تھا کسی کرایہ دار نے مالک مکان کو مطلوبہ پیسے دے دیے اور مالک مکان نے اس پر قبضہ کر کے کچھ بھی نہیں کہا، یہ بھی بیع تعاطی کی صورت ہے اور درست ہے، بشرطیکہ مدت وغیرہ معلوم ہو۔ اسی طرح تعاطی کے ساتھ اقالہ بھی درست ہے۔ یعنی جو معاملہ یا کنٹریکٹ ہو اس کو کینسل اور منسوخ کرنا۔

۲۔ بیع الاستحجار (Supply Sale)

بیع الاستحجار کے احکام کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل چار نکات سمجھنا ضروری ہے:

۱۔ بیع الاستحجار کا تعارف ۲۔ بنیادی صورتیں

۳۔ فقہاء کی آراء ۴۔ احکام شرعیہ

۱۔ بیع الاستحجار کا تعارف:

آج کل بازاروں میں خرید و فروخت کی ایک صورت یہ بھی رائج ہے کہ بعض لوگ دکانداروں کے پاس اپنا کھانا کھولتے ہیں اور رفتہ رفتہ جس چیز کی ان کو ضرورت پڑتی رہتی ہے، اپنی ضرورت کے مطابق وہ چیز دکاندار سے لیتے رہتے ہیں اور دکاندار ان کے کھاتے میں اس چیز کو قیمت کے ساتھ لکھتا رہتا ہے۔ عمومی طور پر خریدار کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ جو چیز وہ اپنی ضرورت کے لیے لے جا رہا ہے اس کی قیمت کیا ہے؟ کبھی کبھی ایک دوسرے سے قیمت پوچھ کر اور بتا کر چیز لے لیتے ہیں، لیکن عمومی طور قیمت نہیں بتائی جاتی، بلکہ خاموشی سے چیز اٹھالی یا کسی بچے کو یا نوکر کو بھیج کر مطلوبہ چیز منگوائی جاتی ہے اور پھر مہینے کے آخر میں خریدار، دکاندار کے پاس جا کر اپنا کھانا دیکھ کر دکاندار کو اس کی رقم دیتا ہے، یا شروع سے ہی دکاندار کے پاس کچھ رقم رکھ کر اس سے تصفیہ کر کے جو کمی بیشی ہوتی ہے اس کو پورا کر لیا

جاتا ہے۔ اس طرح کے معاملے کو فقہ کی اصطلاح میں ”بیع الاستجرار“ کہتے ہیں۔

اس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ خریدار، فروخت کرنے والے سے مختلف اوقات میں ضرورت میں مختلف اشیاء، قیمت معلوم کر کے یا قیمت معلوم کیے بغیر، لیتا رہے اور پھر بعد میں کسی وقت ان تمام اشیاء کی قیمت کا حساب کتاب کر کے تصفیہ کر لے۔

الاستجرار: من جر الشيء إذا شده إليه، ما يأخذه المشتري من البائع شيئا فشيئا

ثم يحاسبه بئمن جميع ما أخذه. (1)

استجرار کے معنی ہے کسی چیز کو کھینچنا۔ خریدار، فروخت کنندہ سے وقت فوقتاً چیز لیتا رہے اور پھر اس کے ساتھ تمام لی ہوئی اشیاء کی قیمت کا حساب کر لیتا ہے۔

۲۔ بنیادی صورتیں:

استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے اپنی کتاب ”فقہ البیوع“ میں بیع الاستجرار کی بنیادی طور پر دو صورتیں لکھی ہیں:

۱۔ استجرار بمبلغ مقدم

۲۔ استجرار بمبلغ مؤخر

پہلی صورت: استجرار بمبلغ مقدم

اس کا مطلب ہے کہ اشیاء خریدنے سے پہلے جہاں خریدار نے کھانا کھولا ہے، اس کے پاس کچھ رقم رکھ لی جائے اور پھر رفتہ رفتہ اس سے ضرورت کی چیزیں لے کر کسی خاص مدت کے بعد تصفیہ و حساب کتاب کر لیا جائے۔

دوسری صورت: استجرار بمبلغ مؤخر

اس صورت میں بھی خریدار، فروخت کنندہ سے رفتہ رفتہ اشیاء لیتا رہتا ہے، لیکن قیمت شروع میں نہیں دیتا، بلکہ بعد میں کسی وقت قیمت کی ادائیگی کرتا ہے۔ آسان الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ کبھی ساری کی ساری کی قیمت بعد میں دیا جاتی ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ پہلے سے ہی دکاندار کے پاس قیمت رکھ لی جاتی ہے اور بعد میں جا کر تصفیہ کیا جاتا ہے۔ (2)

۳۔ فقہاء کی آراء:

اکثر فقہاء شافعیہ کے ہاں بیع الاستجرار درست نہیں ہے، کیونکہ ان کے ہاں بیع تعالیٰ جائز نہیں ہے اور بیع استجرار کی بنیادی طور پر بیع تعالیٰ ہی کی ایک صورت ہے۔ البتہ امام غزالی رحمہ اللہ کے ہاں استجرار جائز ہے۔ فقہا مانا ہے۔ ہاں بیع استجرار اس وقت جائز ہوگی، جب بیع کی قیمت معلوم ہو، اگر قیمت معلوم نہیں ہے تو یہ درست نہیں ہے۔ فقہاء حنفیہ کی بھی تقریباً یہی رائے ہے، البتہ ان کے ہاں مارکیٹ ریٹ کو بنیاد بنا کر معاملہ کرنا جائز ہے۔^(۱)

فقہاء حنفیہ کے ہاں بیع استجرار کی ہر صورت جائز ہے، جس کی تفصیل آگے عنوان کے تحت آ رہی ہے۔

۴۔ احکام شرعیہ:

۱۔ بمبلغ مؤخر:

حنفیہ رائے کے مطابق استجرار کی دونوں صورتیں (بمبلغ مؤخر، بمبلغ مقدم) جائز ہیں، تاہم مزید وضاحت سے اپنے درج ذیل صورتیں ذہن میں رکھیں:

پہلی صورت: بیع استجرار میں چیز لے جاتے وقت اگر دکاندار اور خریدار نے زبان سے ہی قیمت طے کر لی تو یہ درست ہے اور تمام فقہاء کے ہاں جائز ہونا چاہیے۔ جس وقت بھی انہوں نے قیمت بتادی اسی وقت بیع منعقد ہو جاتی ہے۔

دوسری صورت: خریدار جس وقت دکاندار سے چیز لے جا رہا تھا اس وقت تو انہوں نے زبان سے قیمت طے نہیں کی، لیکن دونوں کو اس چیز کی بازاری قیمت معلوم ہے اور بازار میں اس چیز کی ایک ہی معلوم اور متعین قیمت ہے۔ اور دونوں نے زبان سے کہا ہو کہ اس کی بازاری قیمت لکھنی ہوگی۔ تو یہ صورت بھی جائز ہے اور جیسے ہی خریدار چیز کو لے جانے لگے اسی وقت بیع منعقد ہو جاتی ہے، چاہے قیمت بعد میں ادا کرے یا اسی وقت ادا کرے یا پہلے سے فروخت کنندہ سے پاس قیمت رکھی ہو۔

تیسری صورت: چیز لے جاتے ہوئے خریدار اور دکاندار نے نہ تو زبانی طور پر قیمت طے کی اور نہ ہی اس چیز کی بازاری قیمت متعین اور معلوم ہے، بلکہ بعد میں جا کر خریدار دکاندار سے معلوم کرتا ہے کہ جو چیز میں لے کر گیا تھا اس کی کیا قیمت تھی؟ یہ صورت صرف فقہاء حنفیہ کے ہاں جائز ہے۔

۱۰۔ ال یہ ہوتا ہے کہ یہ صورت کیسے اور کیوں جائز اور درست ہے؟ کیونکہ جس وقت خریدار چیز لے جا رہا تھا اس وقت خریدار کو قیمت معلوم نہیں تھی اور بیع خریدتے وقت خریدار کو قیمت کا معلوم ہونا ضروری ہے اور اس سے

لہا جائے کہ بعد میں قیمت معلوم کر کے اس کا تصفیہ کر دیا جائے گا تو اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس وقت تو منع (غیر مباح) چیز (موتی چیز) موجود نہیں ہے۔ تو کو یا چیز کو پہلے استعمال کر کے اب خرید رہا ہے، اس سے غیر مملوک چیز کا استعمال لازم آ رہا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں خرابی ہے۔

اس سوال کا بعض فقہاء حنفیہ نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ درحقیقت ضمان کی ادائیگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خریدار نے دکاندار کی اجازت سے دکاندار کی چیز لے جا کر استعمال کر لی اور بعد میں خریدار اس چیز کا ضمان اور نقصان ادا کر رہا ہے۔

بعض فقہاء حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ معدوم کی بیع ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جس وقت بعد میں تصفیہ کیا جائے گا اس وقت بیع منقذ ہو جائے گی، اور رہی یہ بات کہ اس وقت وہ چیز یعنی بیع موجود ہی نہیں ہے، استعمال ہو چکی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معدوم کی بیع ہے اور معدوم کی بیع اصولی طور پر تو جائز نہیں ہونی چاہیے، لیکن یہاں اس کی گنجائش دے دی گئی، کیونکہ یہاں غرر موجود نہیں ہے۔ بیع معدوم سے فقہاء نے اس لیے منع کیا ہے کہ وہاں فروخت کنندہ کو چیز حوالے کرنے کی قدرت نہیں ہوتی، لیکن یہاں خریدار اس چیز کو استعمال کر چکا ہے، اس لیے یہاں کسی قسم کا غرر، دھوکا وغیرہ نہیں ہے، لہذا اس کی اجازت دے دی گئی۔^(۱)

۳۔ بمبلغ مقدم:

شروع میں فروخت کنندہ کو کچھ رقم دیکر اس سے ضرورت کی اشیاء لیتے رہنا۔ اس میں بھی وہی تفصیل ہے جو اوپر بیان کر دی گئی ہے، البتہ اس میں جو ایڈوانس رقم دی جاتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یعنی جس صورت کے اندر دکاندار وغیرہ کے پاس پہلے سے ہی قیمت یا رقم رکھی جاتی ہے اور بعد میں رفتہ رفتہ دکاندار سے چیز خریدی جاتی ہے، اس رقم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا وہ رقم امانت ہے یا قرض ہے یا کچھ اور؟

بعض فقہاء کے ہاں یہ رقم امانت ہے، لیکن یہاں اعتراض ہو سکتا ہے کہ امانت کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے، حالانکہ دکاندار اس رقم کو استعمال کرتا ہے؟

بعض فقہاء کے ہاں یہ رقم ثمن مقدم ہے یعنی ایڈوانس قیمت۔ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت رقم ایڈوانس میں دکاندار کو دی جاتی ہے اس وقت بیع معلوم ہی نہیں ہے کہ اس رقم سے کیا خریداجائے گا؟ بعض فقہاء کے ہاں یہ رقم قرض ہے، لیکن یہاں بھی شبہ ہو سکتا ہے رقم دیتے وقت خریدار نے شرط لگا دی ہے

اس رقم کے بدلے میں آپ سے بعد میں چیزیں خریدیں گے، لہذا قرض میں بیع کی شرط رکھنی ہوگی جو کہ درست نہیں ہے۔ چاہیے، کیونکہ یہ ”صفقہ فی صفقہ“ ہے۔

استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے فرمایا کہ اس کو ”رقم علی الحساب“ کہا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایڈوانس میں کسی کو رقم دے کر یہ کہنا کہ آئندہ میں آپ سے جو چیزیں خریدوں گا، تم حساب کر کے اس رقم سے اس چیز کی قیمت کا نئے رہنا۔ اصولاً یہ بھی قرض ہی ہے، لیکن اب اس طرح کا قرض دینا اور اس کے بدلے میں خریداری کی شرط لگانے کا عرف ہو چکا ہے، اس لیے یہ جائز ہے۔ جیسے آج کل رسائل و مجلات و اخبارات کی سالانہ ایڈوانس رقم دی جاتی ہے، تو یہ سب ”رقم علی الحساب“ ہے۔^(۱)

۳۔ مزایدہ (Auction)

مزایدہ کے بنیادی مباحث کو چار نکات میں جمع کیا گیا ہے:

- ۱۔ مزایدہ کا تعارف
- ۲۔ حکم شرعی
- ۳۔ ایجاب و قبول
- ۴۔ دو سوالات

۱۔ مزایدہ کا تعارف:

مزایدہ کو اردو میں ”نیلامی“ کہتے ہیں۔ اس کی ایک عمومی تعریف یہ ہے کہ فروخت کرنے والا لوگوں میں اپنی چیز کے بارے میں آواز لگا کر کہتا ہے کہ یہ چیز میں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ جو آدمی جتنی زیادہ قیمت لگائے گا، اس کو یہ چیز دے دی جائے گی۔ اس صورت میں خریدار ایک نہیں، بلکہ کئی ہوتے ہیں۔ ہر ایک، دوسرے سے بڑھ کر قیمت اور بولی لگاتا ہے اور آخر میں جو سب سے زیادہ قیمت لگاتا ہے، اس کی بولی پر اس معاملہ کو روک لیا جاتا ہے اور فروخت کنندہ اس کو وہ چیز دے دیتا ہے۔ عربی میں اس معاملہ کے کئی مزید نام بھی ہیں، مثلاً اس کو ”بیع الدلالہ“، ”بیع المناداة“ اور ”بیع المفالیس“ بھی کہتے ہیں۔

اس طرح کے معاملہ میں فروخت کنندہ یا اس کا وکیل اپنی چیز بیچنے کے لیے جو اعلان کرتا ہے، اس کو ”نداء“ یا ”صیاح“ کہتے ہیں۔ خریداروں کی طرف سے جو بولی یا قیمت پیش کی جاتی ہے، اس کو ”عطاء“ یا ”عرض“ کہتے ہیں۔ جب فروخت کنندہ کسی ایک بولی کو قبول کرتا ہے تو اس کے قبول کرنے کو ”رسو“ کہتے ہیں۔

بيع المرابدة ويسعى بيع الدلالة: أن ينادي على السلعة ويبيد الناس فيها بعضهم على بعض، حتى تنفق على آخر من يزيد فيها فيأخذها.^(۱)

بيع المرابدة کو بیع الدلالة بھی کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ سامان پر آواز/بولی لگائی جائے اور لوگ ایک دوسرے سے زیادہ قیمت لگائے، آخر میں جو شخص سب سے زیادہ قیمت لگائے، اس کی بولی پر معاملہ روک لیا جاتا ہے اور وہ چیز لے لیتا ہے۔

اس کی ایک اور صورت کتابت اور تحریری طور پر آکشن اور نیلامی کی بھی ہے۔ مثلاً کوئی کمپنی اپنی مصنوعات کے بارے میں اعلان کرتی ہے یا شہتار لگاتی ہے اور اس میں چیز کے تمام اوصاف اور اس سے متعلق تمام تفصیلات لکھ دی جاتی ہیں۔ جس مقام میں نیلامی کی جاتی ہے، اس مقام اور وقت وغیرہ کو بھی لکھ لیا جاتا ہے اور ساتھ میں یہ بھی لکھ لیا جاتا ہے کہ خواہش مند حضرات اپنی بولی لکھ کر ہمارے اس پتے پر بھیج دیں۔ پھر مقررہ وقت اور متعین مقام پر سب خواہش مند اور کمپنی کے مالکان/فروخت کنندہ جمع ہو کر سر بمہر لفافے کھولتے ہیں اور چیک کرتے ہیں، جس نے سب سے زیادہ قیمت لگائی ہے اس کے نام کا اعلان کر کے سب کے سامنے اس شخص کو وہ چیز دے دی جاتی ہے۔

۲۔ حکم شرعی:

اس میں فقہاء کی دو رائے ہیں:

پہلی رائے:

ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ اس طرح کا معاملہ کرنا مکروہ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ ”سوم علی سوم اخیہ“ (کسی کے سودے پر سودا کرنا) کے زمرے میں آتا ہے جو کہ حدیث کی رو سے منع ہے۔

دوسری رائے:

تبہور فقہاء کے ہاں اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے۔

ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں سرور دو عالم ﷺ نے ایک صحابی کی چادر اور پیالہ فروخت کرنے کے لیے سحابہ کرام میں آواز لگائی کہ: کون مجھ سے یہ چادر اور پیالہ خریدے گا؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ میں ایک درہم میں خریدتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے دو درہم فرمایا کہ ایک درہم سے زیادہ کون دے گا؟ اس پر ایک شخص نے دو درہم پیش کیے

اور آپ سب کو بتانے کے لیے اس کو وہ چیزیں بیچ دیں۔^(۱)

جہاں تک رسوم علی رسوم آخیہ (دوسرے کی بیع/بھاد پر بیع یا بھاد کرنے) کی بات ہے تو یہ اس وقت منع ہے جب خریدار اور فروخت کنندہ کا قیمت پر اتفاق ہو جائے اور دونوں فریقین بیع کی طرف راغب ہو جائے۔ مذکورہ صورت اس سے خارج ہے۔ اس کی مزید تفصیل ”بیع مکروہ“ کے تحت بیان کر دی گئی ہے۔

۳۔ ایجاب و قبول:

فروخت کنندہ کا اعلان نہ ایجاب ہے، نہ قبول، بلکہ خریدار جب بولی لگاتا ہے تو وہ بولی ایجاب ہے اور پھر جب فروخت کنندہ اس بولی کو قبول کرتا ہے تو وہ قبول ہے۔

۴۔ دو سوالات:

۱۔ کیا فروخت کنندہ پر زیادہ بولی لازم ہے؟

ہر بولی ایک ایجاب ہے، اور فروخت کنندہ پر لازم نہیں ہے کہ وہ ایجاب کو قبول کرے، بلکہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی بولی کو قبول نہ کرے، کیونکہ ممکن ہے اس کو اپنی چیز کی مناسب قیمت نہ ملی ہو۔ اسی طرح فروخت کنندہ کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ زیادہ بولی لگانے والے کے بجائے، کم بولی لگانے والے کو چیز بیچ دے اور یہ بھی جائز ہے کہ فروخت کنندہ اپنی چیز کی کم از کم قیمت پہلے سے ہی مقرر کر دے کہ اس سے کم کوئی بھی بولی نہ لگائے، اس کو ”المزایدة مع الاحفظا“ (auction with reserve) کہتے ہیں۔

۲۔ کیا بولی لگانے والوں پر بولی لازم ہے؟

چونکہ ہر بولی بذات خود ایک ایجاب ہے اور جب تک ایجاب کو قبول نہ کیا جائے، ایجاب کرنے والا اپنے ایجاب سے رجوع کر سکتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی جب تک فروخت کنندہ بولی کو قبول نہ کرے، اس وقت تک ہر بولی والا اپنی بولی سے رجوع کر سکتا ہے اور فروخت کنندہ کو صرف اسی مجلس کی حد تک بولی کو قبول کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ اگر فروخت کنندہ نے کسی ایک کا ایجاب قبول کر لیا تو دونوں کے درمیان عقد لازم ہو جائے گا اور اس کے بعد وہ خریدار اپنی بولی سے رجوع نہیں کر سکتا۔^(۲)

۳۔ مناقصہ (Reverse Auction)

مناقصہ کے سلسلے میں تین نکات بیان کیے جائیں گے:

۱۔ مناقصہ کی تعریف

۲۔ بنیادی احکام

۳۔ اتفاقیات التورید

۱۔ مناقصہ کی تعریف:

”مناقصہ“ کا لفظ ”نقص“ سے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں کمی کرنا۔ یہ ”مزایدہ“ کا عکس ہے۔ اس کو انگریزی میں ”reverse auction“ کہتے ہیں۔ یہ طریقہ عموماً لوگ اختیار کرتے ہیں جو کسی خاص چیز یا خدمات کو کم قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مزایدہ میں بائع یعنی فروخت کرنے والا نیلامی کا اعلان کرتا ہے، جبکہ مناقصہ میں خریدار اعلان کرتا ہے کہ مجھے فلاں چیز یا فلاں قسم کی خدمات چاہیے، کون مجھے یہ چیزیں / خدمات کم قیمت میں مہیا کرے گا یا مجھے بوا کر دے گا؟

اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

طلب الوصول إلى أرخص عطاء، لشراء سلعة أو خدمة، تقدم فيها الجهة الطالبة لها الدعوة للراغبين إلى تقديم عطاءاتهم، وفق شروط ومواصفات محددة.^(۱)
سامان یا خدمات وغیرہ کے حصول کے لیے کم (سستی) بولی تک پہنچنے کو طلب کرنا۔ اس میں نیلامی کا اعلان کرنے والا فریق، خاص شرائط و صفات کے مطابق رغبت رکھنے والوں کو کم بولی لگانے کی دعوت دیتا ہے۔

۲۔ بنیادی احکام:

۱۔ اس کا حکم شرعی بھی وہی ہے جو مزایدہ کا ہے، کیونکہ دونوں میں خاص فرق نہیں، لہذا جس طرح مزایدہ جائز ہے یہ بھی جائز ہے۔ جس طرح مزایدہ میں زیادہ قیمت کی بولی لگائی جاسکتی ہے ایسے ہی یہاں کم قیمت کی بولی لگائی جاسکتی ہے۔

^(۱) قرارداد و بیعینات مجمع الفقہ الاسلامی التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ۱ - ۱۷۴ (ص: ۱۸۵) قرار رقم: ۱۰۷ (۱۲/۱) بشأن بیع عفود التورید والمناقصات.

۲۔ یہ طریقہ عموماً بڑے پروجیکٹس اور ٹھیکوں میں اختیار کیا جاتا ہے، وہاں جو بھی عقد ہو گا اس کی شرائط و ہر شرط ضروری ہوگا۔ مثلاً مناقصہ کے ذریعے اگر استصناع یعنی آرڈر کے ذریعے کوئی چیز بنوائی جا رہی ہے تو استصناع کی تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ اگر اجارہ (کرایہ داری) کا معاملہ ہے تو اجارہ کی تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہوگا۔

۳۔ جو بھی کمپنی نیلامی کرتی ہے خواہ مناقصہ کرے یا مزیدہ کرے، وہ ڈاکومنٹس تیار کرتی ہے جس میں بیچی جانے والی یا خریدی جانے والی اشیاء کی مکمل تفصیلات لکھی جاتی ہیں اور بولی لگانے والوں کو ڈاکومنٹس فراہم کر کے اس کے بدلے معاوضہ لیا جاتا ہے۔ اکثر علماء نے اس کی بھی اجازت دی ہے۔^(۱)

۴۔ کسی ممنوع و حرام چیز پر نہ مزیدہ کرنا جائز ہے نہ ہی مناقصہ۔

۵۔ مزیدہ و مناقصہ میں بخشش سے بچنا ضروری ہے، جس کی تفصیل بیع مکروہ کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے۔

۳۔ اتفاقیات التورید:

مناقصہ کے ذریعے سے کبھی فوراً عقد منعقد ہو جاتا ہے، جیسے مناقصہ کے ذریعے کسی کے ساتھ استصناع کا عقد کر کے اس سے کوئی چیز بنوانا۔ اور کبھی مناقصہ کے ذریعے عقد فوراً وجود میں نہیں آتا، بلکہ فی الحال صرف وعدہ ہوتا ہے، جیسے ”اتفاقیات التورید“ ہے۔ اگر ”اتفاقیات التورید“ پر مناقصہ ہو جائے تو یہ عقد فوراً منعقد نہ ہوگا، کیونکہ یہ محض ایک وعدہ ہے، جس میں رفتہ رفتہ اشیاء پر بیع ہوتی رہتی ہے۔

”اتفاقیات التورید“ ایک جدید اصطلاح ہے۔ یہ دو فریقین کے درمیان ہونے والا ایسا معاہدہ ہے جس میں ایک فریق دوسرے کو ایک خاص چیز، خاص مقدار میں وقتاً فوقتاً فراہم کرتا رہتا ہے۔ چیز فراہم کرنے والا فروخت کنندہ، جبکہ دوسرا فریق خریدار ہوتا ہے۔ قیمت یا تو شروع میں دے دی جاتی ہے یا بعد میں کسی خاص مدت کے بعد حساب کتاب کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی ہوٹل میں یومیہ ایک من دودھ استعمال ہوتا ہے، انہوں نے کسی سے عقد مناقصہ کے ذریعے معاملہ کیا، جو یومیہ ایک من دودھ ہوٹل والوں کو پہنچاتا رہے گا۔ اس کو ”عقد التورید“ یا ”اتفاقیات التورید“ کہتے ہیں۔

ایسے عقد میں چونکہ تمام چیزیں فوری طور پر نہیں بیچی جاتی، بلکہ یومیہ رفتہ رفتہ ایک خاص مقدار میں یہ چیزیں فراہم کی جاتی ہیں، اس لیے یہ عقد بھی فوراً منعقد نہیں ہوگا، بلکہ رفتہ رفتہ جتنی مقدار کی چیز فراہم کی جائے گی اس کی بیع منعقد ہوتی جائے گی۔ یہ معاملہ ”بیع استجرار“ کی طرح ہے، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اسلامک فنڈ اکیڈمی، جدہ نے مناقصہ سے متعلق ایک قرارداد میں لکھا ہے:

اولاً: عقد التورید: عقد یتعهد بمقتضاه طرف اول بأن یسلم سلعا معلومة. مؤجلة. بصفة دورية. خلال فترة معينة، لطرف آخر. مقابل مبلغ معين مؤجل كله أو بعضه.

ثانيا: إذا كان محل عقد التورید سلعة تتطلب صناعة. فالعقد استصناع تنطبق عليه أحكامه.

ثالثا: إذا كان محل عقد التورید سلعة لا تتطلب صناعة. وهي موصوفة في الذمة يلتزم بتسليمها عند الأجل. فهذا يتم بإحدى طريقتين:

أ- أن يعجل المستورد الثمن بكامله عند العقد، فهذا عقد يأخذ حكم السلم فيجوز بشروطه المعتبرة شرعا المبينة في قرار المجمع رقم ۸۵ (۹/۲).

ب- إن لم يعجل المستورد الثمن بكامله عند العقد، فإن هذا لا يجوز لأنه مبني على المواعدة الملزمة بين الطرفين.^(۱)

اول: عقد تورید ایسا عقد ہے جس میں ایک فریق یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ ایک معلوم چیز، رفتہ رفتہ، متعین زمانے میں، تھوڑی تھوڑی دوسرے فریق کو معلوم و متعین معاوضہ کے بدلے فراہم کرے گا، یہ معاوضہ مکمل بعد میں دیا جانا طے ہو یا بعض۔

دوم: اگر عقد تورید کا محل ایسی چیز ہے جو صنعت کا مقضیٰ ہے تو وہاں عقد استصناع منعقد ہوگا، اس پر استصناع کے احکام منطبق ہوں گے۔

سوم: اگر محل تورید ایسی چیز ہے جو صنعت کا مقضیٰ نہیں ہے اور وہ کسی کے ذمہ لازم ہو، کہ وہ متعین وقت میں اسے دوسرے کو حوالے کرے گا تو ایسا عقد دو طریقے سے مکمل ہو سکتا ہے:

الف- مستورد (خریدار) مکمل قیمت عقد کے وقت ہی دیدے تو یہ بیع سلم ہے، جس پر سلم کے احکام لاگو ہوں گے۔

ب- اگر مستورد (خریدار) مکمل قیمت شروع میں نہ دے تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ معاملہ دو طرفہ وعدہ الازمہ پر مبنی ہے۔

بعض ماہر نے آخری صورت کے بارے میں لکھا ہے کہ شروع سے ہی عقد کر لینا تو درست نہیں ہے، کیونکہ یہ

مستقبل کی طرف منسوب معاملہ (مضاف الی المستقبل) ہے، البتہ مفاہمت اور وعدہ کیا جاسکتا ہے، اصل بیع اس وقت منعقد ہوگی جب چیز خریدار کے پاس پہنچتی رہے گی اور یہ بیع تعاطی یا بیع الا تجرار ہوگی۔^(۱)

۵۔ بیع عینہ (Buyback)

بیع عینہ کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل تین نکات ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

۱۔ بیع عینہ کا تعارف

۲۔ حکم شرعی

۳۔ جائز صورتیں

۱۔ بیع عینہ کا تعارف:

بیع عینہ (buyback) کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو اپنی کوئی چیز ادھار فروخت کر دے اور پھر چیز اس کے حوالے کر دے اور قیمت کی وصولی سے پہلے ہی اس سے وہی چیز سستی قیمت میں نقد خرید لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیع عینہ کے اندر بنیادی طور پر دو عقد ہوتے ہیں۔ پہلا عقد ادھار ہوتا ہے اور دوسرا نقد ہوتا ہے۔ اسی کو فقہاء ”شراء ماباع بأقل مما باع“ بھی کہتے ہیں۔

مثلاً زید نے عمر کو اپنا موبائل دس ہزار روپے کے بدلے فروخت کر دیا اور قیمت کی ادائیگی چار مہینے بعد طے ہوئی۔ پھر وہی موبائل عمر سے نو ہزار میں نقد خرید کر اس کو نو ہزار روپے فی الفور دے دیے۔ لہذا اب چار مہینے بعد عمر، زید کو دس ہزار روپے کی ادائیگی کرے گا۔

ہی بیع العین بئمن زائد نسیئۃ، لیببعہا المستقرض بئمن حاضر أقل، لیقضی دینہ۔^(۲)

کسی چیز کو ادھار زیادہ قیمت پر بیچنا، تاکہ مستقرض (خریدار) اس چیز کو نقد کم قیمت میں (فروخت کنندہ کو) بیچ دے اور اپنا قرض ادا کر سکے۔

علامہ رافعی اس عبارت کے تحت لکھتے ہیں:

بأن بیع شینا من غیرہ بئمن مؤجل، وبسلمہ إلی المشتري، ثم یشریہ بانعہ قبل

قبض الثمن بئمن نقد أقل من ذلك القد.

کوئی شخص اپنی کوئی چیز دوسرے کو ادھار قیمت پر بیچ دے، اور خریدار کو چیز حوالے کر دے، پھر فروخت کنندہ قیمت کی وصولی سے قبل اسی خریدار سے وہ کم قیمت میں نقد پر خرید لے۔

۲۔ حکم شرعی:

فقہاء مالکیہ، حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں یہ صورت ممنوع ہے۔ یہ سود کا ایک حیلہ ہے، جو کہ شرعاً درست نہیں ہے۔ کئی احادیث میں اس طرح کی بیچ کو منع کیا گیا ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرف اس کا جواز منسوب ہے، جبکہ امام محمد رحمہ اللہ سے کراہت منقول ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے دونوں اقوال میں تطبیق دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر اس معاملہ میں چیز واپس فروخت کنندہ کے پاس آجائے تو یہ مکروہ تحریمی ہے اور اگر چیز واپس فروخت کنندہ کے پاس نہ آئے، بلکہ خریدار اس چیز کو کہیں اور فروخت کر دے تو یہ جائز ہے، جس کو ”تورق“ کہتے ہیں۔ فقہاء شافعیہ کے ہاں بیع عینہ جائز ہے۔^(۱)

۳۔ جائز صورتیں:

- ۱۔ اگر کوئی شخص دوسرے کو اپنی کوئی چیز فروخت کر دے اور پھر اس سے وہی چیز واپس اصل قیمت پر یا اصل قیمت سے زیادہ پر خرید لے تو یہ جائز ہے۔
- ۲۔ اسی طرح اگر کسی نے اپنی کوئی چیز دوسرے کو بیچ دی اور پھر دوسرے شخص کے پاس اس چیز میں کوئی عیب یا نقص آگیا تو ایسی صورت میں عیب و نقص کی وجہ سے قیمت کم کر کے پہلا شخص واپس یہ چیز خرید سکتا ہے۔ یہاں قیمت کی کمی سود شمار نہیں ہوگی، کیونکہ یہ عیب و نقص کے بدلے میں کی گئی ہے۔
- ۳۔ بیع عینہ کی طرح ایک صورت تورق کی ہے، جس کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

۶۔ تورق (Monetization)

تورق کے بنیادی نکات تین ہیں:

۱۔ تورق کی تعریف

۲۔ حکم شرعی

۳۔ صورتیں

۱۔ تورق کی تعریف:

”تورق“ کا لفظ ”ورق“ سے بنا ہے۔ اس سے لغوی معنی خیر، مال اور درخت کا پتے ہیں۔ اسی معنی سے اس جملی ایک دوسری صورت ہے جسے فقہاء حنابلہ ”تورق“ کا نام دیتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص و بیبیوں کی ضرورت ہو اور وہ دوسرے سے قرض لینے جائے، لیکن دوسرا شخص اس کو قرض دینے پر آمادہ نہ ہو، بلکہ اپنی کوئی چیز اس کو ادھار مانگے داموں فروخت کر دے۔ پھر خریدار اس چیز کو بازار میں کسی تیسرے آدمی کے ہاتھ نقد سے داموں پر فروخت کر کے رقم حاصل کر لے۔ مثلاً عمر نے زید سے دس ہزار کا ادھار موبائل خرید اور اُسے لے جا کر بازار میں کسی کو نو ہزار روپے میں نقد فروخت کر دیا اور رقم لے کر اپنی ضرورت میں استعمال کر لی۔

والتورق في الاصطلاح أن يشتري سلعة نسيئة، ثم يبيعها نقدا - لغبر البائع - بأقل

مما اشتراها به؛ ليحصل بذلك على النقد.^(۲)

تورق کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کو ادھار خرید کر، فروخت کنندہ کے علاوہ کسی اور کو خریدی ہوئی قیمت سے کم قیمت پر، نقد بیچ دینا، تاکہ نقد رقم حاصل ہو۔

۲۔ حکم شرعی:

یہ صورت فقہاء حنابلہ کے ہاں جائز ہے۔ فقہاء حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے، جبکہ امام محمدؒ کے ہاں یہ صورت مکروہ ہے۔ تاہم علامہ ابن المہمامؒ تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امام محمد نے جس صورت کو مکروہ لکھا ہے، اس سے عینہ مراد ہے (جس میں چیز واپس فروخت کنندہ کو بیچی جاتی ہے) تورق مراد نہیں ہے، تورق جائز ہے، البتہ اگر کوئی حاجت مند ہو تو اس کے ساتھ تورق کا معاملہ کرنے کے بجائے اسے قرض حسن دینا چاہیے۔^(۳) فقہاء مالکیہ کے ہاں یہ صورت جائز نہیں ہے، جبکہ فقہاء شافعیہ کے ہاں بیع عینہ کی طرح یہ صورت بھی جائز ہے۔^(۴)

۳۔ صورتیں:

تورق کی بنیادی طور پر چار صورتیں ہیں:

^(۱) معجم مقاییس اللغة لابن فارس ۱۰۱/۶

^(۲) الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۴۷/۱۴

^(۳) فتح القدير ۲۲۱/۱۶

^(۴) فقه البيوع ۵۳۳/۱

۱۔ اتفاقی تورق:

اتفاقی تورق سے وہ صورت مراد ہے جس کی وضاحت ”تورق کی تعریف“ کے تحت بیان کردی گئی ہے۔ اس صورت میں چیز واپس اصل مالک یعنی فروخت کنندہ کو نہیں ملتی۔

۲۔ منظم تورق:

اس کا مطلب یہ ہے کہ فروخت کنندہ، خریدار سے خود تو چیز واپس نہ خریدے، لیکن کوئی ایسی ترتیب کر لے جس کی وجہ سے چیز واپس اسی کے پاس آجائے، مثلاً فروخت کنندہ اپنا کوئی نائب مقرر کر لے جو خریدار سے چیز کم قیمت میں نقد پر خرید کر فروخت کنندہ کو دے دے۔ اس میں اگرچہ درمیان میں تیسرا شخص آیا ہے، لیکن یہ بھی عینہ ہی ہے، اس لیے ”تورق منظم“ شرعاً جائز نہیں ہے۔

۳۔ تورق عکسی:

یہ بھی تورق منظم کی طرح ہے۔ تاہم اس کی صورت یہ بیان کی جاتی ہے کہ مثلاً کسی شخص نے دوسرے کو کسی چیز کے خریدنے کا وکیل بنا کر اس کو نقد رقم بھی دے دی۔ دوسرے شخص (وکیل) نے وہ چیز خریدی۔ خریدنے کے بعد وکیل، اصل خریدار (مؤکل) سے وہی چیز مہنگی قیمت پر خود خرید لے۔

مثلاً زید نے بینک کو ایک خاص گاڑی خریدنے کے لیے وکیل بنا کر اس کو نقد رقم (مثلاً دس لاکھ) دے دی۔ بینک نے وہ گاڑی خریدی اور پھر زید سے وہی گاڑی واپس مہنگی (مثلاً گیارہ لاکھ) پر قسطوں میں یا ادھار خرید لی۔ اس صورت کو بھی علماء نے ممنوع لکھا ہے۔

۴۔ تورق مصرنی:

تورق کی یہ صورت بعض اسلامی بینکوں میں رائج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بینک اپنے کسی کسٹمر کے مطالبہ پر کوئی چیز خرید کر کسٹمر کو بیچ دے اور کسٹمر وہ چیز خریدنے کے بعد اسی بینک کو اس بات کا وکیل بنا دے کہ بینک وہ چیز کسی تیسرے فرد کو بیچ دے اور رقم لے کر کسٹمر کو دے دے۔ اس میں اور عام تورق میں صرف یہ فرق ہے کہ اس میں بینک کو بیچ دینے کا وکیل بنایا جاتا ہے، لہذا اس میں ”وکالت“ کا عنصر اضافی ہے۔

معاصر علماء نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن ایک تو یہ ضروری ہے کہ تمام عقود و معاملات الگ الگ کیے جائیں اور باقاعدہ حقیقی معنوں میں عقد کیا جائے، خریدار کو چیز بھی قبضہ میں دے دی جائے، صرف کاغذی کارروائی اور صورتی حق نہ ہو اور بینک اپنے کسٹمر کی چیز واپس خود نہ خریدے، نہ ہی اپنی کسی شاخ یا ذیلی ادارے کو بیچے۔

شیخ تالیف لکھتے ہیں:

هو أن يطلب العميل من المصرف شراء سلعة، ثم بعد أن يشتريها المصرف يقدّم العميل بشرائه منه، ثم يوكل العميل المصرف لبيعها نيابة عنه، هذا هو التورق المصرفي^(۱)

کسٹمر، بینک سے کسی چیز کے خریدنے کا مطالبہ کرے، پھر بینک کی خریداری کے بعد کسٹمر بینک سے وہ چیز خرید لے اور پھر کسٹمر، بینک کو وہ چیز آگے بیچنے کا وکیل بنا دے۔ یہ تورق مصرفی ہے۔
مجمع الفقہ الاسلامی نے اس موضوع پر درج ذیل قرارداد منظور کی ہے:

(۱) التورق في اصطلاح الفقهاء: هو شراء شخص (المستورق) سلعة بثمن مؤجل من أجل أن يبيعها نقداً بثمن أقل غالباً إلى غير من اشترت منه بقصد الحصول على النقد. وهذا التورق جائز شرعاً، شرط أن يكون مستوفياً لشروط البيع المقررة شرعاً.

(۲) التورق المنظم في الاصطلاح المعاصر: هو شراء المستورق سلعة من الأسواق المحلية أو الدولية أو ما شابهها بثمن مؤجل يتولى البائع (الممول) ترتيب بيعها، إما بنفسه أو بتوكيل غيره أو بتواطؤ المستورق مع البائع على ذلك، وذلك بثمن حال أقل غالباً.

(۳) التورق العكسي: هو صورة التورق المنظم نفسها مع كون المستورق هو المؤسسة والممول هو العميل.

ثانياً: لا يجوز التورقان (المنظم و العكسي) وذلك لأن فيهما تواطؤاً بين الممول والمستورق، صراحة أو ضمناً أو عرفاً، تحايلاً لتحصيل النقد الحاضر بأكثر منه في الذمة وهو ربا.^(۲)

۱۔ فقہی اصطلاح میں تورق کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص (مستورق/تورق کا طالب) کسی چیز کو ادھار اس نیت سے خریدے کہ اسے فروخت کنندہ کے علاوہ کسی اور کو نقد کم قیمت پر بیچ کر نقد رقم حاصل کی جائے۔ تورق شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ اس میں بیچ کی تمام شرائط پائی جائیں۔

مقدمہ فی الصیرفۃ الاسلامیۃ ص: ۱۲۳
فقہاء و توصیات مجمع الفقہ الاسلامی الدولي (۱-۱۸۵-۱۹۰-۱۹۳ھ) (ص: ۳۶۴) قرار رقم: ۱۷۹ (۱۹۹۵)
سنة التورق

۲۔ جدید اصطلاح میں منظم تورق کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص لوکل بازار سے یا بین الاقوامی مارکیٹ سے کوئی چیز ادھار خرید لے، اور فروخت کنندہ خود یا وکیل کے ذریعے اس چیز کی کم قیمت پر اگلی بیع کی ترتیب بنائے (دوبارہ خود یا وکیل کے ذریعے خرید لے) یا خریدار کے ساتھ اس بات پر اتفاق کر لے۔ یہ (دوسری بیع) عموماً کم قیمت پر ہوتی ہے۔

۳۔ تورق عکسی کی صورت بھی منظم تورق کی طرح ہے، البتہ اس میں مستورق (تورق طلب کرنے والا) ادارہ یا بینک ہوتا ہے اور تمویل کار کلائنٹ ہوتا ہے۔

دوم: منظم تورق اور تورق عکسی جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں تمویل کار اور کلائنٹ کے درمیان صراحت کے ساتھ یا ضمنیاً عرفاً اتفاق ہوتا ہے اور یہ اس کے لیے حیلہ ہے کہ موجود نقد رقم کو حاصل کر کے اس سے زیادہ رقم اپنے ذمہ لازم کی جائے، اور یہی رہا ہے۔

تورق پر استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے، جس کے آخر میں ”خلاصۃ البحث“ کے عنوان سے حضرت نے مندرجہ ذیل نکات لکھے ہیں:

(۱)۔ تورق یہ ہے کہ کوئی شخص سامان زیادہ قیمت پر ادھار خریدے، پھر وہ سامان کم قیمت پر دوسرے شخص کو نقد فروخت کر دے، تاکہ اس کو فوراً رقم مل جائے، جس سے وہ اپنی ضرورت پوری کر لے۔

(۲)۔ تورق اور بیع عینہ میں یہ فرق ہے کہ تورق میں انسان چیز کو کسی تیسرے شخص پر فروخت کرتا ہے، جبکہ عینہ میں خریدار اس چیز کو واپس فروخت کنندہ پر ہی بیچتا ہے۔

(۳)۔ امام احمد سے تورق کے بارے میں دو اقوال منقول ہیں، جن میں جواز والا قول زیادہ ظاہر ہے اور ابن ماجہ سے محقق علماء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، جبکہ امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیم ان سے عدم جواز کے قائل ہیں۔

(۴)۔ فقہاء شافعیہ کے قواعد کے مطابق تورق کا عقد جائز ہے، کیونکہ ان کے ہاں بیع عینہ جائز ہے۔ تورق بطریق اولیٰ جائز ہے۔

(۵)۔ فقہاء مالکیہ نے بیع عینہ کو حرام قرار دینے میں سختی اختیار کی ہے، لیکن انہوں نے بیع عینہ کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ چیز واپس پٹیا فروخت کنندہ کے پاس آجائے، اگر خریدار اس چیز کو بائع

اول (فروخت کنندہ) کو واپس نہ بیچے، بلکہ کسی تیسرے شخص کو فروخت کر دے تو ان کے ہاں یہ حرام نہیں ہے۔

(۶)۔ بعض متاخرین حنفیہ نے تورق کو بھی بیع عینہ قرار دیکر مکروہ لکھا ہے، لیکن علامہ ابن ہمام کی رائے یہ ہے کہ اگر سامان واپس فروخت کنندہ کے پاس لوٹ جائے تو یہ عینہ ہے، لیکن اگر خریدار اس چیز کو کسی تیسرے شخص پر بیچ دے تو یہ بلا کراہت جائز ہے، البتہ خلاف اولیٰ ہے، جمہور حنفیہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

(۷)۔ ائمہ اربعہ کے ہاں مختار قول کے مطابق تورق جائز ہے، لیکن غیر سودی قرض دینا زیادہ افضل ہے۔

(۸)۔ تورق کا جواز اس وقت ہے جب اس کے ساتھ دوسرے مشتبہ معاملات ملے ہوئے نہ ہوں۔^(۱)

۷۔ بیع بالتقسیم (Installment Credit Sale)

بیع بالتقسیم / قسطوں پر خرید و فروخت کے بنیادی احکام کو مندرجہ ذیل چار نکات میں بیان کیا جائے گا:

۲۔ شرائط

۱۔ بیع بالتقسیم کا تعارف

۳۔ تاخیر پر جرمانہ

۳۔ جلدی ادائیگی پر ڈسکاؤنٹ

۱۔ بیع بالتقسیم کا تعارف:

”تقسیم“ کا مطلب ہے کسی چیز، قرض یا قیمت وغیرہ کو قسطوں پر تقسیم کر دینا۔ اور ”بیع بالتقسیم“ کا مطلب ہے اپنی خرید و فروخت جس میں مکمل قیمت کی ادائیگی فی الفور نہیں کی جاتی اور نہ ہی مکمل قیمت کی وصولی کا کوئی ایک متعین دن طے کیا جاتا ہے، بلکہ قیمت کو قسطوں کی شکل میں مختلف اوقات میں اداء کیا جاتا ہے۔

بيع التقسيط: هو لون من ألوان بيع النسئنة، فهو بيع يتفق فيه على تعجيل المبيع وتأجيل الثمن كله أو بعضه على أقساط معلومة لأجال معلومة. وهذه الأجال قد تكون منتظمة المدة في كل شهر مثلاً قسط أو في كل سنة أو غير ذلك.

كما أنها قد تكون متساوية المقدار أو متزايدة أو متناقصة.^(۲)

بیع التقسیت: یہ ادھار خرید و فروخت کی ایک قسم ہے۔ یہ ایسی بیع ہے جس میں بیع کی فوری وصولی اور مکمل یا بعض قیمت کے ادھار پر یوں اتفاق ہوتا ہے کہ قیمت کو مختلف معلوم اوقات میں ادا کیا جائے گا۔ ان اوقات کی مدت کبھی مرتب و منظم ہوتی ہے، مثلاً ہر ماہ یا ہر سال ایک قسط کی ادائیگی ہوگی۔ اسی طرح قسطوں کی ادائیگی کی مدت کبھی برابر، کبھی زیادہ تو کبھی کم ہوتی ہے۔
مجلہ الاحکام العدلیہ میں ہے:

(۱) التَّقْسِیْتُ تَأْجِیلُ أَداءِ الدَّیْنِ مُفْرَقًا إِلَى أَوْقَاتٍ مُتَعَدِّدَةٍ مُعَیَّنَةٍ (۱)

تقسیت کا مطلب ہے کہ دین / قرض (یا قیمت) کی ادائیگی کو کئی متعدد و متعین اوقات پر تقسیم کر دینا۔

۲۔ شرائط:

قسطوں کی خرید و فروخت کے لیے بنیادی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بیع کی بنیادی شرائط پائی جائیں، مثلاً جائز اور حلال اشیاء کا کاروبار ہو۔ اپنی مملوکہ چیز بیچی جائے۔ زمین کے علاوہ کوئی چیز ہو تو قبضہ کرنے کے بعد بیچی جائے۔ جس چیز کو بیچا جائے تو اس کو فوراً خریدار کے حوالے کیا جائے، کیونکہ سلم و استسناع کے علاوہ دیگر صورتوں میں بیع کو ادھار کرنا درست نہیں ہے۔

۲۔ مجلس عقد میں چیز کی پوری قیمت طے کر لی جائے۔

۳۔ قسطیں متعین کر لی جائیں۔

۴۔ قیمت / قسط ادا کرنے کی مدت متعین کر لی جائے۔

۵۔ قسط کی مدت کے اندر اندر ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں خریدار پر مالی جرمانہ، یا اس سے کسی قسم کی مزید رقم کا مطالبہ نہ کیا جائے، کیونکہ یہ سود میں داخل ہے۔

۳۔ جلدی ادائیگی پر ڈسکاؤنٹ:

اگر خریدار قسطوں کو وقت سے پہلے ادا کر دے تو کیا اس کو ڈسکاؤنٹ دیا جاسکتا ہے؟ اس کے جواب کے لیے دو صورتیں ذہن میں رکھیں:

۱۔ اگر فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان باقاعدہ عقد کے اندر شرط کے طور پر یہ بات طے شدہ ہو کہ اگر خریدار وقت سے پہلے قسطوں کی ادائیگی کرے گا تو اس کو اتنا ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا تو یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے۔ اس

نیز تفصیل ”ضع و تعجل“ میں آجائے گی۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں نے آپس میں ایسی کوئی شرط نہ رکھی ہو، نہ زبانی نہ تحریری، بلکہ خریدار اپنی سہولت یا کسی بھی وجہ سے قسطیں جلدی ادا کر دیتا ہے اور فروخت کنندہ اس سے خوش ہو کر اپنی طرف سے اس کو چھوڑ دینا دے دیتا ہے تو یہ تبرع و احسان ہے اور جائز ہے۔

۳۔ تاخیر پر جرمانہ:

الف۔ اصل حکم:

اگر خریدار قسط کی ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے تو کیا اس پر مالی جرمانہ لازم کیا جاسکتا ہے؟ اس کو فقہی اصطلاح میں ”تعزیر بالمال“ کہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء حنابلہ، شافعیہ اور حنفیہ کی رائے کے مطابق تو مالی جرمانہ لینا جائز نہیں ہے، لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی ایک روایت، علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم رحمہم اللہ کے مذہب کے مطابق مالی جرمانہ وصول کرنے کی گنجائش ہے۔ علامہ ابن فرحون نے مالکیہ کی رائے بھی جواز کی لکھی ہے۔

صاحب بزازیہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی روایت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ سلطان اور حاکم کے لیے مجرم کی مصلحت کے پیش نظر مالی جرمانہ وصول کر کے اپنے پاس روکنے کی اجازت ہے، تاکہ مجرم اپنے جرم سے باز آجائے، پھر جب مجرم تائب ہو جائے تو وصول کیا ہوا جرمانہ اس کو واپس کر دیا جائے، البتہ اگر توبہ سے ناامید ہو جائے تو اس کو جہاں چاہے خرچ کر سکتا ہے، جبکہ بعض فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس قول کو مطلق ذکر کیا ہے کہ حاکم اور سلطان مالی جرمانہ وصول کر کے بیت المال میں ڈال سکتا ہے، تاہم علماء نے جمہور کی رائے کو لے کر اس طرح کے جرمانہ کو ناجائز قرار دیا ہے۔^(۱)

ب۔ متبادل صورت:

قسطوں میں تاخیر پر جرمانہ وصول کرنا چونکہ اکثر فقہاء کے ہاں جائز نہیں ہے، اس لیے عموماً اس کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بجائے درج ذیل دو متبادل صورتوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے:

- ۱۔ ایئرےمنٹ میں یہ بات طے کر لیں کہ اگر خریدار نے قسط کی ادائیگی میں تاخیر کر دی تو تمام قسطوں کی ادائیگی فوری اور نقد کرنا ہوگی۔ لہذا جب خریدار قسط میں تاخیر کرے گا تو اس پر تمام قسطیں فوراً ادا کرنا لازم ہو جائیں گی۔
- ۲۔ ایئرےمنٹ میں یہ بھی طے کیا جاسکتا ہے کہ اگر خریدار قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر اور مال مٹول کرے گا تو

فروخت کنندہ کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ خریدار کی چیز بازاری قیمت پر ضبط کر لے گا۔ اس صورت میں اگر خریدار قیمتوں کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرے گا تو فروخت کنندہ اس کی چیز کو بازاری قیمت پر ضبط کر لے گا اور کمی بیشی کو پورا کر لیا جائے گا۔ اگر چیز کی قیمت بقیہ قسطوں سے زیادہ ہے تو اضافی قیمت واپس کرنا ضروری ہے۔

اس موضوع سے متعلق مجمع الفقہ الاسلامی، جدہ نے ایک قرارداد منظور کی ہے، جو یہ ہے:

• البیع بالتقسیت جائز شرعاً، ولو زاد فيه الثمن المؤجل علی المعجل.

• يجوز اتفاق المتداینین علی حلول سائر الأقساط عند امتناع المدین عن وفاء آی

قسط من الأقساط المستحقة علیه ما لم یکن معسراً.

• إذا اعتبر الدین حالاً لموت المدین أو إفلاسه أو مماطلته، فيجوز فی جمیع هذه

الحالات الحط منه للتعجيل بالتراضي.

• ضابط الإعسار الذي یوجب الإنظار: ألا یكون للمدین مال زائد عن حوائجه

الأصلية یفی بدینه نقداً أو عیناً.^(۱)

• قسطوں پر بیع کرنا جائز ہے، اگرچہ اس میں ادھار قیمت کو نقد سے زیادہ کیا جائے۔

• قرض خواہ اور مستقرض کا اس بات پر اتفاق کرنا جائز ہے کہ اگر خریدار نے کسی بھی قسط کی ادائیگی

میں تاخیر کر دی، جس کی ادائیگی لازم ہو چکی ہو، تو اس پر تمام اقساط کی ادائیگی فوراً واجب

ہو جائے گی، بشرطیکہ وہ تنگ دست نہ ہو۔

• جب مقروض (خریدار) کی موت، یا افلاس یا ٹال مٹول کی وجہ سے اس پر تمام اقساط کی ادائیگی

فوری طور پر لازم ہو گئی تو ان حالات میں باہمی رضامندی سے قرض میں کچھ کمی کرنا جائز ہے۔

• ایسی تنگ دستی جس کی وجہ سے مقروض کو کچھ رعایت اور سہولت دینا لازم ہوتا ہے، اس کا ضابطہ یہ

ہے کہ مقروض کے پاس اپنی ضروری حاجات کے علاوہ اتنا مال، عین یا نقد کی شکل میں نہ ہو جس

سے قرض ادا ہو سکے۔

۸۔ وضع و تعجل (Discount for Accelerated Payment)

”وضع و تعجل“ ایک جدید اصطلاح ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے تین نکات کافی ہیں:

^(۱) قرارات وتوصيات مجمع الفقہ الاسلامی التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامی ۱ - ۱۷۴ (ص: ۱۰۱) قرار رقم: ۶۴ (۷/۲) نشاء

۱۔ وضع و تعجل کی تعریف

۲۔ حکم شرعی

۳۔ شرائط

۱۔ وضع و تعجل کی تعریف:

”وضع“ کے معنی ہے رکھنا، کمی کرنا۔ جبکہ ”تعجل“ کے معنی ہے جلدی کرنا، وقت سے پہلے کسی کام کو انجام دینا۔ اس اصطلاح کا فقہی مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین / مالی حق ہو، جس کی ادائیگی کے لیے مستقبل کی کوئی تاریخ طے کی گئی ہو۔ جس شخص پر دین (قرض) لازم ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ اگر اس نے وقتِ ادائیگی سے پہلے دین ادا کر دیا تو اس کو کچھ ڈسکاؤنٹ دیا جائے اور دین میں کمی کی جائے، لہذا اس کے مطالبہ پر یا قرض خواہ / دائن یہ مطالبہ کرے کہ تم وقت سے پہلے دین / قرض ادا کر دو، میں اس سے اتنی کمی کر لوں گا۔ اس کو ”وضع و تعجل“ کہتے ہیں۔ اسی کو عربی میں ”الحط من الثمن عند السداد المبكر“ بھی کہتے ہیں۔

موسوعہ فقہیہ کویتیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

وهي تعجيل الدين المؤجل في مقابل التنازل عن بعضه.^(۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس دین / قرض کی ادائیگی کا وقت مؤخر ہو، اس میں کمی کر کے فوری ادائیگی کرنا۔

۲۔ حکم شرعی:

اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں:

پہلی رائے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کی طرف اس کا جواز منسوب ہے۔ یہی امام احمدی بھی ایک روایت ہے جس کو علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم اور علامہ شوکانی رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے۔

دوسری رائے: جمہور فقہاء کے ہاں یہ ناجائز ہے۔ اس کے ناجائز ہونے کی دو وجوہات ہیں:

۱۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس صورت کو ربا کہا ہے۔ کسی صورت کے

ناجائز ہونے کے لیے یہ بھی کافی ہے۔

۲۔ یہ بھی درحقیقت ربا بالجہلیہ کی صورت ہے، جس میں کچھ وقت کے لیے قرض دے کر اس پر اضافی سود لگایا

جاتا تھا، اس کو قرآن میں سود قرار دے کر حرام قرار دیا گیا۔ اس صورت میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ اجل اور وقت کے بدلے رقم میں کمی کی جاتی ہے۔^(۱)

تیسری رائے: مجمع الفقہ الاسلامی، جدہ نے ایک قرارداد میں یہ رائے اختیار کی ہے کہ وقت سے پہلے دین کی ادائیگی پر کچھ ڈسکاؤنٹ دینا اور اس طرح کے ڈسکاؤنٹ کا مطالبہ کرنا دو شرائط کے ساتھ جائز ہیں:

الف- اس ڈسکاؤنٹ پر عقد کے وقت / شروع میں اثنان اور کوئی ایگریمنٹ نہ ہوا ہو کہ اگر مدیون / مقرض وقت سے پہلے ادائیگی کرے گا تو اس کو ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا۔

ب- یہ معاملہ صرف دائن (قرض خواہ) اور مدیون (مقرض) کے درمیان ہو، کوئی تیسرا شخص درمیان میں نہ آئے۔ اگر کوئی تیسرا شخص آکر مدیون کا دین جلدی ادا کر کے اس پر ڈسکاؤنٹ لے کر خود رکھتا ہے تو یہ سود ہے۔^(۲)

۳- شرائط:

جن فقہاء نے ”ضع وتعجل“ کو ممنوع قرار دیا ہے، ان کے ہاں یہ صورت دو شرائط کی موجودگی میں ممنوع ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شرط موجود نہ ہو تو پھر یہ جائز ہے:

۱- حرمت کی ایک شرط یہ ہے کہ دین مؤجل ہو، یعنی اس کی ادائیگی کا وقت ابھی نہ آیا ہو۔ اگر دین حال ہے، جس کی ادائیگی فوری واجب ہے تو اس میں ”ضع وتعجل“ حرام نہیں ہے، کیونکہ وہاں کمی کو کسی وقت کا مقابل نہیں کہہ سکتے ہیں۔^(۳)

۲- حرمت کی دوسری شرط یہ ہے کہ دونوں فریقین نے یا تو ایگریمنٹ / عقد میں یہ شرط طے کر لی ہو کہ اگر مقرض وقت سے پہلے قرض اداء کرے گا تو اس کو ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا، یا بعد میں اس بات کو شرط لگا کر جلدی ادائیگی کا مطالبہ کیا جائے، خواہ قرض خواہ کی طرف سے مطالبہ ہو یا مقرض کی طرف سے۔ البتہ اگر اتفاقی طور پر بغیر شرط اور سابقہ اتفاق سے کسی نے اپنا قرض دین وقت سے پہلے ادا کر دیا اور قرض خواہ خوش ہو کر اپنی طرف سے کچھ ڈسکاؤنٹ دے دے تو یہ بھی جائز ہے۔

^(۱) اجازت قلمین، ص ۱۰۱۔ اہل سنت والجماعت، ج ۱، ص ۱۷۰۔ حواشی، ص ۱۷۰۔ الموسوعة الفقهية

۹۔ عربون (Barnest Money)

عربون کے لیے دو نکات سمجھنا کافی ہیں:

۱۔ عربون کا تعارف

۲۔ حکم شرعی

۱۔ عربون کا تعارف:

”عربون“ کا لفظ مختلف طریقوں سے پڑھا گیا ہے: ”عزْبُون، عَرَبَان، عَزْبَان“، لیکن مشہور بین کے فتح کے ساتھ ”عزْبُون“ ہے۔ لغت میں اس لفظ کے معنی عقد اور معاملہ کے آتے ہیں۔ اسی طرح اس کے معنی کسی بھی چیز کے ابتدائی حصہ کے بھی آتے ہیں۔^(۱)

اس کی اصطلاحی تعریف یوں کی گئی ہے کہ خریدار، فروخت کنندہ سے کوئی چیز خرید لے اور کچھ رقم بھی ادا کر دے، لیکن اپنے لیے خیار شرط رکھے کہ مثلاً تین دنوں کے اندر اگر معاملہ نافذ و مکمل کر دیا تو یہ ابتدائی رقم، شمن (قیمت) کا حصہ بن جائے گی اور بقیہ قیمت بھی ادا کر دی جائے گی۔ اور اگر معاملہ مکمل نہ کیا، بلکہ رد کر دیا تو جو رقم ابتداء میں دی گئی ہے وہ فروخت کنندہ کی ہو جائے گی۔

العربون: هو مبلغ من المال يدفعه العميل المشتري إلى المؤسسة بعد إبرام العقد على أنه إن أمضى البيع خلال المدة المحددة احتسب المبلغ من الثمن وإن عد عن الشراء يكون المبلغ كله للمؤسسة.^(۲)

عربون: یہ مال کی وہ مقدار ہے جو گاہک / خریدار، عقد ہو جانے کے بعد ادارے کو اس طور پر دیتا ہے کہ اگر اس نے مقررہ مدت میں بیع نافذ کر دی تو یہ رقم قیمت میں شمار ہو جائے گی، اور اگر اس نے خریداری سے انکار کر دیا تو یہ ساری رقم ادارے کی ہو جائے گی۔

۲۔ حکم شرعی:

عربون رکھنا / دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ جمہور فقہاء حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اس کو ناجائز کہتے ہیں، جبکہ فقہاء حنابلہ کے ہاں عربون جائز ہے۔ اسی طرح معاصر فقہاء کی آراء بھی اس سلسلے میں مختلف ہیں۔ شیخ

^۱ المنقح للباہی ۲۴۳/۴

^۲ المعاییر الشرعية ص: ۷۸، رقم المعیار: ۸

حدائق الشریعہ کی رائے میں عربوں ناجائز ہے، جبکہ شیخ وہبہ زحیلی اور شیخ مصطفیٰ انور قاء وغیرہ کے ہاں یہ جائز ہے۔ اس سلسلے میں نقلی دلائل مختلف ہیں، بعض دلائل سے اس کا جواز اور بعض سے اس کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔ تفصیل کے لیے ”فقہ البیوع“ ملاحظہ فرمائیں۔

رائع قول جمہور کا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بیع نافذ نہ ہونے کی صورت میں فروخت کنندہ کا ثمن کا مالک بننا کس بنیاد پر ہے؟ یہاں ایسا کوئی شرعی سبب موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر فروخت کنندہ کو عربوں یا ابتدائی رقم کا مالک قرار دیا جائے۔ البتہ مسئلہ چونکہ اختلافی ہے، اس لیے جہاں ضرورت ہو، وہاں اس کے جواز کی گنجائش دی جاسکتی ہے۔

اس موضوع پر مجمع الفقہ الاسلامی، جدہ نے جو قرارداد منظور کی ہے، وہ یہ ہے:

۱- المراد ببيع العربون بيع السلعة مع دفع المشتري مبلغاً من المال إلى البائع على أنه إن أخذ السلعة احتسب المبلغ من الثمن وإن تركها فالمبلغ للبائع .

ويجري مجرى البيع الإجارة. لأنها بيع المنافع. ويستثنى من البيوع كل ما يشترط لصحته قبض أحد البدلين في مجلس العقد (السلم) أو قبض البدلين (مبادلة الأموال الربوية والصرف) ولا يجري في المراجعة للأمر بالشراء في مرحلة المواعدة ولكن يجري في مرحلة البيع التالية للمواعدة .

۲- يجوز بيع العربون إذا قُيدت فترة الانتظار بزمن محدود . ويحتسب العربون جزءاً من الثمن إذا تم الشراء، ويكون من حق البائع إذا عدل المشتري عن الشراء. (۲)

۱- ”بیع عربون“ سے مراد سامان کی اس طرح فروختگی ہے کہ خریدار، بیچنے والے کو طے شدہ قیمت کا ایک حصہ اس شرط کے ساتھ دیتا ہے کہ اگر اس نے حسب معاملہ سامان لے لیا تو دی ہوئی رقم سامان کی قیمت میں شمار ہو جائے گی، اور اگر اس نے سامان نہیں لیا تو یہ رقم بیچنے والے کی ملکیت ہو جائے گی۔

اس سلسلے میں اجارہ بھی بیع کی طرح ہے، کیونکہ اجارہ منافع کی بیع ہے، البتہ اس سے ہر وہ بیع مستثنیٰ ہے جس کے صحیح ہونے کے لیے مجلس عقد کے اندر ہی کسی ایک عوض پر قبضہ ضروری ہو (جیسے بیع سلم) یا دونوں پر قبضہ ضروری ہو (جیسے ربوی اموال کا تبادلہ، بیع صرف)۔ ”مرابحہ لآمر بالشراء“ میں وعدہ کے مرحلہ میں عربوں کی اجازت نہیں ہے، البتہ وعدہ کے بعد بیع کے مرحلہ میں اس کی اجازت ہے۔

^۱ العبر وأثره في العقود ص: ۱۲۵، مجلة مجمع الفقه الإسلامي ۱۰/۲

^۲ قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ۱-۱۲۳ (ص: ۱۱۶)

۲۔ ”بیع عربون“ اس وقت جائز ہوگی، جب انتظار کی مدت متعین کر دی گئی ہو۔ اگر خریداری کا معاملہ مکمل ہو گیا تو یہ رقم قیمت کا حصہ ہو جائے گی، اور اگر خریدار نے اس معاملہ سے انکار کر دیا تو فروخت کنندہ اس رقم کا حقدار سمجھا جائے گا۔

۱۰۔ ہامش الجدیہ (Security Deposit)

”ہامش الجدیہ“ کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل تین نکات کافی ہیں:

۱۔ ہامش الجدیہ کا تعارف

۲۔ فقہاء کی آراء

۳۔ شرعی حکم

ذیل میں ان تین نکات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

۱۔ ہامش الجدیہ کا تعارف:

”ہامش الجدیہ“ اس رقم کو کہتے ہیں جو خریدار کسی چیز کے خریدنے کے وعدہ کرنے کے بعد فروخت کنندہ کو دیتا ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ خریدار اپنے وعدہ میں سنجیدہ ہے اور فروخت کنندہ یہ چیز کسی اور کو فروخت نہ کر دے۔

”عربون“ اور ”ہامش الجدیہ“ میں یہ فرق ہے کہ ”عربون“ باقاعدہ خریداری کا معاملہ کرنے کے بعد دیا جاتا ہے، البتہ خریدار اپنے لیے صرف خیار رکھتا ہے۔ اور ”ہامش الجدیہ“ کی رقم خریداری کے بعد نہیں دی جاتی، بلکہ کسی چیز کی خریداری کے صرف وعدہ کرنے کے بعد دی جاتی ہے، ابھی بیع منعقد نہیں ہوئی، بلکہ صرف بیع کا وعدہ کیا گیا ہے، البتہ بیع بعد میں کی جاتی ہے۔

معاہرہ شرعیہ میں ہے:

۳/۵۱۲ يجوز للمؤسسة في حالة الإلزام بالوعد أن تأخذ مبلغاً نقدياً يسمي هامش الجدية. يدفعه العميل بطلب من المؤسسة من أجل أن تتأكد من القدرة المالية للعميل. وكذلك لتطمئن على إمكان تعويضها عن الضرر اللاحق بها في حال نكول العميل عن وعده الملزم. وبذلك لا تحتاج المؤسسة إلى المطالبة بدفع تعويض الضرر وإنما تقتطع ذلك من مبلغ هامش الجدية، ولا يعتبر هامش الجدية عربوناً. وهذا المبلغ المقدم لضمان الجدية أما أن يكون أمانة للحفظ

لدى المؤسسة فلا يجوز لها التصرف فيه. أو أن يكون أمانة للاستثمار بأن يادى العميل للمؤسسة باستثماره على أساس المضاربة الشرعية بين العميل والمؤسسة.^(۱)

وعدہ لازم ہونے کی حالت میں ادارے کے لیے ”ہامش الجدیہ“ لینا جائز ہے، جو گاہک، ادارے کے مطالبہ کی صورت میں ادا کرے گا، تاکہ ادارہ، گاہک کی مالی استطاعت کے بارے میں مطمئن ہو جائے۔ اسی طرح ادارے کو گاہک کے اس لازمی وعدہ سے انکار کی صورت میں ہونے والے نقصان کا عوض ملنے کا اطمینان ہو جائے۔ چنانچہ ادارہ نقصان پورا کرنے کے لیے مطالبہ کرنے کا محتاج نہیں ہوگا، بلکہ نقصان کی بقدر رقم ”ہامش الجدیہ“ سے کاٹ لے گا۔ ”ہامش الجدیہ“ کو ”عربون“ نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ سنجیدگی کے ضمان کے طور پر دی جانے والی یہ رقم یا تو سرمایہ کاری کے لیے امانت ہوگی، جس کی صورت یہ ہے کہ گاہک، ادارے کو مضاربہ کی بنیاد پر اس رقم کو لگانے کی اجازت دے دے گا یا گاہک کی مرضی سے یہ رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھ دی جائے گی۔

۳۔ فقہاء کی آراء:

”عربون“ کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے جائز قرار دیا ہے، لیکن ”ہامش جدیہ“ ان کے ہاں بھی جمہور کی رائے کی طرح ناجائز ہے۔ ناجائز کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسی رقم دینا سرے سے جائز ہی نہیں ہے، ایسی رقم دینا جائز ہے اور یہ رقم فروخت کنندہ کے پاس امانت رہے گی، اس کے ناجائز ہونے کی صورت یہ ہے کہ خریدار نے اگر حسب وعدہ خریداری نہیں کی تو فروخت کنندہ کے لیے یہ ساری رقم ضبط کرنا جائز نہیں ہے۔^(۲)

۳۔ شرعی حکم:

”ہامش الجدیہ“ کی رقم دینا جائز ہے اور یہ رقم فروخت کنندہ کے پاس امانت ہوگی۔ اگر معاملہ مکمل ہو گیا تو اس رقم کو بھی سامان کی قیمت میں شامل کر دیا جائے گا اور اگر خریدار نے وعدہ خلافی کر دی اور چیز خریدنے سے انکار کر دیا تو فروخت کنندہ پر لازم ہوگا کہ ”ہامش الجدیہ“ کی مکمل رقم واپس کر دے، البتہ اس وعدہ خلافی کی وجہ سے فروخت کنندہ کو جو حقیقی نقصان لاحق ہوا ہے، اس نقصان کو ”ہامش الجدیہ“ سے لیا جاسکتا ہے۔ حقیقی نقصان کا مطلب یہ ہے کہ اگر فروخت کنندہ کو اپنی چیز دوسری جگہ فروخت کرنی پڑی اور اس چیز کی قیمت خرید سے بھی کم رقم ملی تو وہ حقیقی نقصان ہے۔

^(۱) المعاییر الشرعية ص: ۶۳. رقم المعیار: ۸

حقیقی نقصان کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً زید نے عمر سے یہ وعدہ لیا کہ عمر انیس لاکھ روپے کی خریدی ہوئی گاڑی کو اس سے خریدے، زید اس سے بارہ لاکھ لے لے، وہ گاڑی خرید لے گا اور زید نے عمر کو ہامش الجدیہ یعنی رقم یعنی اس سے انیس لاکھ روپے کی گاڑی خریدی، لیکن زید نے وعدہ خلافی کر کے گاڑی خریدنے سے انکار کر دیا اور عمر کو وہ گاڑی ہمارے میں کسی اور کو بیچنی پڑی۔ عمر نے مارکیٹ میں گاڑی جس قیمت پر بیچی ہے اس کی تین سو روپے میں:

۱- عمر نے دس لاکھ کی گاڑی خریدی تھی اور مارکیٹ میں نفع کے ساتھ بیچ دی، مثلاً کیا رہا لاکھ۔

۲- عمر نے مارکیٹ میں اتنی ہی رقم کے بدلے گاڑی بیچی، جتنی میں اس نے خریدی تھی، یعنی اس لاکھ۔

۳- عمر کو مارکیٹ میں قیمت خریدتے کم قیمت میں گاڑی بیچنی پڑی، مثلاً نو لاکھ پچاس ہزار۔

ان تین صورتوں میں سے پہلی دونوں صورتوں میں عمر کو کوئی حقیقی نقصان نہیں، وہ ایونٹ کے پہلی صورت میں اس کو باقاعدہ نفع ملا ہے اور دوسری صورت میں مکمل قیمت خرید مل گئی ہے، اس لیے پہلی دونوں صورتوں میں عمر زید کو اس کی مکمل رقم (ہامش الجدیہ) واپس کرے گا۔ اگرچہ زید نے یہی گاڑی بارہ لاکھ میں خریدنے کا وعدہ لیا تھا، لیکن دس لاکھ سے اوپر کی رقم (دو لاکھ) محض متوقع نفع (الربح المتوقع) ہے، جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

تیسری صورت میں عمر کو پچاس ہزار کا حقیقی نقصان ہوا ہے، کیونکہ اس کو قیمت خریدتے پچاس ہزار روپے کم ملے ہیں، اس لیے تیسری صورت میں عمر کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ زید کی رقم (ہامش الجدیہ) سے پچاس ہزار رقم بشورہ نقصان وصول کرے۔

معاہرہ شرعیہ میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

۲/۸/۲ يجوز أخذ مبلغ من العميل الواعد بالشراء لتوثيق وعده إذا كان الوعد ملزماً للعميل، ويسعى (هامش الجدية)، وهو أمانة وليس عربوناً لعدم وجود العقد، ولا يؤخذ منه عند النكول إلا مقدار الضرر الفعلي، وهو الفرق بين التكلفة وثمان البيع للغير.^(۱)

خریداری کے وعدہ کی توثیق کے لیے گاہک سے کچھ رقم وصول کرنا جائز ہے، جبکہ یہ وعدہ لازم ہو۔ یہ رقم ”ہامش الجدیہ“ شمار ہوگی اور بینک کے پاس بطور امانت رہے گی، یہ رقم ”عربون“ نہیں ہوگی، کیونکہ انہی تک عقد مکمل نہیں ہوا۔ اگر گاہک اپنے وعدہ سے منحرف ہو گیا تو اس صورت میں اس رقم سے صرف حقیقی

نقصان وصول کیا جاسکتا ہے، یعنی کسی دوسرے شخص کو بیچنے کے بعد لاگت اور قیمت فروخت کا فرق اس سے وصول کیا جائے گا۔

۱۱۔ عقد البناء والتشغيل (B-O-T)

یہ ایک جدید اصطلاح ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل دو باتیں ذہن میں رکھنا کافی ہیں:

۱۔ عقد البناء والتشغيل کا تعارف

۲۔ عقد البناء والتشغيل کی فقہی حیثیت

ذیل میں ان دونوں باتوں کی تفصیل عرض کی جاتی ہے۔

۱۔ عقد البناء والتشغيل کا تعارف:

اس معاملہ کو آج کل عربی زبان میں ”عقد البناء والتشغيل والنقل“ کہتے ہیں اور بعض کتابوں میں ”النقل“ کی جگہ ”التحويل“ کا اور بعض میں ”الإعادة“ کا لفظ ہے۔ اس کو انگریزی زبان میں (B-O-T) کہتے ہیں، جو (build operate and transfer) کا مخفف ہے۔

عموماً حکومت کو ان معاملات کی ضرورت پڑتی ہے جب اسے پبلک سیکٹر میں بڑے پروجیکٹ مکمل کرنے ہوتے ہیں، مثلاً پبل، سڑک اور سکول وغیرہ بنانا، لیکن حکومت کے پاس ان پروجیکٹس کے لیے سرمایہ نہیں ہوتا یا نہیں لگانا چاہتی تو حکومت کسی ادارے سے یوں معاملہ کر لیتی ہے کہ ادارہ اپنے خرچہ پر اس پروجیکٹ کو مکمل کر لے (مثلاً پبل بنالے) اور پھر کچھ عرصہ تک اس پروجیکٹ کو استعمال کر کے اس سے نفع حاصل کرتا رہے اور آخر میں پروجیکٹ کو حکومت کے حوالے کر دے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اس قسم کے معاملات میں تین بنیادی کام ہوتے ہیں:

۱۔ البناء (build): پروجیکٹ کی تکمیل، یعنی کوئی عمارت یا پبل وغیرہ بنانا

۲۔ التشغيل (operate): اس عمارت یا پبل کو استعمال میں لانا

۳۔ النقل (transfer): اس عمارت یا پبل کو اصل مالک کے حوالے کرنا

اسلامی فقہ اکیڈمی جده نے اس قسم کے عقد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

اتفاق مالك أو من يمثله مع ممول (شركة المشروع) على إقامة منشأة وإدارتها، وقبض العائد منها، كاملاً أو حسب الاتفاق، خلال فترة متفق عليها بقصد استرداد رأس المال المستثمر مع تحقيق عائد معقول. ثم تسليم المنشأة صالحة

للأداء المرجو منها. (۱)

ایسا معاہدہ ہے جو مالک یا اس کا نمائندہ کسی فائنانسر (پروجیکٹ کمپنی) کے ساتھ کسی سہولت (پروجیکٹ) کو قائم کرنے اور اس کا انتظام کرنے اور اس سے، مکمل طور پر یا معاہدے کے مطابق جو طے ہو، واپس وصول کرنے پر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طے شدہ مدت کے دوران ہوتا ہے جس میں اصل سرمایہ اور معقول سرپلس (فائدہ) کے حصول کی نیت ہوتی ہے اور پھر مطلوبہ سہولت (پروجیکٹ) جو قابل اداء ہو اسے واپس حوالے کیا جاتا ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً حکومت کو ایک پبل ہونا ہے، اس لیے حکومت نے کسی ادارے سے بی اوٹی کا مذکورہ عقد کر لیا۔ ادارہ اس پبل کو اپنے خرچہ اور محنت سے بنائے گا۔ پبل مکمل بن جانے کے بعد اگلے مرحلہ میں ادارہ پبل کا خرچہ اور اپنا نفع حکومت سے وصول کرنے کے بجائے، اسی پبل سے حاصل کرے گا، چنانچہ اسے ایک خاص مدت (مثلاً دس سال) تک اس پبل کو استعمال کرنے کا حق حاصل ہو گا اور اس پبل سے ٹیکس وغیرہ کی صورت میں جو آمدنی حاصل ہوگی وہ ادارہ کو ملے گی۔ مدت کے مکمل ہو جانے کے بعد اگلے مرحلہ میں ادارہ اس پبل کو اصل مالک یعنی حکومت کے حوالے کر دے گا۔

عقد البناء والتشغيل کی طرح ایک اور اصطلاح ہے جسے عربی میں ”حق الامتیاز“ اور انگریزی میں ”concession“ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حکومت اپنی مملوکہ اشیاء یا حقوق کسی کو کچھ عرصہ کے لیے دیتی ہے، خواہ بی اوٹی کا معاملہ ہو یا نہیں اور خواہ حکومت کسی کو مفت میں استعمال کا حق دے یا اس سے کچھ قیمت وصول کرے۔ اس لیے یہ صورت بی اوٹی سے عام اور مختلف ہے۔ (۲)

۲۔ عقد البناء والتشغيل کی فقہی حیثیت:

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ کوئی نیا اور جدید عقد ہے جس کی فقہ میں کوئی نظیر نہیں ہے یا اس عقد کی فقہی نظیر موجود ہے؟ اس سلسلے میں معاصر علماء کی آراء مختلف ہیں:

۱۔ پہلی رائے یہ ہے کہ یہ نیا عقد ہے جو کئی عقود و معاملات کا مجموعہ ہے، اس کی کوئی فقہی نظیر نہیں ہے، لیکن اگر

(۱) قرار رقم: ۱۸۲ (۸/۱۹) بشأن تطبيق نظام البناء والتشغيل والإعانة (B.O.T)

اس میں کسی شرعی اصول کی خلاف ورزی نہ پائی جائے تو فی نفسہ یہ جائز عقد ہے، کیونکہ معاملات میں اس سے یہ نہ جواز ہوتے ہیں۔ اسلامی فقہ اکیڈمی جده نے لکھا ہے:

(۲) - عقد البناء والتشغيل والإعادة عقد مستحدث، فهو وإن شابه في بعض صورته التعاقدات وأدوات الاستثمار المعهودة فقها، فإنه قد لا يتطابق مع أي منها۔

(۳) - يجوز الأخذ بعقد البناء والتشغيل والإعادة في تعمیر الأوقاف والمرافق العامة۔

۳- دوسری رائے یہ ہے کہ اس معاملہ کی فقہی نظیر موجود ہے، جس کی بنیاد پر اس عقد کی فقہی حیثیت معلوم کی جاسکتی ہے، تاہم دوسری رائے اختیار کرنے والے اہل علم کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ فقہ میں عقد البناء والتشغيل کی بنیاد یا نظیر کونسا عقد ہے؟ اس سلسلے میں مشہور آراء چار ہیں:

۱- بعض معاصر علماء نے اس کو ”شرکت موقتہ“ قرار دیا ہے جو شرکت کی ایک جدید صورت ہے۔ اس میں شرکاء کسی خاص کاروباری سرگرمی یا پروجیکٹ کی تکمیل میں شرکت کرتے ہیں اور اس پروجیکٹ کے مکمل ہونے کے بعد نفع باہم تقسیم کرتے ہیں۔

۲- بعض معاصر علماء نے اس کو ”اقطاع“ قرار دیا ہے۔ اقطاع کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کسی کو کسی جاگیر یا حق وغیرہ کا باقاعدہ مالک بناتی ہے یا عارضی طور پر استعمال کے لیے دیتی ہے۔

۳- تیسری رائے یہ ہے کہ یہ ”عقد اجارہ“ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے اپنی زمین ادارہ کو ایک متعین مدت کے لیے کرایہ پر دے دی ہے، جسے ادارہ اس مدت کے اندر استعمال میں لائے گا اور اس معاملہ کا کرایہ اس پروجیکٹ اور عمارت وغیرہ کی شکل میں حکومت کو آخر میں ملے گا جسے ادارہ خود بنائے گا۔

۴- چوتھی رائے یہ ہے کہ یہ ”عقد استصناع“ ہے۔ جس کی وضاحت یہ ہے کہ حکومت نے کسی ادارے کے ساتھ استصناع کا عقد کر کے کسی عمارت یا پیل وغیرہ کے بنانے کا آرڈر دیا ہے، جس میں حکومت، خریدار یعنی ”مستصنع“ ہے اور ادارہ فروخت کنندہ یعنی ”صانع“ ہے اور اس عمارت یا پیل وغیرہ کی قیمت وہ منفعت (services) ہے جو ادارہ ایک مخصوص مدت کے دوران اس عمارت یا پیل وغیرہ کو استعمال کر کے حاصل کرے گا۔^(۱)

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے آخری دونوں آراء کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان دونوں میں اصل بنیاد یہ ہے کہ پروجیکٹ/عمارت وغیرہ کے بن جانے کے بعد جتنی مدت میں ادارہ اس کو اپنے استعمال میں لائے گا، اس مدت میں وہ پروجیکٹ/عمارت کس کی ملکیت ہے؟ اس سوال کے جواب سے آخری دونوں آراء (اجارہ، استصناع) میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے اور اس قسم کے معاملات کی دو صورتیں بھی سامنے آتی ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ عقد میں باقاعدہ اس کی وضاحت ہو جائے کہ اس مدت کے دوران ادارہ ہی اس پروجیکٹ/عمارت کا مالک ہوگا اور مدت کے اختتام پر اس کی ملکیت حکومت کی طرف منتقل کرے گا۔ اس کو ”بناء، تملك ونقل الملكية“ اور انگریزی میں (build own transfer) کہتے ہیں۔ اس صورت پر تیسری فقہی تکلیف منطبق ہوتی ہے کہ یہ اجارہ کا عقد ہے اور ادارے نے اپنی مملوکہ چیز حکومت کو کرایہ کی شکل میں دے دی۔ لیکن یہ صورت فقہی اصول و ضوابط کے مطابق درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں جس چیز (مستقبل میں بننے والے پروجیکٹ کی منفعت) کو اجرت بنایا گیا ہے اس میں اجرت بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عقد میں اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ استعمال کی مدت کے دوران وہ پروجیکٹ/عمارت حکومت کی ملکیت ہوگی اور ادارہ اس خاص مدت میں اسے استعمال کر کے واپس حکومت کے حوالے کرے گا۔ اس کو عربی میں ”بناء، تشغيل وتسليم“ اور انگریزی میں (build operate and transfer) کہتے ہیں۔ اس صورت پر چوتھی فقہی تکلیف منطبق ہوتی ہے کہ یہ عقد استصناع ہے، جس میں حکومت نے اپنے لیے ادارہ سے کوئی چیز بنوائی اور اس کو قیمت اس شکل میں دی کہ ادارہ کو وہی چیز کچھ مدت تک استعمال کرنے کی اجازت دے دی، مذا یہ منفعت ہی ثمن اور قیمت ہے۔

اس صورت پر کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں، جیسے منفعت کو استصناع کی قیمت بنانا اور ادارے کے اپنے عمل سے بنو میں آنے والی چیز کی منفعت کو قیمت بنانا (قفیر الطمان) وغیرہ، لیکن حضرت نے اس کے جوابات ذکر کر کے اس صورت کی گنجائش دی ہے۔^(۱)

۵۔ خرید و فروخت میں اضافی شرط لگانا

خرید و فروخت کا معاملہ جب تمام شرائط کے مطابق وجود میں آجائے تو اس پر کئی شرعی احکامات و اثرات مرتب ہوتے ہیں، مثلاً خریدار خریدی ہوئی چیز کا مالک ہو جاتا ہے، فروخت کنندہ قیمت کے فوری مطالبہ کا حق رکھتا ہے وغیرہ، لیکن بسا اوقات فریقین کوئی ایسی شرط عائد کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے عقد پر مرتب ہونے والے اثرات میں تبدیلی آجاتی ہے، اس کے احکام و آثار مؤخر ہو جاتے ہیں یا معاملہ فاسد ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص فرج خریدتے وقت یہ اضافی شرط لگاتا ہے کہ فرج کو خریدار کے گھر تک پہنچانا فروخت کنندہ کی ذمہ داری ہوگی یا اس جیسی کوئی اضافی شرط۔

سوال یہ ہے کہ کیا معاملہ کرنے والوں کو ایسا اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسی کوئی اضافی شرط / پابندی عائد کر دیں جو اصل میں معاملہ میں شامل نہ ہو؟ اگر جائز ہے تو اس اختیار کی حدود کیا ہیں؟ کیا ان کو ہر قسم کی شرط عائد کرنے کا اختیار ہے یا بعض شرائط ہی عائد کر سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ فقہاء کی آراء سے قبل دو باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے، چنانچہ اس بحث کو تین نکات میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱- شرط کی تعریف

۲- خرید و فروخت میں اضافی شرط کا مفہوم

۳- فقہاء کی آراء

۱- شرط کی تعریف:

شرط کے لغوی معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ جہاں تک شرط کی اصطلاحی تعریف کی بات ہے تو اس سلسلے میں علماء کی عبارات مختلف ہیں، یہاں دو تعریفات پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

۱۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے شرط کی تعریف یوں کی ہے:

ما لا يوجد المشروط مع عدمه , لكن لا يلزم أن يوجد عند وجوده.^(۱)

شرط وہ چیز ہے جس کی عدم موجودگی کی صورت میں مشروط وجود میں نہ آئے، جبکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ شرط کی موجودگی کے وقت مشروط خود وجود میں آجائے۔

۲- علامہ حموی رحمہ اللہ نے شرط کی وضاحت یوں کی ہے:

الشرط: التزام أمر لم يوجد في أمر وجد بصيغة مخصوصة۔^(۱)

شرط کا مطلب یہ ہے کہ مخصوص صیغے کے ذریعے کسی وجود میں آچکنے والے معاملے میں ایسی چیز کا التزام کرنا جو ابھی وجود میں نہ آئی ہو۔

۲- خرید و فروخت میں اضافی شرط کا مفہوم:

خرید و فروخت میں اضافی شرط لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ معاملہ میں فریقین کسی ایسی اضافی شرط یا پابندی پر راضی ہو جائے جس سے اصل میں معاملہ خالی ہو اور اس کی وجہ سے کسی فریق پر کوئی اضافی ذمہ داری عائد ہو جائے۔ معاصر علماء اس کو ”الشرط المقترن بالعقد“ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

التزام واقع في العقد حال تكوينه زائدا عن أصل مقتضاه الشرعي، سواء أكان هذا العقد ناشئا بإرادة المتعاقدين، أم بإرادة منفردة، وهو يضاف إلى صلب العقد عند إنشائه، بحيث يصبح جزءا من أجزائه التي تم التراضي على أساسها۔^(۲)

عقد کو وجود میں لاتے وقت کسی ایسی ذمہ داری کا التزام جو اصل شرعی تقاضوں سے زائد ہو، خواہ یہ عقد فریقین کی مرضی سے وجود میں آیا ہو یا انفرادی مرضی سے، اور ابتداء میں ہی اسے عقد کی اصل جز کی طرف اس طرح منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ عقد کے دیگر اتفاقی اجزاء کی طرح ایک جزء ہو جاتا ہے۔

۳- فقہاء کی آراء:

اس سلسلے میں فقہاء کی مختلف آراء ہیں، جن کو مندرجہ ذیل پانچ مناہج میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱- ظاہر یہ کا منہج:

ظاہر یہ کے ہاں اصول یہ ہے کہ بیع میں کسی بھی قسم کی اضافی شرط لگانے کی اجازت نہیں ہے، البتہ جن شرائط کی شریعت نے واضح الفاظ میں اجازت دی ہے، صرف ان شرائط کو عقد میں عائد کیا جاسکتا ہے، مثلاً بیع میں رہن کی شرط لگانا،

^(۱) غمز عیون البصائر شرح کتاب الأنساب والنظائر ۴/۱

^(۲) الشروط المقترنه بالعقد وأثرها فيه في الفقه الإسلامي، ص: ۶۱

قیمت میں تاخیر کی شرط اور بیع میں کسی خاص صفت کی شرط وغیرہ۔^(۱)

ظاہر یہ دلیل کے طور پر وہ تمام قرآنی آیات اور احادیث پیش کرتے ہیں جن میں یہ مفہوم ہے کہ آپ ﷺ پر دین اسلام کی تکمیل ہو چکی ہے۔ لہذا ان کا کہنا ہے کہ اب کوئی بھی نیا عہد یا نئی شرط، جس کا ذکر قرآن و سنت میں نہیں ہے، اس کی اجازت بھی نہیں ہے۔^(۲)

۲۔ فقہاء شافعیہ کا منہج:

فقہاء شافعیہ بنیادی اصول میں ظاہر یہ کے ساتھ متفق ہیں کہ بیع میں اضافی شرائط لگانا اصل میں جائز نہیں ہے۔ اس کے لیے انہوں نے حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔^(۳) تاہم شافعیہ کے ہاں جائز شرائط کا دائرہ ظاہر یہ کی بنسبت زیادہ وسیع ہے۔ ان کی رائے کو مندرجہ ذیل اصول میں بیان کیا جاسکتا ہے:

الأصل في الشروط الحظر، إلا أن يكون الشرط ملائماً لمقتضي العقد ولمصلحة أو يتضمن معنى من معاني البر.

شرائط میں اصول ممانعت کا ہے، البتہ اگر شرط ایسی ہے جو عقد کے تقاضوں اور مصلحت کے مطابق ہے یا کسی نیکی اور اچھائی پر مشتمل ہے تو وہ جائز ہے۔

فقہاء شافعیہ کی عبارات میں غور کیا جائے تو انہوں نے جن شرائط کی اجازت دی ہیں وہ دونوں نکات یا امور کے تحت آتی ہیں:

۱۔ ایسی شرط جس کی مخالفت پر کوئی شرعی دلیل نہ ہو، وہ شرط عقد کے تقاضوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو اور اس میں عقد کی مصلحت بھی ہو۔ ایسی شرائط کی اجازت ہے۔ مثلاً بیع میں رہن کی شرط لگانا، کفالہ کی شرط لگانا یا گواہوں کی شرط لگانا کہ عقد پر گواہ بنانے ہوں گے۔

۲۔ ایسی شرط جو کسی نیکی اور اچھائی کو شامل ہو، مثلاً غلام فروخت کرنے والا یہ شرط عائد کر دے کہ خریدار اسے آزاد کرے گا۔ اس وقت یہ قسم کی شرط میں فقہاء شافعیہ کی آراء مختلف ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ شرط لغو ہے اور عقد درست ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ شرط اور عقد دونوں فاسد ہیں اور تیسری رائے، جو ان کے ہاں رائج بھی ہے، یہ ہے

کہ شرط بھی صحیح اور واجب العمل ہے اور عقد بھی درست ہے۔

فقہاء شافعیہ کے ہاں ان شرائط کے علاوہ دیگر شرائط کی اجازت نہیں ہے، جن میں کسی شرعی علم کی مخالفت لازم آرہی ہو یا وہ شرط عقد کے تقاضوں اور مقتضیات کے خلاف ہو وغیرہ۔^(۱)

۳۔ فقہاء مالکیہ کا منہج:

فقہاء مالکیہ بھی ظاہر یہ اور فقہاء شافعیہ کی طرح اس اصول پر متفق ہیں کہ شرائط میں اصل ممانعت ہے، تاہم جائز شرائط میں فقہاء مالکیہ کا منہج اور اجتہاد کچھ مختلف ہے، جس کو مندرجہ ذیل اصول میں ذکر کیا جاسکتا ہے:

کل شرط فيه منفعة لأحد المتعاقدين شريطة أن لا يكون مناقضا لمقتضى العقد ولا يتضمن الغرر الكبير والجهالة الفاحشة.

ہر وہ شرط جائز ہے جس میں معاملہ کرنے والوں کے لیے کوئی فائدہ ہو، بشرطیکہ وہ شرط عقد کے تقاضوں کے خلاف نہ ہو اور زیادہ غرر اور جہالت کو بھی شامل نہ ہو۔

فقہاء مالکیہ نے اس سلسلے میں ”مصالح مرسلہ“ کو بنیاد بنایا ہے، اسی لیے اگر فریقین میں سے کوئی ایک فریق اپنے نفع کی کوئی شرط لگاتا ہے اور اس میں کسی شرعی نص کی خلاف ورزی نہیں ہے اور غرر یا جہالت بھی لازم نہیں آرہی ہے تو ایسی شرط ان کے ہاں جائز ہے۔ لہذا عقد میں رہن کی شرط، کفالت اور اجل کی شرط لگانا جائز ہے، بلکہ اگر فروخت کنندہ اپنے مکان کو بیچتے ہوئے اس میں کچھ عرصہ تک رہائش کی شرط لگاتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔ اس کے برعکس وہ شرائط جن سے ربا لازم آئے یا غرر اور جہالت لازم آئے، ان کی اجازت نہیں ہے، بلکہ بیع الوفاء کی بھی اجازت نہیں ہے جس میں فروخت کنندہ یہ شرط عائد کرتا ہے کہ وہ جب بھی قیمت واپس کرے گا تو خریدار پر لازم ہوگا کہ چیز واپس کر دے۔^(۲)

۴۔ فقہاء حنابلہ کا منہج:

فقہاء حنابلہ کا نقطہ نظر دیگر فقہاء کی نسبت مختلف ہے۔ ان کے ہاں اصول یہ ہے کہ بیع میں اضافی شرائط عائد کرنا املا جائز ہے، البتہ جس شرط کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہو وہ جائز نہیں ہے، چنانچہ ان کی رائے کو اس اصول میں بیان کیا جاسکتا ہے:

الأصل في الشروط الإباحة. إلا ما دل الشرع على تحريمه نصا أو قیاسا.

شرائط میں اصول اباحت کا ہے، البتہ ایسی شرط جس کی حرمت کی شریعت نے وضاحت کی ہو یا

قیاس کا تقاضا ہو کہ وہ حرام ہے تو وہ شرط درست نہیں ہے۔

لہذا جو شرائط عقد کے تقاضوں کے مطابق ہوں، جیسے خریدی ہوئی چیز پر فوری قبضہ کی شرط، یا قیمت کی فوری ادائیگی وغیرہ وہ جائز ہیں۔ اسی طرح وہ شرائط جو عقد کی مصلحت کے مطابق ہوں، جیسے رہن کی شرط، شہادت اور کفالت یا ادھار کی شرط، ایسی شرائط بھی جائز ہیں۔ وہ شرائط جن میں فریقین کا کوئی فائدہ ہوں اور وہ عقد کے تقاضوں اور مصالح کے خلاف نہ ہوں وہ بھی جائز ہیں، مثلاً مکان فروخت کرنے والا یہ شرط عائد کر دے کہ بیع کے بعد ایک ماہ تک وہ خود اس مکان میں رہے گا۔ ان کے علاوہ وہ شرائط جو عقد کے تقاضوں یا مصالح کے خلاف ہوں، یا جن سے ربا، غرر اور جہالت لازم آئے یا جن سے ایک عقد میں دو معاملات جمع ہوں لازماً آئے تو ایسی شرائط جائز نہیں ہیں۔^(۱)

۵- فقہاء حنفیہ کا منہج:

فقہاء حنفیہ کی رائے میں بیع میں اضافی شرائط لگانا اصولاً ممنوع ہے، لیکن انہوں نے کئی قسم کی شرائط کو اس اصول سے مستثنیٰ کر کے ان کی اجازت دی ہے اور فقہاء حنفیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کی بنسبت حنفیہ کی رائے میں جائز شرائط کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع ہے۔ اس سلسلے میں حنفیہ نے ”استحسان“ کو بنیاد بنایا ہے۔

شیخ عبدالحی لکھنوی نے فقہاء حنفیہ کی رائے کو ضابطہ کی شکل میں یوں لکھا ہے:

الضابط فیہ علی ما فی "الہدایۃ" وشروحہا: أن کل شرط لا یقتضیہ العقد، وفیہ منفعة لأحد المتعاقدين أو المعقود علیہ وهو من أهل الاستحقاق یفسد البیع، إذا لم یکن متعارفاً، ولم یرد بہ الشرع کشرط الأجل فی الثمن والمثمن وشرط الخیار، ولم یکن متضمناً للتوثق کشرط الكفیل بالثمن فإنہ جائز.^(۲)

ہدایہ اور اس کی شروحات کی تفصیل کے مطابق اس سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ: ہر وہ شرط جو عقد کے تقاضوں کے خلاف ہو اور اس میں معاملہ کرنے والوں کے لیے کوئی نفع ہو یا معقود علیہ کا نفع ہو اور وہ نفع کا اہل بھی ہو تو ایسی شرط سے بیع فاسد ہو جائے گی، بشرطیکہ اس کا عرف نہ ہو چکا ہو اور شریعت نے بھی اس کی اجازت نہ دی ہو جیسے قیمت یا مبیع کو ادھار رکھنے کی شرط اور خیار شرط، اور وہ شرط عقد کی توثیق اور پختگی نہ کرتی ہو جیسے قیمت کے لیے کفیل کی شرط، ایسی شرط جائز ہے۔

^(۱) المغنی ۴/۳۰۹

^(۲) التعلیق المجد علی موطن محمد ۳/۲۵۰

اس ضابطہ کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے تو فقہاء حنفیہ کے ہاں شرائط کی تین قسمیں سامنے آتی ہیں:

۱- جائز شرائط

۲- فاسد شرائط

۳- لغو/باطل شرائط

۱- جائز شرائط:

وہ شرائط جن کی شریعت میں اجازت ہے اور ان کی رعایت اور فریقین پر ان کی پابندی کرنا بھی لازم ہے۔ یہ ایسی شرائط ہیں جن پر عمل کرنا مفید اور انسان کی قدرت و استطاعت میں ہوتا ہے۔^(۱) بیع میں اس طرح کی شرائط لگانے سے معاملہ بھی جائز ہوتا ہے اور شرط بھی معتبر رہتی ہے۔ اس میں چار قسم کی شرائط داخل ہیں:

الف- ایسی شرائط کہ خود عقد ہی ان کا تقاضا کرے، اگر شرط کا ذکر نہ کیا جائے تو بھی انسان کو وہ حق حاصل ہو، جیسے فروخت کنندہ یہ شرط عائد کر دے کہ جب تک خریدار قیمت ادا نہ کر دے، چیز میرے پاس ہی رہے گی۔

ب- وہ شرائط جو عقد کے لیے ملائم و مناسب ہوں۔ جیسے مبادل (بیع یا متاجر) میں کسی صفت کی شرط لگانا، مثلاً خریدار یہ شرط لگا دے کہ کہ فلاں نسل اور رنگ کا گھوڑا ہونا چاہیے، یا بدل (قیمت یا اجرت) میں کسی صفت کی شرط لگانا، مثلاً فلاں ملک کی کرنسی ہو یا نقد یا ادھار ہو، یا ایسی شرط ہو جو عقد کے مقصد کو مزید پختہ کرے، جیسے رہن، حوالہ، کفالتہ کی شرط لگانا جو قیمت کی ادائیگی کو یقینی بناتے ہیں۔

ج- وہ شرائط جن کا عقد تقاضا نہ کرے، نہ وہ شرائط ملائم ہوں، لیکن معاملے میں ان شرائط کے طے کیے جانے کا عرف بن چکا ہو، جیسے آج کل فریج کو گارنٹی کی شرط کے ساتھ خریدا جاتا ہے، یا اسے سی کو اس شرط کے ساتھ خریدا تاکہ ہندار کا عملہ ہی خریدار کے گھر میں اس کی فنگ کرے گا وغیرہ۔

د- وہ شرائط جن کی شریعت نے باقاعدہ صراحت کے ساتھ اجازت دی ہے، جیسے خیار شرط، خیار رؤیت، خیار نسیب، خیار وصف وغیرہ۔

۲- فاسد شرائط:

ان سے وہ شرائط مراد ہیں جو معاملہ کرتے وقت لگائی جائیں اور ان کا تعلق پہلی قسم کے تحت بیان کی گئی چار اقسام نامہ شرائط کے ساتھ نہ ہو اور اس میں فریقین (معاملہ کرنے والوں) یا بیع (بشرطیکہ وہ فائدہ کا اہل ہو) کے لیے فائدہ ہو یا کسی

کے انہی شخصوں کے لیے اس میں فائدہ ہو۔ جیسے کوئی شخص دوسرے سے لپڑا اس شرط پر خریدے کہ فروخت کرنے کے لیے لپڑے کو فروخت کرے گا۔ کوئی شخص اپنا مکان اس شرط کے ساتھ فروخت کر دے کہ ایک مہینے تک وہ (فروخت بند نہ کرے)۔ ان میں سے ایک یہ شرط لگا دے کہ دوسرا فریق فلاں شخص کو قرض بھی فراہم کرے گا۔ یہ ساری مثالیں شرط فاسد کی ہیں۔ اس قسم کی شرائط کا حکم یہ ہے کہ ایسی شرائط کی رنایب نہیں رکھی جائیں گی، بلکہ اس طرح کی شرط خود غیر معتبر ہوگی اور ان کے وجہ سے خرید و فروخت کا معاملہ فاسد ہو جاتا ہے۔

فاسد شرائط کے سلسلے میں مزید دو نکات سمجھنا ضروری ہیں:

۱- فقہاء کی آراء،

۲- فاسد شرط کا الحاق

۱- فقہاء کی آراء:

فاسد شرط کے بارے میں حنفیہ کی عمومی رائے یہ ہے کہ ان کی وجہ سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، جبکہ قاضی اب شبر مدنی کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں بیع بھی صحیح ہے اور شرط بھی درست ہے اور ابن ابی لیلیٰ کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں شرط پر عمل ضروری نہیں، وہ لغو ہے، لیکن بیع کا معاملہ صحیح رہے گا۔

راجہ رائے یہی ہے کہ اس صورت میں بیع فاسد ہو جائے گی، کیونکہ بیع کے معاملہ میں اصل اصول یہی ہے کہ یہ کسی بھی قسم کی شرائط سے خالی ہو اور احادیث میں بھی بیع اور شرط کو جمع کرنے سے منع کیا گیا ہے، خصوصاً وہ شرائط جن کی وجہ سے ربا، غرر وغیرہ لازم آئے، البتہ کسی شرعی دلیل کی بنیاد پر کسی شرط کی اجازت دی گئی ہو تو وہ جائز ہے۔^(۱)

۲- فاسد شرط کا الحاق:

اگر خرید و فروخت کا معاملہ کرتے وقت (صلب عقد میں) ہی فاسد شرط عائد کر دی گئی تو اس سے عقد فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اگر معاملہ بغیر کسی شرط مکمل کر لیا گیا اور اس کے بعد فریقین نے کوئی فاسد شرط لگا دی تو اس طرح کی شرط سے بیع پر کچھ اثر پڑے گا یا نہیں؟ اس کو فقہ میں ”الحاق الشرط الفاسد بالبیع“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں فقہاء حنفیہ کی دو رائے ہیں:

الف- امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں بھی بیع کا معاملہ فاسد ہو جائے گا۔ ان کا اصول ہے کہ

”قران الشرط الفاسد بالعقد والحاقه به سواء“۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فریقین کو معاملہ میں تبدیلی کا اختیار ہے، لہذا وہ جن تبدیلیوں کی شرط لگائیں گے تو اسے اصل عقد کے ساتھ ملحق قرار دیا جائے گا۔

ب۔ امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر معاملہ کرتے وقت ایسی کوئی شرط نہ لگائی گئی اور بعد میں کسی فاسد شرط کا اضافہ کر دیا گیا تو اس سے عقد کے صحیح ہونے پر فرق نہیں پڑے گا، بلکہ شرط لغو اور غیر قابل عمل ہوگی، جبکہ معاملہ اپنی جگہ درست رہے گا، کیونکہ ایک مرتبہ عقد صحیح ہو کر وجود میں آجائے تو اس کے بعد فریقین کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ معاملہ میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر دے۔^(۱) ضرورت کے موقع پر اس رائے کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ لغو/باطل شرائط:

لغو یا باطل شرائط سے مراد وہ شرائط ہیں جو نہ تو جائز شرائط کی چار صورتوں میں داخل ہوں، نہ فاسد شرائط میں آتی ہوں، کیونکہ اس قسم کی شرائط میں معاملہ کرنے والے فریقین، بیع اور کسی اجنبی کے لیے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جیسے کوئی شخص دوسرے کو کوئی چیز اس شرط پر فروخت کر دے کہ خریدار یہ چیز آگے فروخت نہیں کرے گا۔ اس آخری قسم کی شرائط کا حکم یہ ہے کہ یہ شرط خود لغو اور غیر مؤثر ہوتی ہے، اس پر عمل کرنا ضروری نہیں، اور جس عقد میں اس طرح کی شرط لگائی گئی ہو وہ اپنی جگہ درست اور برقرار رہتا ہے، ان کی وجہ سے خرید و فروخت کا معاملہ فاسد نہیں ہوتا۔^(۲)

۶۔ خرید و فروخت کے اہم جدید مسائل

خرید و فروخت کے باب کے اس آخری حصے میں بیوع سے متعلق چند متفرق مسائل بیان کیے جائیں گے۔ ان میں سے کچھ مسائل بعض رسائل و مجلات میں چھپ بھی چکے ہیں۔

۱۔ خریداری سے پہلے آگے بیچنا (Sale without Ownership)

آج کل یہ معاملہ بہت رواج پذیر ہے کہ کوئی شخص جو عموماً مال خرید کر آگے فروخت کرتا ہے، وہ بعض اوقات مال خریدنے سے پہلے ہی اپنے گاہک کو فروخت کر دیتا ہے، حالانکہ جس وقت وہ اپنے خریدار کو مال بیچ رہا ہوتا ہے، اس وقت مال اس کی ملکیت میں نہیں ہوتا، بلکہ معاملہ کرنے کے بعد وہ کسی فیکٹری وغیرہ سے مال خریدتا ہے اور پھر اپنے گاہک کو دے دیتا ہے۔ یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ اس میں فروخت کرنے والا شخص سامان کا مالک بننے سے پہلے ہی اسے آگے بیچ دیتا ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں۔

البتہ اس کی جائز صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایسی صورت میں خریدار سے بیع (sale) کا معاملہ تو نہ کیا جائے، بلکہ بیع کا وعدہ کر لیا جائے اور ایک معاہدہ وعدہ بیع (agreement to sale) کے نام سے تیار کر لیا جائے۔ فروخت کنندہ یہ وعدہ کر لے کہ وہ مال خرید کر اسے بیچے گا اور خریدار یہ وعدہ کرے کہ اس کی مطلوبہ صفات کے مطابق مال آیا تو وہ اسے خرید لے گا، پھر جب عملاً مال آئے تو باقاعدہ معاملہ کر کے اسے فروخت کیا جائے۔^(۱)

اگر خریدار نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور فروخت کنندہ کو یہ مال کہیں اور بیچنا پڑا تو اگر یہ چیز دوسری جگہ قیمت خرید سے کم قیمت میں بیچی تو فروخت کنندہ وعدہ کرنے والے سے اپنا حقیقی نقصان (actual loss) لے سکتا ہے، جس کے لیے بتدریج ہے کہ شروع میں وعدہ کرتے وقت ہی خریدار (وعدہ کرنے والے) سے کچھ رقم بطور امانت لے لی جائے تاکہ درج بالا صورت حال میں اس رقم سے اپنا حقیقی نقصان پورا کیا جاسکے۔^(۲)

۲۔ قبضہ سے پہلے آگے بیچنا (Sale without Possession)

آج کل معاملات میں ایک قباحت یہ پائی جاتی ہے کہ چیز خریدنے کے بعد اس پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی اسے

^(۱) فقہ البیوع ۷۶/۱

^(۲) المعاییر الشرعیة، ص: ۱۲۰

آگے فروخت کر دیا جاتا ہے، حالانکہ شریعت میں کوئی منقولی چیز (movable) خرید کر اسے آگے فروخت کرنے سے قبل یہ شرط ہے کہ آگے فروخت کرنے والا اس پر اس طور سے قبضہ کر چکا ہو کہ اس چیز کا ضمان (risk) اس کی طرف منتقل ہو گیا ہو۔ ایسے قبضہ کے بغیر چیز کو آگے فروخت کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

تاہم یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قبضہ کی شرعی اعتبار سے دو قسمیں ہیں :

۱۔ حسی قبضہ: حسی قبضے کا مطلب یہ ہے کہ خریدی ہوئی چیز عملاً اور حساً خریدار کے قبضہ میں آجائے۔

۲۔ حکمی قبضہ: حکمی قبضے کے مکمل ہونے کے لیے دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہیں:

الف- خریدار گیا سامان فروخت کنندہ (seller) کے دیگر سامان سے الگ اور متعین ہو جائے۔

ب- خریدار کو سامان اپنے استعمال میں لانے کی مکمل قدرت حاصل ہو اور اس کے ضمان میں آجائے۔

اگر درج بالا دونوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کا قبضہ بھی پایا جائے تو خریدی ہوئی چیز کو آگے فروخت

کرنا جائز ہے، ورنہ نہیں۔^(۱)

۳۔ ڈیلیوری آرڈر (D.O) کے ذریعے خرید و فروخت

جب کوئی شخص یا ادارہ کمپنی سے مال خریدتا ہے تو کمپنی اس کے بدلے ایک رسید جاری کرتی ہے جسے ڈیلیوری آرڈر یا D.O کہا جاتا ہے، جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ فلاں شخص کا اتنا مال کمپنی کے ذمہ ہے۔ جس شخص کے پاس D.O ہوتا ہے، بعض مرتبہ وہ اس میں درج شدہ تفصیل کے مطابق کمپنی سے مال اٹھالیتا ہے اور پھر آگے فروخت کرتا ہے، جبکہ عام طور پر اسی D.O کو آگے فروخت کر دیا جاتا ہے، پھر بعض مرتبہ اسی D.O کی کئی مرتبہ آگے سے آگے بیع ہوتی رہتی ہے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ D.O خود کوئی مال نہیں، بلکہ یہ مال کی رسید ہے، لہذا اس کو آگے فروخت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ D.O کے پیچھے جو مال ہے، خریدار اس مال کو باقاعدہ اٹھا کر اپنے ہاں لے آیا ہو۔

۲۔ یا کم از کم نمبرنگ وغیرہ کے ذریعے خریدار ہوا مال اس طرح متعین کر دیا گیا ہو کہ وہ اس جیسی دوسری اشیاء

سے ممتاز اور الگ ہو جائے اور خریدار کو جو D.O دیا جائے، اس میں تعین کر دی جائے کہ فلاں نمبر سے فلاں نمبر (مثلاً ایک سے ہزار) تک کے بند لڑا آپ کے ہیں اور خریدار کو وہاں سے اپنا سامان اٹھانے میں کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو تو اس صورت

میں D.O کو آگے فروخت کرنا جائز ہوگا۔

لیکن اگر خریدار نہ تو مال اٹھا کر اپنے ہاں لائے اور نہ ہی نمبرنگ وغیرہ کے ذریعے تعین کرتے خریدار وہاں اٹھانے کا آزادانہ اختیار حاصل ہو تو اس صورت میں خریدار کے لیے یہ مال (D.O) آگے بیچنا جائز نہ ہوگا کیونکہ یہ ”بیع قبل القبض“ ہوگی جو کہ شرعاً ناجائز ہے۔

۴۔ انوائس (Invoice)

۱۔ آج کل اکثر کمپنیاں جب باہر سے مال منگواتی ہیں تو حکومتی ٹیکس بچانے کے لیے چیز کی اصل قیمت کے بجائے کم قیمت لکھتی ہے تاکہ ٹیکس کم سے کم لگے اور اس کے لیے کبھی رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔ اس کو انڈر انوائسنگ (invoicing under) کہتے ہیں۔ یہ طریقہ کار شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں دھوکہ اور رشوت کے ساتھ ساتھ حکومت کی طرف سے عائد کردہ ٹیکس کی چوری ہے جو کہ عام حالات میں جائز نہیں ہے، لیکن چونکہ حکومت کے عائد کردہ بعض ٹیکس ناحق اور ناقابل برداشت ہوتے ہیں اور اس طرح بعض ٹیکسوں کی شرح فیصد بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ان کے سدباب کے لیے یا تو حکومت سے گفت و شنید کر کے کوئی ایسی صورت نکالی جائے جس میں شرعاً کوئی قباحت نہ ہو، لیکن اگر حکومت سے گفت و شنید کر کے بھی واضح طور پر ظالمانہ ٹیکسوں سے نجات کی کوئی ممکن صورت نہ بن سکے تو اس صورت میں زیادہ قیمت والی چیز کو کم قیمت میں ظاہر کرنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ اس صورت میں اصل قیمت کی نفی نہ کی جائے اور رشوت کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

اسی طرح اگر کسٹم حکام اصل قیمت کو تسلیم نہ کرتے ہوں اور زیادہ قیمت لگا کر زیادہ ٹیکس وصول کرتے ہوں تو ایسی صورت میں بھی درج بالا دو شرطوں کے ساتھ انڈر انوائسنگ کی گنجائش ہے۔

۲۔ انوائس سے متعلق ایک اور اہم بات یہ ہے کہ بسا اوقات کمپنی سے مال خریدنے والا شخص جو مال خرید کر آگے فروخت کرتا ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ انوائس اس کے نام پر بنانے کے بجائے اگلے خریدار کے نام پر بنایا جائے اور کمپنی والے بھی بنا کر دے دیتے ہیں۔ یہ شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ ایسے انوائس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصل خریدار دوسرا ہے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہے، لہذا دھوکہ اور غلط بیانی کی وجہ سے اس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔

۳۔ بعض اوقات کمپنی اپنا مال ریٹیل مارکیٹ کے چھوٹے دکانداروں کو یا کسی ایسے ادارے کو فروخت کرتی ہے جو سیلز ٹیکس ڈیپارٹمنٹ (sales tax department) میں رجسٹرڈ نہیں ہوتا تو اس کے نام سیلز ٹیکس انوائس نہیں بنایا جاسکتا، اس لیے ایسے مال کا انوائس کسی دہ سے ایسے شخص کے نام بنایا جاتا ہے جو رجسٹرڈ ہو اور اس انوائس

کو فروخت کر دیا جاتا ہے، حالانکہ اس نے حقیقت میں لپینی سے مال نہیں خریدا، تاہم جی شرجا جائز نہیں ہے، لیونہ ایک تاجر اس میں غلط بیانی اور دھوکہ ہے اور دوسرے اس لیے کہ اس میں انوائس کو فروخت لیا جاتا ہے جو کہ حقیقت میں ہذا ت خود کوئی مال نہیں ہے، بلکہ یہ محض ایک رسید ہوتی ہے، جس کے پیچھے مذکورہ صورت میں کوئی مال نہیں ہے۔

۵۔ مال میں کمی بیشی

بسا اوقات خرید و فروخت کے معاملے میں مال کی مکمل سپلائی نہیں ہو پاتی، بلکہ اس میں کچھ کمی بیشی ہو جاتی ہے، مثلاً کمپنی نے اشیاء ضرورت خرید لی، یا کسی کو پروڈکٹس بیچ دی، لیکن جب خریدی ہوئی اشیاء کمپنی یا خریدار کے پاس پہنچ گئیں تو اس کی مقدار میں کمی یا زیادتی پائی گئی۔ اس طرح کی صورت حال میں بہتر یہ ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ ایمانداری کے ساتھ ایک دوسرے کو مکمل تفصیل بتا کر تصفیہ کر لیں، اگر کمی ہوئی ہے تو اسے پورا کر لیا جائے اور اگر مال زیادہ مقدار میں آیا ہے تو اسے واپس کیا جائے یا اس کی قیمت ادا کر دی جائے، کسی کا حق کھانا شرجا ساخت گناہ ہے۔ البتہ اگر خریدار کے پاس خرید ہوا مال کم پہنچا اور اسے یہ یقین ہو کہ فروخت کنندہ اس کی بات پر اعتماد نہیں کرے گا تو ایسی صورت میں خریدار ایسا کر سکتا ہے کہ جب کبھی فروخت کنندہ کی کچھ رقم یا مال وغیرہ خریدار کے ہاتھ آجائے تو اس سے اپنا سابقہ حق اور کمی پوری کر لے، شریعت میں اس کی گنجائش موجود ہے، یہ مسئلہ فقہ میں ”مسئلہ الظفر“ کے نام سے مشہور ہے۔^(۱)

۶۔ خریدار کو ڈسکاؤنٹ دینا

فروخت کنندہ اپنے خریداروں کو بعض اوقات قیمت میں ڈسکاؤنٹ دیتا ہے جس کی آج کل مختلف صورتیں رائج ہیں، ذیل میں ان صورتوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ ڈسکاؤنٹ دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ ادھار معاملہ کیا جائے اور قیمت متعین نہ کی جائے، بلکہ خریدار کو یہ کہا جائے کہ اگر تم نے مثلاً دو مہینے میں قیمت کی ادائیگی کر دی تو ایک لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے اور اگر دو مہینے سے تاخیر کر دی تو ایک لاکھ دس ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ ادھار معاملہ کرتے وقت شروع سے ہی ایک قیمت متعین کرنا ضروری ہے، قیمت کو اس طرح وقت ادائیگی کے ساتھ مربوط و معلق کرنا درست نہیں ہے۔

۲۔ بعض اوقات ادھار معاملہ کر کے قیمت کی ادائیگی کے لیے ایک خاص وقت متعین کر لیا جاتا ہے، لیکن

فروخت کنندہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو وقتِ ادائیگی کے آجانے سے پہلے ہی قیمت مل جائے، اس کے لیے وہ خریدار سے یہ کہے کہ اگر تم نے ادائیگی کی مدت سے پہلے قیمت ادا کر دی تو آپ کو مثلاً دو فیصد ڈسکاؤنٹ دے دیا جائے گا۔ اس کے شرعی غم میں یہ تفصیل ہے کہ اگر معاملہ کرتے وقت باقاعدہ تحریری یا زبانی طور پر ڈسکاؤنٹ کی شرط کے ساتھ معاہدہ کر لیا گیا تو یہ جائز نہیں ہے، البتہ اگر بیچنے والا بلا کسی شرط اپنی مرضی سے خریدار کی جلد ادائیگی کی وجہ سے کل قیمت میں سے کچھ کم کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

۳۔ اسی طرح کی ایک صورت یہ پیش آتی ہے کہ ادھار معاملہ کرنے کے بعد ادائیگی کی مدت کے آجانے کے باوجود خریدار ادائیگی نہیں کر پاتا تو فروخت کنندہ اُسے کہتا ہے کہ اگر تم نے جلدی (مثلاً اس دنوں کے اندر) ادائیگی کر دی تو آپ کو ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا۔ یہ صورت شرعاً جائز ہے، کیونکہ جس قرض کی ادائیگی کی مدت آچکی ہو (دین حال) علماء نے اس میں ڈسکاؤنٹ دینے کی اجازت دی ہے۔

۴۔ اگر معاملہ ادھار نہ ہو، بلکہ نقد معاملہ کیا جائے اور خریداریوں کہے کہ قیمت دے دوں گا۔ اس صورت میں فروخت کنندہ کو کسی بھی وقت قیمت کے مطالبہ کرنے کی اجازت ہوتی ہے، جیسا کہ عموماً جان پہچان والوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں بھی اگر فروخت کنندہ جلدی ادائیگی کی وجہ سے خریدار کو کچھ ڈسکاؤنٹ دیدے تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ یہ ”بیع حال“ ہے جس میں ڈسکاؤنٹ دینا منع نہیں ہے۔

۵۔ فروخت کنندہ کی طرف سے خریدار کو ملنے والے ڈسکاؤنٹ کی ایک صورت آج کل یہ بھی رائج ہے کہ ایک مخصوص مالیت کا مال خریدنے پر خریدار کو کچھ ڈسکاؤنٹ دے دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک لاکھ سے دو لاکھ تک کی مالیت کا مال خریدنے پر آڑھائی فیصد، جبکہ دو لاکھ یا اس سے زائد کی مالیت کا مال خریدنے پر پانچ فیصد رعایت دی جائے گی۔ یہ بھی شرعاً جائز ہے۔^(۱)

۷۔ حرام تصاویر والی اشیاء کی خرید و فروخت

کسی جاندار کی تصویر بنانا یا چھاپنا بلا ضرورتِ شرعی جائز نہیں، چھاپنے والا گناہ گار ہوگا، لیکن جن اشیاء پر تصاویر منتقوش اور چسپاں ہوں ان کے خرید و فروخت کا حکم یہ ہے کہ اگر اصل مقصد تصاویر ہی کی خرید و فروخت ہوں تو یہ شرعاً ناجائز ہے، البتہ اگر مقصود تصویر کی خرید و فروخت نہ ہو، بلکہ ان اشیاء کی خرید و فروخت مقصود ہوں جن پر تصویر چسپاں ہوتی ہے، جیسا کہ آج کل استعمال کی تقریباً اکثر اشیاء پر تصاویر چسپاں ہوتی ہیں، جیسے بسکٹ، صابن، شیمپو وغیرہ تو ایسی صورت

میں ان اشیاء کی خرید و فروخت جائز ہے اور ان کی آمدنی بھی جائز ہوگی، کیونکہ ان میں اصل مقصود وہ چیز ہوتی ہے، تصویر ضمناً آجاتی ہے، البتہ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ دوکان میں یہ تصاویر نمایاں نہ ہوں، بلکہ اس طرح رکھی جائیں کہ تصاویر چھپ جائیں یا چہرہ کی جگہ پر بغیر تصویر والا اسٹیکر چسپاں کر دیا جائے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شریعت میں توابع اور ضمن میں پائے جانے والے امور کے سلسلے میں چشم پوشی اور گنجائش والا حکم دیا گیا ہے اور ان کے لیے وہ شرائط ضروری نہیں ہوتیں جو اصل اور مقصودی چیز کے لیے ضروری ہوتی ہیں، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے: "يُغْتَفَرُ فِي التَّوَابِعِ مَا لَا يُغْتَفَرُ فِي غَيْرِهَا"^(۱) اور بقول امام کرخی: "الأصل أنه قد يثبت الشيء تبعاً وحكماً وإن كان قد يبطل قصداً"^(۲)۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”بیع و شراء میں اگر تصاویر خود مقصود نہ ہوں، بلکہ دوسری چیزوں کے تابع ہو کر آجائیں، جیسے اکثر کپڑوں میں مورتیں لگی ہوتی ہیں یا برتنوں اور دوسری مصنوعات جدیدہ میں اس کا رواج عام ہے تو اس کی خرید و فروخت تبجاً جائز ہے، لیکن جبکہ خود تصاویر ہی کی بیع و شراء مقصود ہو تو خریدنا اور فروخت کرنا دونوں ناجائز ہیں۔“^(۳)

۸۔ کسی کے نام پر چیز خریدنا/ زمین کسی کے نام کرنا

اگر کوئی شخص زمین وغیرہ خریدتا ہے، لیکن سرکاری/ حکومتی کاغذات میں اپنے بیٹے/ بیوی یا کسی اور کا نام بطور خریدار لکھتا ہے، حالانکہ مکمل قیمت خود ادا کرتا ہے اور عقد کے دیگر حقوق کا تعلق بھی اسی کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ زمین وغیرہ کس کی ملکیت سمجھی جائے گی؟

اس عقد کو آج کل عربی میں ”العقد الصوري“ اور انگریزی میں (ostensible contract) یا (benami contract) کہتے ہیں۔ لوگ ٹیکس سے بچنے یا کسی اور غرض سے ایسا کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اصل مالک ہی وہ دوسرا شخص ہے جس کے نام پر زمین وغیرہ خریدی گئی ہے، بلکہ ایسے معاملے میں اصل عاقد زمین وغیرہ کا حقیقی مالک وہی شخص ہوگا جو قیمت کی ادائیگی کر کے زمین وغیرہ خرید رہا ہے، جس شخص کا نام حکومتی کاغذات میں لکھا جائے اُسے ”صوری مالک“ کہا جاسکتا ہے، لیکن وہ اصل مالک نہیں ہوگا۔

^(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۲۲ (المادة ۵۹)

^(۲) فواعل المقہ ص: ۱۶

^(۳) جواهر الفقہ ۲/۲۳۳

اسی بنیاد پر علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی مملوکہ زمین اپنے بیٹے یا بیوی کے نام خریدتا ہے۔ اس باقاعدہ تقسیم کر کے، زمین سے اپنا اختیار ختم کر کے ان کے قبضہ میں نہیں دیتا، تو محض اس نکست سے اس کی بیوی یا بیٹا اس زمین کے مالک نہیں ہوں گے، ایک تو اس لیے کہ زمین کسی کے نام کرنے کا صرف یہ مقصد نہیں ہوتا کہ یہ زمین اسی کی ملکیت ہو گئی۔ دوسرے اس لیے بھی کہ ہبہ کے تام و مکمل ہونے کے لیے قبضہ ضروری ہے۔^(۱)

۹۔ رقوم کی ترسیل / ہنڈی

آج کل لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ رقم کی ترسیل میں مارکیٹ ریٹ کی رعایت نہیں کرتے، مثلاً اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ پاکستان میں ہنڈی والوں کو رقم دیکر چائے میں وہ خود یا اس کا کوئی نائب وہاں کی کرنسی (yuan) وصول کرے اور مارکیٹ میں چائے کا ایک (yuan) پاکستانی سولہ روپے کے برابر ہے تو ہنڈی والے اس شخص سے فی یں اٹھارہ روپے وصول کرتے ہیں۔ کیا یہ معاملہ درست ہے؟

یہ ہنڈی کی صورت ہے اور ہنڈی کے کاروبار کے لیے ہمارے اکابر نے تین شرائط لگائی ہیں:

۱۔ دونوں کرنسیوں میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ کر لیا جائے۔ یہ شرط اکثر ہنڈی کے معاملے میں پائی جاتی ہے، بعض اوقات نہیں بھی پائی جاتی۔

۲۔ اگر معاملہ ادھار کا ہو یعنی پاکستان میں رقم بھی دے دی جائے اور چائے میں ”یَن“ کچھ مدت بعد ملنا طے ہو تو اس صورت میں یہ بھی شرط ہے کہ دونوں ملکوں کی کرنسیوں کا تبادلہ بازاری قیمت (مارکیٹ ویلیو) پر ہو۔ ہنڈی کا معاملہ ادھار ہی ہوتا ہے اور عموماً اس شرط کی رعایت نہیں رکھی جاتی۔

۳۔ ہنڈی کے ذریعہ رقم بھیجنا قانونی طور پر ممنوع نہ ہو۔ اس شرط کا لحاظ نہ رکھنے کی صورت میں قانون کی خلاف ورزی کا گناہ ہو گا، اگرچہ اس طرح کمایا گیا نفع حرام نہیں ہو گا۔^(۲)

مارکیٹ ریٹ کو لازم کرنے کی وجہ استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے یہ لکھی ہے کہ اگر مارکیٹ ریٹ سے کم یا زیادہ کی اجازت دے دی گئی تو اس کو سود کے لیے بطور حیلہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کو کچھ مدت کے لیے پانچ سو روپے قرض دیکر اس پر سو روپے سود وصول کرنا چاہتا ہے تو وہ یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ وہ پاکستانی پانچ سو روپے اتنے ڈالرز کے بدلے بیچ دے گا جو چھ سو روپے کے برابر ہو۔ بلکہ اس سے

^(۱) فقہ البیوع ۲۱۹/۱

^(۲) ۱۱ ماہنامہ، جہ یہ معاشی مسائل ۸۷/۲

بڑھ کر وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ جب وصولی کی تاریخ آجائے تو بائع (یا قرض خواہ)، مشتری (یا مقروض) کو یوں کہہ دے کہ آپ کے ذمے میرے جو ڈالر ہیں اُس کے بدلے مجھے پاکستانی روپے (جس کی بازاری قیمت چھ سو روپے ہوگی) دیدو، لہذا بالآخر سود کی وہی صورت نکل آئے گی جس میں پانچ سو روپے دیکر چھ سو وصول کیے جاتے۔^(۱)

جواز کی صورت:

ہنڈی کے معاملے میں غور کیا جائے تو مارکیٹ ریٹ سے زیادہ رقم لینے کے لیے جواز کی ایک صورت ایسی نکل سکتی ہے جس کو سود کے لیے بطور حیلہ اختیار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ یہ صورت صرف رقوم کی ترسیل پر ہی منطبق ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہنڈی والوں کے ساتھ کرنسی کا تبادلہ باقاعدہ مارکیٹ ریٹ پر ہی کیا جائے، کم یا زیادہ پر نہ کیا جائے، لیکن چونکہ ہنڈی والے رقم کی منتقلی کی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں، اس لیے ان خدمات کے بدلے ان کے لیے الگ سے متعین اجرت طے کر کے دی جائے۔ یہ دو معاملے تصور کیے جائیں گے۔ ایک قرض یا حوالہ۔ دوسرا معاملہ اجارہ کا ہے۔ الگ سے اجرت اس طرح بھی طے کی جاسکتی ہے کہ فی ین کی ترسیل پر دو روپے اجرت یا مثلاً ایک لاکھ پاکستانی روپے (جو مارکیٹ ریٹ کے مطابق ۶۲۵۰ ین کے برابر ہوں گے) کی ترسیل پر بارہ ہزار پانچ سو روپے اجرت طے کر کے دی جائے۔ یہ بھی فی ین دو روپے ہی بنتے ہیں۔

یہی رائے ہمارے اکابر نے ایزی پیس اور منی آرڈر کے بارے میں اختیار کی ہے کہ اس میں فقہی اعتبار سے دو معاملے وجود میں آتے ہیں:

اول: قرض۔ کسٹمر، کمپنی کو قرض دیتا ہے اور بغیر کسی کمی زیادتی کے، دوسری جگہ اس کا نائب کمپنی سے وہ قرض وصول کرتا ہے۔

دوم: اجارہ۔ کمپنی فارم بھرنے، ریکارڈ تیار کرنے اور دیگر خدمات کے سلسلے میں اجرت وصول کرتی ہے۔^(۲) چونکہ سود والی صورت عام قرض کی ہے جس میں قرض لینے والا کوئی خدمت فراہم نہیں کرتا، اس لیے وہاں اضافی رقم بطور اجرت نہیں دی جاسکتی، بلکہ اس میں مارکیٹ ریٹ ہی لازم ہوگا۔

۱۰۔ خرید و فروخت میں دو بار تولنے یا ماپنے کا حکم

احادیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے کھانے کی اشیاء کی خرید و فروخت میں دو مرتبہ صاع/ماپنے اور تولنے کا

^(۱) بحوث فی فضا یا فقہیة معاصرة ۱/ ۱۳۷

^(۲) امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۳۶

نظم دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

نہی رسول اللہ عن بیع الطعام حتی یجری فیہ الصاعان: صاع البانع و صاع المشتوی. (۱)

یعنی کھانے کی اشیاء کی بیع میں جب تک دو صاع (ایک صاع بائع کا اور دوسرا مشتری کا) جمع نہ ہو جائے، ان کی بیع سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

بظاہر اس حدیث کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب کبھی کوئی چیز خریدنی ہو تو پہلے فروخت کنندہ اس کو تولے یا ناپے اور پھر خریدار بھی تولے اور ناپے، ورنہ معاملہ درست نہ ہوگا۔ لیکن یہ مفہوم درست نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی وجہ اور حکمت معلوم ہوتی ہے۔ اس حدیث کا درست مفہوم یہ ہے کہ دو صاع یا دو بار وزن کرنے کا تعلق ایک عقد / معاملہ کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد دو عقود / معاملات مراد ہیں۔ مثلاً دکاندار اپنی دکان کے لیے چیز خرید کر لارہا ہے اور آگے بیچ رہا ہے تو خریدتے وقت اپنے لیے وزن کرے، اور پھر جب چیز دکان میں آجائے تو آگے بیچتے وقت گاہک کے لیے بھی وزن کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں چیز کم یا زیادہ نہ ہو اور کسی دوسرے کا حق استعمال میں نہ آئے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر دکاندار اپنی دکان کے لیے چیز خرید رہا ہو اور اس نے اپنے گاہک (مشتری ثانی) کے سامنے ہی چیز کا وزن کر لیا تو اب گاہک کو چیز فروخت کرتے وقت دوبارہ وزن کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ مقصود حاصل ہو گیا۔ (۲)

علامہ بابرؒ نے عنایہ میں لکھا ہے کہ اس طرح کے معاملے کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ کوئی شخص اپنے لیے خریدتے وقت اور آگے بیچتے وقت کیل یا وزن ہی کی بنیاد پر معاملہ کرے تو دو صاع / دو بار تولنا ضروری ہے، ایک بار خود خریدتے وقت، دوسری بار آگے بیچتے وقت۔

۲۔ خود بھی مجازفہ (یعنی تخمینہ، جس میں چیز معلوم و متعین ہو، لیکن مقدار معلوم نہ ہو اور نہ مقدار مقصود ہو) کی بنیاد پر خریدے، آگے بھی مجازفہ کی بنیاد پر بیچے تو ایک بار بھی تولنا ضروری نہیں۔

۳۔ اپنے لیے خریدتے وقت وزن مقصود ہو، لیکن آگے مجازفہ کی بنیاد پر فروخت کرے تو صرف خود خریدتے وقت وزن کرنا ضروری ہے۔

(۱) سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۲۲۸

(۲) فیض الباری شرح صحیح البخاری ۱ / ۳۹۱

۴۔ اپنے لیے خریدتے وقت وزن مقصود نہ ہو، بلکہ مجاز فہ پر خریدے، لیکن آگے وزن کی بنیاد پر بیچے تو آس وقت صرف ایک بار وزن کرنا ضروری ہے۔^(۱)

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ماپ کر بیچی جانے والی یا جن اشیاء کو وزن کر کے بیچا جاتا ہے ان کو بیچنے والے اور خریدار کی موجودگی میں وزن کرنا اس وقت ضروری ہے جب ان اشیاء میں خریدار کی جانب سے وزن ہی ملحوظ اور مقصود ہو۔ اگر اس کا مقصود وزن نہ ہو، بلکہ چیز کی نظر آنے والی متعین مقدار جو پیکنگ میں ہے وہ ملحوظ و مقصود ہو اور اس چیز پر وزن کا ذکر محض مطلوبہ پیکنگ یا ڈبے کی نشاندہی کے لیے کیا گیا ہو تو پھر بیچتے وقت وزن کرنا شرط نہیں۔ (لأنه بيع المبيع المشار اليه مجازفة) نیز ایسے ظرف، بورے، پیک شدہ ڈبے اور شیشیاں جن کا وزن معلوم و معین ہو مثلاً پانچ کلو تیل کا ڈبہ، پچاس کلو چینی کی بوری، ایک لیٹر دودھ کا پیک شدہ ڈبہ وغیرہ تو ان میں بھی وزن اور کیل کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان میں ہر بورا، ظرف اور ڈبہ اصطلاحی کیل ہے۔

۱۱۔ یمنز (Semen) کی خرید و فروخت

آج کل جانوروں کی مصنوعی افزائش نسل کے لیے یمنز (semen) کی ضرورت پڑتی ہے جو ز جانور کے مادہ منویہ میں موجود ایک قسم کا جرثومہ ہوتا ہے۔ اسی مقصد کے لیے ز جانوروں کے مادہ منویہ کی خرید و فروخت بھی آج کل عام ہو گئی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ز جانوروں کے مادہ منویہ کی خرید و فروخت جائز معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس کے اندر عدم جواز کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ چونکہ مادہ منویہ کے خرید و فروخت سے مقصود، اس مادہ منوی میں موجود ”یمنز“ ہوتے ہیں، جن کا وجود معلوم اور مقدار متعین ہو جاتی ہے، اور اس کو خریدار کے حوالے کرنا بھی آسان (مقدور التسليم) ہوتا ہے۔ کسی چیز کی خرید و فروخت کے لیے اس چیز کا مال اور قیمتی ہونا بھی ضروری ہے اور یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ جانوروں کا مادہ منویہ کو ماضی میں کوئی مال یا قیمتی چیز نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن موجودہ زمانے کے عرف کو دیکھا جائے تو یہ باقاعدہ مال اور قیمتی چیز بن گئی ہے اور کسی بھی چیز کے مال بننے میں عرف کو اہم کردار حاصل ہے، لہذا اس کو مال اور متقوم قرار دیا جائے گا اور اس کی خرید و فروخت جائز ہوگی۔^(۲)

^(۱) العناية شرح الهداية ۲۷۵/۹

^(۲) حاشية ابن عابدين ۵۰۱/۴

۱۲۔ حرام اجزاء پر مشتمل فیڈ

آج کل پولٹری فارمز وغیرہ میں جانوروں کو ایسی غذا (feed) کھلائی جاتی ہے جس میں حرام اجزاء مثلاً خنزیر کی چربی اور خون وغیرہ ہوتا ہے۔ ایسی غذا کے بارے میں عموماً تین سوال کیے جاتے ہیں:

۱۔ ایسے فیڈز کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟

۲۔ جانوروں کو ایسا فیڈ کھلانا جائز ہے یا نہیں؟

۳۔ جس جانور کو یہ غذا کھلائی جائے اس کے گوشت کا کیا حکم ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق تو اس سلسلے میں اگر صرف حرام اجزاء کو دیکھا جائے تو ان کی خرید و فروخت کے ناجائز ہونے پر علماء کا اتفاق ہے، البتہ صرف امام احمدؒ خون کی خرید و فروخت کو جائز سمجھتے ہیں، لیکن فیڈز میں حرام اجزاء سے زیادہ حلال اجزاء ہوتے ہیں، جیسے گندم، مکئی، چاول اور باجرہ وغیرہ۔ اس طرح کے مخلوط اشیاء کی خرید و فروخت کا حکم اتفاقاً طور پر ناجائز نہیں ہے، بلکہ ایسی چیز سے چونکہ نفع حاصل کرنا ممکن ہے، اس لیے یہ ایک قابل انتفاع چیز ہے جس کی خرید و فروخت جائز ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ خالص حرام چیز جس طرح انسان کے لیے حرام ہے، اسی طرح جانوروں کو کھلانا بھی حرام ہے، لیکن ایسی مخلوط غذا جانوروں کو کھلانے کی گنجائش ہے، کیونکہ ایک تو اس میں حرام اجزاء نہایت کم ہوتے ہیں اور دوسرے اس میں ایسے کیمیکلز کا استعمال ہوتا ہے جس سے حرام اجزاء کی حقیقت و ماہیت بدل جاتی ہے۔ جیسا کہ فقہاء نے فرمایا ہے کہ جب پانی میں کوئی ناپاک چیز گرجائے اور اس کا رنگ، بو اور ذائقہ تبدیل نہ ہوئے ہوں تو وہ پانی جانور کو پلانا جائز ہے۔^(۱)

جن جانوروں کو خالص حرام غذا کھلائی گئی ہو یا مخلوط غذا کھلائی گئی ہو، لیکن ان کے گوشت میں بدبو نہ آئی ہو ایسے جانوروں کا گوشت کھانا حلال ہے، کیونکہ حلال جانور اگر کوئی حرام چیز یا نجاست کھالے تو محض اس سے اس کا گوشت حرام نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا کھانا اس وقت مکروہ ہے جب نجاست وغیرہ کھانے کی وجہ سے اس کا گوشت متغیر ہو جائے، اور اس میں سے بدبو آنے لگے، جس کو فقہاء ”جلالہ“ کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ خنزیر کے اجزاء کو جب غذا کی صورت میں مرغی کو کھلایا جاتا ہے تو وہ اجزاء بعد میں مرغی کے گوشت کا حصہ بن جاتے ہیں، اس صورت میں استعمال ہونے کی وجہ سے ان اجزاء کی حقیقت اور ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے،

اور فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ کوئی بھی نجس یا حرام چیز استعمال (ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل) ہونے کے بعد جب پاک اور حلال شئی میں تبدیل ہو جائے تو وہ حلال ہو جاتی ہے، تاہم فیڈ میں حرام اجزاء ملانے سے بہر حال پرہیز کرنا ضروری ہے۔^(۱)

۱۳۔ تصاویر اور گڑیوں کی خرید و فروخت

بے جان اشیاء کی تصاویر بنانے، استعمال کرنے اور بیچنے یا خریدنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، جیسا کہ علامہ برہان الدین حنفی فرماتے ہیں:

أن الصورة نوعان: صورة جماد كالشجر ونحوه، وصورة حيوان، فصورة الجماد لا يكره اتخاذها.^(۲)

جہاں تک جاندار کی تصویر کی بات ہے تو اس میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ شرعاً وہ تصویر ممنوع ہے جو سر والی ہو، جس میں کان، ناک اور آنکھ وغیرہ اعضاء صاف بنے ہوئے ہوں، لہذا جس تصویر میں سر نہ ہو، یعنی صرف دھڑ ہو اور سر کٹا ہوا ہو۔ یا سر ہو مگر اس میں آنکھ، ناک، کان صاف بنے ہوئے نہ ہوں، بلکہ یہ اعضاء مٹے ہوئے ہوں۔ یا پوری تصویر نہ ہو، بلکہ تصویر کے اعضاء میں سے کوئی ایک عضو ہو، مثلاً صرف آنکھ، صرف کہنی، ہاتھ، بازو، وغیرہ، یا پشت کی جانب سے لی گئی تصویر ہو جس میں چہرہ سامنے نہ ہو۔ تو ایسی تصاویر شرعاً ممنوع تصویر میں داخل نہیں ہیں، البتہ کسی ستر والے عضو کی تصویر بنانا بھی ممنوع ہے۔^(۳)

ممنوع تصاویر دو قسم کی ہوتی ہیں:

۱۔ وہ تصاویر جو کسی کاغذ، کپڑے یا کسی اور چیز پر منقوش اور چسپاں ہوں۔

۲۔ وہ تصاویر جو کسی کاغذ وغیرہ پر چسپاں نہ ہوں، بلکہ ان کا اپنا وجود اور جسم ہوں، جیسے بت اور گڑیاں وغیرہ۔

پہلی صورت کی خرید و فروخت کا حکم یہ ہے کہ اگر اصل مقصد تصاویر ہی کی خرید و فروخت ہوں تو یہ شرعاً ناجائز ہے۔ البتہ اگر مقصد تصویر کی خرید و فروخت نہ ہو، بلکہ ان اشیاء کی خرید و فروخت مقصود ہوں جن پر تصویر چسپاں ہوتی ہے۔ البتہ اس صورت میں ان اشیاء کی خرید و فروخت جائز ہے۔ اسی قسم میں اخبارات و رسائل بھی داخل ہیں کہ ان کا کاروبار

^(۱) الہندیۃ ۵/۲۸۹

^(۲) المحيط البرہانی ۵/۱۳۵

^(۳) حاشیۃ ابن عابدین ۱/۶۴۸

جائز ہے اور اس کی آمدنی بھی حلال ہے، کیونکہ اخبارات میں تصاویر عموماً ضناً ہوتی ہے، تاہم اخبارات میں جانداروں سے چھاپنا خواہ وہ فحش ہوں یا نہ ہو، حرام ہے، چھاپنے والا گناہ گار ہوگا۔^(۱)

دوسری قسم کی تصاویر (اور گزٹیوں) کا حکم یہ ہے اگر یہ بہت چھوٹی ہوں کہ انہیں زمین پر رکھ کر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو ان کے اعضاء یعنی آنکھ، کان اور ناک واضح نظر نہ آئیں تو ان کا استعمال اور خرید و فروخت جائز ہے، لیکن بنانا بہر حال ناجائز ہے۔^(۲)

اور اگر یہ تصاویر چھوٹی نہ ہوں، بلکہ بڑی ہوں جو کہ باقاعدہ مجسمہ اور بُت کی شکل میں ہوں اور اس کو توڑ کر اس کی دھات فروخت کی جائے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں، اور اس کی قیمت اپنے استعمال میں لانا بلاشبہ جائز ہے۔^(۳)

اور اگر مجسمہ کو اسی سالم حالت (بُت کی شکل میں) فروخت کیا جائے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

الف- اگر مذکورہ مجسمہ کی خرید و فروخت میں اصل مقصود اس کی مالیت نہ ہو، بلکہ شکل و صورت ہی مقصود ہو، جیسا کہ کسی میوزیم والوں کو فروخت کرنا کہ ان کا مقصود مجسمہ کی دھات یا اس کی مالیت نہیں ہوتی، بلکہ اس کی شکل و صورت مقصود ہوتی ہے، تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے، جیسا کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم لکھتے ہیں کہ:

ولكن هذا المنع إنما هو في بيع الصورة بقصد الصورة.^(۴)

ب- دوسری صورت یہ ہے کہ مذکورہ مجسمہ کی خرید و فروخت سے اصل مقصود اس کی شکل و صورت نہ ہو، بلکہ اس کی مالیت اور وہ دھات مقصود ہو جس سے مجسمہ بنا ہے، جیسے سونا، چاندی، پیتل یا لکڑی، پلاسٹک وغیرہ۔ ایسی صورت میں امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک یہ معاملہ شرعاً درست نہیں ہے اور بیع منعقد نہیں ہوگی، جبکہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ بیع کراہت کے ساتھ منعقد ہو جائے گی۔ (کما هو حکم آلات الملاحی)

لیکن اس آخری صورت سے بھی احتراز کرنا لازم ہے، کیونکہ ایک تو بعض ائمہ کرام نے اس کو صراحت کے ساتھ ناجائز لکھا ہے۔ دوسرے اس لیے بھی کہ امام ابو حنیفہ نے اس صورت کو جس کراہت کے ساتھ درست قرار دیا ہے، اس سے کراہت تحریمی مراد ہے، اور مکروہ تحریمی بھی ناجائز ہی کا ایک درجہ ہے، اس لیے اس آخری صورت میں بھی

(۱) جواہر الفقہ ۷/۲۲۳

(۲) الدر المختار ۱/۶۴۸

(۳) تکملة فتح الملمہ ۱/۲۲۳

(۴) حوالہ بالا ۱/۲۲۳

فروخت کنندہ کے لیے حاصل ہونے والی رقم اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہوگا۔^(۱)

خلاصہ یہ ہوا کہ مجسمہ، بُت یا بڑی گڑیوں کو توڑ کر اس کی دھات ہی فروخت کرنی چاہیے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز ہے۔

۱۳۔ نجس و ناپاک اشیاء کی خرید و فروخت

ایسی نجس اور ناپاک چیز کی خرید و فروخت بھی شرعاً ممنوع ہے جن سے داخلی یا خارجی انتفاع اور استعمال شریعت میں ناجائز اور حرام ہو۔ جیسے شراب، خنزیر، خنزیر کے اجزاء یا کوئی بھی ایسی چیز جس میں خنزیر کے اجزاء کا استعمال ہو۔ اسی طرح انسانی فضلہ کی خرید و فروخت وغیرہ، البتہ اگر اس کے ساتھ مٹی مل گئی اور فضلہ مغلوب ہو گیا تو اب اس کی خرید و فروخت جائز ہوگی، لیکن گوبر، لید اور میٹلیوں کی خرید و فروخت جائز ہے، خواہ اس کے ساتھ مٹی نہ بھی ملی ہو، کیونکہ شرعاً ان کا بدن کے علاوہ دیگر ضروریات (جیسے آگ جلانے) میں استعمال جائز ہے۔^(۲)

مردار کا گوشت، مردار کی کھال دباغت (tanning) سے پہلے، یہ چیزیں ناپاک اور عام حالات میں ان کا استعمال کرنا حرام ہے، لہذا ان اشیاء کی خرید و فروخت بھی ممنوع ہے اور ان کو فروخت کر لینے سے جو رقم حاصل ہو وہ بھی حرام ہوگی۔ البتہ کسی مردار جانور کے وہ اجزاء جن کا استعمال کرنا جائز ہوں ان کی خرید و فروخت بھی جائز ہے، جیسے خنزیر کے علاوہ کسی دوسرے مردار جانور کی ہڈی، پھٹے، بال اور اُون وغیرہ، چونکہ ان کا خارجی استعمال جائز ہے، اس لیے ان کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔

اسی طرح اگر خنزیر کے علاوہ کسی جانور کو شرعی طریقے کے مطابق ذبح کیا جائے تو چونکہ اُس کی کھال کو استعمال کرنا شرعاً جائز ہے، اس لیے ایسے مردار کی کھال کی خرید و فروخت جائز اور اس سے حاصل ہونے والا نفع حلال ہوگا۔ اسی طرح اگر مردار جانور کی کھال کو دباغت (tanning) دے دی جائے تو اس کی کھال کا بھی یہی حکم ہے۔^(۳)

خنزیر کے علاوہ جانوروں وغیرہ کے بال، پٹھے، سینگ اور اُون وغیرہ چونکہ شرعاً پاک اور قابل انتفاع ہے، اس لیے ان کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔ انسان کے مذکورہ اجزاء کی بیع شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ انسان کی تعظیم اور کرامت کی وجہ سے اس کے اعضاء سے انتفاع حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔^(۴)

(۱) فقہ البیوع ۱/۳۱۶ تا ۳۱۹

(۲) بدائع الصنائع ۵/۱۴۴

(۳) حوالہ بالا ۵/۱۴۲

(۴) الجوہرۃ النیرۃ ۱/۵۵

۱۵۔ پرندوں اور جانوروں کی خرید و فروخت

شریعت کا ایک اہم اصول ہے کہ جن چیزوں کی خرید و فروخت کی ممانعت قرآن و حدیث میں صراحت کے ساتھ ثابت نہ اور وہ کسی دور میں اس لائق ہو جائے کہ اس سے نفع اٹھایا جاسکے تو ان کی خرید و فروخت جائز ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ خضکی فرماتے ہیں:

وَالْحَاصِلُ أَنَّ جَوَازَ الْبَيْعِ يَدُورُ مَعَ جِلِّ الْإِنْتِفَاعِ.^(۱)

حاصل یہ ہے کہ بیع کے جواز کا دار و مدار کسی چیز سے انتفاع کے حلال ہونے پر ہے۔

لہذا پرندوں کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح کتوں اور بلیوں کی خرید و فروخت بھی شرعاً جائز ہے، لیکن ایسے کتے کی خرید و فروخت درست نہیں ہے سدھایانہ جاسکے اور وہ سرے سے قابل انتفاع ہی نہ ہو، البتہ اگر اس سے ڈاکٹری تجربات یا ریسرچ یا کسی اور ذریعے سے انتفاع ممکن ہو تو اس کی خرید و فروخت بھی درست ہوگی، کیونکہ یہ بھی نفع کی ایک صورت ہے۔^(۲)

کیڑے مکوڑوں اور حشرات الارض سانپ وغیرہ کی خرید و فروخت جائز نہیں، لیکن ریشم کے کیڑے اور اس کے انڈے اور شہد کی مکھی کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ چیزیں قابل انتفاع ہیں۔ اسی طرح فقہ ابو الیث نے سانپ کی خرید و فروخت کو بھی جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اس کا استعمال دواء میں کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح وہ دریائی جانور جن کا کھانا اگرچہ حرام ہیں، لیکن ان کی ہڈیوں اور چمڑے وغیرہ سے اگر کوئی جائز فائدہ حاصل ہو سکتا ہو تو ان کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہوگی۔^(۳)

۱۶۔ خرید و فروخت میں ”غلطی“ کی شرعی حیثیت

شریعت کی نظر میں معاملات اور خرید و فروخت کے صحیح ہونے کے لیے ایک اہم اور بنیادی شرط یہ ہے کہ خرید و فروخت کرنے والے معاملہ پر راضی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی پر کسی معاملہ کے لیے جبر و زبردستی کرنا یا کسی کو دھوکہ دیکر اس سے کوئی چیز سستی خرید لینا یا اسے مہنگی فروخت کر دینا شرعاً ممنوع ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ:

”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، الا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود

^(۱) الدر المختار ۵/۶۹

^(۲) حوالہ بالا ۵/۲۲۴

^(۳) بدائع الصنائع ۵/۱۴۴، الدر المختار ۵/۲۲۷

میں آئی ہو (تو وہ جائز ہے) اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، یقین جانو اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔“^(۱)

ایسے کئی اسباب ہیں جن کی وجہ سے انسان کی رضامندی اور اختیار باقی نہیں رہتا، جیسے جبر و زبردستی اور دھوکہ وغیرہ۔ یہاں صرف ”خطا“ اور غلطی کے بارے میں چند باتیں ذکر کرنا مقصود ہے، کیونکہ بسا اوقات غلطی کی وجہ سے انسان کی رضامندی باقی نہیں رہتی اور کبھی اس کی وجہ سے شریعت کے بقیہ اصولوں کی خلاف ورزی لازم آتی ہے۔

خطا اور غلطی اس حد تک تو عذر ہے کہ اس کی وجہ سے انسان گناہ گار نہیں ہوتا اور وہ آخرت کی سزا سے بچ جاتا ہے، لیکن بعض اوقات انسان کی خطا اور غلطی کی وجہ سے دوسرے انسانوں کا حق ضائع ہو جاتا ہے، اس اعتبار سے خطا اور غلطی کوئی عذر نہیں ہے، بلکہ جس شخص نے غلطی یا خطا کا ارتکاب کیا ہے وہ ان حقوق کا ذمہ دار ہو گا جو اس کے فعل سے ضائع ہوئے ہیں۔^(۲)

خرید و فروخت کے معاملہ میں ”غلطی“ کی درج ذیل صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ الفاظ میں خطا یا غلطی:

غلطی یا خطا کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی شخص کی زبان پر غلطی سے بیچنے یا خریدنے کے الفاظ آجائے، یا کوئی شخص زبان سے قصداً ایسے الفاظ بولے جن کے بارے میں اُسے یہ علم نہ ہو کہ ان الفاظ سے خرید و فروخت کا معاملہ منعقد ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی دوسرے کو یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ چیز میں نے ایک ہزار روپے میں خریدی ہے، لیکن غلطی سے اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے کہ یہ چیز میں تمہیں ایک ہزار میں فروخت کرتا ہوں۔ دوسرے آدمی نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ ایسی صورت میں اگر پہلا شخص یہ دعویٰ کر دے کہ میں چونکہ اس زبان سے واقف نہیں ہوں، اس لیے مجھ سے غلطی ہو گئی اور اس بات پر گواہ بھی پیش کر دے تو اس کی بات معتبر ہوگی۔ لیکن اگر وہ اہل زبان ہے تو پھر اس کی بات معتبر نہیں ہوگی، بلکہ مخالف شخص کی بات قبول کی جائے گی۔ اگر دوسرے شخص نے غلطی اور خطا کی تصدیق کر دی تو معاملہ منعقد ہی نہ ہوگا، ورنہ بیع کا معاملہ منعقد ہو کر لازم ہو جائے گا۔

۲۔ چیز کے وجود میں غلطی:

جس چیز کو فروخت کیا جا رہا ہے، اس کے وجود میں غلطی ہو جائے۔ فروخت کنندہ یہ سمجھ کر چیز بیچ دے کہ یہ چیز میرے پاس ہے، لیکن بعد میں علم ہو جائے کہ چیز موجود ہی نہیں ہے۔ جیسے زید نے اپنے گودام میں رکھا ہوا مال بیچ دیا،

^(۱) النساء۔ آیت نمبر: ۲۹

^(۲) الأشباه والنظائر ص: ۳۳۵

لیکن جب اس نے گودام کھولا تو وہاں مال موجود نہیں تھا۔ کم: دو کیا تھا یا جل گیا تھا یا خراب: دو کیا تھا۔ اس صورت میں یہ معاملہ باطل ہے۔ یہ معاملہ سرے سے منعقد ہی نہیں ہوا، کیونکہ جو چیز موجود نہ ہو، اس کو بیچنا شریعت کی نظر میں ناجائز اور باطل ہے۔

۳۔ ملکیت میں غلط فہمی:

اس کے تحت دو صورتیں آتی ہیں:

الف۔ ایک صورت یہ ہے کہ خریدار یہ سمجھ کر کوئی چیز خریدے کہ یہ چیز فروخت کنندہ ہی کی ملکیت میں ہے، لیکن بعد میں پتہ چلے کہ یہ چیز تو پہلے سے ہی خریدار کی ملکیت میں ہے۔ مثلاً زید نے عمر سے ایک زمین خریدی، بعد میں پتہ چلا کہ یہی زمین زید کو اپنے والد سے وراثت میں ملی ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ یہ عقد بھی شرعاً باطل اور غیر منعقد ہے۔

ب۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خریدار یہ سمجھ کر چیز خرید لے کہ یہ چیز بیچنے والے کی ہے، لیکن معاملہ کرنے کے بعد پتہ چلے کہ یہ چیز کسی اور اجنبی شخص کی ہے۔ مثلاً زید نے عمر سے زمین خریدی، لیکن بعد میں گواہوں کے ذریعے اس بات کا علم ہو گیا کہ یہ زمین فروخت کنندہ (عمر) کی نہیں، بلکہ یہ زمین خالد کی ہے۔ یہ معاملہ اصل مالک (جیسے مذکورہ مثال میں خالد ہے اس) کی اجازت پر موقوف رہے گا۔ اگر اصل مالک نے عقد کی اجازت دے دی تو یہ معاملہ منعقد ہو جائے گا اور اصل مالک اس شخص سے قیمت وصول کر لے گا جس نے اس کی زمین بیچی تھی۔ اگر اصل مالک نے عقد کی اجازت نہ دی اور خریدار سے زمین واپس لے لی تو خریدار کے لیے شرعیہ جائز ہو گا کہ اس نے فروخت کنندہ کو جو رقم دی ہے وہ اس سے واپس وصول کرے۔

۳۔ چیز کی معرفت میں غلطی:

اس سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کو بیچا جا رہا ہے اس کی جنس میں، یا اس کی مقدار میں یا اس کی کسی ایسی صفت میں غلط فہمی ہو جائے جس صفت پر عقد اور معاملے کا دار و مدار ہے۔ مثلاً زید نے عمر سے سونے کی انگوٹھی خریدی، لیکن بعد میں علم ہوا کہ یہ انگوٹھی چاندی کی ہے، صرف سونے کا پانی چمڑکا ہوا ہے۔ یا زید نے عمر سے جاپان کی گھڑی خریدی، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گھڑی چائنہ کی ہے۔

اس صورت کے حکم میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ایسی غلطی دونوں فریقین یعنی خریدار اور فروخت کنندہ دونوں کی طرف سے ہو جائے اور دونوں اس پر متفق ہوں (یعنی mutual mistake ہو) اور بیچی جانے والی چیز کی جنس تبدیل ہو، جیسے سونے کے بجائے چاندی کی انگوٹھی نکل آئی ہو تو یہ عقد باطل ہے، سرے سے منعقد ہی نہیں ہوا، اور اگر یہ فرق

بیز کی مقدار یا صفت میں پایا جائے تو خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔

اگر یہ غلط فہمی کسی ایک فریق سے سرزد ہو جائے، (یعنی unilateral mistake) مثلاً صرف خریدار سے یا صرف فروخت کنندہ سے، اور دوسرے فریق نے اسے زبانی یا تحریری یا فعلی طور پر کوئی دھوکہ نہیں دیا، بلا اس نے اپنے ہی گمان میں غلطی کی وجہ سے چاندی کو سونا سمجھ لیا یا چاندی کی چیز کو جاپانی سمجھ لیا تو عام حالات میں ایسا معاملہ درست اور معتقد ہو گا، البتہ قاضی یا ثالث کو چاہیے کہ ایسی صورت میں غور فکر سے کام لے کر نقصان کا اندازہ لگائے اور یہ متعین کرے کہ اس غلطی کا سبب اور ذمہ دار کون ہے، اس کے بعد اس کے خلاف فیصلہ صادر کرے۔^(۱)

اگر چیز کی جنس میں غلطی ہو جائے اور یہ غلطی دونوں فریقین سے ہو تو فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کی یہ رائے ہے کہ یہ عقد باطل سمجھا جائے گا جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، لیکن مالکیہ اور ایک قول کے مطابق فقہاء شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ یہ عقد باطل نہیں ہو گا، بلکہ دوسرے فریق کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار حاصل ہو گا، جبکہ امام کرخی کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ ان کے ہاں ایسی صورت میں عقد فاسد ہو گا۔^(۲)

۱۷۔ خرید و فروخت میں ”غلط بیانی“ کا حکم

جھوٹ کی خواہ کوئی بھی صورت ہو یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ سرور دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جھوٹ انسان کو برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی جہنم کی طرف“۔^(۳) ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے جھوٹ کو نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔^(۴)

خرید و فروخت اور تجارتی معاملات میں غلط بیانی یہ ہوتی ہے کہ کوئی ایک فریق دوسرے کو بھاننے کے لیے ایسی بات بیان کرے جس پر اعتماد کرتے ہوئے دوسرا فریق معاملہ کرنے پر رضامند ہو جائے، لیکن بعد میں پتہ چلے کہ حقیقت اس کے خلاف ہے جو پہلے فریق نے بیان کی تھی۔

تجارتی معاملات میں جھوٹ بولنا عام جھوٹ سے زیادہ قبیح اور بُرا ہے، کیونکہ اس میں جھوٹ بولنے والا غلط بیانی کے ساتھ ساتھ دھوکہ کی قباحت اور دوسرے انسان کے حق کو ضائع کرنے یا دوسروں کا مال ناحق کھانے کا بھی سبب بنتا

^(۱) فقہ البیوع ۱/۲۱ تا ۲۲۱

^(۲) مقدمات فی المال والملکیة والعقد، علی معی الدین، ص: ۴۳۷

^(۳) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۴۹

^(۴) حوالہ بالا، حدیث نمبر: ۳۴

ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص دوسروں کو دھوکہ دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

جہاں تک تجارتی معاملات میں غلط بیانی کے دنیوی اثرات بات ہے تو مختصر طور پر ان کے درج ذیل تین صورتیں

تیں:

۱۔ چیز کی جنس میں غلط بیانی:

جو چیز بیچی جا رہی ہے اس کی جنس بیان کرنے میں جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لینا۔ مثلاً جیولری بیچنے والوں کے کہ یہ سونے کی جیولری ہے اور خریدار اس کی بات پر اعتماد کر کے جیولری خرید لیتا ہے۔ بعد میں معلوم ہو جائے کہ یہ جیولری سونے کی نہیں ہے، بلکہ سونے کے پانی سے ملمع چاندی کا زیور ہے۔ اس صورت میں یہ معاملہ باطل ہے، لہذا فروخت کنندہ پر لازم ہے کہ خریدار کو اس کی قیمت واپس کر دے اور خریدار اس کا زیور واپس کر دے۔

۲۔ چیز کی صفت میں غلط بیانی:

بیچی جانے والی چیز میں کسی ایسی صفت کو بیان کرنا جو درحقیقت اس چیز میں نہ ہو۔ مثلاً گاڑی بیچنے والا کہے کہ یہ نئی گاڑی ہے یا جاپان کی بنی ہوئی ہے یا یہ موبائل بین پیک ہے۔ خریدار اس کی بات پر اعتماد کر کے گاڑی یا موبائل خرید لیتا ہے، لیکن بعد میں حقیقت اس کے خلاف نکلے۔ گاڑی نئی نہ ہو، یا جاپان کی نہ ہو یا موبائل استعمال شدہ ہو۔ ایسی صورت میں خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

۳۔ چیز کی مارکیٹ ویلیو بتانے میں غلط بیانی:

فریقین میں سے کوئی ایک بیچی جانے والی یا خریدی جانے والی چیز کی بازاری قیمت بتانے میں غلط بیانی سے کام لے۔ یہ غلط بیانی فروخت کنندہ بھی کر سکتا ہے اور خریدار بھی۔ مثلاً فروخت کنندہ نے کہا کہ اس چیز کی بازاری قیمت ایک ہزار روپے ہے، لہذا خریدار نے ہزار روپے میں چیز خرید لی، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اس چیز کی بازاری قیمت پانچ سو روپے ہے۔ یا خریدار نے فروخت کنندہ کو کہا کہ اس چیز کی بازاری قیمت پانچ سو روپے ہے، لہذا فروخت کنندہ نے پانچ سو روپے میں چیز بیچ دی۔ لیکن بعد میں علم ہوا کہ اس چیز کی بازاری قیمت ہزار روپے ہے۔ اس صورت میں بھی جس شخص کے ساتھ غلط بیانی کئی گئی ہے اس کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ پہلی صورت میں خریدار کو اور دوسری صورت میں فروخت کنندہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ معاملہ ختم کر دے۔^(۱)

^(۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۰۱

^(۲) فقہ البیوع: ۲۰۸

۷۔ بیوع کے عمومی ضوابط

معاملات کے تقریباً ہر باب سے متعلق عمومی ضوابط کو الگ جمع کیا گیا ہے، کیونکہ ان ضوابط کو سمجھ کر یاد کرنے سے بہت سارے مسائل و مباحث کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں بیع سے متعلق چند ضوابط کو ذکر کیا جاتا ہے۔

- العبرة في العقود للمقاصد والمعاني، لا للألفاظ والمباني: عقود میں مقاصد و معانی کا اعتبار ہوتا ہے، الفاظ اور ظاہری ڈھانچہ کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔
- إنما البيع عن تراض: بیع باہمی رضامندی سے ہوتی ہے۔
- البيع منوط بالرضا: بیع، باہمی رضامندی سے جڑی ہے۔
- لا يصح البيع إلا من مالك للعين أو من يقوم مقامه: بیع صرف کسی چیز کا مالک یا مالک کا نائب ہی کر سکتا ہے۔ یعنی کسی چیز کو فروخت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فروخت کرنے والا اس چیز کا مالک ہو یا اس کو مالک نے نائب اور وکیل بنایا ہو، ورنہ بیع غیر مملوک ہوگی جو کہ جائز نہیں ہے۔
- الأصل أن البيع لا يقع إلا عن مميز: بیع صرف اچھے برے میں تمیز کر سکنے والا کر سکتا ہے۔
- الأصل منع ما يؤدي إلى النزاع في البيوع: بیوع میں ہر وہ چیز ممنوع ہے جو جھگڑے کا سبب بنے۔
- البيع مبني على رفع الجهالة: بیع کا دار و مدار عدم جہالت پر ہے۔
- البيع موجب للملك بنفسه: بیع بذات خود ملکیت ثابت کرنے والی ہے۔
- حقوق العقد في البيع تتعلق بالعاقدة: بیع میں عقد کے تمام حقوق کا تعلق عقد کرنے والے کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہذا قیمت کی وصولی یا فروخت شدہ چیز کا مطالبہ عقد کرنے والے سے ہی کیا جائے گا۔
- لا يصح تعليق البيع بشرط أو حادثة مستقبلية: بیع کو کسی شرط یا مستقبل کے کسی واقعہ پر معلق کرنا درست نہیں ہے۔
- البيع الموقوف يتم به المملك عند الإجازة من وقت السبب: جب مالک اجازت دیدے تو بیع موقوف کے ذریعے اسی وقت سے ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، جب سے سبب (عقد) وجود میں آیا ہے۔

- ینعقد البیع بما یعدہ الناس بیعاً: ہر ایسی چیز (قول و عمل) سے بیع منعقد ہو جاتی ہے، جس کو اول بیع سمجھتے ہوں۔ بیع کے لیے کوئی خاص اور متعین الفاظ نہیں ہیں۔
- کُلُّ مَالٍ مُتَقَوِّمٍ مُنْتَفَعٍ بِهِ یَجُوزُ بِنَعْتِهِ: ہر ایسا مال جو مقبوض / قیمتی ہو اور اس سے انتفاع حاصل کیا جاسکتا ہو، اس کی بیع جائز ہے۔ ورنہ نہیں۔
- الأصل ثبوت خيار الرؤية في بيع الأعيان الغائبة: غائب اشیاء کی بیع میں اصول یہ ہے کہ خریدار کو خیار رویت حاصل ہوگا۔ لہذا وہ یہ کہہ کر بیع کو ختم کر سکتا ہے کہ مجھے چیز پسند نہیں ہے۔
- کل عیب یوجب الرد علی البائع یمنع الرد إذا حدث عند المشتري، وما لا فلا: ہر ایسا عیب جو چیز کو فروخت کنندہ پر واپسی کرنا لازم کر دیتا ہے، اگر اس جیسا عیب خریدار کے پاس چیز میں پیدا ہو گیا تو چیز واپس کرنا درست نہیں ہوگا، ورنہ وہ عیب کی بنیاد پر چیز واپس کر سکتا ہے۔
- بیع المعدوم باطل: معدوم چیز کی بیع باطل ہے۔
- بیع غیر المملوک باطل: جو چیز انسان کی ملکیت میں نہ ہو، اس کی بیع باطل ہے۔
- البیع قبل القبض فاسد: قبضہ کرنے سے پہلے کسی چیز کو آگے فروخت کرنا بیع فاسد ہے۔
- بیع غیر مقدور التسلیم فاسد: جس چیز کے حوالے کرنے پر فروخت کنندہ کو قدرت حاصل نہ ہو، اس کی بیع فاسد ہے۔
- ما لیس بمضمون لا یباح ربحه: جو چیز انسان کے ضمان / رسک میں نہ ہو، اس سے نفع کمانا جائز نہیں ہے۔
- الأعیان النجسة لا یصح بیعها: نجس و ناپاک اشیاء کی بیع صحیح نہیں ہے۔
- بیع المشاع جائز: مشاع و مشترک چیز کی بیع جائز ہے۔
- کل ما جاز بیعه منفرداً جاز استثناءه من المبیع وما لا فلا: ہر وہ چیز جس کو علیحدہ بیچنا جائز ہو، اس کو کسی دوسری چیز کی بیع سے خارج و مستثنیٰ کرنا بھی جائز ہے، ورنہ نہیں۔
- إتلاف المشتري للمبیع قبض: اگر خریدار نے خریدی ہوئی چیز کو ضائع کر دیا تو اس کو قبضہ قرار دیا جائے گا۔
- المقبوض علی سوم الشراء مضمون، لا المقبوض علی سوم النظر: جس چیز کو خریدنے کی نیت سے قبضہ کیا جائے تو (ضائع ہونے کی صورت میں) اس کا ضمان لازم آئے گا، البتہ اگر صرف دیکھنے کے لیے چیز پر

قبضہ کیا ہو، (خریدنا مقصود نہ ہو) تو اس کا ضمان لازم نہیں ہوگا۔

- الأصل في الأعيان المبيعة عدم جواز اشتراط الأجل في قبضتها: بیچی جانے والی اشیاء میں اصول یہ ہے کہ ان کے قبضہ کرنے کے لیے کوئی مؤخر وقت مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ (سوائے بیع سلم و استصناع کے)
- ما كان في حكم جزء من المبيع فإنه يدخل في البيع: جو چیز بیع کے اجزاء میں سے ہو، وہ بھی بیع میں شامل ہوگی اور خریدار کو ملے گی، اگرچہ اس نے اس چیز کی صراحت نہ کی ہو۔
- الاحتكار يجري بكل ما يضر بالعامّة: ذخیرہ اندوزی کا حکم (ممانعت) ہر اس صورت پر لاگو ہوگا، جس سے عوام کو تکلیف پہنچ رہی ہو۔
- التسعير يدور مع المصلحة: اشیاء کا نرخ مقرر کرنے کا دار و مدار لوگوں کی مصلحت پر ہے۔ اگر عوام کی مصلحت ہے تو حکومت اشیاء کا نرخ مقرر کر سکتی ہے۔
- الإقالة فسخ في حق العاقدين. وبيع جديد في حق غيرهما: اقالہ (عقد کو ختم کرنا) معاملہ کرنے والوں کے حق میں فسخ ہے، جبکہ ان کے علاوہ دیگر لوگوں (جیسے شفیق) کے حق میں بیع جدید ہے۔
- الاستصناع جائز في كل ما جرى التعامل فيه: ہر وہ چیز جس میں استصناع (آرڈر پر چیز بنوانا) کرنے کا تعامل و عرف ہو، اس میں استصناع کرنا جائز ہے۔
- كل ما أمكن ضبط صفته ومعرفة مقداره. جاز السلم فيه: ہر وہ چیز جس کی صفات (کوالٹی) طے کرنا اور مقدار کی پہچان ممکن ہو، اس میں بیع سلم درست ہے۔
- القبض في مجلس الصرف شرط لصحته: بیع صرف میں مجلس عقد کے اندر ہی قبضہ کرنا، بیع صرف کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے۔
- مبنى المايعة على الأمانة: مراہمہ کا دار و مدار امانت پر ہے۔
- لا تجوز الصفقة في الصفقة: صفقہ فی صفقہ، ایک عقد کو دوسرے عقد پر مشروط کرنا جائز نہیں ہے۔
- لا يجوز بيع الثمار حتى يبدو صلاحها: جب تک پھلوں کی صلاحیت ظاہر نہ ہوئی ہو (قابل استعمال نہ ہو) اس وقت تک پھلوں کی بیع جائز نہیں ہے۔

دوسری فصل

ربا کے اصولی مباحث و احکام

(Interest)

ربا/سود کے مباحث اور احکام کے لیے فقہی کتب اور اس موضوع پر لکھی ہوئی تفصیلی کتب کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔ یہاں صرف اس موضوع کا تعارف اور اس کے بنیادی اور اصولی مباحث کو مختصر بیان کرنا مقصود ہے۔ اس فصل کا خاکہ حسب ذیل ہے:

- | | |
|-------------------------|-------------------|
| ۱۔ ربا کا تعارف و اقسام | ۲۔ ربا کی حرمت |
| ۳۔ ربا کی شرائط | ۴۔ ربا کی علت |
| ۵۔ تماثل کی تحقیق | ۶۔ تقابض کی بحث |
| ۷۔ ربا کے عمومی ضوابط | ۸۔ چند جدید مسائل |

ربا کے اصولی مباحث و احکام (Interest)

۱۔ ربا کا تعارف و اقسام

”ربا“ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی زیادتی و اضافہ اور بلندی کے ہیں۔^(۱) اردو میں اس کا ترجمہ عموماً ”سود“ کیا جاتا ہے، جبکہ انگریزی میں اس کو ”interest“ کہتے ہیں۔ ”سود“ اور ”ربا“ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سود کا لفظ عموماً متعین رقم پر متعین اضافہ لینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن ربا کا مفہوم اس سے وسیع ہے۔ ربا میں سود بھی داخل ہے، اس کے ساتھ ربا میں خرید و فروخت کی چند اہم صورتیں بھی داخل ہیں، جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

عرب میں ربا کی ایک خاص صورت راجح تھی جس میں مقروض شخص کو قرض کی واپسی میں مزید مہلت دے کر اس پر قرض میں اضافہ کیا جاتا تھا، چنانچہ قرآن میں جس ربا کی حرمت کا تذکرہ ملتا ہے، اس کے پس منظر میں بھی ربا کی یہی قسم ہے۔ پھر سرورِ دعو عالم رضی اللہ عنہ کی احادیث میں ربا کے دائرے کو مزید وسیع کر کے معاملات کی کچھ خاص صورتوں میں ربا کی وضاحت کر دی گئی۔ یوں ربا کی دو قسمیں وجود میں آگئیں: ربا القرض اور ربا البیع۔ اسی لیے علماء نے دونوں قسموں کی الگ الگ تعریف کی ہے، البتہ علامہ ابن عربی نے ربا کی ایک ایسی اصطلاحی تعریف کی ہے جو دونوں قسموں پر مشتمل ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ربا ہر ایسا اضافہ یا زیادتی ہے جو بغیر کسی معاوضہ کے حاصل ہو جائے۔

كُلُّ زِيَادَةٍ لَمْ يُقَابَلْهَا عَوَضٌ.^(۲)

ہر وہ اضافہ جس کے بدلے کوئی عوض نہ ہو۔

فقہاء کی عبارات اور تفصیل کو مد نظر رکھ کر یہاں ربا کی اہم اقسام کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

الف۔ ربا بالدين (Interest in Loan)

اس کو ”ربا الجاہلیہ“ اور ”ربا القرآن“ بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی کے ذمہ کوئی دین اقرض

^(۱) معجم مقابیس اللغة ۲/ ۴۸۳

^(۲) احکام القضاة، ج ۱، ص ۱۱۱/ ۴۶۶

لازم ہو جائے اور دائن / قرض خواہ اس پر کسی بھی قسم کا نفع حاصل کرے۔

علامہ جصاص رحمہ اللہ نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

وهو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على المستفاد.^(۱)

وہ قرض جس میں ادائیگی کے لیے وقت اور مقروض ہر اضافی رقم لازمی کی گئی ہو۔

اس قسم کی ذیلی صورتیں تین ہیں:

۱- رہا القرض: قرض کا ایسا معاملہ کیا جائے جس میں قرض کی واپسی کی مدت اور مقروض (قرض سے زیادہ)

اضافی رقم لازم کی گئی ہو۔ بالفاظ دیگر وہ قرض جو ابتداء میں ہی کسی کو نفع کی شرط کے ساتھ دیا جائے۔

۲- تاخیر پر اضافہ: دوسری صورت یہ ہے کہ کسی معاملہ کے نتیجے میں کسی پر دین یا قرض لازم ہو جائے اور قرض خواہ اپنے مقروض کو ادائیگی میں مہلت دے کر اس پر اضافی رقم لازم کر دے۔ اس کی تفصیل ہم نے پہلی فصل میں "تساقط پر جرمانہ" کے تحت بیان کر دی ہے۔

۳- وضع و تعجل: قرض یا دین کی ادائیگی کا وقت ابھی نہیں آیا اور مدیون کو یہ کہہ دیا جائے کہ قرض میں اتنی کمی کر کے وقت سے پہلے ادا کر دے۔ جس کی وضاحت "وضع و تعجل" میں گزر چکی ہے۔

ب- رہا بالبیع (Interest in Sale)

اس کو "ربا الفضل" اور "ربا الحدیث" بھی کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عقد معاوضہ (خرید و فروخت

وغیرہ) میں کسی ایک فریق کے لیے بلا عوض زیادتی و اضافہ کی شرط لگانا، بشرطیکہ رہا کی علت پائی جائے۔

ربا الفضل: وهو الزيادة في مقدار احد البدلين المتماثلين، وغالبا تقع هذه

المعاملة عند جودة أحد البدلين.^(۲)

ربا الفضل، دو متماثل اشیاء میں سے کسی ایک کی مقدار میں اضافہ و زیادتی کا نام ہے۔ یہ معاملہ عموما

اس وقت کیا جاتا ہے جب دونوں اشیاء میں سے ایک کی کوالٹی زیادہ اچھی و عمدہ ہو۔

اس قسم کی ذیلی صورتیں بھی تین ہیں:

۱- رہا الفضل: اس کا مفہوم یہ ہے کہ اموال ربویہ میں سے دو ہم جنس چیزوں کا کسی بیشی کے ساتھ تبادلہ کیا

^(۱) احکام القرآن للخصاص ۱۸۹ / ۲

^(۲) فقہ المعاملات ۷۳ / ۱

یہ مشرکین کا گمراہی کے ساتھ لٹی لٹی کرنے کا تبادلہ نہیں ہے۔

۲۔ رہا النسیئہ: اس کی صورت یہ ہے کہ دو اموال ربویہ کا یوں تبادلہ کیا جائے کہ ایک جانب کی چیز کو ادھار رکھا جائے۔ اگر دونوں طرف چیزوں کی جنس ایک ہو اور کسی ایک جانب کی چیز میں کمی بیشی ہو تو یہ ”رہا النفضل“ بھی ہے، لیکن اگر کمی بیشی نہ ہو، صرف ایک جانب کی چیز کو ادھار رکھا گیا جائے تو یہ ”رہا النسیئہ“ ہے۔ رہا النسیئہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ دو ایسی چیزوں کا تبادلہ کیا جائے جن کی جنس الگ الگ ہو، لیکن قدر (پیمانہ) ایک ہو اور کسی ایک جانب کی چیز کو ادھار رکھا جائے۔

علامہ ابن قیمؒ کے ہاں بھی رہا کی انہی دونوں قسموں کا تذکرہ ملتا ہے، لیکن انہوں نے ”رہا النفضل“ کو ”رہا صحیح“ اور ”رہا النسیئہ“ کو ”رہا الجلی“ کا نام دیا ہے اور ”رہا الجلی“ میں ان کے ہاں ”رہا الدین والقرض“ کی صورت بھی شامل ہے۔^(۱)

۳۔ رہا الید: اس قسم کا تذکرہ صرف فقہاء شافعیہ کے ہاں ملتا ہے، اس میں اور ”رہا النسیئہ“ میں فرق بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں اگر دو ہم جنس اموال ربویہ کے تبادلہ میں باقاعدہ ادھار اور تاخیر کی شرط لگادی جائے تو یہ ”رہا النسیئہ“ ہے اور اگر باقاعدہ ادھار کی وضاحت اور شرط نہ لگائی جائے، بلکہ فریقین بغیر کسی شرط اور وضاحت کے صرف قبضہ میں تاخیر کر دے تو یہ ”رہا الید“ ہے۔ اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

رہا الید: وهو تأخیر قبض العوضین أو أحدهما مطلقاً من غیر ذکر أجل۔^(۲)

رہا الید یہ ہے کہ عوضین میں سے دونوں یا ایک کے قبضہ میں بغیر کسی ادھار کے تذکرہ کے تاخیر کر دی جائے۔

۲۔ رہا کی حرمت

رہا کی حرمت کئی قرآنی آیات، احادیث اور اجماع سے ثابت ہے:

• جن قرآنی آیات میں رہا کی حرمت کا تذکرہ کیا ہے وہ یہ ہے: سورہ بقرہ، آیت نمبر: ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۸۔ اور

سورہ آل عمران کی آیت نمبر: ۱۳۰۔ سورہ نساء کی آیت نمبر: ۱۶۱۔

• رہا کی حرمت پر کئی احادیث موجود ہیں۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ سات ہلاکت میں ڈالنے

^(۱) إعلام الموقعین ۱۵۴/۲

^(۲) حاشیہ قلبیوی ۲۰۹/۲

والی چیزوں سے بچو۔ ان میں سود کھانے کا بھی تذکرہ فرمایا۔^(۱)

یہاں ایک اور اہم حدیث ذکر کی جاتی ہے جس کا تعلق اگلے مباحث کے ساتھ ہے:

سرور دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر
والمالح بالمالح مثلا بمثل يدا بيد فمن زاد أو استزاد فقد أربى، الأخذ والمعطي فيه

سواء۔^(۲)

اگر سونا، سونے کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، جو، جو کے بدلے،
کھجور، کھجور کے بدلے اور نمک، نمک کے بدلے لیا، یا دیا جائے تو ان کا لین دین برابر برابر اور ہاتھ
در ہاتھ ہونا ضروری ہے، اس میں کمی بیشی ربا کے حکم میں ہے، جس کے گناہ میں لینے والا اور دینے
والا برابر ہے۔

• ربا کی حرمت پر تمام علماء اور امت مسلمہ کا اجماع ہے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

أجمع المسلمون على تحريم الربا وعلى أنه من الكبائر، وقيل انه كان محرما في
جميع الشرائع۔^(۳)

ربا کی حرمت پر اور اس کے گناہ کبیرہ ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تمام
شریعتوں میں حرام رہا ہے۔

۳۔ ربا کی شرائط

ربا کے تحقق اور وجود میں آنے کے لیے کچھ شرائط کا پایا جانا ضروری ہیں، جن کے بغیر باوجود میں نہیں آتا۔ ان
شرائط میں سے کچھ میں فقہاء کی آراء مختلف بھی ہیں، جس کی وضاحت ہر شرط کے تحت کر دی جائے گی۔ ایسی شرائط کو دو
حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ معاملہ کرنے والوں کی شرائط

۲۔ محل ربا کی شرائط

^(۱) صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۷۶۶

^(۲) صحیح مسلم ۳/۱۲۱۱، حدیث نمبر: ۱۵۸۷

^(۳) المجموع شرح المہذب ۹/۳۹۱

۱۔ معاملہ کرنے والوں کی شرائط:

فقہاء کی عبارات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ربا کے وجود میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ معاملہ کرنے والے فریقین میں مندرجہ ذیل تین شرائط پائی جائیں:

پہلی شرط: معاملہ کرنے والوں کی ملکیت معصوم ہو

دوسری شرط: دونوں اموال ایک فریق کی ملک نہ ہوں

تیسری شرط: فریقین تبادلہ کی چیزوں میں شریک نہ ہوں

پہلی شرط: معاملہ کرنے والوں کی ملکیت معصوم ہو:

ملکیت کے معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی مملوکہ چیزوں کو اگر کوئی اور تلف اور ضائع کر دے تو ضائع کرنے والے پر اس کا ضمان اور نقصان لازم ہو جائے۔ اگر کسی شخص کی مملوکہ چیز ایسی ہے جس کے ضائع کرنے پر ضمان و نقصان لازم نہ ہوتا ہو تو وہ ملکیت معصوم نہیں ہے۔

اس شرط کا تذکرہ فقہاء حنفیہ کی کتابوں میں ملتا ہے کہ ربا کا معاملہ کرنے والے دونوں فریقین کی ملکیت کا معصوم ہونا ضروری ہے، اگر کسی ایک بھی فریق کی ملکیت معصوم نہ ہو تو ایسی صورت میں ربا وجود میں نہیں آئے گا اور وہ معاملہ جائز ہوگا۔^(۱)

اس شرط کے ضمن میں مندرجہ ذیل تین نکات ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہیں:

۱۔ دار الحرب میں سود:

دار الحرب کفار کے ایسے ممالک کو کہتے ہیں جہاں مسلمان حاکم کی حاکمیت نہ ہو اور وہاں سیاسی اور دینی دونوں شعبوں میں اسلامی احکام کا نفاذ نہ ہو اور ان کے ساتھ صلح بھی نہ ہو۔ چونکہ دار الحرب میں کسی حربی کافر کا مال معصوم نہیں ہوتا، اس لیے بعض حنفیہ نے حربی کافر کا مال بطور سود یا جو وغیرہ کے طور پر لینے کی اجازت دی ہے۔

اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف کچھ یوں ہے:

۱۔ جمہور فقہاء، جن میں امام ابو یوسفؒ بھی شامل ہیں، کے نزدیک سود لینا یا دینا بہر صورت اور ہر جگہ حرام ہے، خواہ کافر سے لیا جائے یا مسلمان سے، خواہ دار الحرب میں لیا جائے یا دارالاسلام میں۔ ان کے دلائل وہ تمام قرآنی آیات اور احادیث ہیں جن میں مطلق طور پر سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ درج ذیل شرائط کے ساتھ دار الحرب میں کافر سے سود لینا جائز ہے:

۱۔ دار الحرب ہو، کیونکہ اسلامی مملکت میں سود بہر صورت حرام ہے، خواہ معاملہ دو مسلمانوں کے درمیان ہو، یا دو کافروں کے درمیان یا ایک کافر اور ایک مسلمان کے درمیان۔

۲۔ سود کا معاملہ کافر حربی کے ساتھ ہو۔

۳۔ علامہ ابن عابدین اور علامہ ابن ہمام رحمہم اللہ نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ سودی معاملہ یوں کیا جائے جس میں یقینی طور پر اضافی مال اور سود مسلمان کو ہی ملے۔ اگر اضافی مال اور سود کافر کو مل رہا ہے یا معاملہ مشکوک ہے کہ سودی مال مسلمان کو بھی مل سکتا ہے اور کافر کو بھی تو یہ صورت درست نہیں ہے۔^(۱)

ان حضرات کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ دار الحرب میں حربی کا مال معصوم نہیں ہوتا، اس لیے اس کا مال کسی بھی طریقہ سے لیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس کی رضامندی پائی جائے اور اس کو کوئی دھوکہ نہ دیا جائے۔ اسی طرح انہوں نے ایک کمزور حدیث کی بنیاد پر یہ رائے اختیار کی ہے جو اس طرح ہے کہ: "لا ربا بین المسلم والحربی"۔

لیکن دیگر علماء نے اس حدیث کو رد کیا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور دوسرا اس حدیث کا مفہوم یوں بھی ممکن ہے کہ اس میں نفی کے بجائے نہی ہو، یعنی "مسلمان، حربی کے ساتھ سودی معاملہ نہ کرے"۔
علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

وخبہم مرسل لا نعرف صحته ويحتمل أنه أراد النهي عن ذلك. ^(۲)

اسی لیے بعض حنفیہ کے ہاں بھی جمہور کی رائے کو راجح قرار دیا گیا ہے۔^(۳)

۲۔ دار الحرب کے مسلمان کا مال:

جو حربی کافر دار الحرب میں مسلمان ہو جائے، لیکن ابھی تک اس نے دار الاسلام کی طرف ہجرت نہ کی ہو تو ایسے مسلمان کا مال بھی امام ابو حنیفہؒ کی رائے میں حربی کافر کے مال کی طرح غیر معصوم ہے، لہذا جو مسلمان دار الاسلام سے جا کر دار الحرب میں امن لے کر رہ رہا ہے اس کے لیے ایسے مسلمان سے سودی معاملہ کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر دار الحرب

^(۱) حاشیة ابن عابدین ۱۸۶/۵، فتح القدیر ۱۵/۳۶۱

^(۲) المعنی ۱۸۶/۴

^(۳) فتح القدیر ۷/۳۹

میں دوا ایسے مسلمان آپس میں سودی معاملہ کرتے ہیں جو وہاں مسلمان ہوئے ہیں اور انہوں نے ابھی تک دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ دونوں کا مال معصوم نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نفس اور مال کی عصمت کی علت اور اساس ”وجود فی دارالاسلام“ ہے جو یہاں موجود نہیں ہے۔

اس کے برعکس امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ غیر مہاجر مسلمان کا مال اور نفس دونوں معصوم ہیں، لہذا ان کا آپس میں کوئی سودی معاملہ کرنا کسی دارالاسلام کے مسلمان کے لیے ان کے ساتھ سودی معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر دارالحرب میں مسلمان ہونے والا شخص ایک بار دارالاسلام کی طرف ہجرت کر لے اور اس کے بعد واپس دارالحرب چلا جائے تو ایسے مسلمان کے ساتھ سودی معاملہ کرنا حنفیہ کے ہاں بالاتفاق جائز نہیں ہے۔^(۱)

۳۔ غیر مسلم ممالک کے بینکوں سے سود لینا:

آج کل امام ابوحنیفہ اور امام محمد کی رائے کو دیکھتے ہوئے کچھ لوگ غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں مال رکھ کر اس پر سود لینے کی اجازت دیتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے اور ایک سنگین گناہ ہے، اس پر حنفیہ کی رائے کو منطبق کرنا بالکل غلط ہے، کیونکہ:

۱۔ ایک تو خود حنفیہ کے ہاں امام ابو یوسفؒ کی رائے رائج ہے اور اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے، لہذا مفتی بہ قول عدم جواز کا

یہ ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ کے ہاں اس صورت کے جواز کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اضافی مال اور غلبہ مسلمان کو ملے، کافر کو نہ ملے، جبکہ یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ آج کل کے سودی بینکوں میں جو رقم رکھی جاتی ہے اس پر بینک کو ملنے والا سود بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی اکاؤنٹ ہولڈرز کو ملتا ہے، اس لیے اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ملک کے بینک میں اپنا مال سودی اکاؤنٹ میں رکھتا ہے تو اس کا زیادہ فائدہ اور سود خود بینک کو ہی ملتا ہے۔ لہذا یہ حنفیہ کی رائے کے مطابق بھی جائز نہیں ہے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں رکھی رقم کو مسلمانوں کے خلاف فکری، اقتصادی اور اجتماعی طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے، بلکہ کیا جا رہا ہے۔ اگر آج امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ زندہ ہوتے اور اس صورت حال کو دیکھتے تو اس کی ہر گز اجازت نہ دیتے۔

دوسری شرط: دونوں اموال ایک فریق کی ملک نہ ہوں:

رہا کے وجود کے لیے فریقین سے متعلق دوسری شرط یہ ہے کہ معاملہ کرنے والا ایک فریق دونوں جانب کے مال کا مالک نہ ہو، کیونکہ اگر ایک ہی شخص دونوں جانب کی چیزوں کا مالک ہے تو یہ ایسا ہے جیسے ایک ہاتھ سے چیز اٹھا کر دوسرے ہاتھ میں رکھنا، اس سے رہا متحقق نہیں ہوتا۔ اسی شرط کی بنیاد پر فقہاء نے لکھا ہے کہ غلام اور اس کے آقا کے درمیان ہونے والا سودی معاملہ درحقیقت سودی معاملہ ہے، نہ نہیں، کیونکہ غلام اور اس کی مملو کہ چیزوں کا مالک بھی اس کا آقا ہی ہے، لہذا اگر غلام اپنے آقا سے سودی معاملہ کرتا ہے تو اس سے سود متحقق نہیں ہوگا۔^(۱)

حکومت اور عوام کے درمیان سودی معاملہ:

دوسری شرط کی بنیاد پر کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ حکومت اور رعایا کے درمیان سودی معاملہ جائز ہے، کیونکہ یہ ایسا ہے جیسے آقا اور غلام کے درمیان ہونے والا معاملہ۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اگر حکومت اپنی رعایا کو سودی قرض فراہم کرتی ہے اور اس پر رعایا سے سود وصول کرتی ہے تو یہ اضافی رقم اور سود واپس رعایا اور ان کے مصالح پر ہی خرچ ہوگی، لہذا یہ درحقیقت خود کو ہی سود دینے کی طرح ہے۔ اسی طرح اگر رعایا کسی حکومتی بینک یا حکومت کو سود پر رقم دیتی ہے اور اس پر حکومت سے سود وصول کرتی ہے تو یہ بھی درحقیقت حکومت کے پاس موجود عوام اور رعایا کے مال سے وصول کی جاتی ہے اور یہ بھی اپنا ہی مال ہے، لہذا یہ سود نہیں ہے۔

لیکن یہ رائے درست نہیں ہے اور یہ صورت غلام اور آقا والے معاملہ سے بالکل مختلف ہے۔ غلام اور آقا والے معاملہ میں آقا کو اپنے غلام اور اس کے پاس موجود مال پر ہر قسم کے تصرفات کا اختیار ہوتا ہے، جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے، حکومت کی ملکیت ایک الگ اور مستقل ملکیت ہے، جس پر عوام کو اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ رعایا بھی کسی ایک فرد کا نام نہیں ہے، بلکہ بہت سارے افراد کا مجموعہ ہے، لہذا ہر ایک کو یہ اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ وہ حکومت سے سود وصول کرے، جبکہ حکومت کے پاس اموال میں دیگر لوگوں کا بھی حصہ ہے؟! اس سے بڑھ کر حکومت اور حکومتی بینک درحقیقت ایک دلال اور مڈل مین کی حیثیت سے سودی رقم دیتے اور لیتے ہیں اور درمیان سے اپنا فائدہ نکالتے ہیں۔ اس لیے اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تیسری شرط: فریقین متبادلہ کی چیزوں میں شریک نہ ہوں:

فقہاء حنفیہ کے ہاں رہا کے تحقق کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ معاملہ کرنے والے جن اشیاء کا تبادلہ کر رہے

ہیں، ان اشیاء میں دونوں فریقین شریک نہ ہوں۔ اگر دونوں ان اشیاء میں شریک ہیں تو اس میں ربا نہیں ہوگا۔ اس کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ معاملہ کرنے والے فریقین اگر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ دونوں فریقین شرکتِ مفاوضہ کے طور پر شریک ہیں، جس میں تمام شرکاء کا سرمایہ، نفع، نقصان اور ذمہ داریاں سب برابر اور یکساں ہوتی ہیں اور تمام شرکاء اپنے مکمل مال میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، کسی بھی فریق کا الگ مال نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر دونوں فریقین کوئی سودی معاملہ کر رہے ہیں تو یہ درحقیقت کوئی معاملہ ہی نہیں ہے، کیونکہ دونوں تمام مال میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں اور دونوں فریقین شخص واحد کے حکم میں ہیں۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فریقین کے درمیان شرکتِ عنان ہے، جس میں کچھ مال میں فریقین شریک ہوتے ہیں، ان کا مال، نفع، نقصان اور ذمہ داریاں کم اور زیادہ ہو سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر دونوں شرکاء آپس میں کوئی سودی معاملہ کر رہے ہیں اور جس چیز کا تبادلہ کر رہے ہیں وہ شرکت ہی کی چیزوں میں سے ہے تو یہ بھی سودی معاملہ نہیں ہے، بلکہ سرے سے کوئی معاملہ ہی نہیں ہے، البتہ اگر یہی دونوں شرکاء اپنے کسی ذاتی مال کا تبادلہ کر رہے ہیں جو شرکت کے کاروبار کے علاوہ ہے تو اس پر سودی معاملہ کے احکام لاگو ہوں گے۔

علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

وشريك العنان فيما ليس من تجارتهما، والوصي في الربا بمنزلة الأجانب؛ لأن المبايعة تتحقق بين هؤلاء، والماليك بمنزلة الأحرار في ذلك؛ لأنهم يخاطبون بذلك كما يخاطب الأحرار، فأما المتفاوضان، إذا اشترى أحدهما درهما بدرهمين من صاحبه؛ فليس ذلك منهما بيعا، وهو مالهما كما كان قبل هذا البيع؛ لأنهما كشخص واحد في التجارة، كما يجري بينهما لا يكون بيعا، والله أعلم.^(۱)

۲۔ محل ربا کی شرائط:

ربا کے وجود میں آنے اور تحقق ہونے کے لیے دوسری قسم کی شرائط کا تعلق ”محل ربا“ کے ساتھ ہیں۔ اس

سلسلے میں ربا کے لیے دو شرائط ہیں:

پہلی شرط: اموال ربویہ ہونا

دوسری شرط: معیار شرعی کا ہونا

پہلی شرط: اموال ربویہ ہونا:

ربا کے تحقق کے لیے ضروری ہے کہ جن دو اشیاء کا تبادلہ ہو رہا ہے وہ اموال ربویہ میں سے ہوں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اموال ربویہ کیا کیا ہیں؟ کیا صرف ربا کی احادیث میں مذکورہ اشیاء ہی اموال ربویہ ہیں یا دیگر اموال بھی اس میں شامل ہیں؟

اس سلسلے میں علماء کی دو آراء ہیں:

۱۔ اہل ظاہر اور عثمان البلی کی رائے یہ ہے کہ ربا بالبیع صرف ان چھ چیزوں میں جاری ہو سکتا ہے جن کا تذکرہ احادیث میں آیا ہے، یعنی سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور اور نمک۔ ان کے علاوہ دنیا کی کسی اور چیز کے تبادلہ اور خرید و فروخت پر سود کے احکام لاگو نہیں ہوں گے۔ اہل ظاہر چونکہ قیاس کا انکار کرنے والے ہیں، اس لیے انہوں نے اموال ربویہ کو صرف منصوص اموال تک ہی محدود رکھا ہے، جبکہ شیخ عثمان البلی اگرچہ قیاس کے منکر نہیں ہیں، لیکن ان کی رائے یہ ہے کہ اموال ربویہ کی نص احادیث کے معلول ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے ربا صرف ان ہی چھ چیزوں میں منحصر ہے۔

۲۔ جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اموال ربویہ صرف وہ چھ چیزیں نہیں ہیں جن کا ذکر احادیث میں آیا ہے، بلکہ ایک ضابطہ اور علت ہے جو جہاں اور جس مال میں پائی جائے گی وہ ماں اموال ربویہ میں شامل ہو جائے گا اور اس بات پر جمہور علماء کا اتفاق ہے کہ جن احادیث میں چھ اشیاء کا تذکرہ ہے وہ بطور نمونہ ہیں اور ان سے دراصل ربا کے ضابطہ اور بنیادی علت کی طرف امت کی راہنمائی کی گئی ہے کہ امت مسلمہ اس ضابطہ اور علت کا استخراج کر کے دیگر اموال پر لاگو کرے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ ضابطہ یا علت کیا ہے جس کی بنیاد پر اموال ربویہ کا پتہ چلتا ہے؟ اس میں فقہاء نے اجتہاد سے کام لیا ہے اور مختلف آراء سامنے آئی ہیں، جن کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔^(۱)

دوسری شرط: معیار شرعی کا ہونا:

اس شرط کا تذکرہ صرف فقہاء حنفیہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ انہوں نے ربا کے وجود میں آنے اور تحقق ہونے کے لیے اس شرط کا اضافہ کیا ہے کہ جن دو چیزوں کا تبادلہ ہو رہا ہے، اگر ان کا تعلق کیلی اشیاء کے ساتھ ہیں یا دنیوی چیزیں ہیں تو ان میں ربا کے لیے ایک خاص مقدار کا ہونا ضروری ہے، اگر وہ چیزیں اس خاص مقدار سے کم مقدار میں ہیں تو ان کے تبادلہ پر سودی احکامات لاگو نہیں ہوں گے، بلکہ اس صورت میں کمی بیشی معاف ہے۔

فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر اشیاء کیلی ہیں تو کم از کم ”نصف صاع“ ہونا ضروری ہے، اس سے کم مقدار میں رہا متحقق نہیں ہوتا، اور اگر وزنی چیزیں ہیں تو ”حبہ“ کی مقدار سے کم نہیں ہونا چاہیے، ورنہ اس میں رہا متحقق نہیں ہوگا۔ اسی بنیاد پر حنفیہ نے ایک مٹھی کی گندم کو دو مٹھی کی گندم کے بدلے پینچا جائز لکھا ہے، کیونکہ اس میں معیار شرعی موجود نہیں ہے۔^(۱)

”نصف صاع“ تقریباً پونے دو کلو کی مقدار ہے، جبکہ ”حبہ“ جو کے دانے کو کہتے ہیں، جس کا تذکرہ درہم کے وزن میں آتا ہے اور تقریباً ستر جے ایک درہم کا وزن ہوتا تھا، موجودہ دور میں حبہ کا وزن ۳۳ ملی گرام بنتا ہے۔ اس سلسلے میں حنفیہ نے یہ دلیل دی ہے کہ مقادیر میں سب سے کم وہ مقدار جس پر شریعت کا کوئی حکم لاگو ہوا ہے وہ نصف صاع اور حبہ ہی ہے، اس سے کم کوئی شرعی مقدار موجود نہیں ہے، اس لیے دیگر احکامات میں بھی اسی مقدار کو معیار بنایا جائے گا اور اس سے کم پر حکم لاگو نہیں ہوگا۔

جہاں تک فقہاء حنابلہ کی رائے ہے تو انہوں نے باقاعدہ یہ وضاحت کی ہے کہ کیلی یا وزنی اشیاء کے تبادلہ میں بہر صورت رہا کے احکام لاگو ہوں گے، خواہ ان کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ فقہاء شافعیہ اور مالکیہ کے ہاں چونکہ رہا کی علت کیلی یا وزن نہیں ہے، بلکہ طعم اور ثمنیت ہے، اس لیے ان کے ہاں اگر یہ علت پائی جائے گی تو رہا کے احکام لاگو ہوں گے، خواہ مقدار جتنی بھی ہو۔^(۲)

فقہاء حنفیہ میں سے علامہ ابن ہمامؒ نے ہر مقدار پر سود کے احکامات لاگو ہونے کی رائے اختیار کی ہے اور اس دوسری شرط ”معیار شرعی“ کا انکار کیا ہے اور علامہ شامی نے بھی اس کا تذکرہ کر کے اس پر سکوت کا اختیار کیا ہے۔^(۳)

۴۔ رہا کی علت

جیسے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ جمہور فقہاء کی رائے میں اموال ربویہ صرف چھ نہیں ہیں، بلکہ دیگر وہ اشیاء و اموال جہاں رہا کی بنیادی علت پائی جائے، وہ بھی مال رہا ہو گا اور وہاں پر بھی رہا کا حکم لاگو ہو گا، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رہا کی علت کیا ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ اس بحث کو چار نکات میں بیان کیا جائے گا:

۱۔ رہا بالفضل کی علت

(۱) حاشیة ابن عابدین ۱۲۳/۵

(۲) المغنی ۱۳۹/۴

(۳) فتح القدیر ۱۵۲/۶، حاشیة ابن عابدین ۱۲۳/۵

۲۔ ربا بالنسیۃ کی علت

۳۔ جنس کے اصول

۴۔ قدر کے اصول

۱۔ ربا الفضل کی علت:

اگر خرید و فروخت کا معاملہ کیا جا رہا ہے تو ایسی صورت میں جن دو چیزوں کا تبادلہ ہو رہا ہے ان میں ایسی کوئی علت پائی جانی چاہیے جس کی بنیاد پر ان چیزوں کو اموالِ ربویہ قرار دیا جائے اور اس معاملہ پر ربا کے احکامات لاگو ہو سکتے؟ فقہاء نے اسی حدیث کو بنیاد بنا کر ربا کی علت مستنبط کی ہے، جس میں چھ چیزوں کا ذکر آیا ہے۔ اس سلسلے میں ائمہ کی آراء کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ امام شافعیؒ کے ہاں ربا الفضل کی علت ”طعم و ثمنیت“ ہے، یعنی جو بھی چیز کھائی جاتی ہو یا جس میں زربننے کی صلاحیت ہو وہ اموالِ ربویہ میں سے ہے اور ربا الفضل کے لیے ”جنس“ کا متحد ہونا بھی شرط ہے، لہذا کھائی جانے والی اشیاء یا ثمن کا جب ہم جنس اشیاء کے ساتھ تبادلہ ہو گا تو وہاں ربا الفضل کے احکام لاگو ہوں گے اور کسی بیشی حرام ہوگی۔

۲۔ امام مالکؒ کی رائے یہ ہے کہ ربا کی علت ”قوت و ادخار مع الجنس“ ہے۔ یعنی ”غذائیت اور قابل ذخیرہ اندوزی ہونا“ ربا کی علت ہے، لہذا ہر وہ چیز جو غذا کے کام آتی ہو یا اسے ذخیرہ کیا جاسکتا ہو، جب ان کا تبادلہ ہم جنس چیز کے ساتھ ہو گا تو اس پر ربا کے احکام لاگو ہوں گے اور کسی بیشی حرام ہوگی۔

۳۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں ربا کی علت ”قدر اور جنس“ ہے۔ قدر کا مطلب ہے کسی چیز کا کیلی یا وزنی ہونا، لہذا اگر کسی کیلی/وزنی چیز کا تبادلہ اس کی ہم جنس کیلی/وزنی چیز کے ساتھ ہو رہا ہے تو وہ مالِ ربوی ہے، وہاں کسی بیشی حرام ہوگی۔

۴۔ فقہاء حنابلہ سے تین روایات منقول ہیں:

الف۔ ایک روایت یہ ہے کہ ربا الفضل کی علت ”طعم و ثمنیت مع الجنس“ ہے۔ یہ رائے فقہاء شافعیہ کی رائے کے قریب ہے، تاہم فقہاء شافعیہ کے ہاں ”جنس“ علت نہیں، شرط ہے، جبکہ حنابلہ کے ہاں جنس بھی علت کا ایک حصہ اور وصف ہے۔

ب۔ دوسری روایت حنفیہ کی رائے کی طرح ہے کہ ربا الفضل کی علت ”قدر مع الجنس“ ہے۔

ج۔ تیسری روایت یہ ہے کہ سونا، چاندی کے علاوہ اشیاء میں ربا کی بنیادی علت یہ ہے کہ کوئی چیز کھائی جانے والی بھی ہو اور ان میں قدر اور جنس بھی پایا جائے تو وہاں ربا الفضل کے احکام لاگو ہوں گے۔ اس روایت میں حنفیہ اور شافعیہ کی

رائے کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔^(۱)

ربا الفضل کی علت معلوم کرنے کے لیے فقہاء نے مختلف نصوص اور دلائل کو بنیاد بنا کر اجتہاد کیا ہے، جس کے نتیجے میں فقہاء کی آراء مختلف ہو گئی ہیں۔ ان نصوص، دلائل اور ان سے علت کے استنباط کی تفصیل فقہ کی ضخیم کتب میں موجود ہیں۔

۵۔ ائمہ اربعہ کے علاوہ دیگر ائمہ کی آراء بھی اس سلسلے میں مختلف ہیں، مثلاً امام ابن سیرینؒ کی رائے یہ ہے کہ ربا الفضل کی علت صرف ”جنس“ ہے۔ امام ربیعہؒ کی رائے یہ ہے کہ ربا الفضل کی علت ”قابل زکوٰۃ اموال“ ہے۔^(۲)

۲۔ ربا النسیئہ کی علت:

ربا النسیئہ سے فقہاء عمومی طور پر وہ صورت مراد لیتے ہیں جس میں دو اموال ربویہ کا تبادلہ ہو رہا ہو اور کسی ایک جانب کی چیز پر قبضہ کر کے دوسری جانب کی چیز پر فوری قبضہ نہ کیا جائے، بلکہ اس کے قبضہ کے لیے مستقبل کی کوئی تاریخ مقرر کر لی جائے، لیکن فقہاء شافعیہ کے ہاں ربا النسیئہ کا مفہوم کچھ زیادہ وسیع ہے، ان کے ہاں ربا النسیئہ کی مندرجہ ذیل تین صورتیں بنتی ہیں:

۱۔ غیر معلوم التماثل: دو اموال ربویہ کا تبادلہ ہو رہا ہو اور دونوں کی مقدار میں برابری کا علم نہ ہو تو یہ ربا نسیئہ ہے، بشرطیکہ ربا کی علت پائی جائے۔

۲۔ بیع الکالی، بالکالی: دو چیزوں کا یوں تبادلہ کیا جائے کہ دونوں کے قبضہ کو مؤخر کر کے مستقبل کی کسی تاریخ کو طے کیا جائے۔ اس کو ”بیع الدین بالدین“ بھی کہتے ہیں۔ یہ صورت تقریباً تمام ائمہ کے ہاں حرام ہے، خواہ تبادلہ دو اموال ربویہ کا ہو یا غیر اموال ربویہ کا۔

۳۔ تأخر أحد البدلین: اس کا مفہوم وہی ہے جو دیگر فقہاء کے ہاں پایا جاتا ہے کہ دو اموال ربویہ کا تبادلہ کیا جائے اور کسی ایک جانب کی چیز کو فوری قبضہ میں لے کر دوسری جانب کی چیز کو ادھار رکھا جائے۔

علامہ قلیوبیؒ لکھتے ہیں:

عقد علی عوض مخصوص غیر معلوم التماثل فی معیار الشرع حالة العقد، أو

مع تأخیر فی البدلین، أو أحدهما.^(۳)

^(۱) المعنی ۱۳۵/۴، بدائع الصنائع ۱۸۳/۵

^(۲) المعنی ۱۳۵/۴

^(۳) حاشیة قلیوبی ۲۰۸/۲

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ربالنسیئہ کی مات ایسا ہے یا بالغانہ، بلکہ جب مال بویہ کا تبادلہ ہو، یا کب دونوں پر قبضہ کرنا ضروری ہو گا اور کسی ایک جانب کو بھی ادھار لے لیا جائے نہ ہو گا اور اس سلسلے میں فقہاء کی آراء کا نام لیا یہ ہے:

۱۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں ربالفصل کی علت (قدر اور جنس) ہے اور اسلاف میں سے کوئی بھی ایک، نصف (قدر یا جنس) ربالنسیئہ کی علت ہے، لہذا جن دو چیزوں کا تبادلہ ہو رہا ہے اگر وہ دونوں قدر میں مشابہت ہیں، مثلاً، دونوں نیلی اشیاء ہیں یا دونوں وزنی اشیاء ہیں تو وہاں ادھار حرام ہو گا۔ اسی طرح اگر دونوں قدر میں تو مشابہت نہیں ہیں، لیکن، دونوں کی جنس ایک ہے تو بھی ادھار حرام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء حنفیہ کے ہاں اموال ربویہ کے تبادلہ کی چار صورتیں بنتی ہیں:

الف۔ دو ایسی چیزوں کا تبادلہ ہو رہا ہو کہ دونوں چیزوں کی قدر (پیمانہ یعنی کیل یا وزن) اور جنس ایک ہی ہو، جیسے گندم کا گندم کے ساتھ تبادلہ، یا سونے کا سونے کے ساتھ یا چاندی کا چاندی کے ساتھ تبادلہ وغیرہ۔ اس صورت میں کمی بیشی اور نسیئہ یعنی ادھار دونوں حرام ہیں۔

بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ پہلی صورت (الف) میں دو عناصر ضروری ہیں:

- ۱۔ عنصر الزمن: یعنی یہ ضروری ہے کہ معاملہ ہاتھ در ہاتھ ہو، کسی ایک جانب کی چیز بھی ادھار نہ ہو۔
- ۲۔ عنصر الكمیة: یعنی دونوں جانب کی چیزیں مقدار میں بھی برابر ہوں۔
- ب۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں چیزوں کی قدر (پیمائش کا آلہ) تو ایک ہو، لیکن جنس مختلف ہو، جیسے گندم کا جو سے تبادلہ کرنا۔ اس صورت میں کمی بیشی جائز ہے، لیکن (نسیئہ) ادھار حرام ہے، لہذا دونوں طرف سے نقد ہونا ضروری ہے۔ یعنی پہلا عنصر (عنصر الزمن) ضروری ہے، جبکہ دوسرا عنصر (عنصر الكمیة) ضروری نہیں ہے۔
- ج۔ تیسری صورت یہ ہے کہ دونوں چیزوں کی جنس ایک ہو، لیکن قدر سرے سے موجود نہ ہو یا مختلف ہو، جیسے بکری کا بکری کے ساتھ تبادلہ، (جنس ایک ہے، لیکن قدر موجود نہیں ہے) اس صورت میں بھی تقاضی یعنی کمی بیشی حلال ہے، اور (نسیئہ) ادھار حرام ہے۔ بالفاظ دیگر پھر پہلا عنصر یہاں بھی ضروری ہے، دوسرا عنصر ضروری نہیں ہے۔
- د۔ دونوں چیزوں کی جنس بھی الگ ہو اور پیمائش کا آلہ بھی مختلف ہو، جیسے کپڑے کا تبادلہ گندم کے ساتھ کرنا۔ اس صورت میں کمی بیشی بھی جائز ہے اور ایک جانب سے ادھار بھی جائز ہے۔ یعنی دو بنیادی عناصر (عنصر الزمن + عنصر الكمیة) میں سے کوئی ایک عنصر بھی لازم و ضروری نہیں ہے۔^(۱)

یہاں یہ نکتہ بھی ذہنی میں رہنا چاہیے۔ فقہاء و فقیہوں کے ہاں مومن ربویہ میں سے صرف سو، چاندنی کی چیزوں میں جن پر باقاعدہ تھکانہ تھکانہ قبضہ ضروری ہے، نحو و ادبوں کی جانب جن میں سے ہر ایک ایک کا ایک نکتہ یہ نکتہ ہے، جبکہ مومن ربویہ میں باقاعدہ تھکانہ تھکانہ قبضہ ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ان کی جانب کی جن میں سے تو صرف تعین ہی دانی ہے۔ یہ چیزوں و متعینوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کی مزید تفصیلات ہم نے پہلے باب میں ”نکتہ صرف“ کے تحت بیان کی ہے، وہاں دیکھیں گے۔

۲۔ فقہاء و شافعیہ اور حنبلیہ کے ہاں ربہ منسیہ کی علت وہی ہے جو ان کے ہاں ربہ فطرت کی علت ہے، جنہی شعر اور ثمنیت، مگر کھائی جانے والی شے کے تہا در میں دونوں کی جانب کی چیزوں پر فوری قبضہ ضروری ہے، کسی ایک کی جانب کی چیز کو تھکانہ رکھنے سے ربہ منسیہ لازم آتا ہے۔ اسی طرح سو، چاندنی کے تہا در میں بھی دونوں کی جانب پر فوری قبضہ ضروری ہے، نحو و ادبوں کی جانب سو، یہ دونوں کی جانب چاندنی ہوں ایک کی جانب سو، اور دونوں کی جانب چاندنی ہو، ہم صورت فوری قبضہ ضروری ہے، اگر کسی ایک کی جانب کی چیز کو تھکانہ رکھنا یا کسی اور ربہ منسیہ لازم آئے گا۔

فقہاء و شافعیہ کے ہاں صرف ”جنس“ کی بنیاد پر ربہ منسیہ لازم نہیں آتا، بلکہ اس کے لیے باقاعدہ طہر یا ثمنیت کی علت ضروری ہے۔ جہاں تک فقہاء حنبلیہ کی رائے کی بات ہے تو ان کے ہاں اگر وہاں کی چیزوں کا تہا در ہو رہا ہے جو صرف جنس میں متحد ہیں، ان کے ہاں سے ان تہا در نے چار اقوال نقل کیے ہیں اور اس نکتہ قول یہ ہے کہ ادھار (نسیئہ) جائز ہے، نحو و جنس متحد ہوں مختلف ہوں۔

۳۔ فقہاء حنبلیہ کے ہاں ربہ منسیہ کی علت صرف ”طہر“ یا صرف ”ثمنیت“ ہے، بشرطیکہ کھائی جانے والی چیز کو تھکانہ رکھا جائے ہو، اس سبب سے ان کے ہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ اشیاء کو بطور غذا ہی کھایا جاتا ہو، یہ بھی ضروری نہیں ہے۔ ان میں ذخیرہ و دائرہ زندگی کی صلاحیت ہوں ان کے ہاں عموماً ایک ہی جنس کی چیزوں میں ادھار کی اجازت نہیں ہے، تاہم اگر دونوں چیزوں سے منع اور مہتممہ میں فرق ہو تو چونکہ جنس تبدیل ہو گئی، اس لیے ادھار جائز ہے۔^(۳)

صلہ جنس کے اصول:

یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ بعض فقہاء کے ہاں اموال ربویہ کا ”جنس“ میں متحد ہونا باہمی علت ہے اور

بعض کے ہاں شرط، لیکن سوال یہ ہے کہ کب دو چیزوں کی جنس کو مختلف اور کب دونوں کی جنس کو ایک قرار دیا جائے؟ بالفاظ دیگر ایسا معیار اور پیمانہ کیا ہے جس کی بنیاد میں ہم اشیاء پر ایک جنس یا مختلف جنس کا حکم لاگو کر سکیں؟ اس سلسلے میں بھی فقہاء کا منہج مختلف ہے:

۱۔ فقہاء حنفیہ کی رائے کو استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ”فقہ البیوع“^(۱) میں تفصیل سے لکھا ہے کہ جن اشیاء کے درمیان درج ذیل امور میں سے کوئی ایک امر پایا جائے، ان اشیاء کی جنس ایک دوسرے سے مختلف سمجھی جائے گی:

۱۔ اختلافِ ماہیت: دونوں اشیاء کی حقیقت و ماہیت ایک دوسرے سے مختلف ہو اور عرف میں ان کا نام الگ الگ ہو، جیسے گندم اور جو، وغیرہ۔

۲۔ اختلافِ اصل: کبھی دو چیزوں پر ایک ہی نام بولا جاتا ہے، لیکن چونکہ دونوں کی اصل و ماخذ (source) مختلف ہوتا ہے، اس لیے انہیں الگ الگ جنس سمجھا جاتا ہے۔ جیسے انگور کا سرکہ اور کھجور کا سرکہ۔ اسی طرح بکری اور گائے کا گوشت یا دودھ وغیرہ۔

۳۔ اختلافِ فی القاصد: اگر دو چیزوں کے مقاصد و اغراض الگ الگ ہیں تو بھی دونوں کو الگ الگ جنس سمجھا جاتا ہے۔ جیسے گوشت اور چربی۔ بکریوں کے بال اور بھیڑ کا اون، وغیرہ۔

۴۔ زیادۃِ صنعت: کبھی دو چیزوں کی اصل ایک ہوتی ہے، لیکن دونوں کی صنعت و بناوٹ میں کمی بیشی کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے، جیسے روٹی اور آٹا۔ یہ دونوں الگ الگ جنس ہے، کیونکہ روٹی میں اضافی صنعت شامل ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے اس کا نام بھی الگ ہو گیا ہے۔

۵۔ اختلافِ صنعت: اگر دو چیزیں ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور ان میں فرق ہو تو وہ مختلف الجنس شمار ہوں گی۔ اس کی مثال فقہاء ہروی اور مروی کپڑوں سے دیتے ہیں۔ یا جیسے آج کل مختلف ڈیزائن کے جوتے یا مختلف کمپنیوں کے مختلف ماڈلز کے پروڈکٹس وغیرہ۔

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ فقہاء حنفیہ کے ہاں ”اتحادِ جنس“ کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ مجانسة عينية: اس کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزیں مکمل طور پر ایک دوسرے کی طرح ہوں۔ جیسے زیتون

کے تیل کا تبادلہ جب زیتون کے تیل کے ساتھ کیا جائے گا تو دونوں کے درمیان مجانسة عينية ہوگی۔

۲۔ معجانسة ضمنية: اس سے مراد یہ ہے کہ دو چیزوں میں فلی طور پر مجانست نہ ہو، بلکہ ضمنی طور پر ایک چیز دوسری چیز کی طرح ہو، یعنی ایک چیز کے اندر کوئی ایسی چیز پائی جائے جو دوسری چیز کی جنس ہو۔ مثلاً زیتون کے پھل کا تیل۔ جب زیتون کے تیل کے ساتھ کیا جائے گا تو ان دونوں کے درمیان مجانستہ ضمنیہ ہوگی، کیونکہ دونوں مکمل طور پر ہم جنس نہیں ہیں، بلکہ زیتون کے پھل کے اندر تیل موجود ہے جو مقابل چیز (تیل) کی جنس ہے۔ ایسی صورت میں فقہاء حنفیہ کے ہاں یہ ضروری ہوتا ہے کہ جس جانب خالص مال ربوی موجود ہے، وہ اس چیز سے زیادہ ہو جو دوسری طرف کی چیز کے ضمن میں پائی جا رہی ہے، لہذا یہ ضروری ہے کہ زیتون کا خالص تیل اُس تیل سے زیادہ ہو جو زیتون کے پھل میں موجود ہے، تاکہ اضافی تیل زیتون کے پھل کے مقابلے میں آجائے۔^(۱)

۲۔ فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں اشیاء کے اتحاد جنس کا ضابطہ یہ ہے کہ دونوں چیزوں کا خاص نام ایک ہی ہو، اگر دونوں کا نام الگ الگ ہے تو ان دونوں کی جنس بھی مختلف سمجھی جائے گی۔ اس ضابطے میں بعض شافعی اور حنبلی فقہاء نے کچھ قیود بھی لگائے ہیں، جن کی وجہ سے ان حضرات کی رائے اکثر مسائل میں حنفیہ کی رائے کے قریب ہو جاتی ہے، مثلاً:

الف۔ ایک قید یہ ہے کہ دونوں چیزوں کا نام اصل خلقت سے ہی ایک ہو، اگر اصل خلقت کے وقت دونوں کا نام الگ تھا، بعد میں ان کا نام ایک ہو گیا تو ایسی صورت میں دونوں چیزوں کی جنس الگ ہوگی۔ جیسے مختلف اجناس کا آنا وغیرہ۔ یہ فقہاء حنفیہ کے بیان کردہ ”اختلاف الاصل“ کی طرح ہے۔

ب۔ دوسری قید یہ لگائی گئی ہے کہ دونوں چیزیں معنوی اور حقیقی طور پر ایک نام میں مشترک ہوں، صرف لفظی طور پر اشتراک کافی نہیں ہے۔ جیسے جوڑ ہندی اور جوڑ عادی، یہ دونوں چیزیں نام میں ایک جیسی ہیں، لیکن جوڑ ہندی ناریل کو اور جوڑ عادی اخروٹ کو کہتے ہیں جن کی حقیقت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

ج۔ فقہاء حنابلہ نے حنفیہ کی طرح باقاعدہ اصل اور ماخذ کے ایک ہونے کی شرط بھی لگائی ہے، لہذا جن اشیاء کا ماخذ الگ ہو، اگرچہ ان کا نام ایک ہو، وہ الگ الگ جنس کی شمار ہوں گی۔

ان کے علاوہ ”اختلاف صنعت“ اور ”اختلاف فی المقاصد“ کی بنیاد کو فقہاء شافعیہ اور حنابلہ نے قبول نہیں کیا،

یعنی وجہ ہے کہ آنا اور روٹی ان کے ہاں الگ الگ جنس نہیں ہے۔^(۲)

۳۔ فقہاء مالکیہ کے ہاں اشیاء کے اتحاد جنس کا ضابطہ کچھ زیادہ وسیع ہے، چنانچہ ان کا ضابطہ ہے: ”استواء المنفعة أو تقاربها“، وہ تمام اشیاء جن کے استعمال کے مقاصد اور منافع ایک جیسے ہیں، یا ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں وہ ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں، البتہ جن اشیاء کے منافع بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں، وہ الگ الگ جنس کی چیزیں ہیں۔

اس ضابطہ کے نتائج کچھ یوں ہیں:

۱۔ گندم، جو اور باجرہ، یہ سب ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں، کیونکہ ان کے منافع قریب قریب ہیں کہ ان کو قوت اور غذا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔ نبیذ کی تمام اقسام بھی ایک ہی جنس کی شمار ہوں گی، کیونکہ ان کا مقصد استعمال بھی یکساں ہے۔ اسی طرح ہر قسم کا سرکہ ایک ہی جنس کا شمار ہوگا، اگرچہ ان کی اصل اور ماخذ مختلف ہو۔

۳۔ تمام پرندوں کا گوشت ایک ہی جنس شمار ہوگا۔ اسی طرح تمام بحری جانوروں کا گوشت بھی ایک ہی جنس میں شامل ہے۔

اس تفصیل کے باوجود فقہاء مالکیہ نے ”اختلاف صنعت“ کی بنیاد پر کئی چیزوں کو اس ضابطے سے نکال کر مختلف الجنس قرار دیا ہے، مثلاً اگر گوشت کو نمک یا مصالحہ میں پکا لیا جائے تو وہ کپے گوشت کی جنس سے نکل جائے گا اور مختلف جنس میں شمار ہوگا۔^(۱)

۴۔ قدر کے اصول:

قدر کا تذکرہ عموماً فقہاء حنفیہ کے ہاں ملتا ہے، اس لیے یہاں حنفیہ کے کچھ اصول بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں قدر سے مراد کیل اور وزن ہے اور کیل یا وزن میں اتحاد کا مطلب یہ ہوگا کہ آلہ پیمائش بھی ایک ہو، لہذا اگر دو چیزوں کا قدر اور آلہ پیمائش متحد ہو تو وہاں ادھار حرام ہوتا ہے۔ اگر دو چیزیں وزنی ہیں، لیکن دونوں کا آلہ مختلف ہے تو بھی قدر میں اتحاد نہیں ہوگا، مثلاً سونا بھی وزنی ہے اور لوہا بھی، لیکن دونوں کا آلہ الگ الگ ہے، اس لیے قدر میں اتحاد نہیں ہے۔^(۲)

۲۔ کیا عرف کے بدلنے سے اشیاء کے پیمانے بدل سکتے ہیں؟ یعنی کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ ﷺ کے دور میں

(۱) حاشیة الدسوقی ۳/۲۹

(۲) حاشیة ابن عابدین ۵/۱۷۳

ایک چیز کیلی تھی، لیکن آج وہ وزنی ہو گئی تو اس کے تبادلہ کے وقت آج کے دور کے پیمانے کا اعتبار کیا جائے، یا یہ ضروری ہے کہ آپ ﷺ کے دور میں اس چیز کے لیے جو پیمانہ استعمال ہوتا تھا، آج بھی اسی پیمانے کے ساتھ برابری کرنا ضروری ہے؟ دیگر ائمہ مع احناف کی رائے یہ ہے کہ جو چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیلی تھیں وہ ہمیشہ کیلی رہیں گی، ان میں کیل کے اندر ہی برابری کرنا ضروری ہوگا، اور جو وزنی تھیں وہ ہمیشہ وزنی رہیں گی، ان میں وزن کے اندر ہی برابری کرنا ضروری ہوگا، موجودہ عرف کو نہیں دیکھا جائے گا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ عرف کے بدلنے سے پیمانے بدل جائیں گے، لہذا اگر آج ایسی اشیاء کا تبادلہ ہم جنس اشیاء کے ساتھ ہوگا تو موجودہ عرف اور زمانے کے آلہ کے مطابق برابری ضروری ہوگی۔ جہاں تک احادیث کی بات ہے تو احادیث میں تصریح اس وقت کے عرف کے مطابق تھی۔ متاخرین میں سے اکثر فقہاء نے اسی کو اختیار کیا ہے۔^(۱)

س۔ اموال ربویہ کا تبادلہ جب ہم جنس اشیاء کے ساتھ ہو رہا ہو تو وہاں مجازہ اور تخمینہ کی بنیاد پر بیع کرنا حرام ہے، کیونکہ کمی بیشی (سود) کا احتمال ہے، اور ربا کے سلسلے میں شبہ کو بھی حقیقت کا درجہ دیا گیا ہے، البتہ دونوں چیزوں کی جنس الگ الگ ہو تو وہاں چونکہ کمی بیشی بھی جائز ہے، اسی لیے تخمینہ اور اندازہ کی بنیاد پر تبادلہ بھی جائز ہے۔ اسی بنیاد پر جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں دونوں اشیاء کے برابر ہونے کا یقینی علم ضروری ہے، صرف گمان کافی نہیں ہے، لہذا اگر اموال ربویہ میں ہم جنس اشیاء کا تبادلہ کر دیا گیا اور فریقین کو یقینی طور پر معلوم نہیں تھا کہ دونوں چیزوں کی مقدار برابر ہے تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے، اگرچہ بعد میں معلوم ہو جائے کہ دونوں چیزیں برابر ہیں۔

اس سلسلے میں یہ دو ضابطے اہم ہیں:

۱- الشبهة في باب الربا ملحقه بالحقيقة^(۲)

ربا کے باب میں شبہ کو بھی حقیقت کے ساتھ ملحق قرار دیا گیا ہے۔

۲- الجهل بالتمائل كالعلم بالتفاضل^(۳)

برابری کا علم نہ ہونا ایسا ہے جیسے کمی بیشی کا علم ہے۔

^(۱) البحر المحتمل وحاشية ابن عابدین ۱۷۶، ۵

^(۲) مدنی المصنف ۵، ۱۹۱

^(۳) مع الفہم ۱۵، ۳۴۲

۵۔ تماثل کی تحقیق

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اموال ربویہ میں سے جب دو ہم جنس اشیاء کا تبادلہ ہو رہا ہو تو جمہور علماء کے ہاں یہ لازم ہے کہ فریقین کو یقینی طور پر یہ معلوم ہو کہ دونوں چیزیں مقدار میں برابر ہیں، اسی برابری کو ”تماثل“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں تماثل سے متعلق چند اہم نکات کی وضاحت مطلوب ہے:

۱۔ تماثل کا وقت

۲۔ کوالٹی کا اعتبار

۳۔ مسئلہ مدعجہ

۴۔ تماثل کا معیار

۵۔ تماثل میں خلل

۱۔ تماثل کا وقت:

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن پر مستقبل میں کچھ احوال پیش آنے کی وجہ سے وہ تبدیل ہو سکتی ہیں اور ان کے وزن میں کمی بیشی آسکتی ہے۔ مثلاً تر کھجور اور کچے پھل وغیرہ۔ ایسی اشیاء کا جب ہم جنس اشیاء سے تبادلہ کیا جائے گا تو کیا فی الحال ہی تماثل اور برابری ضروری ہے یا مستقبل کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ علامہ کاسائی نے اصولی شکل میں فقہاء حنفیہ کی آراء کو یوں لکھا ہے:

فأبو حنيفة - رحمه الله - يعتبر المساواة في الحال عند العقد، ولا يلتفت إلى النقصان في المال، ومحمد - رحمه الله - يعتبرها حالا ومآلا، واعتبار أبي يوسف مثل اعتبار أبي حنيفة إلا في الرطب بالتمر فإنه يفسده بالنص.^(۱)

امام ابو حنیفہؒ نے صرف فی الحال، عقد کے وقت ہی تماثل کا اعتبار کیا ہے، مستقبل کی کمی کا اعتبار نہیں کیا، جبکہ امام محمدؒ نے حال اور مستقبل دونوں کا اعتبار کیا ہے اور امام ابو یوسفؒ کی رائے بھی امام ابو حنیفہؒ کی طرح ہے، البتہ کچی کھجور اور پکی کھجور کے تبادلہ میں ان کی رائے مختلف ہے، کیونکہ نص کی وجہ سے یہ صورت فاسد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تر گندم کا تبادلہ تر گندم سے یا خشک گندم سے، اسی طرح کچی کھجور کا

تبادلہ کچی کھجور سے یا خشک کھجور سے کرنا جائز ہے، بشرطیکہ فی الحال مقدار میں برابری ہو، جبکہ امام ابو یوسفؒ صرف کچی کھجور اور پکی کھجور کے تبادلہ کو ممنوع فرماتے ہیں، کیونکہ ایک حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ جہاں تک امام محمدؒ کی رائے ہے تو وہ دونوں طرف کی اشیاء کی شکل و صورت کی مماثلت کی شرط لگاتے ہیں، تاکہ مستقبل میں بھی ان میں کمی بیشی نہ آئے، لہذا ان کے ہاں کچی کھجور کو صرف کچی کھجور اور پکی کھجور کو صرف پکی کھجور کے بدلے ہی بیچا جاسکتا ہے، انگور کو انگور کے بدلے اور کشمش کو صرف کشمش کے بدلے ہی برابری کے ساتھ بیچا جاسکتا ہے۔ کچی کھجور کو پکی کھجور یا انگور کو کشمش کے بدلے بیچنا جائز نہیں ہے، اگرچہ فی الحال دونوں وزن میں برابر ہوں، کیونکہ مستقبل میں ان میں کمی بیشی آسکتی ہے۔

امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ جن اشیاء پر مختلف احوال پیش آتے ہیں، ان کی حالت کمال کو دیکھا جائے گا اور حالت کمال کے علاوہ کسی حالت میں ان کی بیع جائز نہیں ہوگی۔ چنانچہ کچی کھجور اور پھل وغیرہ کو اگر ہم جنس چیز ہی کے بدلے بیچنا ہے تو صرف اور صرف مکمل پکنے اور خشک ہونے کے بعد ہی بیچا جاسکتا ہے۔^(۱)

۲۔ کوالٹی کا اعتبار:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مال عمومی طور پر کوالٹی میں مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی جنس کی کچھ چیزیں دوسری چیزوں کے مقابلے میں بہت عمدہ اور کچھ بہت کم کوالٹی کی ہوتی ہیں، جیسے مختلف کوالٹی کی گندم یا مختلف کیرٹ کا سونا وغیرہ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صنعت اور بناؤٹ کی وجہ سے ایک ہی جنس کی اشیاء کی قیمتوں میں فرق ہو جاتا ہے، جیسے سونے کی اینٹ کے مقابلے میں سونے کا زیور۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تماشل اور برابری میں کوالٹی (quality) اور ویلیو کا بھی اعتبار ہوگا یا صرف مقدار (quantity) میں ہی تماشل ضروری ہے؟ اس مسئلہ کو فقہاء یوں تعبیر کرتے ہیں کہ کیا اموال ربویہ میں جودت اور رداءت کا اعتبار ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں بنیادی اصول پر تقریباً تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ اموال ربویہ میں کوالٹی کا اعتبار نہیں ہے اور جودت و رداءت کو نہیں دیکھا جائے گا، بلکہ مقدار ہی کو دیکھا جائے گا اور جب بھی ہم جنس اموال ربویہ کا تبادلہ ہوگا تو مقدار میں ہی تماشل اور برابری ضروری ہوگی۔ اسی لیے اس قاعدہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

جیدھا وردینھا سواء

تاہم فقہاء مالکیہ میں سے بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اگر تبادلہ میں کسی ایک جانب کی چیز کی کوالٹی یا ویلیو زیادہ اور دوسری جانب کی چیز کی کوالٹی یا ویلیو کم ہو تو وہاں مقدار میں کمی بیشی کی اجازت ہے، تاکہ دونوں کو ویلیو میں برابر کیا

جائے۔ لیکن اگر وہ نون جانب لوائٹی مخلوط ہو، مثلاً ایک جانب عمدہ کوائٹی اور کم کوائٹی دونوں قسم کا مال ہو اور دوسری طرف سببی عمدہ اور کم کوائٹی، نون قسم کا مال ہو تو ایسی صورت میں مقدار میں کمی بیشی کی اجازت نہیں ہے۔^(۱)

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

والجيد والردى والتبر والمضروب والصحيح والمكسور سواء في جواز البيع مع التماثل وتحريمه مع التفاضل وهذا قول أكثر أهل العلم منهم أبو حنيفة و الشافعي وحكي عن مالك جواز بيع المضروب بقيمته من جنسه وأنكر أصحابه ذلك ونفوه عنه.^(۲)

۳۔ مسئلہ مد عجوہ:

”مد“ ایک خاص پیمانے کا نام ہے، جبکہ ”عجوہ“ کھجور کی ایک خاص قسم ہے۔ خرید و فروخت کی ایک خاص صورت کا نام ”مسئلہ مد عجوہ“ رکھا گیا ہے، کیونکہ اس مسئلہ کی عمومی مثال یہ دی جاتی ہے کہ ایک جانب ایک درہم اور ایک مد عجوہ کھجور ہو اور دوسری جانب دو درہم ہوں اور ان کا تبادلہ کیا جائے۔ اس طرح کی صورت حال کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ اموال ربویہ کو ہم جنس مال کے بدلے بیچا جائے اور دونوں میں سے کسی ایک جانب یا دونوں جانب کچھ کچھ خلاف جنس چیز بھی موجود ہو۔ جیسے سابقہ مثال میں دونوں جانب ہم جنس مال ربوی (درہم/چاندی) ہے اور ایک جانب خلاف جنس چیز (کھجور) بھی ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

إن باع شينا فيه الربا بعضه ببعض ومعهما أو مع أحدهما من غير جنسه كمد و درهم بمد ودرهم أو بمدين أو بدرهمين فهذه المسألة تسعى مسألة مد عجوہ.^(۳)

اگر ایسی چیزوں کی باہم بیچ کی جائے جن پر بائع کے احکام لاگو ہوتے ہیں اور دونوں جانب یا کسی ایک جانب خلاف جنس چیز بھی موجود ہو، جیسے ایک مد اور درہم کو ایک مد اور درہم کے بدلے بیچنا، یا ایک مد اور درہم کو دو مدوں کے بدلے یا دو درہم کے بدلے بیچنا، اس مسئلہ کو ”مسئلہ مد عجوہ“ کا نام دیا گیا ہے۔

^(۱) حاشیة الدسوقي ۴۳/۳

^(۲) المغني ۴/۱۶۱

^(۳) حوالہ بالا ۴/۱۶۸

اس مسئلہ سے متعلق فقہاء کی عبارات کے تتبع و استقراء سے اس کی تین صورتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ دو ہم جنس اموال ربویہ کا تبادلہ ہو اور دونوں طرف خلاف جنس چیز بھی موجود ہو، خواہ وہ خلاف جنس چیز بھی اموال ربویہ میں سے ہو یا نہ ہو۔ مثلاً ایک مد عجوبہ کھجور اور ایک درہم کاتبالہ ایک مد عجوبہ کھجور اور ایک درہم کے ساتھ یا ایک درہم اور بکری کا تبادلہ ایک درہم اور بکری کے ساتھ کرنا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دو ہم جنس اموال ربویہ کا تبادلہ ہو رہا ہو اور کسی ایک جانب خلاف جنس چیز موجود ہو، مثلاً ایک جانب دو درہم اور دوسری جانب ایک درہم اور ایک مد عجوبہ کھجور ہے۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ دو ہم جنس اموال ربویہ کا تبادلہ ہو اور دونوں طرف خلاف جنس چیز کوئی بھی نہ ہو، لیکن کسی ایک جانب کی چیز مختلف صفات والی ہو، مثلاً ایک طرف ایک صاع سرخ گندم اور ایک صاع زرد گندم ہے، جبکہ دوسری جانب دو صاع صرف سرخ یا دو صاع صرف زرد گندم ہے۔

ان میں سے پہلی اور دوسری صورت ائمہ ثلاثہ کے ہاں ممنوع ہے، کیونکہ ان میں یقینی طور پر یا احتمالی طور پر کمی بیشی لازم آتی ہے اور یہی ربا الفضل ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ان کے ہاں جب ایک ہی معاملہ میں دونوں طرف مختلف قیمت کی چیزیں جمع ہو جائیں تو وہاں ویلیو اور قیمت کو دیکھا جائے گا اور مذکورہ صورتیں بھی ایسی ہی ہیں، لہذا اگر اس مثال میں ایک جانب مد کھجور کی قیمت زیادہ ہے تو یہی زیادتی ہے اور اس کے مقابل میں کمی ہے اور اگر دونوں طرف کی کھجور کی قیمت بالکل برابر ہے تو بھی یہاں مماثلت اور برابری یقینی نہیں ہے، کیونکہ یہاں مماثلت اور برابری کا دار و مدار ”تقویم“ اور قیمت پر ہے اور تقویم ایک ظنی چیز ہے جس سے مماثلت کا پتہ نہیں چلتا، اس لیے یہ صورت مطلقاً ممنوع ہے۔ تیسری صورت بھی فقہاء شافعیہ اور مالکیہ کے ہاں جائز نہیں ہے اور وہ اس کی وہی وجہ بیان کرتے ہیں جو اوپر بیان ہو چکی ہے، جبکہ فقہاء حنابلہ تیسری صورت کی اجازت دیتے ہیں۔

جن صورتوں کو ائمہ ثلاثہ نے ممنوع لکھا ہے، ان کے لیے کچھ شرائط بھی مقرر کی گئی ہیں، مثلاً ایک شرط یہ ہے کہ ایک ہی عقد میں دونوں چیزوں کو بیچا جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جو ہم جنس مال ربویہ دونوں طرف موجود ہے وہ تابع اور غیر مقصود نہ ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ دونوں طرف موجود ہم جنس چیز کے ساتھ دوسری خلاف جنس چیز مخلوط نہ ہو، بلکہ الگ اور جدا ہو۔^(۱)

فقہاء حنفیہ کے ہاں سابقہ تینوں صورتیں شرعاً جائز ہیں۔ پہلی صورت امام زفرؒ کے علاوہ دیگر حنفی ائمہ کے ہاں جائز

ہے اور اس کے لیے کسی قسم کی شرط نہیں ہے، کیونکہ اس میں دونوں طرف خلاف جنس چیز بھی موجود ہے، اس لیے عقد کو صحیح قرار دینے کے لیے ایک جنس کی چیز کو دوسری جنس کی چیز کے مقابل سمجھا جائے گا۔ مثلاً ایک جانب ایک درہم اور ایک بکری ہو اور دوسری طرف بھی ایک درہم اور ایک بکری ہو تو درہم کو بکری کے مقابل سمجھا جائے گا۔

دوسری صورت فقہاء حنفیہ کے ہاں ایک شرط کے ساتھ جائز ہے، وہ یہ کہ ہم جنس مال ربوی، جو دونوں جانب موجود ہے، وہ جس جانب خالص اور اکیلا ہے، اس جانب کچھ زبرد۔ جو نا ضروری ہے۔ مثلاً ایک جانب چاندی اور بکری ہے، جبکہ دوسری جانب صرف چاندی ہے تو اس صورت میں جس جانب صرف چاندی ہے وہ دوسری جانب کی چاندی سے کچھ زیادہ ہونا ضروری ہے، تاکہ زیادہ چاندی، بکری کے عوض میں آجائے۔

تیسری صورت بھی فقہاء حنفیہ کے ہاں جائز ہے، بشرطیکہ دونوں طرف مقدار میں برابری ہو، کیونکہ کوئی (جودت و رداءت) کا کوئی اعتبار نہیں ہے، صرف مقدار کو دیکھا جائے گا۔

اس سلسلے میں فقہاء حنفیہ کی بنیادی دلیل یہ ضابطہ ہے:

إذا أمکن حمل العقد علی الصحة، یحمل علیہ

جب عقد کو صحیح ہونے پر محمول کرنا ممکن ہو تو اسی پر محمول کیا جائے گا۔

اگر معاملہ ایسا ہے کہ اس کو کسی بھی طریقے سے صحیح قرار دیا جاسکتا ہے تو اس کی تاویل کر کے اس کو درست قرار دیا جائے گا، خواہ اس کے لیے جودت و رداءت کے اعتبار کو ختم کیا جائے یا ایک جنس کو دوسری جنس کے مقابل کر دیا جائے۔^(۱)

۳۔ تماثل کا معیار:

فقہاء کے ہاں عمومی طور پر یہ رائے پائی جاتی ہے کہ جب ہم جنس اموال ربویہ کا تبادلہ ہو رہا ہو تو جو اشیاء کیلی ہیں ان کو باقاعدہ کیل کے ذریعے برابر کر کے تماثل کے ساتھ بیچنا ضروری ہے اور جو اشیاء وزنی ہیں ان میں تماثل کا معیار وزن رہے گا، لہذا کیلی اشیاء کو وزن کے ذریعے یا وزنی اشیاء کو کیل وغیرہ کے ذریعے برابر کر کے نہ بیچا جائے، کیونکہ وزنی اشیاء میں تماثل کا علم صرف وزن سے ہی ممکن ہے اور کیلی اشیاء میں تماثل کا علم صرف کیل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ البتہ اگر خلاف جنس اشیاء کا تبادلہ ہو تو وہاں وزنی اشیاء کو وزن کر کے اور کیلی اشیاء کو کیل کر کے بیچنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں تماثل اور برابری ضروری نہیں ہے، کسی بیشی کی اجازت ہے، لہذا اگر وزنی اشیاء کو کیلی کے ذریعے بیچ دیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

ولا یباع ما أصله الکلیل بشيء من جنسه وزنا ولا ما أصله الوزن کیلا. (۱)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشیاء کے بارے میں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ کیلی ہیں یا وزنی ہیں؟ کیا اس کا معیار اور مدار عرف ہے یا کوئی اور دلیل؟ اس کے جواب کے لیے ہم اموال ربوی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱- منصوص اموال

۲- غیر منصوص اموال

۱- منصوص اموال:

جن اموال اور اشیاء کے بارے میں احادیث میں یہ وضاحت آئی ہے کہ وہ کیلی ہیں یا وزنی ہیں ان کو ”منصوص

اموال“ کہا جاسکتا ہے، جیسے سونا، چاندی، گندم، جو، نمک اور کھجور وغیرہ۔ ایسی اشیاء کے بارے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

۱- جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جن اشیاء کے بارے میں احادیث میں وزنی ہونے کی وضاحت آگئی ہے، وہ اشیاء

ہمیشہ کے لیے وزنی ہی رہیں گی اور جب بھی ان کا تبادلہ ہم جنس اشیاء کے ساتھ کیا جائے گا تو تماش اور برابری کے لیے وزن

میں ہی برابری ضروری ہوگی، ایسی اشیاء کبھی بھی کیلی نہیں بن سکتیں، جیسے سونا اور چاندی۔ اسی طرح جن اشیاء کے بارے

میں احادیث میں یہ آیا ہو کہ وہ کیلی ہیں، وہ اشیاء بھی قیامت تک کیلی ہی رہیں گی، جیسے کھجور، گندم اور نمک وغیرہ، لہذا اگر

ان کا ہم جنس اشیاء کے ساتھ تبادلہ کیا جائے گا تو کیل کے ذریعے ہی برابر کرنا ضروری ہوگا، وزن کے ذریعے تماش اور

برابری کافی نہیں ہوگی۔ (۲)

۲- امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ اس سلسلے میں عرف کو مدار بنایا جائے گا، اگر کوئی چیز آپ ﷺ کے زمانے

میں کیلی یا وزنی تھی، لیکن بعد میں اس میں عرف بدل گیا تو بعد والے عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ مثلاً گندم اور کھجور وغیرہ

آپ ﷺ کے زمانے میں کیلی تھیں، لیکن آج کل کے عرف میں یہ وزنی بن گئی ہیں، اس لیے جب ان کا ہم جنس اشیاء کے

ساتھ تبادلہ ہوگا تو وزن میں تماش اور برابری کافی ہے۔ اسی رائے کو متاخرین نے اختیار ہے۔ اس کی کچھ تفصیل ”قدر کے

اصول“ کے تحت آگئی ہے۔

(۱) المغنی ۴/۱۳۵

(۲) حوالہ ۴/۱۳۵

۲۔ غیر منصوص اموال:

جن اموال ربویہ کے وزنی یا کیلی ہونے پر احادیث میں کوئی وضاحت نہیں آئی، ان کو ”غیر منصوص اموال“ کہہ سکتے ہیں، جیسے چاول، مکئی، لوہا وغیرہ۔ ایسی اشیاء میں تماثل کا معیار کیا ہوگا؟ یا ایسی اشیاء کے کیلی یا وزنی ہونے کا علم کیسے ہوگا اور ان کے ہم جنس اشیاء کے ساتھ توالہ میں کس پیمانہ کے ذریعے برابری ضروری ہوگی؟

ایسی غیر منصوص اشیاء کے معیار کے بارے میں فقہاء کے دو مناجح ہیں:

۱۔ فقہاء شافعیہ اور فقہاء حنابلہ کا منج یہ ہے کہ ایسی اشیاء میں اس وقت کے اہل حجاز کے عرف کو مدار بنایا جائے گا جو آپ ﷺ کے زمانے میں رائج تھا، لہذا جو چیز آپ ﷺ کے زمانے میں حجاز کے عرف میں کیلی تھی وہ ہمیشہ کیلی رہے گی اور جو وزنی تھی وہ ہمیشہ وزنی رہے گی۔ جن اشیاء کے بارے میں آپ ﷺ کے زمانے کے اہل حجاز کا عرف معلوم نہ ہو، ان اشیاء کے بارے میں فقہاء شافعیہ کے مختلف اقوال ہیں، مثلاً ایک قول یہ ہے کہ جو چیز کھجور سے بڑی ہوگی، جیسے انڈہ وہ ہمیشہ وزنی رہے گی، بقیہ چیزوں کا مدار علاقے کے عرف پر ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بقیہ تمام اشیاء کیلی رہیں گی۔ تیسرا قول یہ ہے کہ بقیہ تمام اشیاء وزنی رہیں گی اور ایک قول میں عوام کو اختیار بھی دیا گیا ہے۔ جہاں تک فقہاء حنابلہ کی بات ہے تو ان کے بھی دو طریقے ہیں: ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر چیز پر اہل حجاز کے ہاں رائج کسی مشابہ اور ملتی جلتی چیز والا حکم لاگو ہوگا، مثلاً جو چیز اہل حجاز کے ہاں وزنی ہوگی، اس سے ملتی جلتی تمام اشیاء وزنی سمجھی جائیں گی، جبکہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر علاقے کے عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔^(۱)

۲۔ فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کا منج غیر منصوص اشیاء کے بارے میں یہ ہے کہ ایسی اشیاء کا معیار طے کرنے کے لیے ہر علاقے کے عرف کو مدار بنایا جائے گا، لہذا جس علاقے میں جو چیز وزن کے ساتھ نیچی جاتی ہے وہ وزنی ہے اور تماثل بھی وزن کے ذریعے طے کیا جائے گا۔ یہی حکم ان اشیاء کا بھی ہے جو کسی عرف میں کیلی ہو کہ وہ کیلی سمجھی جائے گی۔^(۲)

جیسا کہ پہلے عرض کر دیا گیا کہ اگرچہ کسی عرف کی بنیاد پر کسی ربوی مال کو اموال ربویہ کے دائرے سے نہیں نکالا جاسکتا، لیکن اس سلسلے میں اکثر متاخرین علماء نے امام ابو یوسفؒ کی رائے کو ترجیح دی ہے کہ تمام اموال ربویہ میں معیار کے لیے اس علاقے کے عرف کو مدار بنایا جائے گا اور اس سلسلے کی احادیث میں وزن یا کیلی کی جو تصریح آئی ہے وہ بھی اسی زمانے اور عرف کی وجہ سے آئی ہے، لہذا وہ احادیث معلول بعلمہ ہیں۔

(۱) مغنی المحتاج ۲/۲۲۲، المغنی ۲/۱۳۸

(۲) فتح القدیر ۶/۱۵۷، حاشیۃ الدسوقی ۳/۵۳

۵۔ تماشل میں خلل:

جب دو ایسی چیزوں کا تبادلہ ہو رہا ہو جو اموال ربویہ ہوں اور دونوں کی جنس بھی ایک ہو تو تماشل یعنی دونوں طرف برابری ضروری ہوتی ہے۔ یہاں اس نکتہ پر غور کیا جائے گا کہ ایسی صورت میں تماشل میں کیسے خلل آسکتا ہے جسے دور کرنے ضروری ہے؟ فقہاء کی عبارات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل چار باتوں کی وجہ سے تماشل میں خلل آسکتا ہے جن کی تفصیل عرض کی جاتی ہے:

۱۔ کمی بیشی:

اس بات میں کسی فقہیہ کا اختلاف نہیں ہے کہ معاملہ کرتے وقت دو ہم جنس اشیاء میں برابری ضروری ہے، کسی ایک جانب کمی، بیشی کی اجازت نہیں ہے، لیکن اگر معاملہ کرتے وقت دونوں طرف کی چیزوں کی مقدار بالکل برابر ہو اور معاہدہ کرنے کے بعد فریقین نے کسی ایک جانب کچھ کمی بیشی کر دی تو اس کا کیا حکم ہے؟ مثلاً دو آدمیوں نے دو، دو کلو گندم کا برابر تبادلہ کیا، لیکن معاملہ کرنے کے بعد کسی ایک فریق نے دو کے بجائے تین کلو گندم دے دی۔ اس کو فقہاء یوں تعبیر کرتے ہیں کہ عقد کے بعد جو کمی بیشی (حط والزیادة) کی جائے، اس کو اصل عقد کے ساتھ ملایا جائے گا یا نہیں؟

اس صورت کا حکم فقہ حنفی کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر عقد کے بعد کسی فریق نے بطور گنٹ دوسرے کو کوئی چیز دے دی، اس کو بچی ہوئی چیز میں شامل نہ کیا، بلکہ الگ رکھا تو یہ جائز ہے، لیکن عقد کے بعد اگر فریقین نے کسی چیز میں کمی، بیشی کر دی تو امام ابو حنیفہؒ کی رائے میں اس کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس کمی بیشی کو اصل عقد کے ساتھ ملایا جائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ عقد میں ہی کمی بیشی ہوئی ہے، لہذا تماشل میں خلل آئے گا۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ کمی بیشی باطل ہے اور اس کی وجہ سے معاملہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، بلکہ معاملہ اپنی جگہ درست رہے گا۔ امام محمدؒ نے کمی اور زیادتی میں فرق کیا ہے، آپ کی رائے یہ ہے کہ اگر فریقین نے کمی پر رضامندی اختیار کر لی، مثلاً ایک فریق نے خود دوسرے کو کہہ دیا کہ دو کلو کے بجائے ایک کلو گندم دے دو تو یہ ہبہ اور گنٹ ہے، جو کہ جائز ہے، لیکن اگر کسی فریق نے چیز میں اضافہ کر لیا تو یہ جائز نہیں ہے۔

فقہاء حنفیہ کا یہ اختلاف درحقیقت ایک اور اصولی اختلاف پر مبنی ہے۔ وہ اختلاف یہ ہے کہ اگر معاملہ میں کسی قسم کی فاسد شرط نہ لگائی جائے، لیکن معاملہ کے بعد کوئی فاسد شرط لگادی جائے تو کیا اس شرط کو اصل عقد کے ساتھ ملا کر اس عقد کو فاسد قرار دیا جائے گا یا نہیں؟ امام ابو حنیفہؒ اس طرح کی شرط فاسد کو اصل عقد کے ساتھ ملا کر اس معاملہ کو فاسد سمجھتے ہیں، جبکہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ ایسی شرائط کو اصل عقد کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا اور ان کی وجہ سے

عقد و فاسد نہیں سمجھا جائے گا۔^(۱)

۲۔ تراور خشک کا تبادلہ:

جن اشیاء کی دو حالتیں ہوتی ہیں، ایک تراور دوسری خشک، ان میں سے اگر تراور بھیگی چیز کو خشک چیز کے بدلے برابری کے ساتھ بیچا جائے گا تو اس سے بھی تماثل میں خلل آتا ہے، کیونکہ مستقبل میں تر چیز جب خشک ہوگی تو اس میں کمی آسکتی ہے، اسی لیے بعض فقہاء نے اس کو ممنوع لکھا ہے، البتہ امام ابو حنیفہؒ نے صرف فی الحال تماثل کو ضروری قرار دے کر اس کی اجازت دی ہے۔ اس کی بقیہ تفصیل ”تماثل کا وقت“ کے تحت گزر چکی ہے۔

۳۔ مقدار معلوم نہ ہونا:

جب اموال ربویہ کو ہم جنس اشیاء کے بدلے بیچا جاتا ہے تو وہاں یقینی طور پر برابری کا علم ضروری ہے، اگر کسی ایک جانب کی چیز کی مقدار معلوم نہ ہو یا دونوں جانب کی چیز کی مقدار معلوم نہ ہو تو تماثل میں خلل آئے گا اور یہ جائز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء نے ”مزابنہ“ اور ”محاقلہ“ جیسی صورتوں کو ممنوع لکھا ہے۔ ان کی مزید تفصیل پہلے باب کی پہلی فصل میں موجود ہے۔

۴۔ اصل اور اجزاء کی بیخ:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز اصل حالت میں کسی اور شکل میں ہوتی ہے، لیکن اس کو پینے یا مختلف اجزاء میں توڑنے کی وجہ سے اس کی شکل و صورت بدل جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں جب اصل چیز کا اس کے اجزاء کے ساتھ تبادلہ کیا جاتا ہے تو وہاں تماثل میں خلل کا امکان ہوتا ہے۔ مثلاً گندم کے دانوں کی اصل شکل الگ ہوتی ہے، لیکن اس کو پس کر آنا بنایا جائے تو اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ جب گندم کو آٹے کے بدلے کیل یا برتن کے ذریعے بیچا جائے گا تو یقینی طور پر تماثل ناممکن بنے گا۔ کچھ نہ کچھ کمی بیشی کا امکان بہر صورت ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کو فقہاء نے ممنوع لکھا ہے۔ البتہ فقہاء مالکیہ نے اس فی اجازت دی ہے۔ اسی طرح امام ابو یوسفؒ کی رائے کے مطابق اگر آٹے اور گندم کو وزن کی قرار دے کر دونوں کو وزن میں برابر لیا جائے تو تماثل کا علم یقینی طور پر بھی معلوم ہو جاتا ہے، لہذا ان کی رائے میں یہ صورت جائز ہوگی۔ اسی طرح فقہاء مالکیہ اور صاحبین (امام ابو یوسف و محمد رحمہم اللہ) نے گندم کو ستو کے بدلے بیچنے کی بھی اجازت

دی ہے، کیونکہ دونوں کی جنس الگ الگ ہے۔^(۲)

^(۱) فتح القدیر ۶/۲۳۶

^(۲) ۱/۱۰۱۔ ۱۰۲۔ حاشیہ ابن عابدین ۱۸۲/۲

۲۔ تقابض کی بحث

تقابض کا مطلب ہے کہ مجلس عقد کے اندر ہی دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ کرنا۔ کیا اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ کرنا فی الفور ضروری ہوتا ہے یا نہیں؟ اور اگر ضروری ہے تو تقابض ہاتھ در ہاتھ ضروری ہے یا صرف اشیاء کو متعین کر لینا کافی ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں اس اعتبار سے اموال ربویہ کی دو قسمیں ہیں:

الف۔ سونا، چاندی: دونوں طرف سے سونا ہو، یا دونوں طرف سے چاندی، یا ایک طرف سے چاندی اور دوسری طرف سے سونا۔ ان صورتوں میں تاخیر (ادھاری مدت طے کرنا) بھی حرام ہے اور مجلس عقد کے اندر دونوں جانب پر قبضہ / تقابض بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ چیزیں تعین کو قبول نہیں کرتیں اور یہ بیع صرف ہے۔

ب۔ دیگر اموال ربویہ: جیسے گندم، نمک، چاول وغیرہ۔ ان کا اصول یہ ہے کہ جب دونوں طرف سے ایک ہی جنس کی چیز ہو اور قدر / پیمانہ بھی دونوں کا ایک ہو، یا صرف جنس ایک ہو یا صرف قدر متحد ہو تو ادھار حرام ہے، لیکن مجلس عقد میں تقابض ضروری نہیں، بلکہ اگر چیزوں کو متعین کر دیا گیا تو کافی ہے، کیونکہ یہ چیزیں متعین کرنے سے متعین ہو جاتی ہیں۔

اس کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ:

فقہاء حنفیہ کے ہاں سونے کا سونے یا چاندی کا چاندی سے تبادلہ میں تین احکام لاگو ہوں گے:

۱۔ (تفاضل) کمی زیادتی حرام ہے۔

۲۔ نسیئہ (باقاعدہ ادھار کی مدت طے کرنا) بھی حرام ہے۔

۳۔ تقابض (ایک ہی مجلس میں دونوں عوضوں پر قبضہ کرنا) بھی ضروری ہے۔

اور اگر ایک جانب سونا اور دوسری جانب چاندی ہے تو پہلا حکم تو لاگو نہ ہوگا، یعنی کمی بیشی جائز ہے، لیکن بقیہ

۱۔ (تفاضل) کمی زیادتی حرام ہے، اور تقابض (ایک ہی مجلس میں دونوں عوضوں پر قبضہ کرنا) بھی ضروری ہے۔

۲۔ نسیئہ (باقاعدہ ادھار کی مدت طے کرنا) بھی حرام ہے، اور اگر ایک جانب سونا اور دوسری جانب چاندی ہے تو پہلا حکم تو لاگو نہ ہوگا، یعنی کمی بیشی جائز ہے، لیکن بقیہ

۳۔ تقابض (ایک ہی مجلس میں دونوں عوضوں پر قبضہ کرنا) بھی ضروری ہے۔

۱۔ (تفاضل) کمی زیادتی حرام ہے، اور اگر ایک جانب سونا اور دوسری جانب چاندی ہے تو پہلا حکم تو لاگو نہ ہوگا، یعنی کمی بیشی جائز ہے، لیکن بقیہ

۲۔ نسیئہ (باقاعدہ ادھار کی مدت طے کرنا) بھی حرام ہے، اور اگر ایک جانب سونا اور دوسری جانب چاندی ہے تو پہلا حکم تو لاگو نہ ہوگا، یعنی کمی بیشی جائز ہے، لیکن بقیہ

۳۔ تقابض (ایک ہی مجلس میں دونوں عوضوں پر قبضہ کرنا) بھی ضروری ہے۔

واضح رہے کہ اگر کرنسی سے سونا خریداجا رہا ہے تو چونکہ آج کل کے عرف میں سونا، شمنیت سے نکل کر مروجہ شکل اختیار کر چکا ہے، لہذا اس کی صرف تعین ہی کافی ہے۔

یہاں ایک سوال ہو سکتا ہے کہ جب اس صورت میں ادھار حرام ہے تو تقابض کیسے جائز ہو سکتا ہے، کیونکہ سید (ادھار) کے حرام ہونے کا نتیجہ یہی نکلتا ہے ایک ہی مجلس میں دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ ضروری ہو، جسے تقابض کہتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ادھار اور عدم تقابض میں فرق ہے۔ ادھار کا مطلب ہے کسی چیز/ قیمت کی ادائیگی کے لیے باقاعدہ مستقبل کا کوئی وقت طے کیا جائے، جبکہ عدم تقابض کا مطلب ادھار نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجلس عقد میں چیز پر قبضہ نہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ چیز کی ادائیگی کے لیے کوئی وقت طے نہ ہوا ہو، بلکہ چیز متعین ہوگئی اور وصول کرنے والے نے اس پر فی الحال قبضہ نہ کیا، لہذا عدم تقابض سے ادھار لازم نہیں آتا۔

حاصل یہ ہے کہ سونا، چاندی کے علاوہ دیگر اشیاء میں (جنس بھی ایک ہو اور آلہ پیمائش بھی ایک ہو تو) تا جیل یعنی ادھار جائز نہیں ہے، لیکن بیع حال ہو، مؤجل نہ ہو، اور چیز کو باقاعدہ متعین کر دیا جائے، اس کے باوجود کسی عذر یا باہمی رضامندی سے مجلس میں عوضین پر قبضہ نہ کیا جائے تو یہ درست ہے۔ اور تعین بیان صفات سے بھی ہو سکتی ہے۔^(۱)

۲۔ ائمہ ثلاثہ کی رائے یہ ہے کہ تمام اموال ربویہ میں ہاتھ در ہاتھ قبضہ ضروری ہے، صرف تعین کافی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں احادیث میں جو ”ید اید“ کے الفاظ آئے ہیں، انہوں نے اس کے حقیقی معنی مراد لیے ہیں۔^(۲)

یہاں دو نکات مزید سمجھنا ضروری ہیں:

۱۔ چونکہ اموال ربویہ کے تبادلہ میں تقابض ضروری ہے، اس لیے فقہاء کے ہاں ان کے تبادلہ میں ”خیار شرط“ رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے، کیونکہ یہ تقابض کے خلاف ہے۔

۲۔ اگر ایسی صورت حال پیش آجائے کہ اموال ربویہ کا تبادلہ ہو جائے اور مجلس میں ہی دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ ہو جائے، لیکن بعد میں کسی ایک فریق کی چیز میں کوئی عیب اور خرابی نکل آئے تو کیا اسے وہ چیز واپس کرنے کا اختیار اور حق حاصل ہے یا نہیں اور اس کی وجہ سے عقد پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

۱۔ فقہاء حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ اس فریق کو چیز واپس کرنے کا حق حاصل ہو گا اور عقد اپنی جگہ درست رہے گا،

^(۱) فتح القدیر ۳/۴۱۵

^(۲) المغنی ۴/۱۴۱

کیونکہ عقد کے وقت دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ ہو گیا تھا اور وہی قبضہ دوسری صحیح چیز، جس میں عیب نہ ہو۔۔۔ کے قائم مقام ہو جائے گا۔

۲۔ جہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں عقد فاسد ہو جائے گا اور اس عقد کو ختم کر کے نیا عقد کرنا ہوگا، کیونکہ جب چیز میں عیب نکل آیا تو گویا اس چیز پر قبضہ ہی نہیں ہوا اور تقابض کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ فاسد ہو جائے گا۔^(۱)

۷۔ ربا کے عمومی ضوابط

ذیل میں ربا/سود سے متعلق چند فقہی ضوابط کو ذکر کیا جاتا ہے، انہیں ذہن میں رکھنا مفید ہے۔ ان ضوابط کی تفصیل گزشتہ مباحث میں بیان کر دی گئی ہے:

• الربا حرام قلیلہ وکثیرہ: ربا، خواہ کم ہو یا زیادہ، حرام ہے۔

• الأموال الربویة منصوصة ومقبیسة: اموال ربویہ کچھ منصوصی ہیں اور کچھ قیاسی۔ منصوصی اموال ربویہ چھ ہیں جن کا تذکرہ احادیث میں آیا ہے: سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور، نمک۔ ان کے بالمقابل جن چیزوں میں ربا کی علت پائی جائے اور کسی حدیث میں ان کا تذکرہ نہیں ہے وہ اموال ربویہ قیاسی ہیں۔

• النقود الورقیة من الأموال الربویة: کاغذی کرنسی بھی اموال ربویہ میں سے ہے۔

• کل قرض جر نفعاً فهو ربا: ہر وہ قرض جو اپنے ساتھ نفع کھینچ لائے وہ سود ہے۔ خواہ نفع نقد کی شکل میں ہو، کسی چیز کی شکل میں یا کسی منفعت کی شکل میں۔ لہذا اس میں یہ صورتیں شامل ہیں: انشورنس، سودی بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹس کا نفع، انعامی بانڈز کا نفع، حکومت کی دیگر وہ اسکیمیں جن میں عوام سے رقم لے کر بعد میں نفع کے ساتھ رقم واپس کی جاتی ہے۔

• لا يجوز بیع الأموال الربویة بجنسها إلا مثلاً بمثل: ہم جنس اموال ربویہ کا تبادلہ کرنا برابر برابر جائز ہے، ورنہ نہیں۔

• إن اختلف الجنسان جاز البیع متفاوتاً، یدا بیدا: اگر دو چیزوں کی جنس مختلف ہو تو دونوں کا کمی بیشی کے ساتھ نقد تبادلہ جائز ہے۔

- يجوز بيع خالص الربوي بمشوب من جنسه عند الحنفية: فقهاء حنفیہ کے ہاں خالص ربوی چیز کو ایسی چیز کے بدلے بیچنا جائز ہے جس میں ربوی اور غیر ربوی دونوں چیزیں ہوں۔
- الجهل بالنمائل كالعلم بالفاضل: برابری کا علم نہ ہونا، ایسا ہے جیسے کسی بیشی کا علم۔ اگر ہم جنس چیزوں کا تبادلہ ہو رہا ہے تو وہاں برابری کا علم ضروری ہے، اگر برابری کا علم نہ ہو تو ایسا سمجھا جائے گا جیسے فریقین کو کسی بیشی کا علم ہے جو کہ سود اور ناجائز ہے۔
- الربا يجري في المعاوضات المالية دون غيره: ربا صرف معاوضات مالیہ میں جاری ہوتا ہے، ان کے علاوہ دیگر معاملات میں جاری نہیں ہوتا۔

۸۔ چند جدید مسائل

۱۔ صدقہ کی نیت سے سود وصول کرنا:

بینک کے سودی اکاؤنٹ میں رقم رکھوا کر سود وصول کرنا جائز نہیں ہے، اگرچہ غریب کو دینے کی نیت سے یا دیگر رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کی نیت سے ہو۔ اگر بینک میں رقم رکھنا ہی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی جاسکتی ہے جس میں سود نہیں ملتا پھر کسی ایسے غیر سودی بینک میں رکھی جائے جو مستند علمائے کرام کے زیر نگرانی چل رہا ہو۔

۲۔ سودی رقم کا مصرف:

سودی رقم کا حکم یہ ہے کہ یہ رقم اصل مالک کو واپس کر دی جائے، لیکن اگر اصل مالک معلوم نہ ہو اور اس تک رقم پہنچانا ناممکن ہو تو یہ رقم ثواب کی نیت کے بغیر اصل مالک یا اصل مالکوں کی طرف سے صدقہ کرنا ضروری ہے، اور احتیاط اسی میں ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں اکابر علماء کی دورائے ہیں:

۱۔ سودی و حرام مال کے مصارف وہی ہیں جو زکاۃ اور دیگر صدقات واجبہ کے ہیں، جن کا ذکر قرآن میں ہے، اور اس میں تملیک (کسی کو مالک بنانا) بھی شرط ہے یعنی کسی فقیر و مسکین کو باقاعدہ مالک و قابض بنا کر دینا ضروری ہے کسی رفاہی کام میں لگانا جائز نہیں۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ رقم، لفظ کے حکم میں ہے اور لفظ کا مصرف وہی ہے جو صدقات نافلہ کا ہیں یعنی رفاہی کاموں مثلاً مساجد، مدارس وغیرہ میں لگانا جائز ہے۔

پہلے قول میں احتیاط ہے اور دوسرے قول میں توسع (گنجائش) ہے۔^(۱)

س۔ سودی بینک میں ملازمت:

سودی بینک میں ملازمت سے متعلق تفصیل یہ ہے کہ اگر ملازم کا تعلق براہ راست سودی لین دین یا سودی لکھت پڑھت وغیرہ سے نہ ہو جیسے چوکیدار، ڈرائیور، نئے نوٹ چھاپنا، اسکی کاپی دینا، پرانے نوٹ جلانا، انہیں تبدیل کرنا، حکومت کے جائز ٹیکس وصول کرنا، صفائی اور چائے بنانے والا وغیرہ، تو اس ملازمت کی گنجائش ہے، اور اس پر ملنے والی تنخواہ بھی حلال ہے۔ اور اگر ملازم کا تعلق براہ راست سودی لین دین یا سودی لکھت پڑھت وغیرہ سے ہو جیسے مینیجر، کیشئر، اکاؤنٹنٹ، سودی قرضہ فراہم کرنا، کمپیوٹر پروگرام لکھنے والا وغیرہ تو یہ ملازمت ناجائز ہے، اور اس پر ملنے والی تنخواہ بھی ناجائز ہے۔^(۱)

دوسرا باب

مشاركات و اجاره کے اصولی مباحث

(Partnership and Leasing)

دوسرے باب میں معاملات کے مندرجہ ذیل چار اہم ابواب کے اصولی

مباحث اور احکام کو مختصر بیان کیا جائے گا:

۱۔ شرکت کے اصولی مباحث

۲۔ مضاربت کے اصولی مباحث

۳۔ مزارعت کے اصولی مباحث

۴۔ اجارہ (کرایہ داری) کے اصولی مباحث

۱۔ شرکت کے اصولی مباحث

(Partnership)

دوسرے باب کے اس حصے میں شرکت (partnership) اور مشارکہ کے بنیادی اصول و مباحث اور احکام

کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ اس خلاصہ کو درج ذیل گیارہ نکات میں پیش کیا جاتا ہے:

- ۱۔ شرکت کا تعارف
- ۲۔ شرکت کا ثبوت
- ۳۔ شرکت کی اقسام
- ۴۔ شرکت اباحت کے احکام
- ۵۔ شرکت ملک کے اصول
- ۶۔ شرکت عقد کے اصول
- ۷۔ اس المال کے اصول
- ۸۔ نفع و نقصان کے اصول
- ۹۔ شریک کو اجیر بنانا
- ۱۰۔ شرکت کا اختتام
- ۱۱۔ شرکت کے عمومی ضوابط

۱۔ شرکت کا تعارف

شرکت کے لغوی معنی ہیں شریک ہونا اور کسی کو شریک کرنا۔ علامہ ابن فارس لکھتے ہیں:

(شرك) الشين والراء والكاف أصلان، أحدهما يدل على مقارنة وخلاف انفراد، والآخر يدل على امتداد واستقامة. فالأول الشركة، وهو أن يكون الشيء بين اثنين لا ينفرد به أحدهما.

شیمین، راء اور کاف کے دو اصولی معانی ہیں: پہلا یہ ہے کہ یہ مقارنة اور غیر منفرد ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ لمبا اور سیدھا ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ پہلے معنی شرکت کے ہیں اور

دو یہ ہے کہ ایک چیز دو افراد میں مشتک ہو، کوئی ایک اس میں اکیلا نہ ہو۔^(۱)

جہاں تک مقدمہ شرکت کی اصطلاحی تعریف کی بات ہے تو فقہ حنفی میں شرکت کی مختصر اور جامع تعریف یوں کی

(۱) اختصاص انہیں أو اکثر بمحل واحد.

یعنی دو یا زیادہ افراد کا کسی ایک محل کے ساتھ مخصوص ہو جانا۔

بعض علماء نے ان الفاظ میں شرکت کی تعریف کی ہے:

(۲) اختصاص ما فوق الواحد من الناس بشيء و امتيازهم بذلك الشيء.

لوگوں میں سے ایک سے زیادہ افراد کا کسی چیز کے ساتھ اختصاص اور امتیاز۔

جہاں تک لفظِ مشارکہ کی بات ہے تو یہ ایک جدید اصطلاح ہے۔ یہ دراصل فقہی اصطلاح ”شرکت“ سے ماخوذ ہے، لیکن شرکت ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جبکہ مشارکہ کا مفہوم محدود ہے۔ مشارکہ کے تحت عموماً ”شرکتہ الاموال“ اور کبھی کبھی ”شرکتہ الاعمال“ کی قسم آتی ہے، اس میں شرکتہ کی تمام اقسام داخل نہیں ہیں، جبکہ شرکت کے ضمن میں کئی اقسام آتی ہیں، جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

۲۔ شرکت کا ثبوت

شرکت کا جواز قرآنی آیات، حدیث، فقہاء کے اجماع اور عقل سے ثابت ہے۔

• مثلاً سورہ نساء میں ہے:

{فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثَّلَاثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرِ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ} (۳)

اگر یہ لوگ ایک سے زیادہ ہیں تو جو وصیت کی جائے اس کے بعد یا دین کے بعد یہ لوگ ایک تہائی میں سب شریک ہوں گے، بشرطیکہ کسی کو ضرر نہ پہنچایا جائے، یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ خوب جاننے والا، حلیم ذات ہے۔

اس آیت میں ماں شریک بہن بھائیوں کو وراثت میں شریک قرار دیا گیا ہے، اس لیے اس سے شرکت کا جواز

ثابت: دور ہے۔

• سورہ کہف میں ہے:

(۱) اللہ فی شرح الكتاب ص: ۱۹۴

(۲) در الحکام فی شرح مجلة الأحكام ۷/۳

{ فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هَذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا }^(۱)

اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ دے کر شہر کی طرف بھیجو، پھر وہ تحقیق کریں کہ کونسا کھانا حلال ہے، تاکہ تمہارے پاس اس میں سے کھانا لے آئے، نرمی سے جائے اور تمہارے بارے کسی کو نہ بتائے۔

علماء نے لکھا ہے کہ تمام اصحابِ کہف نے ایک کو مشترک مال دیکر شہر کی طرف بھیجا تھا، اس سے شرکت کے بنیادی تصور کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

• شرکت کا ثبوت آپ ﷺ کے قولی، فعلی اور تقریری احادیث سے موجود ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان الله يقول: أنا ثالث الشريكين ما لم يخن أحدهما صاحبه.^(۲)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں دو شریکوں کے درمیان تیسرا شریک ہوں، جب تک کوئی ایک خیانت نہ کرے۔

• حضور ﷺ کے فعل سے بھی شرکت ثابت ہے، چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت سائب بن ابی السائب رضی اللہ عنہ کے ساتھ شرکت کا عقد کیا تھا۔^(۳)

• اسی طرح آپ ﷺ کی موجودگی میں صحابہ کرام شرکت و مضاربت کے معاملات کرتے تھے اور آپ ﷺ نے ان کو منع نہیں فرمایا، لہذا آپ کے سکوت (سنتِ تقریریہ) سے بھی شرکت کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

• شرکت کے جواز پر فقہاء کا اجماع ہے۔ چنانچہ علامہ طرابلسی لکھتے ہیں:

الإجماع على جوازها من حيث الجملة.^(۴)

فی الجملہ شرکت کے جواز پر علماء کا اجماع ہے۔

• عقل کا تقاضا بھی یہ ہے کہ شرکت کا عقد جائز ہونا چاہیے، کیونکہ یہ ابتغاء اور مال کمانے کا ایک ذریعہ ہے اور

(۱) الکہف: ۱۹

(۲) سنن ابن داود ۳/ ۲۶۴. حدیث نمبر: ۳۳۸۵

(۳) نیل الاوطار ۵/ ۳۱۵. کتاب الشركة والمضاربة. حدیث نمبر: ۲

(۴) مواہب الجلیل لشرح مختصر الخلیل ۲/ ۲۱

مال کمانے کی ترغیب قرآن و سنت میں موجود ہے۔ اسی طرح معاشرے میں کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جن سے پاس سرمایہ ہوتا ہے، لیکن وہ کاروبار اور تجارت سے ناواقف ہوتے ہیں، جبکہ ان کے مقابلے میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے پاس کاروبار اور تجارت کا تجربہ اور مہارت ہوتی ہے، لیکن ان کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا۔ ایسی صورت حال میں دونوں کے باہمی تعاون اور شراکت سے دونوں کو فائدہ ہو سکتا ہے، اسی لیے عقلاً یہ ایک مناسب اور بہتر آپشن معلوم ہوتا ہے۔^(۱)

۳۔ شرکت کی اقسام

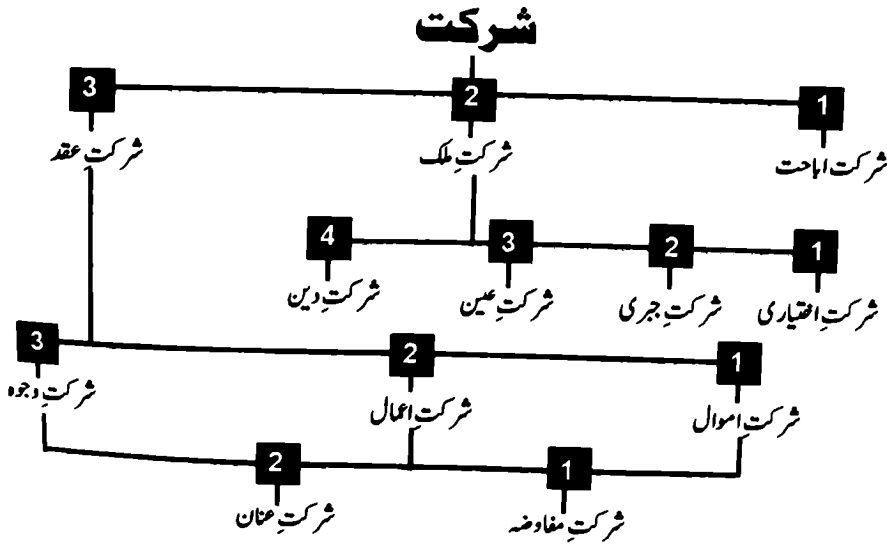
شرکت کی اقسام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ شرکت کی قدیم اقسام

۲۔ شرکت کی جدید اقسام

۱۔ شرکت کی قدیم اقسام:

شرکت کی قدیم اقسام کی تفصیلات سے پہلے مندرجہ ذیل خاکہ ذہن میں رکھیں:



فتہنہا نے شرکت کی مندرجہ ذیل تین قسمیں لکھی ہیں:

۱۔ شرکتِ اباحت

۲۔ شرکتِ ملک

۳۔ شرکتِ عقد

۱۔ شرکتِ اباحت:

”اباحت“ کا مطلب ہے کسی چیز کا مباح اور حلال کر دینا، جبکہ شرکتِ اباحت کا مطلب ہے کسی چیز کا سب لوگوں کے درمیان مشترک طور پر مباح ہونا۔ بالفاظِ دیگر عام لوگوں کا کسی ایسی مباح چیز میں شریک ہونا جو کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہ ہو۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

وہي كُونُ الْعَامَّةِ مُشْتَرِكِينَ فِي صَلَاحِيَةِ التَّمَلُّكِ بِالْأَخْذِ وَالْإِحْرَازِ لِلْأَشْيَاءِ الْمُبَاحَةِ الَّتِي

لَيْسَتْ فِي الْأَصْلِ مِلْكًا لِأَخْذِ كَالْمَاءِ.^(۱)

عام لوگوں کا ایسی اشیاء کو لینے اور محفوظ کر کے اپنی ملکیت میں داخل کرنے میں مشترک ہونا، جو

چیزیں مباح ہیں اور دراصل کسی کی ملکیت نہیں ہیں، جیسے پانی۔

اس کے ثبوت پر بھی ایک واضح حدیث موجود ہے، جس میں ہے:

الناس شركاء في ثلاث: الماء والكلا والنار.

لوگ تین چیزوں میں شریک ہیں: پانی (مباح پانی جیسے دریاؤں اور بارش کا پانی وغیرہ) گھاس (یعنی

خود رو) اور آگ (جو مباح لکڑیوں سے جلائی گئی ہو)۔

۲۔ شرکتِ ملک:

اس کا مطلب ہے کسی چیز کی ملکیت کا دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان مشترک ہونا، اگرچہ انہوں نے باہم کوئی

نقد یا کاروبار کا معاملہ نہ کیا ہو۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں شرکتِ ملک کی تعریف یوں کی گئی ہے:

شركة المملک: هي كُونُ الشَّيْءِ مُشْتَرَكًا بَيْنَ أَكْثَرِ مَنْ وَاجِبِ أَيْ مَخْصُوصًا بِهِمْ بِسَبَبِ

^(۱) مجلة الاحکام العدلیة، ص: ۲۰۲ (المادة ۱۰۴۵)

من أسناب التملك. (۱)

شرکت ملک: یہ ہے کہ ایک سے زیادہ افراد کے درمیان کوئی چیز مشترک ہو، یعنی اسباب ملک میں سے کسی سبب کی وجہ سے کوئی چیز چند افراد کے ساتھ خاص ہو جائے۔

شرکت ملک کی چار قسمیں ہیں:

الف۔ شرکت اختیاری

ب۔ شرکت جبری

ج۔ شرکت عین

د۔ شرکت دین

الف۔ شرکت اختیاری:

شرکاء اپنے اختیار سے کسی چیز کی ملکیت میں شریک ہو جائے۔ مثلاً دو آدمیوں نے مل کر مکان خرید لیا تو دونوں اس مکان میں شریک ہو جاتے ہیں۔ فقہاء اس قسم کی تعریف یوں کرتے ہیں:

الشركة الاختيارية: هي الاشتراك الحاصل بفعل المتشركين. (۲)

ب۔ شرکت جبری:

بلا اختیار ایسی شرکت وجود میں آجائے، مثلاً کسی کا انتقال ہو جائے تو ورثاء ترکہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس کی تعریف فقہاء یوں کرتے ہیں:

الشركة الجبرية: هي الاشتراك الحاصل بغير فعل المتشركين. (۳)

ج۔ شرکت عین:

دو یا دو سے زیادہ افراد کا کسی متعین اور موجودہ مال میں شریک ہونا۔ جیسے کسی متعین بکری یا متعین مکان میں کچھ افراد شریک ہوں۔

مجلد الاحکام العدلیہ میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص. ۲۰۴ (المادة ۱۰۶۰)

(۲) حوالہ بالا، ص. ۲۰۵ (المادة ۱۰۶۳)

(۳) حوالہ بالا، ص. ۲۰۵ (المادة ۱۰۶۴)

شركة العین اشترک فی المال المعین والموحد^(۱)

د۔ شرکت دین:

پند افراد کا کسی غیر متعین اور ایسی چیز میں شریک ہونا؛ ایک قسم کا مالی حق، دو، بیسے، دو یا دو سے زیادہ افراد کا ان شخص کے ذمہ ایک ہی سبب سے قرض لازم ہو جائے تو سارے قرض خواہ اس میں اپنے اپنے حصے کے تناسب سے شریک ہوتے ہیں۔

شركة الدین: الاشتراک فی الدین^(۲)

س۔ شرکت عقد:

اس کا مطلب ہے دو یا زیادہ افراد کا اصل سرمایہ اور نفع میں شرکت کا باقاعدہ معاملہ کرنا کہ سب شرکاء کا کچھ پانچ سرمایہ فراہم کریں گے اور کاروبار کر کے نفع کو باہم تقسیم کریں گے۔ جملہ میں ہے:

شركة العقد عیناً عن عقد شركة بین اثنين أو أكثر علی کون رأس المال والربح
مُشْتَرَكًا بَيْنَهُمْ^(۳)

شرکت عقد ایسے عقد کا نام ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ افراد آپس میں اصل سرمایہ اور نفع میں شریک ہونے کا معاملہ کرتے ہیں۔

شرکت عقد کی تین قسمیں ہیں:

الف۔ شرکت الاموال

ب۔ شرکت الاعمال

ج۔ شرکت الوجوه

الف۔ شرکت الاموال:

دو یا دو سے زیادہ افراد سرمایہ فراہم کر کے نفع میں شرکت پر عقد کریں اور یہ طے ہو جائے کہ سب یا بعض کام

کریں گے۔ اس کی وضاحت فقہاء پوں کرتے ہیں:

مجلة الأحكام العدلية، ص: ۲۰۵، (المادة ۱۰۶۷)

حوالہ بالا ص: ۲۰۵، (المادة ۱۰۶۸)

حوالہ بالا ص: ۲۰۴، (المادة ۱۳۲۹)

فإذا وضع كل واحد من الشركاء مقدارا من المال ليكون رأس مال للشركة وعقدوا الشركة على أن يبيعوا ويشتروا معا أو كل واحد على حدة أو مطلقا وعلى أن يقسم ما يحصل من الربح بينهم تكون الشركة شركة أموال.⁽¹⁾

جب ہر شریک مال کی ایک خاص مقدار شرکت کے سرمایہ کے لیے رکھ لیں اور سب یہ عقد کر لیں کہ وہ ایک ساتھ یا علیحدہ خرید و فروخت کریں گے اور جو نفع حاصل ہوگا وہ آپس میں تقسیم کریں گے تو یہ شرکتِ اموال ہے۔

ب۔ شرکت الاعمال:

دو یا دو سے زیادہ صاحبِ پیشہ افراد یوں معاملہ کرے کہ ہم مشترکہ طور پر لوگوں کا کام کریں گے اور جو اجرت ملے گی اس میں سب شریک ہوں گے۔ اس کو ”شركة الصنائع“ اور ”شركة التقبل“ بھی کہتے ہیں۔

إذا عقدوا الشركة بأن جعلوا عملهم رأس مال على تقبل العمل من آخر أي تعهده والتزامه وعلى أن يقسموا الكسب الذي سيحصل أي الأجرة بينهم فتكون شركة أعمال.⁽²⁾

جب شرکاء یوں شرکت کا عقد کر لیں کہ اپنے عمل کو سرمایہ بنالیں اور دوسروں سے عمل قبول کریں گے، یعنی اسے پورا کرنے کی ذمہ داری لیں گے اور جو نفع حاصل ہوگا وہ آپس میں تقسیم کریں گے تو یہ شرکتِ اعمال ہے۔

شرکت الاعمال کے ساتھ ساتھ کبھی شرکتِ ملک بھی وجود میں آ جاتی ہے۔ مثلاً چند شرکاء نے مل کر یہ شرکت کر لی کہ وہ اپنی خدمات فراہم کر کے نفع کمائیں گے اور انہوں نے کچھ کچھ سرمایہ اکٹھا کر کے اس سے مشینری اور آلات وغیرہ بھی خرید لیے تو اس مشینری اور آلات میں ان کی شرکت، شرکتِ ملک ہوگی۔

شرکت الاعمال کی چند جدید مثالیں یہ ہیں:

۱۔ کچھ شرکاء مل کر قانونی معاونت (legal consultancy) کا ادارہ قائم کر لیتے ہیں اور اس میں کوئی ایک شریک یا سب کچھ سرمایہ بھی لگا لیتے ہیں اور خدمات فراہم کر کے فیس کی شکل میں نفع کماتے ہیں اور اس نفع کی شرح

⁽¹⁾ درر الحکام فی شرح مجلة الأحكام ۳/ ۳۵۵

⁽²⁾ حوالہ بالا ۳/ ۳۵۵

تمام شرکاء میں ایک خاص تناسب سے تقسیم ہوتی ہے۔ یہ شرعاً جائز ہے۔

۲۔ کچھ شرکاء (انجینئرز) مل کر مکانات کے نقشے بنانے (architectury) پر شرکت کا عقد کر لیتے ہیں اور ان میں کچھ شرکاء کچھ پیسہ یا سامان بھی لگا لیتے ہیں اور لوگوں کو خدمات فراہم کر کے نفع کماتے ہیں اور اس نفع کو ایک خاص تناسب سے باہم تقسیم کرتے ہیں۔ یہ بھی شرعاً جائز ہے۔

۳۔ کچھ شرکاء مل کر گاڑیوں کے ورکشاپس یا سروس اسٹیشن قائم کر لیتے ہیں اور اپنی خدمات فراہم کر کے نفع کماتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ مل کر مشترکہ طور پر بڑا ہسپتال قائم کر کے لوگوں کا علاج کرتے ہیں اور نفع آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ کچھ درزی (tailors) مل کر لوگوں کے لیے مشترکہ طور پر کپڑے بناتے ہیں اور نفع باہم تقسیم کر لیتے ہیں۔ یہ سب صورتیں ”شرکت الاعمال“ کی ہیں اور جائز ہیں۔

ج۔ شرکت الوجوه:

دو یا زیادہ افراد باہم یوں شرکت کر لیں کہ ہم اپنی ذاتی ساکھ اور وجاہت کی بنیاد پر ادھار چیزیں خرید کر، نفع کے ساتھ فروخت کریں گے اور حاصل شدہ نفع باہم تقسیم کریں گے۔

إذا عقدوا الشركة مع عدم وجود رأس مال لهم على أن يشترتوا مالا نسيئة على ذمتهم وببيعوه وأن يقسموا الربح الحاصل بينهم فتكون الشركة شركة وجوه.^(۱)

جب شرکاء کے پاس سرمایہ بالکل نہ ہو اور وہ یوں شرکت کا عقد کر لیں کہ وہ اپنی ذمہ داری پر ادھار مال خریدیں گے اور اسے بیچیں گے اور حاصل شدہ نفع آپس میں تقسیم کریں گے تو شرکت کا یہ عقد شرکت وجوہ ہے۔

سابقہ تینوں صورتوں میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں:

الف۔ شرکت المقاضہ

ب۔ شرکت عنان

الف۔ شرکت المقاضہ:

ایسی شرکت جس میں ہر شریک کا سرمایہ، نفع اور ذمہ داری و حقوق وغیرہ سب برابر ہوں۔ یہ صورت شاذ و نادر پیش آتی ہے۔ اس میں ہر شریک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے اور کفیل بھی۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ اس قسم کی شرکت میں تمام

شرکاء تین بنیادی چیزوں میں برابر شریک ہوتے ہیں:

۱- مساواة في المال: یعنی تمام شرکاء کا سرمایہ برابر ہوگا۔

۲- مساواة في التصرف: تمام شرکاء کو برابر کام اور تصرف کا حق حاصل ہوگا۔

۳- مساواة في الربح: تمام شرکاء کا نفع بھی برابر ہوگا۔

چونکہ شرکتِ مفاوضہ میں ہر شریک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے اور کفیل بھی، اس لیے نتائج کے اعتبار سے اس قسم کے لیے مندرجہ ذیل دو ضابطے ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہیں:

• پہلا قاعدہ: كل شيء يلزم أحد المفاوضين بسبب كالتجارة والغصب والكفالة، يلزم الآخر

أيضا.

کسی ایک شریک پر جو بھی مال، کسی بھی سبب سے لازم ہوگا تو دوسرا شریک بھی اس مال کا برابر ذمہ دار ہوگا۔ مثلاً تجارت کی وجہ سے، غصب کی وجہ سے یا کفالہ وغیرہ کی وجہ سے کسی ایک پر مال لازم ہو جائے تو دوسرا بھی اس میں برابر شریک ہوگا۔ یہ قاعدہ شرکتِ مفاوضہ کے ضمن میں پیدا ہونے والے عقدِ کفالہ کا نتیجہ ہے۔

• دوسرا قاعدہ: كل شيء يثبت لأحد المفاوضين من التجارة وأمنالها، فللشريك المفاوض

المطالبة بها وقبضها.

تجارت وغیرہ کی وجہ سے اگر کسی ایک شریک کو کوئی مالی حق حاصل ہو جائے، (یعنی کسی دوسرے انسان پر کوئی مال لازم ہو جائے) تو دوسرا شریک بھی اس میں برابر حقدار ہوگا اور اسے بھی اس مالی حق کا مطالبہ اور قبضہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ یہ شرکتِ مفاوضہ کے ضمن میں پیدا ہونے والے عقدِ وکالہ کا نتیجہ ہے۔^(۱)

ب- شرکتِ عمان:

ایسی شرکت جس میں سرمایہ میں یا نفع یا حقوق وغیرہ میں شرکاء متفاوت اور ایک دوسرے سے مختلف ہوں، سب برابر نہ ہوں۔ اس میں ہر شریک دوسرے کا صرف وکیل ہوتا ہے۔^(۲)

شرکتِ عمان اور شرکتِ مفاوضہ میں بنیادی طور پر پانچ فرق ہیں:

۱- شرکتِ عمان میں تمام شرکاء کا سرمایہ برابر ہونا ضروری نہیں ہے، جبکہ شرکتِ مفاوضہ میں ضروری ہے۔

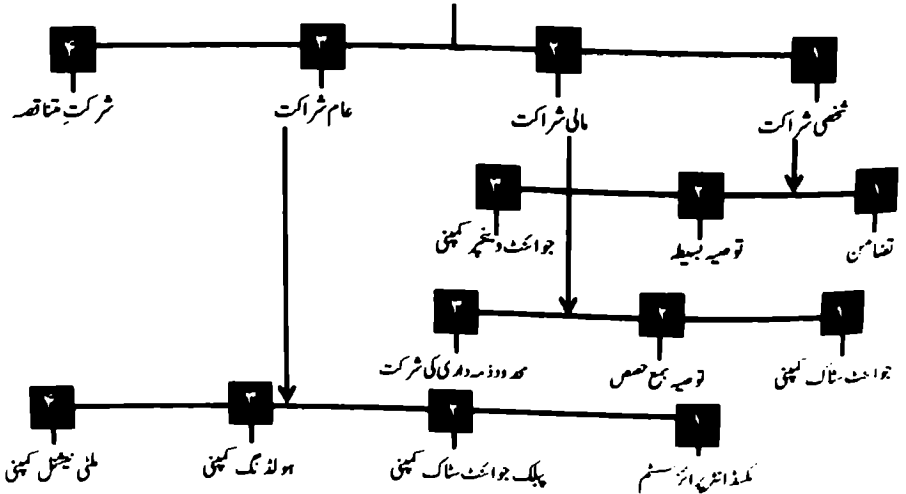
^(۱) درر الحکام فی شرح مجلة الأحکام ۳/۲۷۲

^(۲) بدائع الصنائع ۶/۵۷

- ۲۔ شرکتِ عنان میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر شریک اپنا تمام ایسا سرمایہ شرکت میں لگائے گا جو سرمایہ (امال) بننے کی صلاحیت رکھتا ہو، جبکہ شرکتِ مفاوضہ میں یہ ضروری ہوتا ہے۔
- ۳۔ شرکتِ عنان میں یہ جائز ہے کہ ہر شریک کا سرمایہ دوسرے شریک کے سرمایہ سے الگ جنس اور کم یا زیادہ قیمت کا ہو، جبکہ شرکتِ مفاوضہ میں یہ درست نہیں ہے۔
- ۴۔ شرکتِ عنان میں نفع کا تناسب برابر رکھنا ضروری نہیں ہے، جبکہ شرکتِ مفاوضہ میں یہ ضروری ہے۔
- ۵۔ شرکتِ عنان میں کاروبار کی کسی ایک قسم کو متعین کر کے صرف اسی پر شرکت کرنا جائز ہے، جبکہ شرکتِ مفاوضہ میں کسی ایک قسم کی شرکت کو خاص نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس میں ہر شریک ہر قسم کا کاروبار کر سکتا ہے۔^(۱)
- ۲۔ شرکت کی جدید اقسام:

عصر حاضر میں مختلف ناموں کے ساتھ شرکت کی جدید صورتیں وجود میں آئی ہیں، جن کا واضح تذکرہ فقہی کتابوں میں نہیں ملتا۔ ایسی کمپنیوں یا شرکت سے متعلق معاصر علماء نے عربی میں تفصیل سے لکھا ہے، یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ ان اقسام کی تفصیلات سے پہلے مندرجہ ذیل خاکہ ذہن میں رکھیں:

شرکت کی جدید اقسام



شرکت کی جدید اقسام کی تفصیل سے پہلے کچھ اصولی باتیں ذکر کرنا ضروری ہیں:

۱۔ پہلی بات: شرکت اور کمپنی میں فرق: کمپنی کی حقیقت کیا ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس بارے

میں اہل علم کی دو آراء ہیں:

۱- ایک رائے یہ ہے کہ کمپنی بھی درحقیقت شرکت ہی کی ایک قسم ہے۔ اس رائے کے علماء میں سے بعض کے ہاں کمپنی، شرکت العنان کی ایک صورت ہے، جبکہ بعض علماء کے ہاں کمپنی، شرکت کی ایک جدید قسم ہے، جو قدیم فقہاء کے زمانے میں رائج نہیں تھی، لیکن اس کے بنیادی خدوخال شرکت کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہیں۔ یہ رائے اکثر عرب علماء اور حضرات استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے اختیار کی ہے۔

۲- دوسری رائے یہ ہے کہ کمپنی اور شرکت میں ایک سے زیادہ فروق ہیں اور کمپنی کا بنیادی تصور شریعت کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اس اختلاف اور اس کے اسباب کے بارے میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی اور شرکت میں بڑے فقہی مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- شرکت میں ہر شریک کاروبار کے اثاثہ جات کا مالک ہوتا ہے، ہر شریک دوسرے کا وکیل اور کفیل (ذمہ دار) ہوتا ہے، لیکن کمپنی میں ایسا نہیں ہے۔ کمپنی کا اپنا مستقل وجود (شخص قانونی / شخص اعتباری) ہے اور وہ خود اپنے اثاثہ جات کی مالک ہے۔ اسی طرح شئیر ہولڈرز نہ ایک دوسرے کے وکیل ہیں، نہ کفیل ہیں، نہ کمپنی کسی شئیر ہولڈر کے لیے وکیل یا کفیل ہے۔ یہ فرق قانون میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

۲- شرکت کے کاروبار پر اگر کوئی شخص کوئی دعویٰ کرتا ہے تو ہر شریک مدعی علیہ ہوتا ہے، جبکہ کمپنی میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ کمپنی کا اپنا مستقل وجود ہے اور وہ خود مدعی علیہ ہوتی ہے، البتہ کمپنی کی نمائندگی انتظامیہ کرتی ہے۔

۳- شرکت ایک غیر لازم عقد ہے، لہذا کوئی بھی شریک کسی بھی وقت اپنا سرمایہ لے کر شرکت سے نکل سکتا ہے، لیکن کمپنی میں ایسا نہیں ہے، کوئی شئیر ہولڈر کمپنی سے اپنا سرمایہ لے کر نکل نہیں سکتا، البتہ شئیر آگے کسی اور کو فروخت کر سکتا ہے۔

۴- چوتھا فرق ”محدود ذمہ داری“ کا ہے۔ شرکت میں شرکاء کی ذمہ داری محدود نہیں ہوتی، بلکہ اگر کاروبار کے قرضے زیادہ ہوں تو شرکاء کے ذاتی اثاثہ جات سے بھی وصول کیے جاسکتے ہیں، جبکہ کمپنی میں شئیر ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے اور وہ صرف اپنے شئیر کی حد تک نقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

محدود ذمہ داری کا یہ مفہوم، پہلی رائے نے اہل علم نے بیان کیا ہے، جبکہ اولیٰ اہل علم نے قانون ماننے سے انکار کیا ہے۔ محدود ذمہ داری کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ: شئیر زہولڈرز، یعنی اے این (قانس ڈائریوں) نے ماننے باہل جی ذمہ داری نہیں ہیں، البتہ شئیر ہولڈرز، کمپنی کے سامنے صرف ان شئیر زلی حد تک ذمہ دار ہیں، جو انہوں نے خریدے اور ان کی قیمت ادا نہیں کی، لہذا وہ قیمت ادا کریں گے۔

دوسری رائے کے اہل علم کے ہاں سابقہ چاروں فروق اہم ہیں اور ان کی بنیاد پر یعنی اور شرائط میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ ان کے علاوہ دوسری رائے اختیار کرنے والوں کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱- شخص قانونی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے، کیونکہ اسلام میں شخصیت کے لیے ”ذمہ“ ضروری ہے اور کمپنی میں شخص بننے کے لیے ضروری چیز، ذمہ / اہلیت نہیں ہے۔

۲- شرکت اور کمپنی میں قانوناً بھی کئی فروق ہیں، مثلاً کمپنی خود اپنے اثاثہ جات کی مالک ہے، شئیر ہولڈرز مالک نہیں ہیں، جبکہ شرکت میں ہر شریک اپنے حق کی نسبت اثاثہ جات میں مالک ہوتا ہے۔

۳- قانون شرکاء کو ایک دوسرے کا وکیل، کفیل اور کاروبار میں ان کی شرکت کو شرکت ملک سمجھتا ہے، جبکہ کمپنی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

۴- کمپنی کو شخص قانونی ماننے اور شئیر ہولڈرز کی ذمہ داری کو محدود کرنے (ان کے بیان کردہ مفہوم کے مطابق) سے کئی مزید خرابیاں لازم آتی ہیں، جیسے سود وغیرہ، کیونکہ بغیر کسی رسک اور ذمہ داری کے کسی کو رقم دے کر اس پر نفع وصول کرنا سود کے زمرے میں آتا ہے۔

۵- شخص قانونی اور محدود ذمہ داری کے لیے پیش کی گئی مثالیں (وقف، بیت المال، عبد مازون) پر بھی ان حضرات نے کئی اعتراضات و شبہات ذکر کیے ہیں کہ وہ درست مثالیں نہیں ہیں۔

جہاں تک پہلی رائے والوں کی بات ہے تو ان فروق کو سامنے رکھ کر، ان کے ہاں صرف دو نکات قابل توجہ ہیں: ایک شخص قانونی کا تصور اور دوسرا محدود ذمہ داری کا تصور۔ جہاں تک بقیہ باتوں کا تعلق ہے تو ان کے ہاں یہ فقط انتظامی باتیں ہیں اور ان سے کمپنی کی بنیادی فقہی یا شرعی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہوں نے اپنے غور و فکر کے مطابق شخص قانونی کے تصور کی اجازت دی ہے اور اس کے لیے وقف، بیت المال وغیرہ جیسی مثالیں دی ہیں۔ اسی طرح محدود ذمہ داری کا جو مفہوم دوسری رائے کے اہل علم نے بیان کیا ہے وہ درست نہیں، کیونکہ شئیر زہولڈرز کوئی قسم کے رسک اور ذمہ داریاں برداشت کرتے ہیں اور اسی لیے ”رسک مینجمنٹ“ کا قاعدہ ایک فن کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ محدود ذمہ داری

۱۔ اسلامی فقہ میں بائعہ کے بیان کیا ہے، ان سے ہاں ان کی بھی احکام میں اجازت ہے اور ان سے یہ اجازت ہے کہ وہ بائعہ کی تجارت میں شامل دی ہے۔ اسی طرح بیعتی کے اثاثہ جات کا مالک وان ہے اس پر قانون میں بائعہ کی اجازت موجود ہے اور بعض مقامات پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ شفیق بولڈرز بیعتی کے اثاثہ جات کے مالک ہیں۔

۲۔ دوسری بات: پہلی رائے کے علماء کے ہاں چونکہ شرکت کا ایک بنیادی اصول ہے کہ شرکت کا جواز بیعت سابقہ ذکر کردہ اقسام میں منحصر نہیں ہے، بلکہ شرکت کی کوئی بھی صورت وجود میں آئے گی تو وہ جائز ہوگی، بشرطیکہ اس میں شرکت کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اس لیے آنے والی قسموں کا بھی یہی حکم ہے۔ چنانچہ آنے والی تفصیلات اسی رائے کے مطابق بیان کی گئی ہیں۔

۳۔ تیسری بات: شرکت کی جدید اقسام پر شرکت کے وہ تمام اصول لاگو ہوں گے جو آگے بیان کیے جائیں گے، خواہ اس کا تعلق نفع و نقصان کے ساتھ ہو یا اس المال (سرمایہ) سے متعلق ہو یا دیگر احکام، مثلاً ان کاروبار / کمپنیوں کا اصل کام حرام نہ ہو، ان کا بنیادی نفع سودی نہ ہو وغیرہ۔

۴۔ چوتھی بات: شرکت کی جدید اقسام کو مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کر کے لکھا جا رہا ہے، لہذا مزید تفصیلات کے لیے ان کتب کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہیں:

۱۔ قرارات مجمع الفقہ اسلامی:

[قرار رقم ۱۳۰، ۱۴/۴، بشأن الشركات الحديثة: الشركات القابضة وغيرها وأحكامها الشرعية]

۲۔ المعايير الشرعية:

[ص: ۱۱۵، المعيار الشرعي رقم (۱۲) الشركة (المشاركة) والشركات الحديثة]

۳۔ الفقہ المیسر [لجنة العلماء ۱۶۲/۶]

شرکت کی جدید صورتوں کو مندرجہ ذیل چار اقسام میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ شخصی شرکت

۲۔ مالی شرکت

۳۔ عام شرکت

۴۔ شرکت تناقصہ

۱۔ شخصی شراکت:

یہ عام چھوٹے موٹے شراکتی کاروبار کو کہتے ہیں جس کا وجود ایسے شراکت داروں کے افراد پر مبنی ہوتا ہے جو ایک دوسرے کو جانتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے پر بھروسہ کرتا ہے۔ اس کو انگریزی میں (partnership) یا (firms) کہہ سکتے ہیں۔

اس طرح کے شخصی شراکت کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے:

الف۔ شرکت تضامن

ب۔ شرکت توصیہ بسیط

ج۔ جوائنٹ وینچر کمپنی

الف۔ شرکت تضامن:

یہ ایک ایسی شرکت ہے جو دو یا دو سے زیادہ افراد کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے اور تمام شرکاء اپنا سرمایہ بانٹ دیتے ہیں۔ اس شرکت کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس کو قانونی شخصیت (juristic personality) کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ دوسری خاصیت یہ ہے کہ تمام شرکاء، کاروبار کے قرض خواہوں کے سامنے ذاتی طور پر اور مشترکہ طور پر اپنے تمام نجی فنڈز کے ذمہ دار ہوں گے، یعنی اگر کاروبار / کمپنی تحلیل ہو جائے اور کاروبار کے اثاثے اس کے واجبات اور قرض سے کم پڑ جائے تو تمام شرکاء پر لازم ہوتا ہے کہ وہ ان واجبات کو اپنے ذاتی مال سے ادا کریں۔ اس کو عربی میں "شركة التضامن" اور انگریزی میں (joint-liability company) کہتے ہیں۔

ب۔ شرکت توصیہ بسیط:

ایک ایسی شراکت یا کمپنی جس میں دو قسم کے شرکاء شامل ہوتے ہیں: ایک انتظامی معاملات چلانے والے شرکاء اور دوسرے خارجی شرکاء جو انتظامی معاملات میں کسی بھی طرح دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ اس میں خارجی شرکاء کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے، یعنی اگر کمپنی تحلیل ہوتی ہے تو خارجی شرکاء صرف کمپنی میں موجود ان کے حصوں تک ذمہ دار ہوں گے، کمپنی کے واجبات کے لیے خارجی شرکاء کے ذاتی اموال کی طرف تجاوز نہیں کیا جاتا، البتہ انتظامی شرکاء کے ذاتی مال سے واجبات ادا کیے جائیں گے۔ اس میں شرکاء کا سرمایہ برابر نہیں ہوتا، بلکہ کم اور زیادہ ہو سکتا ہے۔ اس کو انگریزی میں (special/limited partnership) یا (partnership in commendum) کہتے ہیں۔

ج۔ جوائنٹ ونچر کمپنی:

یہ ایک ایسی شراکت ہے جو شرکاء کے علاوہ بقیہ لوگوں سے پوشیدہ ہوتی ہے اور شراکت / کمپنی کی قانونی شخصیت بھی نہیں ہوتی۔ یہ شرکت دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان وجود میں آتی ہے، جن میں سے ہر ایک کا شرکت میں معلوم سرمایہ ہوتا ہے اور نفع و نقصان بھی طے شدہ ہوتا ہے۔ اس میں ہر ایک کی ذمہ داری بھی صرف شرکت میں اس کے حصہ تک محدود ہوتی ہے۔ اس کو عربی میں ”شركة المحاصة“ اور انگریزی میں (particular partnership) یا (joint venture) کہتے ہیں۔

۲۔ مالی شراکت:

شرکت کی جدید اقسام میں سے دوسری قسم کو عربی ”شركات الاموال“ کہتے ہیں، جس کو انگریزی میں (corporations) کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایسے شراکت / کمپنی کو کہتے ہیں جس کا وجود، تشکیل و انتظام صرف اور صرف شرکاء کے سرمایہ پر منحصر ہوتا ہے، اس میں شرکاء کی آزادانہ شخصیت کو نہیں دیکھا جاتا۔ اس طرح کی شرکت کا باقاعدہ قانونی وجود اور شخصیت ہوتی ہے اور ان کے حصص (shares) اسٹاک مارکیٹ میں قابل تبادلہ ہوتے ہیں۔

اس قسم کی شرکت کی تین قسمیں ہیں:

الف۔ جوائنٹ سٹاک کمپنی

ب۔ توصیہ بمع حصص

ج۔ محدود ذمہ داری کی شرکت

الف۔ جوائنٹ سٹاک کمپنی:

یہ کمپنی یا شرکت کی ایک مشہور قسم ہے جس کو عربی میں ”شركة المساهمة“ اور انگریزی میں (joint stock company) کہتے ہیں۔ یہ ایسی شرکت یا کمپنی کو کہتے ہیں جس کے سرمایہ کو مختلف برابر برابر حصوں اور اٹالیوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے، جن کو (shares) کہتے ہیں۔ ان حصص کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور جو لوگ یہ حصص خریدتے ہیں وہ کمپنی میں حصص کے تناسب سے شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ فقہ کی قدیم شرکت کی قسم ”شرکت عنان“ جتنی ایک قسم ہے، تاہم اس میں شرکاء کی ذمہ داری صرف ان کے حصص کی حد تک محدود ہوتی ہے اور شرکاء کو کسی بھی وقت شرکت ختم کرنے کی کمپنی سے اپنا سرمایہ واپس لینے کا حق نہیں ہوتا، البتہ شئیرز کو کسی اور جگہ فروخت کیا جاسکتا ہے۔^(۱)

^(۱) شئیرز کی خرید و فروخت اور دیگر احکام کے لیے دیکھیں: فقہ البیوع ۱/۳۶۵، و تجارتی کمپنیوں کا لائحہ عمل، ص: ۵۹، ۶۱۔

ب۔ توصیہ بمع حصص:

یہ ایسی شرکت / کمپنی ہے جس کا وجود قابل تبادلہ حصص پر مشتمل ہوتا ہے، اور اس میں دو قسم کے شراکت دار ہوتے ہیں: ذمہ دار شراکت دار، جو کمپنی کے قرضوں کے لیے مکمل طور پر ذمہ دار ہوتے ہیں اور ان کی ذمہ داری محدود نہیں ہوتی۔ دوسرے محدود شراکت دار، جن کی ذمہ داری ان کے حصص کی حد تک محدود ہوتی ہے۔ اس کو عربی میں ”شركة التوصية بالأسهم“ اور انگریزی میں (partnership limited by shares) کہتے ہیں۔

ج۔ محدود ذمہ داری کی شرکت:

یہ بھی مالی شراکت کی ایک قسم ہے۔ اس میں شرکت / کمپنی کا مکمل سرمایہ چند محدود شراکت داروں کی ملکیت میں ہوتا ہے اور شرکاء ایک خاص تعداد سے تجاوز نہیں کرتے اور یہ محدود تعداد مختلف قوانین کے مطابق مختلف ہوتی ہے۔ اس میں شراکت داروں کی ذمہ داری ہر ایک کے حصے کی مقدار تک اور محدود ہوتی ہے، لیکن اس کے حصص قابل تبادلہ نہیں ہوتے۔ اس کو عربی میں ”الشركة ذات المسؤولية المحدودة“ اور انگریزی میں (liability limited company) کہتے ہیں۔

۳۔ عام شراکت:

شرکت کی جدید اقسام کی تیسری قسم ”الشركات العامة“ ہے جس کو انگریزی میں (general partnership) کہتے ہیں۔ یہ وہ کمپنیاں ہیں جن میں عوامی سرمائے کو نجی سرمایہ کے ساتھ بانٹ دیا جاتا ہے، تاکہ عوامی مفاد اور انفرادی مفاد دونوں کا ساتھ ساتھ خیال کیا جاسکے، اور ایسا بھی ممکن ہے کہ ریاست یا کوئی سرکاری ادارہ اس کے تمام حصص کا مالک ہو۔

اس قسم میں مندرجہ ذیل اقسام داخل ہیں:

الف۔ مکسڈ انٹریز سسٹم:

یہ بھی درحقیقت جائنٹ سٹاک کمپنی ہی کی ایک قسم ہے جس کا وجود اسی طرح کے مراحل کے بعد مکمل ہوتا ہے اور اس پر جائنٹ سٹاک کمپنی کے ہی قوانین لاگو ہوتے ہیں، تاہم اس کے انتظامات اور سرمایہ عوام اور بڑے اداروں کے درمیان مشترک ہوتا ہے۔ اس کو عربی میں ”الشركة الاقتصادية المختلط“ اور کو انگریزی میں (mixed enterprise system) کہتے ہیں۔

ب۔ پبلک جوائنٹ سٹاک کمپنی:

یہ وہ کمپنیاں ہیں جو نیشنلائزیشن کے عمل کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں۔ اس قسم کی کمپنیاں عموماً حکومت یا کسی بڑے ادارے کی ملکیت ہوتی ہیں۔ اس کو عربی ”الشركة المساهمة العامة“ اور انگریزی میں (public joint stock company) کہتے ہیں۔

ج۔ ہولڈنگ کمپنی:

یہ وہ کمپنی ہے جو کسی دوسری کمپنی کے سرمایہ اور شیئرز کی مالک ہوتی ہے اور ایسی کمپنی کو قانونی طور پر دوسری کمپنی کے انتظامات اور اس کے عمومی منصوبوں کو تیار کرنے میں دخل اندازی کا حق و قوت حاصل ہوتی ہے۔ ایسی کمپنی کو عربی میں ”الشركة القابضة“ اور انگریزی میں (holding company) کہتے ہیں۔

د۔ ملٹی نیشنل کمپنی:

یہ ایک ایسی کمپنی ہے جو ماتحت کمپنیوں کے ایک گروپ پر مشتمل ہوتی ہے، جس کا اصل مرکز ایک ہی ملک میں واقع ہوتا ہے، جبکہ اس کے ذیلی ادارے مختلف دوسرے ممالک میں کام کرتے ہیں، اور وہ اکثر اسی ملک کی شناخت حاصل کرتے ہیں۔ ایسی کمپنی کا اصل مرکز اپنے ماتحت کمپنیوں کے ساتھ مربوط اقتصادی حکمت عملی کے ذریعے منسلک ہوتا ہے جس کا مقصد سرمایہ کاری کے مخصوص اہداف کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کو عربی میں ”الشركة متعددة الجنسيات“ اور انگریزی میں (multinational corporation/company) کہتے ہیں۔

۴۔ شرکت متناقصہ:

شرکت کی جدید صورتوں میں سے ایک اہم صورت ”شرکت متناقصہ“ کی ہے، جس کو عموماً اسلامی بینکوں میں بائس فنانسنگ کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کو انگریزی میں (diminishing musharakah) کہتے ہیں۔ اس طریقہ کار میں بنیادی طور پر مندرجہ ذیل تین معاملات وجود میں آتے ہیں:

۱۔ شرکت ملک: سب سے پہلے دو آدمی (مثلاً اسلامی بینک اور کلائنٹ) مشترکہ رقم سے ایک مکان خریدتے

تھا۔ وہ مکان وہاں میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہی شرکت ملک ہے۔

۲۔ پچھلے شریک (بینک) کا مکان میں جتنا حصہ ہے، اس حصے کو مختلف یونٹس میں تقسیم کیا جاتا ہے

اور وہ شریک (کلائنٹ) مختلف اوقات میں پہلے شریک کے حصے کا ایک ایک یونٹ خریدتا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں

دوسرے شریک کا حصہ مکان میں بڑھتا جاتا ہے اور پہلے شریک کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے۔ بالآخر دوسرا شریک (کلائنٹ) پہلے

شریک کا مکمل حصہ خرید لیتا ہے۔

۳۔ اجارہ: پہلے شریک (بینک) کے حصے کے جتنے یونٹس ابھی تک دوسرے شریک (کلائنٹ) نے نہیں خریدے، ان حصوں کو دوسرا شریک اپنے استعمال میں لاتا ہے اور اس کے بدلے پہلے شریک کو کرایہ ادا کرتا ہے، لیکن یونٹس کی خریداری کی وجہ سے پہلے شریک کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے، اس لیے کرایہ میں بھی اسی تناسب سے رفتہ رفتہ کمی ہوتی رہتی ہے۔

جب دوسرا شریک، پہلے شریک کا حصہ مکمل خرید لیتا ہے تو شرکت متناقصہ کا یہ عقد مکمل ہو جاتا ہے۔ اس میں چونکہ پہلے شریک کا حصہ، دوسرے شریک کی خریداری کی وجہ سے رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے، اس لیے اس کو ”متناقصہ“ کہتے ہیں۔^(۱)

معايير شرعية میں ہے:

۵- المشاركة المتناقضة:

۱/۵ المشاركة المتناقضة عبارة عن شركة يتعهد فيها أحد الشركاء بشراء حصة الآخر تدريجياً إلى أن يتملك المشتري المشروع بكامله. وإن هذه العملية تتكون من الشركة في أول الأمر، ثم البيع والشراء بين الشريكين، ولا بد أن تكون الشركة غير مشترط فيها البيع والشراء، وإنما يتعهد الشريك بذلك بوعده منفصل عن الشركة، وكذلك يقع البيع والشراء بعقد منفصل عن الشركة، ولا يجوز أن يشترط أحد العقدين في الآخر.^(۲)

شرکت متناقصہ:

یہ ایسی شرکت ہے جس میں ایک شریک دوسرے شریک کا حصہ تدریجاً خریدنے کا عہد کرتا ہے، یہاں تک کہ پورے پروجیکٹ کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ اس شرط پر جائز ہے کہ شرکت کے بنیادی معاہدے میں خرید و فروخت کی شرط نہ پائی جائے، بلکہ شرکت سے ہٹ کر الگ اس کا وعدہ کیا جائے۔ اسی طرح حصص کی خرید و فروخت شرکت سے الگ ہوگی اور کسی ایک معاہدہ کی دوسرے

۱۔ ابن عثیمہ، ص ۱۵۰ - شرکت متناقصہ ہے جمع الفقہاء (۱) سلاوی کی اس قرارداد کا مطالعہ مفید رہے گا: قرارات ونوصیات مجمع الفقہ الاسلامی التابع لمحللة الموندر الإسلامی ۱ - ۱۷۴ (ص ۲۱۲) قرار رقم: ۱۲۲ (۱۳/۴) بشأن موضوع المشاركة المتناقضة في س.و.ت. عقود المستعدة

۲۔ المعايير الشرعية ص ۱۲۸، رقم المعيار ۱۲

میں شرط لگانا بھی جائز نہیں ہے۔

۳۔ شرکتِ اباحت کے احکام

اس دنیا کی کچھ چیزیں ایسی ہیں جو شریعت کی نظر میں مباح عام ہیں۔ ہر ایک کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو اپنی ملکیت میں لائے۔ ایک حدیث میں یوں آتا ہے:

المُسْلِمُونَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ: فِي الْمَاءِ وَالْكَلْبِ وَالنَّارِ. ^(۱)

تمام مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں: پانی، گھاس اور آگ میں۔

اس کے علاوہ قرآنی آیت: {أَجَلٌ لَّكُمْ صَيِّدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ} ^(۲) سے شکار اور دیگر احادیث

سے معادن کا مباح ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس کو فقہاء ”شرکتِ اباحت“ کے تحت بیان کرتے ہیں۔ ایسی چیزوں میں شکار، پانی، گھاس، آگ اور معادن و دھنیے شامل ہیں، لیکن ان کے کچھ خاص اصول و ضوابط ہیں۔ یہاں ہر ایک کی مختصر سی وضاحت مطلوب ہے۔ ایسی مباح چیزیں پانچ ہیں:

- | | | |
|---------|--------------------|---------|
| ۱۔ شکار | ۲۔ پانی | ۳۔ گھاس |
| ۴۔ آگ | ۵۔ معادن اور دھنیے | |

۱۔ شکار:

شکار سے متعلق درج ذیل تین نکات سمجھنا ضروری ہیں:

۱۔ تعریف

۲۔ شرائط

۳۔ شکار کا پیشہ

۱۔ تعریف:

هُوَ الْحَيَوَانُ الْبَرِّيُّ الْمَتَوَحَّشُ أَيُّ الَّذِي يَخَافُ وَيَنْدَعِرُ مِنَ الْإِنْسَانِ ^(۳)

۱۔ سنن ابی داؤد ۳/۲۹۵، حدیث نمبر ۳۵۱۹

^(۲) المائدہ: ۹۶

^(۳) محللۃ الأحکام العدلیۃ، ص ۲۵۱ (المائدہ: ۱۲۹۳)

خشکی کا وہ جانور جو متوحش ہو، یعنی جو انسان سے ڈرتا اور اس سے نالوس ہو۔

فقہاء کی بیان کردہ توضیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ”صيد“ یا شکار وہ جانور ہے یا اس جانور کا شکار کرنا جائز ہے، جس میں درج ذیل تین صفات پائی جائیں:

۱۔ وہ نالوس جانور جو انسان سے ڈرتا ہو اور اپنے پنجوں یا پاؤں سے اپنی حفاظت کرتا ہو۔

۲۔ اسے بغیر کسی حیلہ (مثلاً جال وغیرہ) کے پکڑنا ممکن نہ ہو۔ اگر اسے آسانی سے پکڑنا ممکن ہے تو تیر یا بندوق وغیرہ سے شکار کے بجائے اسے شرعی طریقے سے ذبح کرنا ضروری ہے۔

۳۔ ایسا جانور ہو جو کسی کی ذاتی ملکیت میں نہ ہو۔^(۱)

لہذا جس جانور میں درج بالا صفات پائی جائیں اس کا شکار حلال ہے، خواہ وہ بحری جانور ہو، خشکی کا ہو یا پرندوں میں سے ہو، اور خواہ کسی مباح زمین و جنگل میں شکار کیا جائے یا کسی کی ذاتی زمین میں، تاہم کسی کی ذاتی زمین میں مالک کی اجازت کے بغیر داخل ہونا درست نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا جانور ہے جس کا گوشت حلال ہے تو ایسے جانور کا شکار اور اس کا گوشت دونوں حلال ہیں، اور اگر اس کا گوشت حلال نہیں ہے تو اس کا شکار جائز ہے، لیکن اس کا کھانا حلال نہیں ہے، تاہم اسے شرعی طریقے کے مطابق ذبح کر کے یا اس کے چمڑے کو دباغت دے کر خارجی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

۲۔ شرائط:

اس سلسلے میں فقہاء نے شکار کرنے والے شخص، شکار کے جانور اور شکار کے آلہ میں سے ہر ایک کے لیے الگ

شرائط بیان کی ہیں۔ یہاں صرف اہم شرائط پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

۱۔ شکار کرنے والا مسلمان یا اہل کتاب میں سے ہو۔

۲۔ شکار کرنے والا حالت احرام میں نہ ہو۔

۳۔ حرم کی حدود کے اندر جانور کا شکار جائز نہیں ہے۔

۴۔ تیر پھینکتے ہوئے یا کتا وغیرہ شکار پر چھوڑتے ہوئے بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے۔

۵۔ اگر شکار کو زندہ پکڑ لیا تو اسے شرعی طریقے کے مطابق ذبح کرنا ضروری ہے۔

۶۔ کسی تیز اور دھاری دھار آلہ کو استعمال کیا جائے۔ ورنہ شکار کو بہر صورت ذبح کرنا ہوگا۔

۷۔ اگر جال کے ذریعے شکار کیا اور جانور پکڑا جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جال کو شکار ہی کی نیت سے

بچھایا ہو۔ اگر کسی نے جال کو محض خشک کرنے کے لیے بچھایا، جس میں جانور آکر پھنس گیا تو محض پھنسنے سے جانور کو چھڑایا ہو۔ والے کی ملکیت میں داخل نہ ہوگا، بلکہ اسے باقاعدہ ہاتھوں سے پکڑنا ہوگا، اگر اس سے پہلے کسی اور نے جال سے جانور کو پکڑ لیا تو وہی مالک ہوگا۔^(۱)

۳۔ شکار کا پیشہ:

بعض فقہاء حنفیہ نے لکھا ہے کہ شکار کو بطور پیشہ اختیار کرنا ممنوع و مکروہ ہے، لیکن علامہ خضکی اور علامہ شامی وغیرہما نے اس پر رد کر کے لکھا ہے کہ شکار کا پیشہ جائز ہے۔ جواز کی وجہ یہ ہے کہ:

- ۱۔ کسبِ حلال کا طریقہ اگر شرعاً جائز ہے تو کسب بھی جائز ہوتا ہے اور شکار کرنا ایک نوع کا کسبِ حلال ہی ہے، اس لیے یہ بھی جائز ہے۔
- ۲۔ کسبِ حلال کا ہر طریقہ ایسا ہے کہ انسان اس کو کبھی ضرورت و حاجت کے موقع پر اپناتا ہے اور کبھی اس کو بطور پیشہ اختیار کر لیتا ہے اور یہ دونوں صورتیں شرعاً جائز ہیں، لہذا شکار میں بھی یہ دونوں صورتیں (بوقتِ حاجت اور بطور پیشہ) جائز ہیں۔

۳۔ کراہت ایک شرعی حکم ہے جس کا فیصلہ بغیر کسی دلیل کے نہیں کیا جاسکتا، جبکہ شکار کے پیشہ کی کراہت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔^(۲)

۴۔ پانی:

پانی بھی شریعت کی نظر میں مباح عام ہے اور اس میں ہر شخص شریک ہے۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ پانی استعمال کرے اور اسے اپنی ملکیت میں لائے، لیکن یہاں دو باتوں کی وضاحت نہایت ضروری ہے:

- ۱۔ پہلی بات یہ کہ پانی میں ہر فرد کی شرکت سے کیا مراد ہے؟
 - ۲۔ دوسری بات یہ کہ پانی کئی قسم کا ہوتا ہے، یہاں کونسا پانی مراد ہے؟
- ۱۔ پانی میں شرکت کی اقسام:

جہاں تک پہلی بات کا تعلق تو اس سلسلے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ پانی میں شرکت کی دو قسمیں ہیں:

- ۱۔ شخص کو پانی پینے، اس سے وضوء کرنے اور غسل کے لیے استعمال کرنے، کپڑے دھونے اور جانوروں کو

پانے کے لیے لے جانے کا حق حاصل ہو۔ اسے ”شركة في حق الشفة“ کہتے ہیں۔

۲۔ دوسری قسم کو ”شركة في الشرب“ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نہروں کے ذریعے زمین پر پانی لے کر لینے کے لیے مالک زمین کو باری کا حق حاصل ہو۔^(۱)

۳۔ پانی کی قسمیں:

اب ہم دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے پانی میں بہاؤ اور نالہ بالاشرکت کی دونوں قسموں میں سے کس قسم کی شرکت حاصل ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ پانی کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ پہلی قسم دریاؤں، سمندروں اور غیر مملوکہ نہروں کے پانی کی ہے۔ اس میں ہر فرد کو دونوں قسم کی شرکت کا حق حاصل ہوتا ہے، ”حق شفة“ بھی اور ”حق شرب“ بھی۔ یعنی اس سے پینا، پلانا، زمین کو سیراب کرنا وغیرہ ہر شخص کے لیے جائز ہے۔

۲۔ دوسری قسم سے مراد وہ پانی ہے جو ذاتی اور مملوکہ برتنوں میں رکھا ہوا ہو، گھروں کے ٹنکیوں میں یا کسی اور چیز میں محفوظ کیا ہوا ہو۔ یہ پانی محرز یعنی اسی شخص کی ملکیت ہے جس نے اسے محفوظ کیا ہے۔ کسی اور کے لیے ایسے پانی کو اضطراری حالت کے بغیر کسی بھی طرح استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ تیسری قسم میں کنویں کا پانی، حوض، چشموں اور قناتوں کا پانی داخل ہے۔ اس قسم کے پانی میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض شوافع کے ہاں یہ بھی دوسری قسم کی طرح مملوکہ ہی ہے، جبکہ حنفیہ اور اکثر شوافع کے ہاں یہ پانی محض حق ہے، ملک نہیں ہے۔

حق ہونے اور ملک نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کا کنواں، چشمہ یا قنات ہے وہ اس پانی کا سب سے پہلا حقدار ہے، لیکن اس پر لازم ہے کہ اس کی ضرورت سے جو پانی زیادہ ہے وہ لوگوں کو پینے کے لیے دے۔ مالک کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی زمین میں داخل ہونے سے روکے، لیکن اگر وہاں آس پاس پانی نہ ملے تو پھر مالک پر لازم ہوگا کہ یا تو خود پانی اپنی زمین سے باہر نکال کر لوگوں کے حوالے کر دے یا لوگوں کو اپنی زمین میں داخل ہونے کی اجازت دے دے۔ واضح رہے کہ اس قسم میں لوگوں کو صرف ”حق شفة“ حاصل ہے، ”حق شرب“ حاصل نہیں ہے۔^(۲)

^(۱) معلة الأحكام العدلیة، ص: ۲۴۲ (المأذة: ۱۲۶۳)

^(۲) حوالہ بالا ص: ۲۴۳ (المأذة: ۱۲۶۵) و (المأذة: ۱۲۶۶) و (المأذة: ۱۲۶۷)

اسی قسم میں آج کل کے ٹیوب ویل کا پانی بھی داخل ہے، ایسے پانی کا زیادہ حقدار ٹیوب ویل کا مالک ہے۔ اس لئے لوگوں کو اس میں حق خشف حاصل ہے۔ البتہ اگر آس پاس پانی موجود ہے تو مالک عام لوگوں کو اپنی زمین میں داخل کرنے سے روک سکتا ہے۔

۳۔ گھاس:

گھاس بھی مباح عام اشیاء میں داخل ہے، تاہم اس کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کا حکم الگ ہے:

۱۔ کسی غیر مملوکہ زمین میں خود بخود اگنے والی گھاس میں تمام لوگ شریک ہیں۔ ہر شخص ایسی گھاس اپنے جانور کو کھلا سکتا ہے، کاٹ کر اپنی ملکیت میں بھی لاسکتا ہے، تاہم کاٹنے اور محفوظ کرنے سے پہلے اس کی بیع جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بیع غیر مملوکہ ہے۔ اس میں فقہاء کا اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ وہ خود رو گھاس جو خود بخود، مالک زمین کے عمل کرنے اور سبب بننے کے بغیر ہی کسی کی مملوکہ زمین میں اگ آئے۔ ایسی گھاس میں فقہاء کا اختلاف ہے:

شوافع اور امام احمد کی ایک روایت کے مطابق یہ گھاس مالک زمین ہی کی ملکیت ہے۔ جبکہ مالکیہ کے ہاں اگر مالک زمین نے اس گھاس کی حفاظت کے لیے کوئی باڑ وغیرہ لگائی ہو تو وہ اس کا مالک ہے، ورنہ نہیں۔^(۱)

حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں ایسی گھاس مباح عام ہے، البتہ مالک زمین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنی زمین میں داخل ہونے سے روکے، لیکن اگر وہاں آس پاس مباح گھاس نہ ملے اور لوگوں کو ضرورت ہو تو مالک زمین پر لازم ہو گا کہ لوگوں کو زمین میں داخل ہونے کی اجازت دے دے یا گھاس کاٹ کر ان کے حوالے کر دے۔ اگر مالک زمین نے ایسی گھاس کاٹ کر خود محفوظ کر لی تو اب وہ اس گھاس کا مالک ہو جائے گا۔

۳۔ تیسری قسم ”مملوکہ“ گھاس کی ہے جو صرف مالک ہی کا حق ہے، اس میں دوسرے لوگ شریک نہیں ہوتے۔ اس میں دو قسم کی گھاس داخل ہے:

الف۔ کسی نے اپنی مملوکہ زمین میں یوں عمل کر کے گھاس اگائی کہ اس کو خود ہی زمین میں لگا دیا یا اس کے اگنے کا سبب بنا۔ سبب بننے کا مطلب یہ ہے کہ آس پاس لگا کر گھاس کو پانی دیتا رہا اور اس کی حفاظت کرتا رہا۔

ب۔ وہ گھاس جس کو کسی نے مباح مقام سے کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا ہو۔ پہلی قسم میں گھاس کا مالک، مالک

زمین: دو کا اور دوسری قسم میں گھاس کاٹ کر محفوظ کرنے والا مالک: دو کا۔

آج کل مملوکہ زمین کے مالک اپنی زمین میں خود بخود اگنے والی گھاس کو فروخت کرتے ہیں، حالانکہ فقہاء حنفیہ سے ہاں ایسی گھاس مباح عام ہے جس کو بیچنا بیع غیر مملوکہ میں داخل ہو کر ناجائز ہے، تاہم اس کے متبادل جائز صورتیں درج ذیل دو ہو سکتی ہیں:

۱۔ مالک زمین گھاس خود کاٹ کر فروخت کر دے۔

۲۔ یا گھاس کی بیع کے بجائے، زمین کے جس حصہ میں گھاس ہے وہ حصہ گھاس کے خریدار کو چند دنوں کے لیے کرایہ پر دے دیا جائے جن میں وہ گھاس کاٹ سکے اور کرایہ جتنا چاہے طے کر سکتے ہیں۔^(۱)

۳۔ آگ:

حدیث میں آیا ہے کہ آگ میں تمام مسلمان شریک ہیں۔ یہاں آگ سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد محض آگ کی روشنائی اور تپش میں شریک ہونا ہے، لہذا آگ جس نے بھی جلائی ہو، سب اس کی روشنی اور تپش سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ آگ سے مراد جنگلات اور غیر مملوکہ زمینوں کی لکڑیاں ہیں، جن کو ہر فرد کاٹ کر اپنی ملکیت میں لاسکتا ہے اور اس سے آگ بھی جلا سکتا ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ آگ سے مراد آگ جلانے والے وہ پتھر ہیں جو کسی مباح اور غیر مملوکہ زمین میں ملتے ہیں، لہذا ہر فرد ایسے پتھروں کو حاصل کر سکتا ہے۔

علامہ شامی نے اس سلسلے میں جو جامع خلاصہ ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک شخص نے کسی مباح اور غیر مملوکہ زمین میں آگ جلائی۔ ایسی آگ سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے۔ اس کی حرارت اور تپش سے فائدہ حاصل کرے، وہاں کپڑے خشک کرے، آگ کی روشنی میں کوئی کام کرے یا اس آگ سے کوئی چراغ وغیرہ جلائے۔ آگ جلانے والا لوگوں کو منع نہیں کر سکتا، تاہم عام لوگوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ایسی آگ کی لکڑی یا انگارہ اٹھا کر لے جائے۔

۲۔ کسی نے اپنی مملوکہ زمین میں آگ جلائی تو مالک زمین عام لوگوں کو اپنی زمین میں داخل ہونے سے روک سکتا ہے، جہاں تک آگ سے استفادہ کی بات ہے تو مجملہ الاحکام العدلیہ میں لکھا ہے کہ مالک زمین ایسی آگ کے انتفاع سے

معادن اور دفتینوں کے احکام میں فقہاء کے تفصیلی اختلافات موجود ہیں، یہاں صرف فقہاء حنفیہ کی رائے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں ”معادن“ (جو مخلوق فی الارض ہو) کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ معادن جو جامد ہیں، لیکن آگ یا کسی اور چیز کے ذریعے پگھلانے سے پگھل جائے۔ جیسے سونا، چاندی، لوہا، پتیل وغیرہ۔ ایسے معادن اگر کسی غیر مملوکہ زمین میں مل جائے تو اس کا خمس (پانچواں حصہ) بیت المال میں جمع کر کے بقیہ حصہ اس کا ہوگا جس کو ملا ہے۔ اگر کسی کی مملوکہ زمین میں نکل آئے تو اس میں بھی خمس اداء کر کے بقیہ حصہ مالک زمین کا ہوگا۔

۲۔ وہ معادن جو سیال اور مائع ہیں، جیسے پانی، پٹرول وغیرہ۔

۳۔ وہ معادن جو درج بالا دونوں قسموں کے علاوہ ہے، جیسے یاقوت، شیشہ، قیمتی پتھر وغیرہ۔ آخری دونوں قسموں کا حکم یہ ہے کہ ان میں کوئی خمس نہیں ہے، بلکہ سارا مال اس شخص کو ملے گا جس کو ملا ہے۔

جہاں تک ”کنوز“ کا تعلق ہے، جس کو بنی آدم میں سے کسی نے زمین میں دفن کیا ہو تو ان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اگر وہ کسی ایسی زمین میں مل جائے جو غیر مملوکہ ہو تو اگر اس خزانہ پر اسلام و مسلمانوں کی کوئی علامت موجود ہو تو یہ لفظ کے حکم میں ہے، اور اگر اس پر کفر اور جاہلیت کی کوئی علامت موجود ہو تو اس میں سے خمس اداء کر کے بقیہ سارا واجد (جس کو ملا ہے) اس کا ہوگا۔

۲۔ کسی کی مملوکہ زمین میں ایسا خزانہ مل جائے تو اس میں سے بھی خمس اداء کرنا ہوگا، بقیہ خزانہ کس کا ہوگا؟ امام ابو حنیفہ اور امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ بقیہ حصہ مالک زمین کا ہوگا، جبکہ امام ابو یوسفؒ کی رائے میں بقیہ حصہ واجد (جس کو ملا ہے) اس کا ہوگا۔ حنفیہ کے ہاں امام ابو یوسفؒ کی رائے مفتی بہ ہے۔^(۱)

۵۔ شرکت ملک کے اصول

۱۔ شرکت ملک میں تمام شرکاء کے ملکیاتی حقوق بقدر حصہ اور بقدر ملک ہوں گے۔ اسی طرح شرکت ملک سے حاصل ہونے والا نفع بھی سب کو ان کے حصوں کے بقدر ملتا ہے۔ اگر نقصان ہو گیا تو وہ بھی ہر ایک اپنے حصے کے تناسب سے برداشت کرے گا۔

۲۔ شرکت ملک میں ہر شریک دوسرے کے حصے میں اجنبی کی طرح ہوتا ہے۔ لہذا کوئی شریک دوسرے کی اجازت کے بغیر اس کے حصے میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔

۳۔ مشترکہ ملکیت سے استفادہ کے تین طریقے ہیں: مہایاۃ: یعنی باری مقرر کرے۔ تقسیم: یعنی الگ الگ حصے کر دیے جائیں، یا مشترکہ طور پر استعمال کیا جائے۔

۴۔ شرکت ملک میں اپنے شریک کو اپنا حصہ بیچنا اور اجارہ پر دینا جائز ہے۔ شریک کے علاوہ کسی اور کو اپنا حصہ تقسیم سے پہلے اجارہ پر دینا حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں درست نہیں ہے، جبکہ فقہاء شافعیہ اور مالکیہ کے ہاں درست ہے۔ البتہ کسی اجنبی کو اپنا حصہ بیچنا جائز ہے، تقسیم کے بعد خریدار کو حصہ حوالے کر دیا جائے گا، جیسے کوئی وارث اپنا حصہ تقسیم سے پہلے بیچ دیتا ہے تو یہ جائز ہے۔

۵۔ اگر قابل تقسیم چیز ہے تو تقسیم کرنے سے پہلے اسے کسی اور کو گفٹ کرنا بھی درست نہیں ہے، بلکہ تقسیم کے بعد گفٹ کر سکتے ہیں۔

۶۔ اگر کوئی ایک شریک غائب ہے تو دوسرا شریک اپنے حصے سے ایسا نفع اٹھا سکتا ہے جس میں غائب شریک کے لیے ضرر و تکلیف نہ ہو۔^(۱)

۷۔ دیون مشترکہ کا اصول یہ ہے کہ جب کسی شخص پر چند افراد کا دین / قرض لازم ہو جائے اور اس کا سبب ایک ہو تو یہ ”دین مشترک“ کہلاتا ہے۔ مثلاً زید اور عمر کا مشترکہ مکان تھا جو انہوں نے خالد کو بیچ دیا اور اپنا حصہ الگ الگ نہیں بتایا۔ یا زید اور عمر کی رقم مشترک تھی اور اسی رقم کو یکمشت خالد کو قرض میں دے دیا گیا۔ اگر سبب الگ الگ ہو تو یہ دین مشترک نہیں ہوگا، مثلاً زید نے الگ خالد کو کچھ رقم قرض دی اور عمر نے الگ۔ یا خالد نے زید کی کوئی چیز توڑ دی اور عمر کی بھی کوئی چیز توڑ دی اور دونوں کا خالد کے ذمہ نقصان / مالی حق لازم ہو گیا تو یہ دین مشترک نہیں ہے۔

اگر دین مشترک ہو تو جو بھی شریک (قرض خواہ) مقروض سے جتنا بھی قرض وصول کرے گا، اس میں تمام شرکاء (قرض خواہ) برابر شریک ہوں گے۔ اور اگر دین مشترک نہ ہو تو ہر شریک / قرض خواہ اپنے قرض کا الگ مطالبہ کر سکتا ہے اور وہ مقروض سے جتنا وصول کرے گا، وہ صرف اسی کا ہوگا، اس میں دیگر قرض خواہ شریک نہ ہوں گے۔^(۲)

۶۔ شرکت عقد کے اصول

۱۔ شرکت عقد میں ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے، لہذا وہ مشترکہ کاروبار میں بطور وکیل خرید و فروخت وغیرہ کا تصرف کر سکتا ہے۔

^(۱) مجلة الاحكام العدلیة. (المادة: ۱۰۶، ۱۱۱۳)

^(۲) درر الحکام فی شرح مجلة الاحکام ۵۳/۳

۲۔ نفع کا جو بھی تناسب عقد کے وقت طے ہو جائے، اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا، خواہ بعد میں کسی فریق نے عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ مثلاً دو آدمیوں نے کاروبار اس شرط پر شروع کیا کہ دونوں کام کریں گے اور نفع بھی دونوں کو آدھا آدھا ملے گا۔ کچھ عرصہ ایک شریک نے کام کیا، جس سے کچھ نفع حاصل ہو گیا، جبکہ دوسرے نے کام نہیں کیا، تو دونوں اس نفع میں شریک ہوں گے۔

۳۔ ہر شریک دوسرے کی طرف سے امین ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں شرکت کا مال امانت کے حکم میں ہوتا ہے، لہذا اگر کسی کوتاہی، غفلت اور تعدی کے بغیر کچھ مال ضائع ہو جائے تو اکیلا وہی شریک ذمہ دار نہیں ہوگا، بلکہ تمام شرکاء اپنے سرمایہ کے تناسب سے اس نقصان میں شریک ہوں گے۔

۴۔ عقد کے تمام حقوق عقد کرنے والے شریک پر لازم ہوں گے، کسی دوسرے شریک پر وہ حقوق لازم نہیں ہوں گے۔ مثلاً اگر کسی ایک شریک نے کاروبار کے لیے کوئی چیز خریدی تو فروخت کنندہ اسی خریدار (شریک) سے ہی قیمت کا مطالبہ کرے گا، دوسروں سے مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۵۔ کوئی شریک دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر کاروبار کا مال کسی کو قرض نہیں دے سکتا۔

۶۔ شرکت عقد کے ضمن میں مندرجہ ذیل معاملات وجود میں آتے ہیں اور شرکاء صرف اس حد تک نئے معاملات کر سکتے ہیں:

الف۔ شرکت عقد کے ضمن میں وکالت کا عقد خود ہی وجود میں آجاتا ہے، لہذا شرکت عقد میں ہر شریک مال فروخت کر سکتا ہے۔ نیا مال خرید بھی سکتا ہے۔

ب۔ اجرت پر کام کے لیے مزدور بھی رکھ سکتا ہے۔

ج۔ کسی کے پاس مال امانت رکھ سکتا ہے۔

و۔ کسی کو مال مضاربت پر دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں دونوں روایتیں ہیں، جواز والی روایت راجح ہے۔

ھ۔ کوئی شریک شرکت کا مال کسی کو گفٹ یا قرض نہیں دے سکتا۔

و۔ کوئی بھی شریک دوسرے شریک کے سرمایہ کی ضمانت نہیں لے سکتا۔^(۱)

۔ شرکت الاعمال میں اگر کوئی ایک شریک بھی کام کرے گا تو اس سے حاصل شدہ اجرت سب میں تقسیم

ہوگی۔ کیونکہ اس میں نفع کا استحقاق ضمان اور ذمہ داری پر ملتا ہے، عمل پر نہیں۔

۸۔ شرکت الامتال کی وہ صورتیں جن میں شرکا کو اپنی خدمات (SERVICES) سے ماوراء ان کی سرمایہ بھی لگانا پڑتا ہے، وہ بھی شرعا جائز نہیں اور اس سرمایہ سے جو تقویٰ اتی کام، شہینہ کی یا آلات خریدنے سے ماوراء چیزیں سرمایہ فراہم کرنے والوں کے درمیان اپنے اپنے سرمایہ کے تناسب سے شرکت الملک فی بنیاد پر تقسیم ہوتی ہیں۔

۹۔ ”شرکت وجوہ“ جس میں چند شرکا اپنی ساکھ کی بنیاد پر بازار سے اسٹاک سامان خرید کر نفع سے ماوراء بیچتے ہیں اور نفع باہم تقسیم کرتے ہیں، اس کے نفع کے سلسلے میں عام شرکت کا ہی اصول ہے کہ شرکا نے جو بھی تناسب ملے یا بہ، اسی تناسب سے نفع تقسیم کیا جائے گا۔ جہاں تک اس قسم کی شرکت میں نقصان اور خسارہ کی بات ہے تو یہ شرکت کی ابتداء کے وقت باقاعدہ طے کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شریک ادھار پر لیے ہوئے سامان کی قیمت کی ادائیگی کی ذمہ داری لے گا، جو شریک جتنی ذمہ داری اٹھائے گا، بعد میں وہ اتنا ہی نقصان اور خسارہ بھی برداشت کرے گا۔ اگر تمام شرکا نے ادھار سامان کی قیمت چکانے میں برابر ذمہ داری لی ہو تو نقصان میں بھی سب برابر شریک ہوں گے۔^(۱)

۷۔ راس المال کے اصول

۱۔ شرکت عقد میں راس المال (سرمایہ) کا معلوم و متعین ہونا ضروری ہے، البتہ حنفیہ کے ہاں یہ تعین عقد شرکت کی ابتداء میں ضروری نہیں، بلکہ بعد میں جب کاروبار کیا جائے گا اس وقت ضروری ہے۔

۲۔ دیگر ائمہ کے ہاں ابتداء میں ہی تمام شرکا کا سرمایہ مخلوط ہونا ضروری ہے، جبکہ حنفیہ کے ہاں خلط کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔

۳۔ حنفیہ کے ہاں راس المال نقد شکل میں ہونا ضروری ہے، جبکہ فقہاء حنابلہ اور مالکیہ کی ایک رائے کے مطابق عروض یعنی سامان اور غیر نقد شکل میں بھی کسی چیز کو راس المال بنایا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں جس شریک نے غیر نقد چیز کو راس المال بنایا ہے، اس کا حصہ مارکیٹ ریٹ کے مطابق طے کیا جائے گا، اس کی چیز کی جو قیمت ہوگی، وہی اس کا حصہ ہوگا۔ معاصر علماء نے ضرورت کی وجہ سے حنابلہ و مالکیہ کی رائے کو اختیار کیا ہے۔^(۲)

چنانچہ معاصر شریعہ میں ہے:

۱/۲/۱/۳ الأصل أن يكون رأس مال الشركة موجودات نقدية يمكن بها تحديد مقدار رأس المال لتقرير نتيجة المشاركة من ربح أو خسارة. ومع ذلك يجوز

^(۱) المعايير الشرعية ص: ۱۲۲، رقم المعيار: ۱۲

^(۲) بداية المجتهد ۲/۲۵۲

باتفاق الشركاء - الإسهام بموجودات غير نقدية (عروض) بعد تقويمها بالنقص لمعرفة مقدار حصة الشريك. (۱)

اصل یہ ہے کہ شرکت کا سرمایہ نقد اٹائے ہوں تاکہ اس کی مقدار کا تعین ہو سکے۔ تعین کی ضرورت اس لیے ہے کہ شراکت داری کے نتیجے میں حاصل ہونے والے نفع و نقصان کا حساب لگایا جاسکے۔ لیکن اس کے ساتھ شراکت کے اتفاق سے یہ بھی جائز ہے سرمایہ غیر نقد اٹائے ہوں (جیسے سامان) لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس اٹائے کی نقد قیمت متعین کر دی جائے تاکہ ہر شریک کا حصہ واضح طور پر معلوم ہو جائے۔

۴۔ کسی ایسی چیز کو اس المال بنانا جائز نہیں ہے جو کسی دوسرے پر دین (قرض) ہو، البتہ وصولی کے بعد اس کو اس المال بنایا جاسکتا ہے۔ (۲) اسی طرح معاصر علماء نے ایک صورت میں دیون/قرضوں کو شرکت کا اس المال بنانے کی اجازت دی ہے، وہ یہ ہے کہ دیون/قرضوں کو کسی نقد سرمایہ یا جامد اثاثہ کا تابع بنا کر شرکت میں شامل کیا جائے۔

۴/۲/۱/۳ لا يجوز أن تكون الديون وحدها حصة في رأس مال الشركة إلا في الحالات التي يكون فيها الديون تابعة لغيرها مما يصح جعله رأس مال للشركة مثل تقديم مصنع رأس مال للشركة بما له وما عليه. (۳)

یہ جائز نہیں ہے کہ صرف دیون کو شرکت کے سرمایہ کے طور پر پیش کیا جائے، البتہ صرف ان حالات میں دیون کو سرمایہ (راس المال) بنانے کی اجازت ہے جن میں دیون ان چیزوں کے تابع ہوں جو سرمایہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہوں، مثلاً کسی فیکٹری کو اس کے حقوق و واجبات سمیت کسی شرکت میں بطور سرمایہ پیش کرنا جائز ہے۔

۱۔ نفع و نقصان کے اصول

۱۔ ہر شریک کا نفع ابتداء میں ہی طے کیا جائے۔

۲۔ نفع مشاع ہونا چاہیے، جیسے نصف نصف، ٹلٹ وغیرہ یا حقیقی نفع کا فیصدی حصہ طے کیا جائے کہ جو نفع ہوگا

(۱) المعايير الشرعية ص: ۱۱۷. رقم المعيار: ۱۲

(۲) مجلة الأحكام العدلية. ص: ۲۵۷ (المادة: ۱۳۴۱)

(۳) المعايير الشرعية ص: ۱۱۷. رقم المعيار: ۱۲

اس کا دس فیصد فلاں کا دس فیصد فلاں کا وغیرہ۔

شریک کے فراہم کردہ سرمایہ کا فیصدی حصہ بطورِ نفع طے کرنا درست نہیں ہے، مثلاً زید، عمر اور خالد نے کاروبار شروع کیا۔ زید نے چار لاکھ، عمر نے چار لاکھ اور خالد نے دو لاکھ کا سرمایہ فراہم کر دیا۔ اس صورت میں یوں نفع طے کرنا درست ہے کہ جو حقیقی نفع ہوگا، اس کا چالیس فیصد زید کو، چالیس فیصد عمر کو، اور بیس فیصد خالد کو طے گا، لیکن یوں طے کرنا جائز نہیں ہے کہ خالد نے جتنی سرمایہ کاری کی ہے، اس کا دس فیصد اس کو نفع طے گا، کیونکہ خالد کے سرمایہ کا دس فیصد بیس ہزار ہے، لہذا یہ نفع کو فکس اور متعین کرنے والی صورت ہوگئی جو کہ جائز نہیں ہے۔

۳۔ کسی بھی شریک کے لیے نفع کی متعین مقدار طے کرنا درست نہیں۔

۴۔ فقہاء مالکیہ و شافعیہ کے ہاں فراہم کردہ سرمایہ کے تناسب سے زیادہ نفع رکھنا درست نہیں ہے، جس نے جتنا سرمایہ فراہم کیا ہے، اسی نسبت سے اس کو نفع میں حصہ ملے گا۔ فقہاء حنابلہ کے ہاں نفع کا کوئی بھی تناسب رکھا جائے، درست ہے، خواہ کتنا بھی طے کیا جائے۔ حنفیہ کے ہاں بھی کوئی بھی نسبت طے کی جاسکتی ہے، تاہم اگر کوئی شریک شروع میں یہ شرط عائد کر دے کہ وہ کام نہیں کرے گا تو اس کا نفع اس کے لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ رکھنا جائز نہیں ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ زید نے چار لاکھ، عمر نے چار لاکھ اور خالد نے دو لاکھ سرمایہ فراہم کر کے کاروبار شروع کیا۔ فقہاء مالکیہ اور شافعیہ کے ہاں اس صورت میں جو نفع ہوگا اس میں زید کے لیے زیادہ سے زیادہ چالیس فیصد، عمر کے لیے بھی زیادہ سے زیادہ چالیس فیصد اور خالد کے لیے زیادہ سے زیادہ بیس فیصد طے کیا جاسکتا ہے۔ اس سے زیادہ طے کرنا درست نہیں ہے۔ فقہاء حنابلہ کے ہاں کوئی بھی تناسب رکھے، درست ہے۔ حنفیہ کے ہاں بھی ہر تناسب درست ہے، اگر زید اور عمر کے لیے بیس بیس فیصد اور خالد کے لیے ساٹھ فیصد رکھا جائے تو بھی جائز ہے، لیکن اگر کسی ایک نے، مثلاً خالد نے شروع میں ہی یہ شرط رکھ دی کہ میں عمل / کام نہیں کروں گا تو پھر اس کے لیے نفع میں بیس فیصد سے زیادہ حصہ رکھنا درست نہیں ہے۔^(۱)

۵۔ شرکاء میں نفع کی تقسیم کا مرحلہ شرکت کے اخراجات نکالنے کے بعد آتا ہے، لہذا جب تک نفع سے ہر قسم کے اخراجات، فیسیں اور ٹیکس وغیرہ نکال نہ لیے جائیں، اس وقت تک نفع تقسیم نہ ہوگا۔ اصل سرمایہ کے علاوہ جو صانی نفع موجود ہو اس کے بعد شرکاء میں حتمی طور پر طے شدہ تناسب سے نفع تقسیم کیا جائے گا۔

۲۔ اگر کسی شرعی شرط کی خلاف ورزی کی وجہ سے شرکت کا عقد فاسد ہو گیا تو اس میں نفع کی تقسیم کی تین

صورتیں ہیں:

الف۔ ایک صورت یہ ہے کہ تمام شرکاء نے سرمایہ لگایا ہے۔ اس صورت میں تمام شرکاء کو ان کے سرمایہ کے تناسب سے نفع دیا جائے گا۔

ب۔ کچھ شرکاء نے سرمایہ لگایا ہو اور کچھ نے نہیں لگایا۔ ایسی صورت میں سارا نفع اس شریک کو ملے گا جس نے سرمایہ لگایا ہے، دوسرے شرکاء کو ان کے عمل کی وجہ سے اجرت مثل دی جائے گی۔

ج۔ کسی بھی شریک نے سرمایہ نہیں لگایا، بلکہ سب عمل کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں سارا نفع اس کو ملے گا جس نے عمل کیا ہے۔^(۱)

۷۔ نقصان کا ایک ہی اصول ہے کہ ہر شریک اپنے سرمایہ کے تناسب سے نقصان برداشت کرے گا۔ علامہ کسان لکھتے ہیں:

الریح علی ما اصطالحا والوضیعة علی قدر المال.^(۲)

نفع کی تقسیم باہمی اتفاق کے مطابق ہوگی، جبکہ نقصان سرمایہ کے تناسب سے لازم ہوگا۔

۹۔ شریک کو اجیر بنانا

کیا شرکاء میں کسی ایک شریک کو شرکت کے نفع کے علاوہ، اس کے عمل / کام کے بدلے الگ سے اس کے لیے اجرت مقرر کی جاسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک بہتر طریقہ ہے اور دوسرے طریقہ میں فقہاء کا اختلاف ہے:

بہتر طریقہ: اگر کوئی شریک کاروباری ذمہ داریوں میں زیادہ حصہ لیتا ہے اور دیگر شرکاء کی نسبت زیادہ کام کرتا ہے تو اس کے لیے الگ سے تنخواہ مقرر کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ ابتداء ہی سے اس کے نفع کا تناسب زیادہ مقرر کیا جائے، اگرچہ وہ اس کے لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ ہو۔ اور جو شرکاء کام نہیں کرتے یا کم کام کرتے ہیں ان سے نفع کا تناسب ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے کم ملے کیا جائے۔

اختلافی طریقہ: اگر مذکورہ بالا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے کام کرنے والے شریک کی ماہانہ یا روزانہ کی بنیاد پر

الگ سے تنخواہ مقرر کی جائے تو اس میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ ائمہ احناف رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت نہیں دی، کیونکہ اس میں ”صفقة في صفقة“ (شرکت میں اجارہ کی شرط) کی خرابی اور ”تفیز الطمان“ کی خرابی پائی جاتی ہے۔ تاہم امام زفر اور ائمہ ثلاثہ اور بعض معاصر علماء کرام نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اس لیے الگ سے تنخواہ مقرر کرنے کی بھی گنجائش ہے، جبکہ شرکاء کی طرف سے اس کی اجازت ہو۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ شرکت اور اجارہ کا معاملہ ایک دوسرے پر مشروط نہ ہوں، بلکہ دونوں معاملوں کو الگ الگ کیا جائے، تاکہ ”صفقة في صفقة“ کی خرابی لازم نہ آئے۔^(۱)

۱۰۔ شرکت کا اختتام

شرکت کے معاملہ کو ختم کرنے کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ تکمیل شرکت: جس مقصد کے لیے کاروبار شروع کیا تھا، وہ مقصد مکمل ہو گیا۔

۲۔ فسخ اختیاری: فریقین خود ہی شرکت کو ختم کر دیں۔

۳۔ فسخ غیر اختیاری: جبری طور پر شرکت کا عقد ختم کرنا پڑے، مثلاً کسی شریک کا انتقال ہو گیا یا مجنون ہو گیا،

مکمل شرکت کا مال ضائع ہو گیا وغیرہ۔

حکم: جب شرکت ختم ہو جائے اور تمام اثاثہ جات نقد شکل میں ہوں تو پہلے اصل راس المال (سرمایہ) اور پھر طے شدہ نفع باہم تقسیم کر لیں۔ اگر اثاثہ جات جامد شکل میں بھی ہیں تو ایان کو بیچ کر نقد کی شکل میں تبدیل کر کے تقسیم کر دیں یا اسی حالت میں اس کی بازاری قیمت معلوم کر کے آپس میں تقسیم کر لیں۔ اگر شرکاء کا اختلاف ہو جائے، کچھ نقد میں تبدیل کرنا چاہتے ہوں اور کچھ اسی حالت میں تقسیم چاہتے ہیں تو اثاثہ جات اسی حالت میں تقسیم کیے جائیں گے۔

اگر کوئی ایک شریک کاروبار سے نکلنا چاہے، بقیہ شرکاء کاروبار جاری رکھنا چاہتے ہیں تو نکلنے والے شریک کا حصہ

کوئی اور شریک خرید سکتا ہے، جس سے اس کا حصہ کاروبار میں بڑھ جائے گا۔^(۲)

شرکاء آپس میں یہ معاہدہ کر سکتے ہیں کہ جو شریک بھی شرکت کے معاملہ سے نکلنا چاہے تو وہ ایک متعین مدت

(مثلاً دو ماہ پہلے) بقیہ شرکاء کو اطلاع کرے گا۔ اسی طرح یہ معاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ شرکاء آپس میں ایک متعین مدت

تک شرکت کا معاملہ جاری رکھیں گے اور کوئی بھی فریق اس وقت سے پہلے شرکت کے کاروبار سے نہیں نکل سکتا، البتہ اگر

(۱) احسن الفتاویٰ ۷/۳۲۱، الدر المختار وحاشیة ابن عابدین ۶/۵۷

(۲) فقہ المعاملات ۱/۵۹۹

تمام شرکاء راضی ہوں تو اس مقررہ مدت سے پہلے بھی شرکت کا معاملہ ختم کیا جاسکتا ہے یا کسی ایک ذیق و نکتہ و اجازت دی جاسکتی ہے۔^(۱)

۱۱۔ شرکت کے عمومی ضوابط

۱۔ پہلا ضابطہ: مطلق عقدِ شرکت کا تقاضا یہ ہے کہ ذمہ داریاں اور حقوق برابر تقسیم ہوں۔ بالفاظِ دیگر مطلق شرکت کا عقد برابری کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی اگر دو یا زیادہ افراد نے شرکت کا معاملہ کر لیا اور ذمہ داریوں، حقوق اور عمل کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تو سب شرکاء حقوق، عمل اور ذمہ داریوں میں برابر شریک ہوں گے۔

• الأصل في الشركة التسوية

• مطلق عقد الشركة يقتضي التسوية

۲۔ دوسرا ضابطہ: شرکت میں نفع کا استحقاق یا تو عمل کے ذریعے ملتا ہے، یا مال کے ذریعے یا ضمان / رسک کے ذریعے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرکت کا کوئی بھی معاملہ ہو، اس میں کسی شریک کو اس وقت نفع لینے کا حق ملتا ہے جب وہ تین کاموں میں سے کوئی ایک کام کرے گا: یا تو عمل کرنے کی ذمہ داری لے گا، جیسا کہ شرکت الاعمال میں ہوتا ہے۔ یا سرمایہ لگائے گا، (اگر نقصان ہو گیا تو اسے بھی برداشت کرے گا) یا ضمان اور رسک اٹھائے گا جیسے شرکت الوجوہ میں ہوتا ہے۔

• الربح في الشركة لا يستحق إلا بعمل أو مال أو ضمان

• لا يستحق الربح إلا بإحدى ثلاث: بمال أو عمل أو تقبُّل

سرتیسرا ضابطہ: شرکت کا معاملہ، وکالت کو شامل ہوتا ہے۔ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر شریک، دوسرے شریک کے لیے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے، اگرچہ انہوں نے وکالت کا معاملہ الگ سے نہیں کیا، کیونکہ شرکت کا عقد خود ہی وکالت کے عقد کو شامل ہوتا ہے۔ البتہ یہ صرف شرکت عقد کا حکم ہے، شرکت ملک میں ہر شریک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتا ہے۔

• عقد الشركة يتضمّن التوكيل

• كل واحد من الشريكين وكيل من جهة صاحبه

۳۔ چوتھا ضابطہ: شریک امین ہوتا ہے۔ اس ضابطہ کا مفہوم یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک کے پاس مشترک مال

امانت کی حیثیت سے ہوتا ہے اور یہ شریک امین ہوتا ہے۔ لہذا اگر اس کی کوتاہی، غفلت اور تعدی کے بغیر مشترک چیز ضائع ہو گئی تو صرف وہ ضامن نہ ہوگا، بلکہ تمام شرکاہ اپنے نہ مایہ ملک کے تناسب سے نقصان میں شریک ہوں گے۔

• الشریک امین

• الشریکان کل واحد منہما امین الآخر

۵۔ پانچواں ضابطہ: شرکت کے معاملات میں اصول جواز کا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ شرکت کی فقہاء نے جو

اقسام لکھی ہیں، ان کا مطلب یہ ہے گزر نہیں ہے کہ ان کے علاوہ شرکت کی کوئی اور صورت جائز نہیں ہے، بلکہ یہ اس وقت کی رائج صورتیں ہیں، لہذا کسی وقت شرکت کی کوئی اور صورت سامنے آجائے اور اس میں شرعی اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو تو وہ صورت بھی جائز ہوگی۔ جیسے آج کل جو اینٹ اسٹاک کمپنی کی صورت رائج ہے۔

• الاصل فی الشركات الجواز

معادہ شراکت داری

چار صفحات پر مشتمل معادہ شراکت داری کا ایک نمونہ ”جامعہ دارالعلوم کراچی“ سے جاری ہوا تھا، جس کو ذمہ کے لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

نوعیت عقد:

یہ عقد و شراکت کے درمیان باہمی رضامندی سے شرکت کی بنیاد پر بتاریخ _____ مہینہ _____ سر _____ قائم ہو رہا ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

متعاقدین:

۱۔ شریک اول:

نام _____ ولدیت _____ شناختی کارڈ نمبر _____

پتہ _____

موبائل نمبر: _____

۲۔ شریک ثانی:

نام _____ ولدیت _____ شناختی کارڈ نمبر _____

پتہ _____

موبائل نمبر: _____

عقد کی تفصیل:

۱۔ شریک اول کے سرمایہ کی کل مالیت مبلغ _____ (Rs _____) ہے، جو کہ کل سرمایہ کا _____ فیصد ہے۔

۲۔ شریک ثانی کے سرمایہ کی کل مالیت مبلغ _____ (Rs _____) ہے، جو کہ کل سرمایہ کا _____ فیصد ہے۔

۳۔ شراکت داری کی کل مدت _____ ماہ/سال ہے۔ مدت ختم ہونے سے پہلے ایک طرفہ طور پر کسی فریق

_____ کی رضامندی کے بغیر شراکت ختم کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

iii. عقدِ شرکت کی مدت ختم ہونے پر اگر فریقین دوبارہ عقد کرنا چاہیں یا مدت ختم ہونے سے پہلے اس مدت آئندہ کسی مدت تک کے لیے جاری رکھنا چاہیں تو اس کا فیصلہ باہمی رضامندی سے ہوگا۔

نفع و نقصان:

i. کاروبار میں نفع کا تناسب فریق اول جناب _____ کے لیے حقیقی نفع کا _____ فیصد اور فریق ثانی جناب _____ کے لیے حقیقی نفع کا _____ فیصد ہوگا۔

ii. نقصان کی صورت میں اولاً نفع سے اس کو پورا کیا جائے گا۔ اگر نقصان کی شرح نفع سے بڑھ جائے تو بقیہ نقصان دونوں شریک اپنے سرمایہ کے تناسب سے برداشت کریں گے۔

عقد کی شرائط:

i. کاروبار پر ہونے والے براہ راست اخراجات شرکت کے مال سے ادا کیے جائیں گے۔

ii. مدت ختم ہونے پر عقدِ شرکت خود بخود ختم ہو جائے گا، اس کے بعد شرکت میں موجود اثاثوں کی قیمت لگوائی جائے گی اور ہر شریک اپنے سرمایہ کے مطابق اثاثوں کا مالک ہوگا۔ نیز اختتام شرکت پر ہر شریک باہمی رضامندی سے دوسرے شریک کا حصہ خریدنے کا بھی مجاز ہوگا۔

iii. عقد کی مدت ختم ہونے سے پہلے اگر کوئی فریق وفات پا جائے تو وفات پانے والے فریق کا حصہ اس کا ترکہ شمار ہوگا۔ اس کے حصہ میں شرکت کو جاری رکھنے کے لیے اس کے ورثاء/سرپرست کی اجازت ضروری ہے۔

دستخط فریق اول: _____ تاریخ _____
دستخط فریق ثانی _____ تاریخ _____

گواہان:

نمبر (1)

جناب _____ شناختی کارڈ نمبر _____ موبائل _____

پتہ _____ دستخط _____

نمبر (2)

جناب _____ شناختی کارڈ نمبر _____ موبائل _____

پتہ _____ دستخط _____

نوٹ: گواہوں کو عقد کی تفصیل وغیرہ کا علم ہو اور ان کی موجودگی میں عقد کیا جائے، ورنہ ان کی گواہی معتبر نہ ہوگی۔

شرکت کے رہنما اصول:

- ۱- کسی بھی شریک کے لیے متعین رقم میں نفع طے کرنا یا نفع کی شرح کو مجہول رکھنا (مثلاً یہ کہا کہ کچھ نفع آپ کا ہوگا) جائز نہیں۔ اس سے شرکت فاسد ہو جائے گی۔ لہذا شرکت کے شرعاً درست ہونے کے لیے نفع کی شرح فیصد کے حساب سے طے کرنا ضروری ہے۔
- ۲- شریک کے پاس سرمایہ امانت ہو گا اور عقد کے وقت لگائی گئی شرائط کی پابندی ہر شریک پر لازم ہوگی، اگر کسی شریک سے مذکورہ قیود و شرائط کی خلاف ورزی کرنے کی بناء پر سرمایہ ضائع ہو گیا یا کاروبار میں نقصان ہو گیا تو وہ خود ضامن ہوگا۔
- ۳- حنفیہ کے نزدیک شرکت میں لگایا جانے والا سرمایہ کرنسی کی شکل میں ہونا ضروری ہے، البتہ اگر کوئی شریک دوسرے شریک کو سامان دے کر یہ کہے کہ اس سامان کو فروخت کر کے جو رقم حاصل ہو اس سے کاروبار کرو تو یہ جائز ہے۔ نیز کسی کے ذمہ واجب الاداء دین (قرض) کو بھی شرکت کار اس المال نہیں بنایا جاسکتا۔ البتہ اگر قرض خواہ یہ کہے کہ فلاں کے ذمہ میرا قرض ہے تم وہ وصول کر کے کاروبار کرو تو یہ بھی درست ہے۔
- ۴- شرکت میں ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے، لہذا ہر شریک کو عقد میں طے کی گئی شرائط اور عرف کا لحاظ رکھتے ہوئے نقد، ادھار، کرایہ پر کوئی چیز لینا یا دینا، گروی رکھنا (mortgage)، رکھوانا وغیرہ سب کی اجازت ہوگی۔
- ۵- اگر کسی وجہ سے شرکت فاسد ہو جائے تو ہر شریک کاروبار میں لگائے گئے اپنے سرمایہ کے تناسب سے نفع کا مالک ہوگا، ایگر منٹ میں نفع کے طے شدہ تناسب کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔
- ۶- کسی شریک کا کاروبار میں شریک کے سرمایہ کی ضمانت دینا درست نہیں، اگر عقد میں یہ شرط لگادی گئی تو شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔
- ۷- جس شریک کا عقد کے وقت کاروبار میں کام نہ کرنا (sleeping partner) طے ہو اس کے نفع کا تناسب اس کے کاروبار میں لگائے گئے سرمایہ کی شرح سے زیادہ نہیں مقرر کیا جاسکتا۔
- ۸- کام کرنے والے شریک (working partner) کے نفع کی شرح اس کے سرمایہ کی شرح سے زیادہ بھی مقرر کی جاسکتی ہے۔ نیز اگر کام کرنے والا شریک اپنے کام کے عوض متعین تنخواہ ماہانہ بطور اجرت لینا چاہے تو اس کی بھی تنجائش ہے۔

۹۔ اگر کسی شریک نے عین فاحش (اس قدر نقصان اٹھانا جتنا عام طور پر لوگ برداشت نہیں کرتے، مثلاً روپے کی چیز دو سو کی خرید لی وغیرہ) کے ساتھ کوئی چیز خریدی تو یہ شرکت کے لیے نہ ہوگی، بلکہ وہ چیز اس شریک کی ذاتی شمار ہوگی جس کی قیمت کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی۔

۱۰۔ نفع کی تقسیم کا طریقہ کاریہ ہے کہ جب شرکت کی مدت ختم ہو جائے گی تو کاروبار میں موجود تمام اثاثہ جات کو کرنسی میں تبدیل کیا جائے گا یا اگر باہمی رضامندی سے تمام اثاثہ جات کی قیمت لگالی جائے تو یہ بھی درست ہے۔ لوگوں کے ذمہ جو قرض ہو وہ وصول کیا جائے گا۔ دونوں شریک اب تک جو نفع علی الحساب لے چکے ہیں اس کا بھی حساب ہوگا۔ اس کے بعد کاروباری اخراجات، واجب الاداء قرضے اور کاروبار میں لگایا گیا سرمایہ نکالا جائے گا۔ جو رقم باقی بچے وہ نفع شمار ہوگا جس کو عقد میں طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

۲۔ مضاربت کے اصولی مباحث

(Mudaraba)

اس حصے میں عقدِ مضاربت کے اصولی مباحث کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ تفصیلی مباحث کے لیے فقہی کتب کی طرف مراجعت کریں۔ اس خلاصہ کو مندرجہ ذیل چودہ نکات میں بیان کیا جائے گا:

- | | |
|----------------------------|--|
| ۱۔ مضاربت کا تعارف | ۲۔ مضاربت کا ثبوت |
| ۳۔ مضاربت کی فقہی حیثیت | ۴۔ مضاربت کا لزوم |
| ۵۔ مضاربت کی اقسام | ۶۔ سرمایہ کے اصول |
| ۷۔ اخراجات | ۸۔ نفع و نقصان کے اصول |
| ۹۔ مضاربت فاسدہ کا حکم | ۱۰۔ مضاربت کی حیثیتیں |
| ۱۱۔ مضاربت کے حقوق و فرائض | ۱۲۔ شرکت و مضاربت کا اجتماع اور مضاربتِ مشترکہ |
| ۱۳۔ مضاربت کا اختتام | ۱۴۔ مضاربت کے عمومی ضوابط |

۱۔ مضاربت کا تعارف

مضاربت کا لفظ ”ضرب“ سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں سفر کرنا، چونکہ مضاربت میں کاروبار کے لیے سفر کیا جاتا ہے، اس لیے اس کو مضاربت کہتے ہیں۔ مضاربت کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ ایک فریق کی طرف سے سرمایہ ہو اور دوسرے فریق کی طرف سے عمل ہو اور دونوں ایسا معاہدہ کر لیتے ہیں کہ عمل کرنے والا فریق عمل (کاروبار) کر کے نفع کمائے گا اور اس میں ایک خاص تناسب سے دونوں فریق شریک ہوں گے۔

الْمُضَارَبَةُ نَوْعٌ شَرِكَةٍ عَلَى أَنْ يَكُونَ رَأْسُ الْمَالِ مِنْ طَرَفٍ وَالسَّعْيُ وَالْعَمَلُ مِنَ الطَّرَفِ
الْآخَرِ، وَيُنْدَعَى صَاحِبُ الْمَالِ رَبَّ الْمَالِ، وَالْعَامِلُ مُضَارِبًا.^(۱)

مضاربت، شرکت کی ایک قسم ہے۔ اس میں ایک فریق کی طرف سے سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرے

(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۲۷۱ (المأذؤة: ۱۴۰۴)

کی طرف سے سعی اور عمل ہوتا ہے۔ سرمایہ فراہم کرنے والے کو رب المال اور عمل کرنے والے کو مضارب کہتے ہیں۔

اس کو فقہی اصطلاح میں ”قراض“، ”مقارضة“ اور ”معاملۃ“ بھی کہا جاتا ہے۔ سرمایہ فراہم کرنے والے کو ”رب المال“ اور عمل کرنے والے کو ”مضارب“ جبکہ سرمایہ کو ”راس المال“ کہتے ہیں۔ سرمایہ فراہم کرنے والے ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح عمل کرنے والے بھی ایک سے زیادہ افراد ہو سکتے ہیں۔ اس کی درج ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:

- ۱۔ سرمایہ فراہم کرنے والا ایک ہو اور عمل کرنے والا بھی ایک ہو۔
 - ۲۔ سرمایہ فراہم کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں اور عمل کرنے والا ایک ہو۔
 - ۳۔ سرمایہ فراہم کرنے والا ایک ہو اور عمل کرنے والے ایک سے زیادہ ہو۔
 - ۴۔ سرمایہ فراہم کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں اور عمل کرنے والے بھی ایک سے زیادہ ہوں۔
- مضاربت کا بنیادی رکن ایجاب و قبول ہی ہیں، جن کی تفصیل بیع کے رکن کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں مزید یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے جدید اقتصادی نظام اور خاص کر اسٹاک مارکیٹ میں ”مضاربہ“ کا پایا جانے والا تصور، فقہ اسلامی کے مضاربہ سے یکسر مختلف اور شرعی نقطہ نظر سے ایک ناجائز سرگرمی ہے۔ اسٹاک مارکیٹ میں مضاربہ کو انگریزی میں (speculation) کہتے ہیں جو درحقیقت سٹہ بازی کی صورت ہے۔ اس میں دو فریق خرید و فروخت کا معاملہ کر کے اسے مستقبل کی طرف منسوب کرتے ہیں اور مستقبل میں خریدار کا چیز پر قبضہ کر کے مالک بنا اور فروخت کنندہ کا چیز بیچنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ صرف قیمتوں کا فرق برابر کر کے ایک دوسرے سے رقم وصول کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اس کی تعریف معاصر علماء نے یوں کی ہے:

المخاطرة بالبيع والشراء بناء على التوقع في تقلبات الأسعار بغية الحصول على فارق السعر۔^(۱)

قیمتوں کے فرق کو حاصل کرنے کے لیے، قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے توقع کی بنیاد پر خرید و فروخت کا رسک لینا۔

۲۔ مضاربت کا ثبوت

عقدِ مضاربت کا جواز ان تمام آیات سے ثابت ہے جن میں رزق کمانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جہاں تک احادیث کی بات ہے تو اس پر واضح احادیث موجود ہیں، مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا:

ثلاث فہن البرکة: البیع الی أجل، والمقارضة، واخلط البر بالشعیر للبیع. لا للبیع.^(۱)

تین چیزوں میں برکت ہے: ادھار خرید و فروخت، مضاربت، اور بیع کے لیے نہیں، بلکہ گھر کے استعمال کے لیے جو اور گندم کو ملانا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ مضاربت کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کئی صحابہ سے مضاربت ثابت ہے۔ اس لیے مضاربت کے جواز پر فقہاء کا اجماع ہے۔^(۲)

مضاربت کی حقیقت بھی شرکت کے قریب ہے، لہذا جن دلائل سے شرکت کا ثبوت ہوتا ہے، ان سے مضاربت کا عقد بھی ثابت ہوتا ہے اور جس طرح معاشرے میں لوگوں کو شرکت کے معاملات کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح مضاربت کے معاملات کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے عقلی تقاضا بھی یہ ہے کہ مضاربت کا معاملہ جائز ہونا چاہیے۔

۳۔ مضاربت کی فقہی حیثیت

عقدِ مضاربت کی فقہی تکلیف اور حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ عقود معاوضہ جیسے بیع اور اجارہ وغیرہ میں آتا ہے یا یہ کوئی اور عقد اور معاملہ ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

۱۔ جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ عقدِ مضاربت بھی اجارہ ہی جیسا ایک عقدِ معاوضہ ہے۔ البتہ اجارہ کے لیے منفعت اور اجرت وغیرہ کا معلوم ہونا ضروری ہے، جبکہ مضاربت میں منفعت اور اجرت معلوم نہیں ہوتی، اس لیے جمہور کے ہاں مضاربت کا عقد درحقیقت اجارہ مجہولہ ہے جو فاسد ہونا چاہیے، لیکن شریعت نے لوگوں کی آسانی اور سہولت کے لیے اس کو مستثنیٰ کر کے جائز قرار دیا ہے۔^(۳)

^(۱) سنن ابن ماجہ ۲/۷۶۸۔ حدیث نمبر: ۲۲۸۹

^(۲) الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۸/۳۷

^(۳) بدائع الصنائع ۶/۷۹

۲۔ فقہاء حنابلہ، علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم رحمہم اللہ کے ہاں مضاربت عقد معاوضہ نہیں ہے، بلکہ یہ مساقات اور مزارعت کی طرح ایک قسم کی شرکت کا ایک مستقل عقد ہے اور قیاس کے مطابق جائز ہے۔^(۱)

۳۔ مضاربت کا لزوم

اس عنوان کے تحت دو نکات بیان ہوں گے:

۱۔ مضاربت کا لزوم

۲۔ توقیتِ مضاربت

۱۔ مضاربت کا لزوم:

کیا عقدِ مضاربت لازم عقد ہے یا جائز؟ بالفاظِ دیگر کیا کوئی بھی فریقِ مضاربت کا معاملہ کسی بھی وقت فسخ اور ختم کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ عقدِ مضاربت لازم نہیں ہے، بلکہ جائز عقد ہے، لہذا کوئی بھی فریق اس معاملے کو کسی بھی وقت ختم کر سکتا ہے، تاہم اگر معاملہ ختم کرنے کے بعد کاروبار میں جامد اثاثہ جات ہوں تو مضارب کو یہ حق حاصل ہوگا کہ ان کو بیچ کر نقد میں تبدیل کر لے۔

۲۔ فقہاء مالکیہ کے ہاں اصلاً تو عقدِ مضاربت لازم نہیں ہے، بلکہ یہ ایک جائز عقد ہے، لیکن اس کے مختلف احوال کا حکم مختلف ہو سکتا ہے، چنانچہ:

الف۔ جب تک کاروبار شروع نہ ہو اور تو یہ عقد نہ رب المال کے لیے لازم ہے اور نہ مضارب کے لیے، لہذا دونوں سے کوئی بھی فریق، کسی بھی وقت اس عقد کو ختم کر سکتا ہے۔

ب۔ مضارب نے مالِ مضاربت سے راستے کا خرچہ اور زائد راہ خرید لیا، لیکن ابھی سفر شروع نہیں کیا تو ایسی صورت میں یہ عقد مضارب کے لیے تو لازم ہے، لیکن رب المال کے لیے لازم نہیں ہے، البتہ اگر مضارب اس خرچہ کو خود برداشت کر لے تو ایسی صورت میں وہ بھی معاملہ ختم کر سکتا ہے۔

ج۔ اگر مضارب نے کاروبار شروع کر لیا یا کاروبار کے لیے باقاعدہ سفر کر لیا تو ایسی صورت میں یہ معاملہ دونوں فریقین کے لیے لازم ہے، کوئی بھی فریق اس معاملہ کو دوسرے کی رضامندی کے بغیر ختم نہیں کر سکتا۔^(۲)

^(۱) فقہ المعاملات ۱/۳۸۱

^(۲) بدائع الصنائع ۶/۱۰۹، الشرح الكبير ۳/۲۹۹

۳۔ توقیتِ مضاربت:

”توقیت“ کا مطلب ہے عقدِ مضاربت کو کسی میعاد یا وقت کے ساتھ خاص کرنا یا پابند بنانا۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ مضاربت کی انتہائی مدت بیان کرنا۔ مثلاً مضاربت کا عقد شروع کرتے ہوئے یہ شرط لگانا کہ فلاں تاریخ (مثلاً ۳۰/۱۰ ستمبر ۲۰۲۲ء) کو مضاربت کا یہ معاملہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔

۲۔ مضاربت کی کم از کم مدت بیان کرنا جس میں کوئی فریق مضاربت کو ختم نہ کر سکے۔ مثلاً شروع میں یہ شرط لگانا کہ اتنی مدت (مثلاً ستمبر ۲۰۲۲ء) تک یہ مضاربت لازم ہے، کوئی اس کو ختم نہیں کر سکے گا۔

پہلی صورت کی دیگر ائمہ کے ہاں گنجائش ہے، حنفیہ کے ہاں دونوں روایتیں ہیں، تاہم جواز کو ترجیح دی گئی ہے۔ دوسری صورت میں حنفیہ کے ہاں کوئی تصریح نہیں ہے، حنابلہ کے ہاں گنجائش ملتی ہے۔ معاصر فقہاء نے اس کی بھی گنجائش دی ہے۔ لہذا دونوں صورتوں کی گنجائش ہے۔^(۱)

مضاربت کی توقیت کے بارے میں مجمع الفقہ الاسلامی کی ایک قرارداد یوں ہے:

ب- لزوم المضاربة إلى مدة معينة، وتوقيت المضاربة:

الأصل أن المضاربة عقد غير لازم وبحق لأبي من الطرفين فسخه، وهنالك حالتان لا يثبت فيهما حق الفسخ وهما:

(١) إذا شرع المضارب في العمل حيث تصبح المضاربة لازمة إلى حين التنضيف الحقيقي أو الحكمي .

(٢) إذا تعهد رب المال أو المضارب بعدم الفسخ خلال مدة معينة، فينبغي الوفاء، لما في الإخلال من عرقلة مسيرة الاستثمار خلال تلك المدة .

ولا مانع شرعا من توقیت المضاربة باتفاق الطرفين، بحيث تنتهي بانتهاء مدتها دون اللجوء إلى طلب الفسخ من أحدهما، ويقتصر أثر التوقيت على المنع من الدخول في عمليات جديدة بعد الوقت المحدد، ولا يحول ذلك دون تصفية العمليات القائمة.^(۲)

ب۔ مقررہ وقت کے ساتھ مضاربت کی تحدید:

(۱) بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۱۷۵/۲

(۲) قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ۱- ۱۲۳ (ص: ۲۱۴)

اصول یہ ہے کہ مضاربت عقد غیر لازم ہے اور فریقین میں سے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عقد کو فسخ کر لے، البتہ دو صورتیں ایسی ہیں جن میں معاملہ فسخ کرنے کا حق باقی نہیں رہتا:

۱- ایک یہ کہ مضاربت کام شروع کر دے تو مضاربت اس وقت تک کے لیے لازم ہو جاتی ہے جب تک سامان حقیقت میں یا حکماً نقد نہ ہو جائے۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ جب رب المال اور مضاربت یہ طے کر لیں کہ ایک مقررہ مدت کے درمیان عقد فسخ نہیں کیا جائے گا تو اس فیصلہ کی پابندی کی جائے گی، کیونکہ اس مدت کے دوران خلل اندازی سے سرمایہ کاری کے سفر میں رکاوٹ ہوگی۔

فریقین کے باہمی اتفاق سے مضاربت کو کسی متعین وقت کے ساتھ محدود کرنے میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے، اس طور پر کہ وہ مدت گزرتے ہی مضاربت ختم ہو جائے گی، کسی فریق کی طرف سے فسخ کے مطالبہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس تحدید وقت کا اثر صرف اس بات پر ہوگا کہ مقررہ وقت کے بعد کوئی نیا معاملہ نہیں کیا جائے گا، لیکن پہلے سے جاری معاملات کے تصفیہ پر اس کا اثر نہیں ہوگا۔

۵۔ مضاربت کی اقسام

مضاربت کی دو بنیادی قسمیں ہیں:

۱۔ مضاربت مطلقہ

۲۔ مضاربت مقیدہ

۱۔ مضاربت مطلقہ:

ایسی مضاربت جس میں سرمایہ فراہم کرنے والا شخص کوئی قید یا حدود بیان نہ کرے، بلکہ مضاربت کو مکمل

اجازت ہو کہ وہ جب تک چاہے، جس شہر میں اور جو بھی کاروبار یا عمل کرنا چاہتا ہے، وہ کرے۔^(۱)

اس قسم میں مضاربت کو اپنے تجربہ کی بنیاد پر ہر قسم کے معاملات اور کاروبار کی اجازت ہوتی ہے، لیکن عصر حاضر

کے علماء نے اس صورت میں بھی دو قیود یا شرائط کے ساتھ مضاربت کو معاملات کی اجازت دی ہے:

الف- مضاربت پر لازم ہے کہ وہ اپنے اور سرمایہ فراہم کرنے والے کی مصلحت کا خیال رکھے، بالفاظ دیگر مکمل

احتیاط کے ساتھ صرف نفع بخش کاروباری کو شش کرے۔

ب۔ اس سلسلے میں مارکیٹ کے عرف کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہوگا، لہذا مضارب ایسا کوئی عمل نہیں کر سکتا ہے۔
عمومی طور پر مارکیٹ کے عرف کے بالکل خلاف ہو۔^(۱)

۲۔ مضاربت مقیدہ:

جس میں سرمایہ فراہم کرنے والا کاروبار یا مقام یا وقت کو خاص کر دیتا ہے۔ مثلاً مضارب کو کہہ دے کہ تم صرف کپڑے کا کاروبار کرو گے یا اس کو کسی خاص و متعین شہر کا پابند بنا دے کہ اس شہر سے باہر جا کر کام نہیں کرو گے۔ ایسی پابندی یا شرائط کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر اس کی وجہ سے نفع کمانے یا مضارب کے عمل میں خلل نہ آئے اور شرط یا پابندی کسی اعتبار سے مفید بھی ہو تو مضارب پر ایسی شرط لازم ہوتی ہے۔ اگر مضارب نے ایسی کسی بھی شرط یا پابندی کی خلاف ورزی کر دی تو وہ ضامن ہوگا۔^(۲)

فقہاء کی تفصیلات کو سامنے رکھنے سے مضاربت مقیدہ کی چار صورتیں سامنے آتی ہیں:

۱- التقييد بنوع من البضاعة: اس کا مطلب یہ ہے کہ رب المال نے مضارب کے لیے خاص اشیاء اور سامان کا تعین کر لیا کہ مضارب صرف انہی اشیاء اور سامان کا کاروبار کرے گا۔ مثلاً مضارب صرف جوتوں کا یا صرف کپڑے کا کاروبار کرے گا۔ تقریباً تمام فقہاء اس شرط کی اجازت دیتے ہیں اور مضارب پر ایسی شرط کی پابندی کرنا لازم ہے، تاہم فقہاء شافعیہ اور فقہاء مالکیہ اس میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ جس سامان اور اشیاء کو مخصوص کیا گیا ہے وہ ایسا نہ ہو کہ نادر الوجود ہو اور ہر جگہ نہ پایا جاتا ہو یا جس کا حصول مشکل ہو۔^(۳)

۲- التقييد بنوع من البيع: سرمایہ فراہم کرنے والے (رب المال) نے مضارب کے لیے خرید و فروخت کی کسی خاص صورت کو متعین کر کے اس کی پابندی لگادی، مثلاً مضارب کو کہہ دیا کہ وہ صرف نقد خرید و فروخت کرے گا، ادھار معاملات نہیں کرے گا۔ اس شرط کے صحیح ہونے اور مضارب پر اس کی پابندی لازم ہونے کے بارے میں بھی تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔^(۴)

(۱) المعايير الشرعية ص: ۱۳۸، رقم المعيار: ۱۳

(۲) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۲۷۱ (المأذنة: ۱۳۰۷)

(۳) بدائع الصنائع ۶/۹۹، الشرح الكبير ۳/۵۲۰

(۴) بدائع الصنائع ۶/۱۰۰

۳- التقييد بالمكان: رب المال نے مضاربیت کے کاروبار کے لیے مقام اور علاقہ خاص کر لیا، مثلاً مضارب صرف فلاں شہر کی حد میں رہ کر ہی کاروبار کرے گا۔ کیا ایسی شرط درست اور مضارب پر اس کی پابندی لازم ہے؟ اس بارے میں فقہاء کی تین آراء ہیں:

۱- فقہاء حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں ایسی شرط درست ہے اور مضارب پر اس کی پابندی لازم ہے، کیونکہ یہ ایسی شرط ہے کہ اس میں کاروبار کا فائدہ اور مصلحت ہو سکتی ہے۔^(۱)

۲- فقہاء مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی شرط / قید درست نہیں ہے اور مضارب پر اس کی پابندی بھی ضروری نہیں ہے، کیونکہ اس میں مضارب کے لیے ایک قسم کی تنگی اور مشقت ہے۔^(۲)

۳- فقہاء شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ ایک عمومی مقام یا مکمل بازار یا شہر کی پابندی لگانا درست ہے، تاہم کسی خاص دکان کی شرط لگانا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں حرج ہے۔^(۳)

۴- التقييد بمعاملة شخص: اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ فراہم کرنے والا (رب المال) مضارب پر یہ شرط اور پابندی لگا دے کہ وہ کسی خاص شخص سے ہی خرید و فروخت کے معاملات کرے گا، اس کے علاوہ کسی سے معاملات نہیں کرے گا۔ اس قسم کی شرط اور پابندی کے بارے میں بھی فقہاء کی آراء مختلف ہیں:

۱- فقہاء حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں ایسی شرط اور پابندی لگانا درست ہے، کیونکہ اس میں کاروبار کے لیے کسی درجے میں فائدہ کا امکان ہے۔^(۴)

۲- فقہاء مالکیہ اور شافعیہ کے ہاں ایسی شرط لگانا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں مضارب کے لیے مشقت بھی ہے اور یہ شرط کاروبار کے لیے بھی فائدہ مند نہیں ہے۔^(۵)

۶- سرمایہ کے اصول

سرمایہ سے متعلق یہاں بھی وہی اصول لاگو ہوں گے جو شرکت میں بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً معلوم و متعین ہو۔

^(۱) بدائع الصنائع ۶/۱۰۰، المغنی ۶۸/۵

^(۲) الشرح الكبير ۵۲۱/۳

^(۳) مغنی المحتاج ۳۱۱/۲

^(۴) بدائع الصنائع ۶/۱۰۰، المغنی ۶۹/۵

^(۵) الشرح الكبير ۵۲۱/۳، مغنی المحتاج ۳۱۱/۲

حنفیہ کے ہاں سرمایہ نقد شکل میں ہو، وغیرہ۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں ہے:

يُسْتَرْطُ أَنْ يَكُونَ رَأْسُ الْمَالِ مَالًا صَالِحًا لَأَنْ يَكُونَ رَأْسُ مَالٍ شَرِكَةٍ^(۱)

(مضاربت میں) یہ ضروری ہے کہ اس المال ایسا ہو جو شرکت میں اس المال بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

البتہ چند اضافی باتیں یہاں ذہن میں رہنی چاہیے:

۱۔ مضاربت میں عقد مضاربت کے فوراً بعد سارا سرمایہ مضارب کے حوالے کرنا ضروری ہے، تاکہ وہ کاروبار شروع کر سکے، سرمایہ اپنے پاس روکے رکھنا درست نہیں ہے۔

۲۔ اگر مضارب پر رب المال کا قرض ہو اور وہ مقروض (مضارب) کو کہے کہ اسی قرض کی رقم کو مضاربت کے لیے استعمال کر لے تو ایسی صورت میں قرض کو اس المال نہیں بنایا جاسکتا۔ البتہ اگر کسی تیسرے شخص پر قرض ہو اور قرض خواہ، مضارب کو یہ کہے کہ فلاں (مقروض) کے ذمہ میرا قرض ہے، تم میرے وکیل بن کر اس رقم پر قبضہ کرو اور پھر اس رقم کو مضاربت میں استعمال کرو تو فقہاء حنفیہ اور حنابلہ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر قرض / ادین کو کسی نقد یا سامان کا تابع بنا کر سب کا مجموعہ مضاربت میں دے دیا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ یہی اصول شرکت کا بھی ہے۔^(۲)

۳۔ اگر کسی شخص کا مال کسی دوسرے کے پاس بطور امانت / ودیعت رکھا گیا ہو تو جمہور علماء کے ہاں مالک اس مال کو بھی مضاربت میں لگا سکتا ہے، البتہ فقہاء مالکیہ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی طرح عصر حاضر کے علماء نے ساز و سامان کو بھی مضاربت کا سرمایہ بنانے کی اجازت دی ہے، جس میں بوقت معاہدہ اس سامان کی جو قیمت ہوگی، اس کے بقدر سامان فراہم کرنے والے کا مضاربت میں حصہ / سرمایہ ہوگا۔^(۳)

۴۔ منافع کو فقہاء حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کے ہاں مضاربت کا اس المال نہیں بنایا جاسکتا، البتہ حنابلہ کے ہاں اس کی گنجائش ملتی ہے۔ مثلاً زید نے عمر کو ایک مکان دے کر کہا کہ: اس مکان کی منفعت یعنی رہائش سے نفع کمایا جائے جو دونوں کے درمیان آدھا آدھا تقسیم ہوگا۔ عمر اس مکان کو کرایہ پر دے کر نفع کماتا ہے اور پھر نفع دونوں آپس میں تقسیم

^(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۲۷۲ (المأذة: ۱۴۰۹)

^(۲) فقه المعاملات ۱/ ۴۰۸

^(۳) فقه المعاملات ۱/ ۴۰۸، المعايير الشرعية ص: ۱۳۹، رقم المعيار: ۱۳

کرتے ہیں۔ یہ صورت حنابلہ کے ہاں جائز ہے۔^(۱)

عصر حاضر میں سرومزر کے کاروبار میں مضاربت کی تمام صورتوں پر بھی تیسرا اصول لاگو ہوتا ہے، کیونکہ آنٹل اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے پاس سرمایہ ہوتا ہے، لیکن اس کے پاس ہنر نہیں ہوتا تو ایسے لوگ منافع اور سرومزر پر مضاربت کر لیتے ہیں، مثلاً:

الف۔ ایک شخص ڈاکٹر ہے، لیکن اس کے پاس ہسپتال یا علاج کا ساز و سامان نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کوئی دوسرا شخص یا ادارہ اس کو کلینک اور اس کا سامان فراہم کرتا ہے اور ڈاکٹر وہاں لوگوں کا علاج کرتا ہے اور جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ باہم تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ بھی درحقیقت منافع پر مضاربت ہے۔

ب۔ کوئی شخص دوسرے کو سرمایہ فراہم کر کے کہتا ہے کہ اس سے گاڑی خرید کر کرایہ پر چلاؤ اور نفع دونوں کا برابر ہوگا۔ یہ بھی مضاربت ہے کہ ایک کا سرمایہ لگا ہے اور دوسرے کا عمل ہے۔

ج۔ اس سے ملتی جلتی صورت آج کل یہ بھی رائج ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی گاڑی کا مالک ہے اور دوسرا ڈرائیور، مالک گاڑی فراہم کرتا ہے اور ڈرائیور اپنی خدمات فراہم کر کے نفع کماتا ہے۔ نفع کی باہمی تقسیم کے مختلف طریقے رائج ہیں: ۱۔ ایک طریقہ تو یہ رائج ہے کہ ڈرائیور کے لیے متعین تنخواہ طے کی جاتی ہے اور بقیہ سارا نفع گاڑی کے مالک کا ہوتا ہے۔ یہ صورت شرعاً اجارہ میں آتی ہے اور جائز ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ گاڑی کا مالک اپنی گاڑی کے بدلے ماہانہ متعین رقم لینا طے کرتا ہے اور بقیہ سارا نفع ڈرائیور کا ہوتا ہے۔ یہ صورت بھی شرعاً اجارہ کے تحت آتی ہے اور جائز ہے، کیونکہ ڈرائیور نے گاڑی کے مالک سے گاڑی ایک متعین رقم کے بدلے کرایہ پر لے لی اور کرایہ داری کی مدت کے دوران خود اس پر اپنے لیے نفع کما رہا ہے۔

۳۔ نفع کی تقسیم کی تیسری صورت یہ ہے کہ مالک اور ڈرائیور آپس میں آدھا آدھا نفع لینا طے کر دیں۔ یہ صورت مضاربت کے تحت آتی ہے اور فقہاء حنابلہ کے ہاں اس کی اجازت ہے، بشرطیکہ ڈرائیور پر نقصان کی شرط عائد نہ کی جائے، بلکہ اگر نقصان ہوگا تو اسے پہلے نفع سے پورا کیا جائے گا، اگر نقصان، نفع سے زیادہ ہوگا گاڑی کا مالک برداشت کرے گا، جبکہ ڈرائیور کا عمل ضائع ہو جائے گا۔

اس جیسی بہت سی صورتیں آج کل رائج ہیں، اگر ان میں دیگر فقہاء کی رائے کو لیا جائے گا تو اس میں حرج لازم

آئے گا، اس لیے لوگوں کی سہولت کے لیے حنابلہ کی رائے کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ اخراجات

اس بات پر تقریباً تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ مضارب چونکہ اپنے نفع کے لیے عمل کر رہا ہے، اس لیے اصول یہی ہے کہ وہ اپنا نان و نفقہ اور خرچہ خود ہی برداشت کرے گا، لیکن اس کے باوجود فقہاء نے سفر کی صورت میں مضارب کو یہ حق دیا ہے کہ اگر مضارب کاروبار کے مقصد کے لیے کسی جگہ کا سفر کرتا ہے تو اس سفر کا خرچہ مضاربت کے مال سے وصول کر سکتا ہے، اور اگر اس کو دوران سفر رات گزارنی پڑی تو سفر کے خرچہ کے ساتھ اقامت کا خرچہ بھی مضاربت کے مال سے وصول کر سکتا ہے، لیکن اس کے لیے دو تین نکات ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

الف- ایک نکتہ یہ ہے کہ سفر کرنے کی صورت میں مضارب کا خرچہ مال مضاربت پر ہوگا، رب المال کے ذمہ لازم نہیں ہوگا، لہذا اگر فی الحال مال مضاربت سے خرچہ لینا ممکن نہ ہو تو مضارب اپنا مال خرچ کر کے بعد میں مضاربت کے مال سے وصول کرے گا، لیکن رب المال سے مطالبہ نہیں کرے گا۔

ب- دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مضارب اس خرچہ کا مستحق تب ہوگا جب اُس شہر میں اس کے اہل و عیال نہ ہوں جس شہر کی طرف اس نے سفر کیا ہے۔ اگر وہاں اس کے اہل و عیال ہیں تو ایسی صورت میں مضارب کا خرچہ خود اسی پر ہوگا۔

ج- جہاں تک خرچہ کی مقدار کی بات ہے تو اس بارے میں اصول یہ ہے کہ جو خرچہ تاجروں کے ہاں معروف ہے، صرف اتنا ہی لے گا، اسراف کی اجازت نہیں ہے، مثلاً پیسنے کا خرچہ، کھانے اور پینے کا خرچہ، فراش اور قیام کا خرچہ، بلکہ مضارب نے مضاربت کے لیے جو مزدور رکھے ہوں ان کا خرچہ بھی مضاربت کے مال سے لیا جائے گا۔

د- اگر مال مضاربت میں کچھ نفع ہوا ہے تو مضارب اپنا خرچہ اسی سے وصول کرے گا، اگر نفع نہیں ہے تو پھر اصل سرمایہ (اس المال) سے وصول کر سکتا ہے۔^(۱)

اس سلسلے میں فقہاء حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ اخراجات سے متعلق عقد مضاربت کے معاہدہ میں فریقین نے جو بھی صورت باہمی رضامندی سے طے کی ہو، اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ موجودہ دور میں آسانی کے لیے اس کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

وإذا اشترط المضارب نفقة نفسه صح سواء كان في الحضر أو السفر.^(۲)

^(۱) بدائع الصنائع ۶/۱۰۷

^(۲) المغنی ۵/۱۸۶

۸۔ نفع و نقصان کے اصول

۱۔ نفع کا وہی طریقہ اختیار کیا جائے جس کا تذکرہ شرکت میں ہو چکا ہے۔ یعنی حقیقی نفع کا فیصدی و مشاع طور پر نفع طے کیا جائے۔ متعین مقدار میں نفع طے کرنا درست نہیں ہے۔

۲۔ مضارب کے لیے نفع کے ساتھ ساتھ الگ سے تنخواہ مقرر کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ اس کی ایک صورت جائز ہے، وہ یہ کہ رب المال نے مضارب کو کسی اور کام کے لیے مزدور رکھا، جس کا مضاربت کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو اور اس کام کے ختم ہونے سے مضاربت پر یا مضاربت کے ختم ہونے سے اس کام پر کوئی فرق نہ پڑتا ہو، تو چونکہ یہ ایک الگ اور مستقل عقدِ اجارہ ہے، اس لیے یہ جائز ہے۔^(۱)

۳۔ اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو اس نقصان کو پہلے نفع سے پورا کیا جائے گا۔ اگر نقصان، نفع سے زیادہ ہے تو پھر اس المال سے پورا کیا جائے گا۔ مضارب کو نقصان کا ضامن نہیں بنایا جاسکتا، البتہ اس کا عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ مضارب پر نقصان کی شرط لگانا درست نہیں ہے۔^(۲)

۴۔ نفع کی تقسیم سے پہلے مضاربت کے ایک معاملہ کے تمام معاملات اور سودوں کا تصفیہ کیا جائے گا اور مکمل آمدنی سے تمام سودوں / معاملات کے نقصان کو پورا کیا جائے گا، اس کے بعد نفع تقسیم کیا جائے گا، البتہ اگر ایک مضاربت کا معاملہ مکمل ہو گیا اور پھر مضاربت کا دوسرا عقد کیا گیا تو مضاربت کے دوسرے معاملہ کا پہلے والے معاملہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوگا۔^(۳)

۵۔ نفع سے متعلق ایک سوال یہ بھی ہے کہ جب مضاربت کے کاروبار میں نفع ہو جائے تو کیا مضارب نفع میں اپنے طے شدہ حصہ کا اسی وقت مالک ہو جائے گا یا وہ باقاعدہ نفع کی تقسیم کے بعد اپنے حصہ کا مالک بنے گا؟ اس سلسلے میں فقہاء کی دو رائے ہیں:

۱۔ جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مضارب صرف نفع کے ظہور کے وقت اپنے حصہ کا مالک نہیں ہوگا، بلکہ جب نفع باقاعدہ تقسیم کیا جائے گا تو اس وقت مضارب اپنے حصہ کا مالک سمجھا جائے گا۔

۲۔ فقہاء حنابلہ کی رائے اور فقہاء شافعیہ کی ایک روایت یہ ہے کہ مضارب اسی وقت اپنے حصہ کا مالک ہو جائے گا

(۱) المعاییر الشرعية ص: ۱۴۰، رقم المعیار: ۱۳

(۲) مجلة الأحكام العدلیة، ص: ۲۵۵ المأذنة: ۱۳۲۷

(۳) المعاییر الشرعية ص: ۱۴۰، رقم المعیار: ۱۳

جب کار و بار میں نفع ظاہر ہو جائے، خواہ نفع تقسیم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔^(۱)

البتہ اس بات پر تقریباً تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ نفع کے بعد اگر کار و بار میں نقصان ہوگا تو اس نقصان کو پہلے نفع سے ہی پورا کیا جائے گا، خواہ فریقین نے نفع تقسیم کر لیا ہو یا نہیں۔

۹۔ مضاربتِ فاسدہ کا حکم

مضاربتِ فاسدہ کا مطلب یہ ہے کہ مضاربت کے لیے شریعت کی طرف سے مقرر کی گئی شرائط نہ پائی جائیں، یا اس میں خلافِ شرع شرط لگادی جائے یا نفع میں جہالت پائی جائے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً:

۱۔ ہر وہ شرط جس کی وجہ سے منافع میں جہالت لازم آرہی ہے یا منافع میں شرکت ختم ہو رہی ہے، اس کی وجہ سے مضاربت کا عقد فاسد ہو جائے گا۔ مثلاً کسی ایک کے لیے نفع کی خاص و متعین مقدار طے کر دی گئی تو مضاربتِ فاسد ہو جائے گی۔ یا فریقین میں سے کسی کے لیے نفع مبہم رکھ دیا گیا۔

۲۔ یا مضارب پر نقصان کی شرط عائد کی گئی۔

۳۔ یا رب المال نے مضارب کے ساتھ عمل کرنے کی شرط رکھ دی ہے۔ ان سب صورتوں میں مضاربت کا عقد فاسد ہو جائے گا۔^(۲)

مضاربتِ فاسدہ پر مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں:

• معاملہ فوراً ختم کیا جائے یا جس وجہ سے معاملہ فاسد ہوا ہے وہ وجہ ختم کر دی جائے۔
• اب تک مضارب نے جو عمل اور کار و بار کیا ہے وہ نافذ اور معتبر ہوگا۔

• کار و بار سے جو نفع ہوا ہے وہ سارا رب المال کو دیا جائے گا اور مضارب کو اجرت مثل دی جائے گی۔ یعنی اس طرح کے کام پر وہاں جو مزدوری/اجرت ملتی ہے، وہ اس کو دے دی جائے گی، لیکن اگر مضارب کے لیے طے کردہ نفع، اجرت مثل سے کم ہو تو پھر مضارب کو طے کردہ نفع کے برابر ہی اجرت ملے گی۔

• اگر مضاربتِ فاسدہ کے کار و بار میں سرے سے نفع ہی نہیں ہوا تو کیا مضارب کو پھر بھی کچھ نفع یا اجرت دی جائے گی یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں:

۱۔ امام محمدؒ کے رائے یہ ہے کہ مضاربتِ فاسدہ میں مضارب کو بہر صورت اجرت مثل دی جائے گی، خواہ کار و بار

^(۱) بدائع الصنائع ۱۰۷/۶، مغنی المحتاج ۳۱۸/۲

^(۲) مجلة الأحكام العدلیة ص: ۲۵۵ (المأذنة: ۱۳۲۶)

سے نفع حاصل ہوا ہے یا نہیں۔ لیونائے مضاربت فاسدہ کا نظم ایسا کہ فاسدہ کی طرف سے وہ اجاڑ دیا جائے گا۔
 کر لے تو اس کو بہر صورت اجرت مثل ملتی ہے۔

۲- امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں مضارب کو پتہ بھی نہیں ملے گا۔ وہ مضاربت فاسدہ
 مضاربت صحیحہ پر قیاس کرتے ہیں کہ اگر مضاربت صحیحہ میں نفع حاصل نہ ہو تو مضارب کو پتہ بھی نہیں ملتا۔ ان کے
 اس صورت میں بھی اسے کچھ نہیں ملے گا۔^(۱)

۳- فقہاء مالکیہ اور فقہاء شافعیہ سے دونوں اقوال منقول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ مضارب کو اجرت مثل ملتی ہے،
 جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ مضارب کو کچھ نہیں ملے گا۔^(۲)

۴- فقہاء حنابلہ سے دو روایات منقول ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ مضارب کو اجرت مثل دی جائے گی، جبکہ
 دوسری روایت یہ ہے کہ مضارب کو اجرت مثل اور ملے شدہ نفع میں سے جو کم ہو، وہ ملے گا۔^(۳)

راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر مضاربت فاسدہ کے کاروبار میں نفع نہیں ہوا تو مضارب کو پتہ بھی نہیں
 ملے گا، کیونکہ یہ عدل کے خلاف ہے، اس سے رب المال کو ضرر لاحق ہو رہا ہے۔ اس میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ
 مضاربت صحیحہ میں ایسی صورت میں مضارب کو کچھ نہیں ملتا، جبکہ مضاربت فاسدہ میں اسے اجرت مثل دی جا رہی ہے تو
 اس سے مضاربت فاسدہ کو زیادہ قوت اور ترجیح حاصل ہو جاتی ہے۔ مجملہ الاحکام العدلیہ میں بھی اسی قول کو اختیار کیا گیا ہے
 کہ ایسی صورت میں مضارب کو کچھ نہیں ملے گا۔

اسْتِحْقَاقُ رَبِّ الْمَالِ لِلرَّيْحِ هُوَ بِمَالِهِ فَلِذَلِكَ يَكُونُ جَمِيعُ الرِّيحِ لَهُ فِي الْمُضَارَبَةِ
 الْفَاسِدَةِ وَيَكُونُ الْمُضَارِبُ بِمَنْزِلَةِ أَجِيرِ الْمِثْلِ لَكِنْ لَا يَتَجَاوَزُ الْمِقْدَارَ الْمَشْرُوطَ حِينَ
 الْعَقْدِ وَلَا يَسْتَحِقُّ أَجْرَ الْمِثْلِ أَيْضًا إِنْ لَمْ يَكُنْ رِيحًا.^(۴)

• مضاربت فاسدہ میں اگر نقصان ہو جائے اور اس میں مضارب کی کوئی کوتاہی یا غفلت اور تعدی نہ ہو تو نقصان

کس کے ذمہ ہوگا؟ اس میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

(۱) بدائع الصنائع ۱۰۸/۶

(۲) بداية المجتهد ۲۴۲/۲، مغنی المحتاج ۲۱۵/۲

(۳) المغنی ۱۸۹/۵

(۴) مجلة الأحكام العدلیة ص: ۲۷۵، المأذة ۱۴۲۶

۱- جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ سارا نقصان سرمایہ فراہم کرنے والا (رب المال) برداشت کرے گا۔ یہی مضارب نے اس کی اجازت سے رقم کاروبار میں لگائی ہے۔

۲- امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں سارا نقصان مضارب ہی برداشت کرے گا، کیونکہ فساد کی وجہ سے عقد ختم ہو گیا تھا، لہذا مضارب کی حیثیت ”اجیر مشترک“ کی ہوگی اور نقصان اسی کے ذمہ ہوگا۔^(۱) مجلہ الاحکام العدلیہ میں جمہور کی رائے کو اختیار کیا گیا ہے:

المادة (۱۳۲۷) - إذا تلف مقدار من مال المضاربة فيحسب في بادي الأمر من الربح ولا يسري إلى رأس المال. وإذا تجاوز مقدار الربح وسرى إلى رأس المال فلا يضمنه المضارب سواء كانت المضاربة صحيحة أو فاسدة.^(۲)

۱۰- مضارب کی حیثیتیں

مضارب کے مختلف مراحل میں مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں، ہر مرحلہ میں اس پر وہی حکم لاگو ہوگا جیسی اس کی حیثیت ہوگی:

۱- امین: رب المال نے مضارب کو سرمایہ دے دیا اور مضارب نے ابھی کاروبار شروع نہیں کیا تو اس مرحلہ پر مضارب کی حیثیت صرف امین کی ہے، یہ سرمایہ اس کے پاس امانت رہے گا اور اس پر امانت کے احکام لاگو ہوں گے۔
۲- وکیل: اس کے بعد اگلا مرحلہ وکالت کا ہے، مضارب جب سرمایہ آگے کاروبار میں لگائے گا تو وکیل ہونے کی حیثیت سے لگائے گا اور وہ وکیل ہوگا۔

۳- شریک: جب کاروبار میں نفع ہو جائے تو چونکہ اس نفع میں مضارب بھی شریک ہوگا، اس لیے اس کے بعد کے مرحلہ میں مضارب کی حیثیت شریک کی ہوگی، اسی لیے نقصان پہلے نفع سے ہی پورا کیا جاتا ہے اور مضارب نفع کی حد تک نقصان میں بھی شریک ہوتا ہے۔

۴- اجیر: اگر مضاربت کا معاملہ کسی وجہ سے فاسد ہو جائے تو مضارب کی حیثیت اجیر کی ہو جائے گی اور اس کو اس کے عمل کے بدلے اجرت مثل ملے گی، جیسا کہ مضاربت فاسدہ کے تحت بیان ہو چکا ہے۔

۵- ضامن: اگر مضارب نے کسی بھی مرحلہ میں رب المال کی کسی شرط یا قید کی مخالفت کر دی اور اس کی وجہ

(۱) المغنی ۲/۵، بدائع الصنائع ۱۰۸/۶

(۲) مجلة الأحكام العدلیة ص: ۲۷۵

سے کاروبار میں نقصان ہو گیا تو مضارب ضامن ہوگا۔^(۱)

سابقہ پانچ احوال میں سے پہلی چار اقسام میں مضارب ”امین“ کے حکم میں ہوتا ہے، لہذا اگر کاروبار میں نفع و ادا وہ طے شدہ نفع وصول کرے گا، (سوائے چوتھی صورت کے، جس میں مضارب کو اجرت مثل ملے گی) اگر کچھ بھی نفع نہ ہوا تو اسے کچھ نہیں ملے گا اور اس کا عمل ضائع ہو جائے گا۔ اگر نقصان ہو گیا اور اس میں مضارب کی کوئی کوتاہی، غفلت یا تعدی نہ ہو تو سارا نقصان سرمایہ فراہم کرنے والے (رب المال) کے ذمہ ہوگا، مضارب پر نقصان نہیں آئے گا۔

۱۱۔ مضارب کے حقوق و فرائض

۱۔ مضارب پر مضاربت کے معاہدہ کی تمام جائز شرائط کی پابندی لازم ہے۔

۲۔ جس کاروبار کے لیے مضاربت کا عقد کیا ہے، مضارب وہ کاروبار کر سکتا ہے، اس کے لیے خرید و فروخت کر سکتا ہے، اگرچہ ادھار ہی ہو۔ کسی کی چیز اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ کسی کو خرید و فروخت کے لیے وکیل بنا سکتا ہے۔ کسی کے پاس مضاربت کا مال بطور حفاظت اور امانت رکھ سکتا ہے۔ دیگر کاروبار سے متعلق ضروری امور بھی سرانجام دے سکتا ہے، البتہ کسی کو مضاربت کی رقم قرض یا گفٹ نہیں دے سکتا۔

۳۔ اکثر فقہاء کے ہاں رب المال کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خود بھی کاروباری سرگرمی میں حصہ لے، بلکہ عمل صرف مضارب کرے گا، البتہ فقہاء متبادلہ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ موجودہ دور کے بڑے کاروبار میں ضرورت کے وقت اس قول کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ مضارب کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ وہ رب المال کے مال کی ضمانت لے، البتہ اپنی ذمہ داری اور کام کو مکمل اور درست طریقے سے کرنے کی گارنٹی دے سکتا ہے۔^(۲)

اس عنوان کے تحت مزید تین اہم سوالات کے جوابات ذکر کرنا ضروری ہیں:

۱۔ کیا مضارب صرف تجارت کرے گا؟

۲۔ کیا مضارب مختلف لوگوں کا مال ملا سکتا ہے؟

۳۔ کیا مضارب کسی کو مضاربت پر رقم دے سکتا ہے؟

^(۱) مجلة الأحكام العدلیة، ص: ۲۷۳ (المآذیة: ۱۳۱۲)

۱۔ کیا مضارب صرف تجارت کرے گا؟

مضاربت میں نفع کمانے کے لیے مضارب کیا کام کر سکتا ہے؟ کیا وہ صرف تجارت یعنی خرید و فروخت کے معاملات ہی کرے گا یا مال مضاربت سے کوئی چیز خرید کر اس میں کوئی عمل / کام کر کے بھی نفع کما سکتا ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

- ۱۔ فقہاء شافعیہ کے ہاں مضارب صرف تجارت (خرید و فروخت) کر کے ہی نفع کما سکتا ہے، تجارت کے علاوہ کوئی عمل کر کے نفع نہیں کما سکتا۔ اس کو فقہاء "اقتصار عمل المضارب فی التجارة" سے تعبیر کرتے ہیں۔
- ۲۔ فقہاء حنابلہ اور فقہاء مالکیہ کے ہاں مضارب پر صرف تجارت کر کے نفع کمانا لازم نہیں ہے، بلکہ وہ ہر ایسا عمل کر سکتا ہے جس سے نفع کمایا جاسکے، خواہ وہ عمل خرید و فروخت ہو یا کوئی اور عمل ہو، لہذا اگر خرید و فروخت کے بغیر ہی مضارب کے اپنے عمل سے نفع ہو رہا ہے تو بھی جائز ہے۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

وإن دفع رجل دابته إلى آخر ليعمل عليها وما يرزق الله بينهما نصفين أو أثلاثا أو كقيضا شرطاً صح. (۱)

اگر کسی نے دوسرے کو اس شرط پر اپنا جانور دے دیا کہ دوسرا اس جانور کے ذریعے عمل کرے گا اور اس سے اللہ جو بھی رزق عطا کرے گا وہ دونوں کے درمیان آدھا آدھا یاد اور ایک تہائی یا کسی بھی طرح تقسیم طے کر دیں تو یہ صحیح ہے۔

۳۔ جہاں تک فقہاء حنفیہ کی رائے ہے تو اس سلسلے میں فقہاء کی ذکر کردہ جزئیات سے درج ذیل اصول معلوم ہوتا

ہے:

ما كان من عمل التجار يملكه المضارب.

مضارب ہر وہ عمل کر سکتا ہے جو تاجر کرتے ہوں۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ مضارب وہ سارے کام کر سکتا ہے جو عرف اور معاشرے میں تجارت نفع کمانے کے لیے کرتے ہیں، خواہ خرید و فروخت کا معاملہ ہو یا کوئی اور۔ مثلاً اگر کسی نے دوسرے کو مال مضاربت دیا اور مضارب نے اس مال سے زمین اور بیج خرید کر کھیتی باڑی کر کے نفع کمایا تو یہ جائز ہے، کیونکہ زراعت بھی تاجروں کا ہی عمل ہے۔ اسی طرح اگر

مضارب نے مال مضاربت سے کچرا خرید کر، اُسے سی لیا اور فروخت کر کے نفع کما لیا تو یہ بھی جائز ہے۔^(۱)

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ فقہاء حنفیہ کے ہاں اس صورت میں بھی راس المال کی شرائط کا پایا جانا ضروری ہیں، جن میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ راس المال نقد ہو، کسی سامان وغیرہ کی شکل میں نہ ہو۔ اسی لیے علامہ ابن قدامہؒ کی ذکر کردہ صورت فقہاء حنفیہ کے ہاں جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ صورت حنفیہ کے ہاں مضاربہ نہیں ہے، بلکہ اجارہ ہے جس میں اجیر کی اجرت مجہول ہے۔

۲۔ کیا مضارب مختلف لوگوں کا مال ملا سکتا ہے؟

کیا مضارب کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مضاربت کا مال اپنے مال سے ملا دے یا کئی لوگوں سے حاصل شدہ مال کو آپس میں ملا دے؟ اس بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر رب المال کی اجازت ہے یا رب المال نے مضارب کو یہ کہہ کر آزادانہ اختیار دے دیا کہ جو تمہیں مناسب لگے وہ کر لے تو ایسی صورت میں مضارب کے لیے مضاربت کے مال کو اپنے مال یا دیگر لوگوں کے مال کے ساتھ خلط کرنا اور ملانا جائز ہے، ورنہ نہیں۔^(۲)

۲۔ فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں صرف ایک صورت میں اس کی اجازت ہے کہ مضاربت کے مال سے ابھی کاروبار شروع نہ کیا گیا ہو اور رب المال نے خلط اور ملانے کی اجازت دے دی تو پھر یہ عمل جائز ہے، لیکن اگر مال مضاربت سے کاروبار شروع ہو گیا، اس کے بعد یہ عمل جائز نہیں ہے، اگرچہ رب المال اجازت دے دے۔^(۳)

۳۔ فقہاء مالکیہ کے ہاں مضارب کے لیے اس عمل کی اجازت کے لیے تین شرائط ضروری ہیں:

الف۔ مال مثلی ہو، مثلاً گندم، کرنسی وغیرہ۔

ب۔ اس خلط میں فائدہ کی امید ہو، اگر فائدہ یقینی ہے تو پھر ان کے ہاں مختلف اموال کو ملانا ضروری ہے۔

ج۔ مال مضاربت سے ابھی کاروبار شروع نہ کیا گیا ہو، تاہم بعض فقہاء مالکیہ نے اس تیسری شرط کی نفی کی ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔^(۴)

^(۱) المبسوط ۷۳/۲۲

^(۲) حوالہ بالا ۲۸/۲۲

^(۳) المغنی ۱۷۵/۵

^(۴) الشرح الكبير مع حاشية الدسوقي ۲۶۸/۳

۳۔ کیا مضارب کسی کو مضاربت پر رقم دے سکتا ہے؟

کیا مضارب کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مضاربت کی رقم آگے کسی اور کو مضاربت پر دے دے؟ اس سلسلے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں اگر رب المال نے مضارب کو اس بات کی اجازت دی ہے یا رب المال نے مضارب کو آزادانہ تصرفات کا اختیار دے دیا ہے کہ جو اسے مناسب لگے وہ کرے تو ان دونوں صورتوں میں مضارب کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مضاربت کا مال آگے کسی اور کو مضاربت پر دے دے۔

۲۔ فقہاء شافعیہ اور مالکیہ کے ہاں اگر رب المال نے مضارب کو یہ اجازت دے دی ہے کہ وہ مال آگے کسی کو مضاربت پر دے سکتا ہے تو مضارب ایسا کر سکتا ہے، اس کے علاوہ کسی صورت میں وہ ایسا نہیں کر سکتا، خواہ رب المال نے اسے آزادانہ تصرف کا اختیار دیا ہو یا نہ دیا ہو۔^(۱)

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر مضارب نے مال آگے کسی کو مضاربت پر دے دیا اور نفع حاصل ہو گیا تو اس نفع کو کیسے تقسیم کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ تینوں نے آپس میں نفع کا جو بھی تناسب طے کیا ہو، اسی تناسب سے نفع تقسیم ہوگا۔ اگر صرف رب المال اور مضارب اول نے باہم نفع کا تناسب طے کر دیا اور پھر مضارب اول نے مضارب دوم کے ساتھ الگ عقد میں نفع کا تناسب طے کر دیا تو ایسی صورت میں رب المال کو اس کا حصہ ملنے کے بعد جو مال بچے گا اس میں مضارب اول اور مضارب ثانی طے شدہ تناسب سے شریک ہوں گے۔

۲۔ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ چونکہ مضارب اول نے کوئی مال نہیں لگایا اور نہ ہی اس نے کوئی عمل کیا ہے، اس لیے اس کو کچھ بھی نہیں ملے گا، بلکہ یہ سمجھا جائے گا کہ مضارب اول محض رب المال کا وکیل تھا جس نے رب المال کا مال آگے مضارب ثانی تک پہنچا دیا، لہذا مضارب اول کا کام ختم ہو گیا۔^(۲)

۱۲۔ شرکت و مضاربت کا اجتماع اور مضاربت مشترکہ

آج کل شرکت اور مضاربت کو جمع کر کے بھی کاروبار کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے سرمایہ فراہم کیا اور دوسرا اس سے عمل کر رہا ہے، دونوں نے مضاربت کا عقد کر لیا۔ بعد میں مضارب نے بھی اس کاروبار میں سرمایہ شامل کر لیا

(۱) فقہ المعاملات ۱/۲۲۲

(۲) فقہاء کی آراء اور حوالہ جات کے لیے دیکھیں: فقہ المعاملات ۱/۲۲۲

جس کی وجہ سے وہ اس کاروبار میں شریک ہو گیا تو اس کی وہ شیئیں بنیں جو مندرجہ ذیل ہیں، چنانچہ اس نے تقابلی لگائی ہے، اس لیے وہ شریک بھی ہے۔ لہذا وہ اپنے لیے مضاربت کے مال میں بلکہ مضاربت کے نفع اور اپنے حصے کے سرمایہ کا الگ سے نفع طے کر سکتا ہے، بشرطیکہ دوسرا فریق بھی راضی ہو۔^(۱)

جہاں تک ”مضاربت مشترکہ“ کی بات ہے تو اس سے مضاربت علی و بصورت مراد ہوتی ہے جس میں ارباب الاموال (سرمایہ فراہم کرنے والے) کئی ہوتے ہیں، جبکہ مضاربت لوئی ایک شخص یا ادارہ ہوتا ہے۔ فی نفسہ یہ لوئی ایسی صورت نہیں ہے جس میں مضاربت کے اصولوں کی خلاف ورزی پائی جاتی ہو، لہذا یہ صورت بھی شرعاً جائز ہے۔

استاذ محترم حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم اس کی تعریف اور شرعی حکم کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولیس عندهم ذکر للمضاربة الجماعية التي تضخ فيها أموال جمع كبير من الناس في وعاء واحد تديره مؤسسة مالية بصفة كونها مضاربة لجمع أرباب الأموال، ولكن ليس معنى ذلك أن مثل هذه المضاربة الجماعية لا تجوز في الشريعة الإسلامية؛ لأن الشريعة إنما مهدت أصولاً وأحكاماً للمضاربة، ومادامت هذه الأصول والأحكام محتفظة، فإن أي صورة جديدة لتطبيق مبدأ المضاربة جائزة في الشريعة الإسلامية.^(۲)

فقہاء کے ہاں اس طرح کے اجتماعی مضاربت کا ذکر نہیں ہے جس میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کسی ایک صندوق میں مال جمع کرتی ہے، جسے ایک ادارہ تمام سرمایہ کاروں کے لیے بطور مضاربت چلاتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرح کی مضاربت شریعت میں جائز نہیں ہے، کیونکہ شریعت نے مضاربت کے لیے اصول اور احکام دیے ہیں، جب تک ان اصولوں کی رعایت رکھی جائے گی تو مضاربت کی ہر نئی صورت شریعت میں جائز ہوگی۔

اس صورت کے بارے میں مجمع الفقہ الاسلامی نے ایک قرارداد منظور کی ہے، اس کا اہم حصہ یہ ہے:

۱۔ مشترکہ مضاربت یہ ہے کہ چند سرمایہ کاری کے بعد دیگرے کسی ایک شخص یا ادارہ کے پاس آتے ہیں اور اپنے اموال کی سرمایہ کاری کرتے ہیں، جبکہ عمل کرنے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جہاں مناسب سمجھے، سرمایہ کاری کرے اور اسے تمام اموال کو ملانے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔

(۱) فقہ المعاملات ۱/۲۳۶

(۲) بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۲/۱۶۳

۲- سرمایہ فراہم کرنے والے ارباب (اموال) کے اور سرمایہ فراہم کرنے والے کے درمیان مضارب اور مضراب ہے۔ اگر یہ مضارب ہی مال مضراب سے لے کر آئے ان دونوں کے درمیان مضاربت ہوگی۔

۳- مشتبہ مضاربت ان کے لیے جائز ہے۔ فقہاء کے بقول مضاربت میں متعہ و ارباب الاموال ہوتے ہیں۔^(۱)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مضاربت مشتبہ اور حرم میں سرمایہ فراہم کرنے والوں کے درمیان آپس سے تعلق اور ان کا مضارب کے ساتھ تعلق کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ان کے اگلے سے ان دونوں تعلقات کو الٹ الٹ دیکھتے ہیں:

۱- ارباب الاموال کا آپس میں تعلق:

سرمایہ فراہم کرنے والے (ارباب الاموال) کے درمیان آپس کے تعلق کے حوالے سے فقہاء مابنی و وراثت ہیں:

۱- فقہاء مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ تمام ارباب الاموال کے درمیان آپس میں شرکت ملکت ہے، لہذا ایسی صورت میں نفع سے مضارب کا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ حصہ تمام ارباب الاموال کے درمیان ان کے سرمایہ اور ملکیت کے تناسب سے تقسیم ہوگا، کیونکہ یہی شرکت ملکت کا اصول ہے۔

۲- فقہاء حنفیہ اور حنبلیہ کے ہاں ارباب الاموال کے درمیان یہ شرکت عقد ہے اور اس کی ذیلی قسم شرکت عنان ہے۔ فقہاء حنبلیہ شرکت میں شرکت کا، کے لیے نفع کے تناسب میں تفاوت اور فرق کی اجازت دیتے ہیں، لیکن مضاربت میں اس کی اجازت نہیں دیتے، جبکہ فقہاء حنفیہ مضاربت میں بھی یہ اجازت دیتے ہیں کہ تمام ارباب الاموال کے نفع کا تناسب مختلف رکھا جاسکتا ہے، لہذا اس صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مضارب، ارباب الاموال کے نفع کا تناسب مختلف رکھے، کسی کے لیے زیادہ تو کسی کے لیے کم۔

۲- ارباب الاموال اور مضارب کا تعلق:

سرمایہ فراہم کرنے والوں (ارباب الاموال) اور کام کرنے والے (مضارب/ادارہ) کے درمیان کا تعلق مضاربت ہے۔ اس سلسلے میں فقہاء شافعیہ نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ مضارب ہر سرمایہ کار (رب المال) کے ساتھ نفع کا اٹک تناسب رکھ سکتا ہے، مثلاً کسی سرمایہ کار کے مال میں اپنا نفع کم تو کسی کے ساتھ زیادہ نفع کا معاملہ کر سکتا ہے۔^(۲)

(۱) فتاویٰ و توضیحات مجمع الفقہ الاسلامی التابع لمنظمتہ المؤتمر الاسلامی ۱- ۱۲۴ (ص: ۲۱۴)

(۲) بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ۱۶۲/۲

۱۳۔ مضاربت کا اختتام

مضاربت کے اختتام کی بھی وہی صورتیں ہیں جو شرکت میں بیان ہو چکی ہیں، کہ جس کاروبار کے لیے مضاربت کا معاملہ شروع کیا تھا، وہ مکمل ہو گیا یا کسی فریق کا انتقال ہو گیا یا وہ وقت ختم ہو گیا جس وقت تک عقد مضاربت کو موقت کیا تھا، یا شرکاء نے خود ہی مضاربت ختم کر دی تو ایسی صورتوں میں اگر اثاثے نقد ہیں تو تقسیم کر دیں۔ اگر مضاربت کے اختتام پر اثاثہ جامد شکل میں ہیں تو مضارب کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ انہیں بیچ کر نقد میں تبدیل کر دے اور اس کے بعد اصل سرمایہ مالک کو دے کر بقیہ نفع طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لیں۔^(۱)

۱۴۔ مضاربت کے عمومی ضوابط

۱۔ پہلا ضابطہ: مضاربت کی بناء و بنیاد امانت پر ہے۔ لہذا اگر مضارب کے پاس کوئی چیز بغیر تعدی و کوتاہی کے ضائع ہو جائے تو وہ ضامن نہیں ہوگا:

• مبنی المضاربة على الأمانة

۲۔ دوسرا ضابطہ: مضاربت میں اصل عموم اور اطلاق ہے۔ اگر رب المال نے کسی خاص کاروبار یا شہر وغیرہ کی شرط نہیں لگائی تو مضارب ہر قسم کا کاروبار، ہر جگہ کر سکتا ہے۔

• الأصل في المضاربة العموم والإطلاق

۳۔ تیسرا ضابطہ: ہر ایسی شرط جس سے نفع میں جہالت لازم آئے، وہ مضاربت کو فاسد کر دیتی ہے۔ اسی جیسا ضابطہ یہ بھی ہے کہ: ہر ایسی شرط جو نفع میں شرکت کو ختم کرتی ہو، اس سے مضاربت فاسد ہو جائے گی، ورنہ نہیں۔ مثلاً رب المال نے یہ شرط لگائی کہ دس ہزار نفع میرا ہوگا، بقیہ مضارب کا۔ اس سے مضاربت فاسد ہو جائے گی، کیونکہ ممکن ہے کہ دس ہزار سے زیادہ نفع ہی نہ ہو تو نفع میں مضارب کی شرکت ختم ہو جائے گی۔

• كل شرط يوجب جهالة الربح يفسد المضاربة

• كل شرط يوجب قطع الشركة، فهو مفسد للمضاربة، وما لا فلا

۴۔ چوتھا ضابطہ: مضاربت فاسدہ پر اجارہ کا حکم لاگو ہوگا۔ یعنی نفع سارا رب المال کو طے گا اور مضارب کو اجرت

مثل دی جائے گی۔ اس ضابطہ کو یوں بھی بیان کیا گیا ہے: مضاربت فاسدہ، اجارہ بن کر منعقد ہو جاتا ہے۔

• حکم المضاربة الفاسدة حكم الإجارة

• المضاربة الفاسدة تنعقد إجارة

۵۔ پانچواں ضابطہ: ہر وہ شرط / عمل جس سے وکالت باطل ہوتی ہے، اس سے مضاربت بھی باطل ہو جائے گی۔
جیسے کسی ایک فریق کا انتقال ہو جائے، یا ممنون ہو جائے وغیرہ۔

• کل ما تبطل به الوكالة تبطل به المضاربة

۶۔ چھٹا ضابطہ: قراض (مضاربت) میں نفع کا حق عمل کے مکمل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اگر مضارب عمل کر کے نفع کمائے گا تو اس کے بعد ہی اس کو طے شدہ نفع ملے گا۔

• القراض لا يُستحق إلا بتمام العمل

۳۔ مزارعت کے اصولی مباحث (Share-Cropping)

مزارعت کے مباحث کو بنیادی طور پر مندرجہ ذیل دس (۱۰) عنوانات میں جمع کیا گیا ہے:

- | | |
|---------------------|-----------------------------|
| ۱۔ مزارعت کا تعارف | ۲۔ مزارعت کا حکم |
| ۳۔ فقہی تکلیف | ۴۔ مزارعت کے ارکان |
| ۵۔ مزارعت کی شرائط | ۶۔ پیداوار کی تقسیم کے اصول |
| ۷۔ مزارعت کی صورتیں | ۸۔ مزارعت فاسدہ کا حکم |
| ۹۔ فنح مزارعت | ۱۰۔ مزارعت کے جدید مسائل |

۱۔ مزارعت کا تعارف

مزارعت کا لفظ ”زرع“ سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں بیج بونا، کسی کو زمین بٹائی پر دینا۔ اس کی اصطلاحی

تعریف ”صاحب ہدایہ“ نے یوں کی ہے:

هي عقد على الزرع ببعض الخارج.^(۱)

یعنی زمین کی بعض پیداوار کو بطور عوض دیکر کھیتی پر عقد کرنا۔

مثلاً کوئی شخص زمین فراہم کرے اور دوسرا اس میں کاشت کاری کرے، پیداوار دونوں آپس میں تقسیم کریں تو

اس کو مزارعت کہتے ہیں۔ اسی کو بعض کتب میں ”مخابرہ“، بعض میں ”مخالقہ“ بھی کہا گیا ہے، جن کی کچھ وضاحت آگے آئے گی اور اہل عراق اس قسم کے عقد کو ”قرح“ کہتے تھے۔

مزارعت سے ملتے جلتے تین الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مخابرہ:

یہ لفظ ”خبرہ“ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں حصہ۔ مخابرہ اور مزارعت دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ مخابرہ کے بھی

یہی معنی ہے کہ زمین کو پیداوار کے کچھ حصے پر بٹائی پر دینا۔ بعض علماء نے دونوں میں یوں فرق بیان کیا ہے کہ مخابرہ میں بیج،

(۱) الهدایة فی شرح بداية المبتدی ۴ / ۳۳۷

عمل کرنے والے کی طرف سے ہوتا ہے، جبکہ مزارعت میں بیچ مالک زمین کی طرف سے ہوتا ہے۔^(۱)

۲۔ مساقات:

مساقات کا لفظ ”سقی“ سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں درختوں کو سیراب کرنا۔ فقہی اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو باغ/درختوں کی دیکھ بھال، حفاظت کرنے اور پانی وغیرہ دینے کے لیے اس شرط پر رکھنا کہ جو پھل حاصل ہوں گے اس کا بعض حصہ عامل (کام کرنے والے) کو اور بعض حصہ مالک کو ملے گا۔^(۲)

۳۔ محاقله:

یہ لفظ ”حقل“ سے بنا ہے، جس کے لغوی معنی کھیتی، کھیت یا زرعی زمین کے ہیں۔ بعض فقہاء اس لفظ کو بھی مزارعت ہی کے مفہوم میں لیتے ہیں، جبکہ اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مزارعت ایک خاص صورت کا نام ہے، جبکہ محاقله عام لفظ ہے، اس میں مزارعت کے علاوہ تین قسم کے معاملات شامل ہیں: ایک معاملہ یہ ہے کہ گندم کے بدلے کسی زمین کو کراہیہ پر لینا، یادینا۔ دوسرا یہ کہ کھیتی پکنے اور تیار ہونے سے پہلے بیچنا۔ تیسرا یہ کہ بالیوں اور خوشوں میں موجود گندم کو صاف گندم کے بدلے اندازے سے بیچنا۔ دوسرے معنی میں اس کو علماء نے ممنوع لکھا ہے۔^(۳)

۲۔ مزارعت کا حکم

اس عنوان کے تحت دو نکات پر گفتگو ہوگی:

الف۔ مزارعت کا اصل حکم

ب۔ مزارعت کا لزوم

الف۔ مزارعت کا اصل حکم:

عقدِ مزارعت کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں فقہاء کے چار اقوال ہیں:

۱۔ امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ عقدِ مزارعت جائز ہے۔ یہی رائے بعض شافعی علماء نے بھی اختیار کی ہے جیسے علامہ ابن المنذر، امام خطابی، امام ماوردی رحمہم اللہ۔ یہی رائے کئی صحابہ کی طرف بھی منسوب ہے جیسے حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت سعد رضی اللہ عنہم، اور کئی تابعین اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کی

(۱) الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۶ / ۲۳۹

(۲) حاشیة ابن عابدین ۱۸۱/۵

(۳) المبسوط للسرخسي ۲۳ / ۱۵ . الفقه الإسلامي وأدلته ۵ / ۱۶۱

بھی یہی رائے ہے۔

۲۔ امام ابوحنیفہ اور امام زفر رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ عقدِ مزارعت بالکل جائز نہیں ہے۔ یہی رائے حضرت عکرمہ، مجاہد اور علامہ نخعی رحمہم اللہ کی طرف بھی منسوب ہے۔

۳۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں عقدِ مزارعت کے جواز کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہیں:

الف۔ عقدِ مزارعت کو عقدِ مساقات کے ضمن میں کیا جائے۔ مثلاً کسی زمین میں درخت ہیں، ان درختوں کی دیکھ بھال کے لیے کسی کے ساتھ عقدِ مساقات کر لیا گیا تو اسی کے ضمن میں جس زمین میں درخت ہیں، اس کو مزارعت پر بھی دے دیا جائے۔

ب۔ مساقات (درختوں کی دیکھ بھال) اور مزارعت میں عمل کرنے والا ایک ہی ہو۔ الگ الگ افراد کے ساتھ الگ الگ معاملہ نہ کیا جائے۔

ج۔ مساقات اور مزارعت دونوں معاملات ایک ساتھ کیے جائیں، الگ الگ نہ کیے جائیں۔

د۔ معاملہ کرتے وقت عقدِ مزارعت کو مساقات پر مقدم نہ کیا جائے۔

ه۔ یہ بھی ضروری ہے کہ درختوں کی دیکھ بھال اور زمین کو آباد کرنا، دونوں کا الگ الگ کرنا ممکن نہ ہو۔

و۔ مزارعت میں بیج مالکِ زمین کے ذمہ ہوگا، عمل کرنے والے کے ذمہ نہیں ہوگا۔

۴۔ امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں بھی عقدِ مزارعت عام احوال میں درست نہیں ہے، البتہ دو شرائط پائی جائیں تو

پھر عقدِ مزارعت جائز ہے:

الف۔ عقدِ مزارعت کو مساقات کے ضمن میں کیا جائے، جیسے فقہاء شافعیہ کی رائے ہے۔

ب۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس زمین میں فصل کی پیداوار کے لیے عقدِ مزارعت کیا جا رہا ہے، وہ اس زمین کی

ایک تہائی حصے سے زیادہ نہ ہو جس پر مساقات کا عقد ہوا ہے اور جہاں درخت لگے ہیں۔^(۱)

اس اختلاف کے بنیادی اسباب دو ہیں:

۱۔ مزارعت کے سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث اور آثارِ بظاہر متعارض ہیں۔ کچھ احادیث سے اس کی ممانعت

معلوم ہوتی ہے، جبکہ بعض احادیث سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے فقہاء کے درمیان بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔

۲۔ دوسرا سبب عقدِ مزارعت کی کیفیت کی تعیین ہے۔ بعض نے اسے شرکت کی ایک نوع قرار دیا ہے، بعض نے

مضاربت اور بعض نے اجارہ اور اسی بنیاد پر اس پر جواز یا عدم جواز کا حکم لاگو کیا گیا ہے۔

جو حضرات مزارعت کے جواز کے قائل ہیں۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ مزارعت کا معاملہ کیا تھا اور ان کو زمینیں دے کر فصل کا ایک حصہ ان کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔^(۱)

۲۔ ان حضرات کی دوسری دلیل صحابہ کرام کا قولی و عملی اجماع ہے۔ صحابہ نے مزارعت پر عمل بھی کیا اور کسی سے اس کا انکار بھی ثابت نہیں ہے۔^(۲)

۳۔ تیسری دلیل عقلی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ مضاربت کی طرح مزارعت میں بھی ایک طرف سے مال (زمین) ہوتا ہے اور دوسری طرف سے عمل، لہذا جس طرح مضاربت جائز ہے، اسی طرح مزارعت بھی جائز ہے۔ اور دونوں کی لوگوں کو حاجت بھی پیش آتی ہے۔

جو حضرات مزارعت کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ حضرت ثابت بن ضحاک کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا اور اجارہ پر زمین دینے کی اجازت دی۔^(۳)

۲۔ اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے مخابرہ اور زمین کو آدھے یا چوتھائی وغیرہ پر بنائی پر دینے سے منع فرمایا ہے۔^(۴)

۳۔ ان حضرات کی تیسری دلیل یہ ہے کہ مزارعت کی حقیقت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ”قفیر الطمان“ کی خرابی پائی جاتی ہے، کیونکہ کام کرنے والے کو اسی کے عمل سے پیدا ہونے والی فصل سے اجرت دی جاتی ہے، لہذا یہ درست نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ یہ حضرات ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ اگر اس کو اجارہ قرار دیا جائے تو بھی یہ درست نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اس میں کام کرنے والے کی اجرت متعین و معلوم نہیں ہوتی۔^(۵)

(۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۵۱

(۲) المغنی ۴۱۸/۵

(۳) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۴۹

(۴) سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۴۰۶

(۵) بدایۃ المجتہد ۲/۲۷۶

لیکن مزارعت کو جائز کہنے والے حضرات کی رائے میں جن احادیث میں ممانعت موجود ہے، وہ یہ آیتوں میں ہیں۔ ان کی تاویل کی گئی ہے، جبکہ ”تفہیم الطحان“ کی تعامل و عرف کی وجہ سے مزارعت میں اجازت دے دینی گئی ہے یہ یہ مسئلہ اجارہ ہی نہیں ہے، بلکہ مضاربت کی طرح ہے، جس میں اس بات کی گنجائش ہے۔ اجرت کے مجبول ہونے کا جواب یہ ہے کہ یہ عقد مضاربت کے زیادہ مشابہ ہے، لہذا کام کرنے والے کے لیے فیصدی حصہ رکھنا کافی ہے۔

استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم فقہاء کی آراء اور دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وبالجملة؛ فالقول بجواز المزارعة هو القول المنصور بالأحاديث وتعامل الأمة المتواتر، وأما الأحاديث التي وردت النهي عن المزارعة فلا تخلوا من أمرين: إما هي تتعلق بصورة مخصوصة من المزارعة، وهي دفع الأرض بقدر مسعى غير شائع ممن الخارج، وإما هي محمولة على الإرشاد والمشورة، دون الحرمة.^(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مزارعت کے جواز کا قول ہی ایسا ہے جو احادیث اور امت کے متواتر تعامل سے مؤید ہے۔ جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جن میں مزارعت کی ممانعت آئی ہے تو وہ دو امور سے خالی نہیں ہیں: یا تو ان کا تعلق مزارعت کی ایک خاص صورت کے ساتھ ہے، اور وہ یہ ہے کہ زمین کو فصل کی ایک متعین، غیر مشترک حصے کے بدلے میں کاشتکاری کے لیے دینا۔ یا وہ احادیث ترغیب اور مشورہ پر محمول ہیں، حرمت پر محمول نہیں۔

ب- مزارعت کا لزوم:

فقہاء حنفیہ (جن کی رائے میں مزارعت جائز ہے) کی رائے یہ ہے کہ مزارعت میں جس شخص کی جانب سے بیج فراہم کیا جائے اس پر عقد مزارعت لازم نہیں ہے، لہذا وہ کسی بھی وقت عقد مزارعت ختم کر سکتا ہے، جہاں تک دوسرے شریک کی بات ہے تو اس کے حق میں یہ عقد لازم ہے، لہذا وہ بغیر کسی عذر کے یہ عقد ختم نہیں کر سکتا۔ تاہم متاخرین نے لکھا ہے کہ اگر دوسرے شریک نے کچھ کام کر لیا اور اس کے بعد بیج والے نے عقد ختم کیا تو عمل کرنے والے کو اس کے کام کی اجرت مثل دینی چاہیے۔^(۲)

فقہاء مالکیہ (جن کے ہاں صرف مساقات کے ضمن میں ہی عقد مزارعت درست ہے) کی اس سلسلے میں دو روایات ہیں: ایک روایت میں یہ ہے کہ صرف زبانی ایجاب و قبول سے ہی عقد لازم ہو جاتا ہے، جبکہ دوسری روایت میں یہ

(۱) تکملة فتح الملمہ ۱/۴۱۸

(۲) درر الحکام فی شرح مجلة الأحکام ۳/۶۷

ہے کہ صرف زبانی ایجاب و قبول سے عقد لازم نہیں ہوگا، بلکہ جب بل وغیرہ چلا کر باقاعدہ بیع بویا جائے تو اس سے بعد عقد لازم ہو جاتا ہے۔ پہلا قول راجح ہے۔^(۱)

۳۔ فقہی تکلیف

مزارعت کے عقد کی فقہی حیثیت فقہاء حنفیہ (جن کے ہاں عقد مزارعت درست ہے) کے ہاں یہ ہے کہ یہ ابتداء اجارہ ہے (کہ زمین میں کام کرنے کے لیے کسی کو اجیر رکھ لیا گیا) اور انتہاء شرکت ہے، کیونکہ آخر میں پیداوار میں دونوں شریک ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے فقہاء لکھتے ہیں کہ عقد مزارعت کے دو بنیادی احکام ہیں:

۱۔ حکم حالی: جیسے ہی عقد مزارعت وجود میں آجائے تو مزارع، زمین کی منفعت کا مالک ہو جاتا ہے، لہذا اسے کاشت وغیرہ کے لیے استعمال کر سکتا ہے اور مالک زمین، مزارع کے عمل کا مالک ہو جاتا ہے۔ گویا کہ یہ ابتداء میں جانیں سے اجارہ کا عقد ہے۔

۲۔ حکم مالی: جب پیداوار پک کر تیار ہو جائے تو مزارع اور مالک زمین دونوں اس فصل میں اپنے اپنے حصہ کے بقدر شریک ہو جاتے ہیں، اسی لیے یہ معاملہ انتہاء میں شرکت بن کر مکمل ہو جاتا ہے۔^(۲)

۳۔ مزارعت کے ارکان

عقد مزارعت کے بنیادی ارکان تو ایجاب و قبول ہیں، لیکن بعض فقہاء کے ہاں اس کے چار ارکان ہیں:

- | | |
|---------|---|
| ۱۔ زمین | ۲۔ بیج |
| ۳۔ عمل | ۴۔ آلہ جیسے ٹریکٹریا، بیل وغیرہ۔ ^(۳) |

۵۔ مزارعت کی شرائط

جن حضرات کے ہاں مزارعت کا عقد شرعاً جائز ہے، ان کے ہاں اس کے لیے مندرجہ ذیل چار قسم کی شرائط

ضروری ہیں:

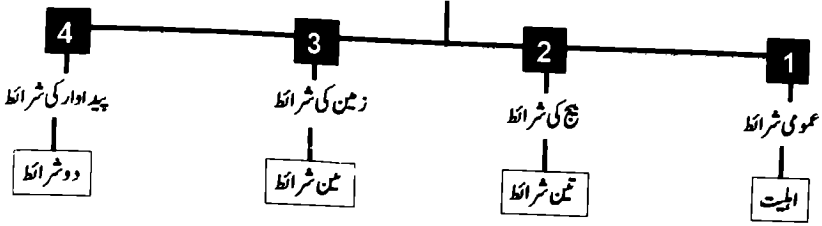
- | | | | |
|----------------|-----------------|------------------|---------------------|
| ۱۔ عمومی شرائط | ۲۔ بیج کی شرائط | ۳۔ زمین کی شرائط | ۴۔ پیداوار کی شرائط |
|----------------|-----------------|------------------|---------------------|

^(۱) فقہ المعاملات ۱/ ۶۰۵

^(۲) درر الحکام فی شرح مجلة الأحکام ۳/ ۴۶۷

^(۳) الدر المختار ۶/ ۲۷۴

مزارعت کی شرائط



۱۔ عمومی شرائط:

وہ تمام شرائط یہاں بھی ضروری ہیں جو کسی بھی عقد کے لیے ضروری ہوتی ہیں، جیسے عقد کرنے والے عاقل،

ممیز ہوں وغیرہ۔

۲۔ بیج سے متعلق شرائط:

الف۔ جس کے ذمہ بیج ہے اس کی تعیین کر دی جائے۔ یعنی یہ طے کیا جائے کہ فصل کے لیے بیج کون فراہم

کرے گا۔

ب۔ بیج کی جنس، نوع، صفت وغیرہ معلوم ہو۔ یعنی یہ طے کیا جائے کہ زمین میں کونسی فصل اگائی جائے گی اور

کس نوع کی فصل اگائی جائے گی، تاکہ اسی کے مطابق بیج فراہم کیا جائے۔

ج۔ بیج کسی ایک کی طرف سے ہو، دونوں کی طرف سے نہ ہو۔ اگر دونوں فریقین پر بیج کی شرط رکھ دی گئی تو اس

سے مزارعت کا معاملہ فاسد ہو جائے گا، البتہ فصل کی ادویات وغیرہ کے اخراجات کسی کے ذمہ یا مشترکہ طور پر براشت کیے جاسکتے ہیں۔ اس کی وجہ اور دلیل کے لیے تفصیلی کتب کی طرف مراجعت کریں۔

۳۔ زمین سے متعلق شرائط:

الف۔ زمین معلوم و متعین ہو۔

ب۔ زمین کھیتی کی قابل ہو۔

ج۔ جب مزارعت کا عقد ہو جائے تو اس کے فوراً بعد زمین خالی کر کے کاشتکار یعنی عمل کرنے والے کے حوالے

کر دی جائے۔

۴۔ پیداوار سے متعلق شرائط:

الف۔ پیداوار میں کس کا کتنا حصہ ہوگا، یہ شروع سے ہی طے کیا جائے، تاکہ ہر ایک کو اپنا حصہ معلوم ہو۔

ب۔ پیداوار مشترکہ ہونا ضروری ہے، کسی کے لیے متعین مقدار طے کرنا درست نہیں ہے۔ اس کی مزید

وضاحت اگلے عنوان کے تحت آرہی ہے۔^(۱)

۶۔ پیداوار کی تقسیم کے اصول

۱۔ پیداوار کی تقسیم کا اصول یہ ہے کہ یہ مشاعا ہو، یعنی نصف یا ثلث وغیرہ کے ذریعے تقسیم کی جائے یا فیصد کے طریقے کے مطابق تقسیم کی جائے، تاکہ پیداوار میں قطع شرکت لازم نہ آئے۔

۲۔ جس زمین کو مزارعت پر دیا جائے اسی کی فصل کی تقسیم ہو، کاشتکار کو اس کے عمل کے بدلے کسی اور زمین کی

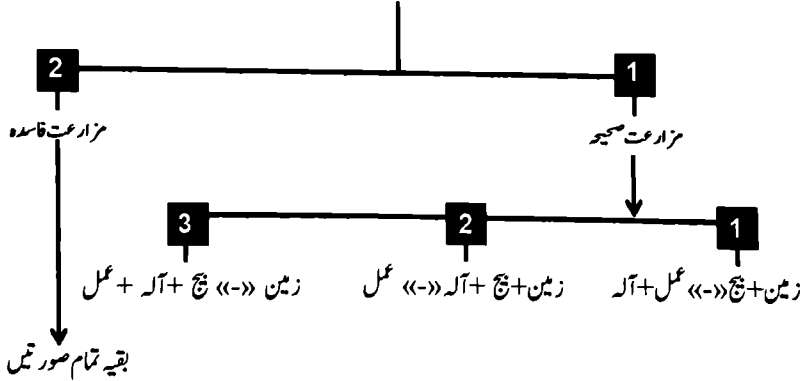
پیداوار یا کوئی اور چیز نہ دی جائے۔

۳۔ یہ تو اصل فصل سے متعلق اصول تھا، تاہم بھوسہ وغیرہ کی تقسیم میں کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے،

لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے اصل فصل میں قطع شرکت لازم نہ آئے۔^(۲)

۷۔ مزارعت کی صورتیں

مزارعت کی صورتیں



عقد مزارعت کی صرف تین صورتیں درست ہیں، جن کی نشاندہی اوپر کے نقشہ میں کئی گئی ہے، ان کے علاوہ

سب صورتوں میں مزارعت کا عقد فاسد ہوگا۔ ان صورتوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ زمین اور بیج ایک کی طرف سے ہو، جبکہ عمل اور آله، بیل وغیرہ دوسرے کی طرف سے ہو تو یہ جائز ہے۔

۲۔ یہ بھی جائز ہے کہ ایک فریق کی طرف سے صرف عمل ہو، دوسرے کی طرف سے بقیہ تین چیزیں ہوں،

^(۱) بدائع الصنائع ۱۷۶/۶

^(۲) درر الحکام فی شرح مجلة الأحکام ۴۶۹/۳

یعنی زمین، بیج، آلہ۔

۳۔ تیسری جائز صورت یہ ہے کہ زمین ایک کی طرف سے ہو، بقیہ تین چیزیں دوسرے کی طرف سے ہوں۔

یعنی عمل، بیج اور آلہ۔

ان کے علاوہ صورتیں درست نہیں ہیں، مثلاً:

• زمین اور آلہ ایک کی طرف سے ہو، اور عمل اور بیج دوسرے کی طرف سے ہو۔

• بیج اور آلہ ایک کی طرف سے ہو اور زمین و عمل دوسرے کی طرف سے ہو۔

• بیج ایک کی طرف سے ہو اور زمین، عمل اور آلہ دوسرے کی طرف سے۔ یہ اور ان کے علاوہ وہ سب صورتیں

درست نہیں ہیں جو اوپر کی تین صورتوں میں سے نہیں ہیں۔^(۱)

۸۔ مزارعتِ فاسدہ کا حکم

اگر عقدِ مزارعت میں سابقہ شرائط نہ پائی جائیں، مثلاً مزارعت کی کوئی ناجائز صورت اختیار کر لی گئی یا بیج دونوں کے درمیان مشترک طے پائی گئی، یا کسی ایک فریق کا حصہ متعین مقدار میں طے کیا گیا تو ان سب صورتوں میں مزارعت کا عقد فاسد ہو جاتا ہے۔ مزارعتِ فاسدہ کے احکام کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اگر عقدِ مزارعت کسی وجہ سے فاسد ہو اور کاشتکار نے ابھی کام شروع نہیں کیا، تو اسے کہا جائے گا کہ یہ عقد درست نہیں ہے، لہذا کام شروع نہ کرے۔

۲۔ اگر کام کر چکا ہے، فصل اگ آئی ہے تو ایسی صورت میں ساری پیداوار اس کی ہوگی جس نے بیج فراہم کیا تھا:

• اب اگر بیج، مالکِ زمین کی طرف سے ہے تو اس کے لیے ساری پیداوار حلال ہے اور عمل کرنے والے کو اس کے کام کی اجرت مثل دی جائے گی۔

• اگر بیج، عمل کرنے والے کی طرف سے ہے تو مالکِ زمین کو زمین کا کرایہ (اجرت مثل) دیا جائے گا، اگر زمین والے نے نیل یا ٹریکٹر فراہم کیا تھا تو اس کا بھی کرایہ ادا کرنا ہوگا، اور عمل کرنے والے کے لیے پیداوار میں صرف اتنی مقدار حلال ہے جتنا اس نے بیج دیا تھا اور جتنا اس نے زمین وغیرہ کرایہ ادا کیا ہے، اس کے علاوہ بقیہ پیداوار صدقہ کرے گا۔^(۲)

(۱) بدائع الصنائع ۶/۱۷۹

(۲) حوالہ بالا ۶/۱۸۲

۹۔ فسخ مزارعت

اس عنوان کے تحت ایک تو عقد مزارعت کے فسخ اور ختم ہونے کے اسباب کو بیان کیا جائے گا اور دوسرا مزارعت کو فسخ یا ختم کرنے پر جو احکام لاگو ہوتے ہیں، ان کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اس بحث کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

الف۔ اسبابِ فسخ مزارعت

ب۔ فسخ مزارعت کے احکام

الف۔ اسبابِ فسخ مزارعت:

عقد مزارعت کے فسخ اور ختم ہونے کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ صریح الفاظ سے فسخ کرنا: جب بیچ کا مالک یہ کہہ دے کہ میں اس عقد کو ختم یا فسخ کرتا ہوں یا اس جیسے الفاظ بولے جو عقد کو ختم کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو اس سے عقد ختم ہو جائے گا۔ اگر دوسرا فریق (جس کی طرف سے بیچ نہیں ہے) مزارعت کا عقد ختم کرتا ہے تو اس پر بذریعہ عدالت اس عقد کو جاری رکھنے کے لیے زبردستی کی جاسکتی ہے، تاہم اگر بیچ کا مالک بھی راضی ہو تو عقد ختم ہو جائے گا۔

۲۔ عجز: اگر عمل کرنے والا فریق کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے کام سے عاجز آجائے اور مزارعت کے عقد کو مزید جاری نہ رکھ سکے تو اس سے بھی عقد ختم ہو جاتا ہے۔

۳۔ مدت کا اختتام: عقد مزارعت کے لیے جو مدت طے کی گئی تھی، وہ مدت گزر جائے تو اس سے بھی عقد مزارعت فسخ یا ختم ہو جائے گا۔

۴۔ مالک زمین کی موت: جس فریق کی طرف سے مزارعت کے لیے زمین فراہم کی گئی تھی، اگر اس کا انتقال ہو جائے تو اس سے بھی عقد مزارعت ختم ہو جائے گا، خواہ بیچ کو کاشت کیا گیا ہو یا نہیں اور خواہ فصل نکل آئی ہو یا نہیں۔

۵۔ مزارع کی موت: جو فریق کام کر رہا ہے، اگر اس کا انتقال ہو جائے تو اس سے بھی عقد مزارعت ختم ہو جاتا ہے، خواہ فصل جیسی بھی ہو۔^(۱)

ب۔ فسخ مزارعت کے احکام:

جب عقد مزارعت کسی سبب کی وجہ سے فسخ اور ختم ہو جائے تو اس پر کیا احکام لاگو ہوں گے؟ ان احکام کا خلاصہ

سمجھنے کے لیے اس سوال کو دو حصوں میں تقسیم لیا جاتا ہے: ایک یہ کہ بیج کو بونے اور کاشتکاری سے پہلے ہی عقد مزارع ہو جائے اور دوسرا حصہ یہ ہے کہ بیج کو بونے اور کاشت کرنے کے بعد عقد کو فسخ لیا جائے۔ ذیل میں ۱۰ نوں حصوں نے اس پر بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ کاشت سے پہلے فسخ: اگر عقد مزارعت کو کسی بھی سبب سے فسخ بونے اور کاشت کرنے سے پہلے فسخ اور ختم کر دیا گیا تو ایسی صورت میں مزارع یعنی کام کرنے والے کو کچھ بھی نہیں ملے گا، خواہ مزارعت کو کسی بھی سبب سے فسخ کیا گیا ہو، اور خواہ مزارع نے زمین میں کچھ نہ کچھ کام کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مزارع کو عقد مزارعت کی وجہ سے صرف پیدا ہونے والی پیداوار میں حق حاصل ہوتا ہے جو کہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ البتہ فقہاء لکھتے ہیں کہ یہ قضاء کا حکم ہے، جہاں تک تقویٰ اور دیانت کا تقاضا ہے تو وہ یہ ہے کہ زمین والے کو چاہیے کہ مزارع نے جو تھوڑا بہت کام کیا ہے، اس کے بدلے اسے اجرت مثل یا کچھ نہ کچھ دیکر راضی کر لے۔

۲۔ کاشت کے بعد فسخ: اگر مزارع نے بیج بویا اور کاشتکاری کر لی، اس کے بعد کسی وجہ سے عقد مزارعت کو فسخ کر لیا گیا تو اگر فصل پک کر کٹنے کے قابل ہو چکی ہے تو اسے باہمی طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لیا جائے گا اور اگر فصل ابھی پکی نہیں ہے تو ایسی صورت میں مندرجہ ذیل تفصیل ہے:

الف۔ اگر عقد مزارعت کو صریح الفاظ سے ختم کیا گیا، یا عجز کی وجہ سے یا مدت کے مکمل ہونے کی وجہ سے معاملہ کو فسخ کر لیا گیا ہے تو ان سب صورتوں کا حکم یہ ہے کہ کچی کھیتی دونوں فریقین کے درمیان طے شدہ تناسب سے تقسیم ہوگی، لیکن فصل کو پکنے تک اسی زمین پر چھوڑا جائے گا اور جس وقت عقد ختم ہو گیا ہے، اس وقت سے لے کر فصل پکنے تک دونوں فریقین اپنے اپنے حصے کے بقدر کام کریں گے اور مزارع کا جتنا حصہ بنتا ہے، وہ اس حصے کی وجہ سے فصل پکنے تک مالک زمین کو زمین کا کر ایہ ادا کرے گا، کیونکہ مزارع نے اس کی زمین پر اپنی فصل لگائی ہے۔

ب۔ اگر کاشت کے بعد مالک زمین کا انتقال ہو جاتا ہے اور فصل پکی نہیں ہے تو عقد مزارعت کو باقی رکھا جائے گا اور مزارع اس فصل میں سابقہ عقد کے مطابق ہی کام کرے گا اور جب کھیتی پک جائے گی تو طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لی جائے گی۔ اگر مالک زمین کے ورثاء کچی فصل تقسیم کر کے عقد ختم کرنا چاہیں تو اس کی اجازت نہیں ہے اور اگر مزارع یہ چاہتا ہے کہ اسی حالت میں کچی فصل تقسیم کر کے عقد ختم کیا جائے تو مالک زمین کے ورثاء کو یہ اختیار ہوگا کہ یا تو اسی حالت میں کھیتی تقسیم کر لیں یا مزارع کو اس کے حصے کی قیمت دے کر اس کا حصہ خرید لیں یا فصل پکنے تک کسی اور کو مزدور رکھ کر بعد میں مزارع سے اس کے حصہ پر ہونے والا خرچہ طلب کر لے۔

ج- اگر کاشتکاری کے بعد مزارع کا انتقال ہو گیا اور فصل ابھی پختی ہے تو اس کے ورثاء اس زمین پر عمل کر کے مزارعت کو جاری رکھ سکتے ہیں، اگرچہ مالک زمین انکار کرے۔ اگر مزارع کے ورثاء کام سے انکار کریں اور عقد ختم کرنا چاہیں تو مالک زمین کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ یا تو اسی حالت میں فصل کاٹ کر طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لے یا مزارع کے ورثاء کو ان کے حصے کی قیمت دے کر ان سے حصہ خرید لے یا فصل پکنے تک کسی اور کو مزہ دور رکھ کر بعد میں مزارع کے ورثاء سے وہ خرچہ وصول کر لے جو ان کے حصہ پر ہوا ہے۔^(۱)

۱۰۔ مزارعت کے جدید مسائل

۱۔ مزارعت کے اخراجات:

مزارعت میں پیداوار پر ہونے والے اخراجات دو قسم پر ہیں:

اول: وہ اخراجات جو فصل پکنے سے پہلے فصل پر ہوتے ہیں، جیسے کھاد اور اسپرے وغیرہ۔

دوسرے: وہ اخراجات جو فصل پکنے کے بعد ہوتے ہیں جیسے فصل کی کٹائی، گہائی اور اٹھانے کی اجرت وغیرہ۔

دوسری قسم کے اخراجات تو بالاتفاق مالک زمین اور مزارع دونوں کے ذمہ ان کے پیداوار میں حصہ کے مطابق واجب ہوں گے، البتہ پہلی قسم کے اخراجات میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض فقہاء کرام نے یہ اخراجات بھی دونوں کے ذمہ ان کے پیداوار میں حصہ کے مطابق واجب کیے ہیں، جبکہ بعض کتب میں مزارعت کی مدت ختم ہونے سے پہلے عامل پر اور مدت ختم ہونے کے بعد دونوں پر واجب کئے ہیں۔ لہذا اگر مالک زمین اور مزارع دونوں باہمی رضامندی سے پیداوار میں اپنے حصہ کے مطابق یا کوئی ایک اپنے ذمہ لے لے، تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ فقہاء کرام نے اس صورت کے جواز کی صراحت کی ہے کہ مزارعت میں ایک آدمی کی طرف سے زمین اور تمام اخراجات ہوں اور دوسرے کی طرف سے صرف عمل ہو۔^(۲)

۲۔ مزارعت میں عشر کس کے ذمہ ہے؟

اگر عقد مزارعت شرعی اصولوں کے مطابق ہے اور فاسد نہیں ہے تو دونوں فریقین کو فصل کی طے شدہ مقدار دی جائے گی اور ہر فریق پر لازم ہوگا کہ حاصل ہونے والی فصل سے عشر یا نصف عشر خود ہی ادا کرے، لہذا ہر فریق پر اس کے حصے کا عشر واجب ہے۔

^(۱) بدائع الصنائع ۶/۱۸۵

^(۲) بدائع الصنائع ۱۴/۱۲، درر الحکام شرح مجلۃ الأحکام ۳/۵۰۲

اگر عقدِ مزارعت فاسد ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ جس کی طرف سے بیج ہے پیداوار اسی کی ہوگی اور تشریح میں اس ادا کرنا ہوگا، البتہ عشر ادا کرنے میں تفصیل یہ ہے کہ:

اگر بیج عامل (کاشتکار) کی طرف سے ہو تو وہ کل پیداوار سے اصل بیج کے بقدر اور مالکِ زمین اور عامل کے لیے اجرتِ مثل کی مقدار الگ کرے، اور جتنا حصہ اصل بیج، مالکِ زمین اور عامل کی اجرتِ مثل کے برابر ہو اتنے حصہ کا عشر ادا کرے، اور جو حصہ باقی بچے، چونکہ اس حصہ کو بلائیتِ ثواب صدقہ کرنا لازم ہے، اس لیے اس حصہ پر عشر واجب نہیں۔ اور اگر بیج مالکِ زمین کی طرف سے ہو تو وہ پیداوار سے عشر ادا کر کے بقیہ پیداوار خود رکھ سکتا ہے، اس پر بقیہ حصہ کو صدقہ کرنا لازم نہیں ہے۔^(۱)

۳۔ چرس، بھنگ، ایون کی کاشت:

چرس، بھنگ اور ایون کا جائز استعمال آج کل نہ ہونے کے برابر ہے اور حکومت کی طرف سے بھی ان کی کاشت و تجارت پر پابندی ہے، لہذا مذکورہ اشیاء کو کاشت کرنا یا ان کا کاروبار کرنا اور ان پر عقدِ مزارعت کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر کسی نے ایون اور بھنگ فروخت کر لی تو چونکہ فی الجملہ ان کا جائز استعمال بھی ممکن ہے، اس لیے اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو حرام نہیں کہا جائے گا، لیکن چرس چونکہ بطورِ نشہ صرف معصیت ہی میں استعمال ہوتی ہے اور نشہ کے عادی افراد ہی اسے خریدتے ہیں اور ہماری معلومات کے مطابق اس کا کوئی جائز مصرف موجود نہیں ہے، اس لیے اس کی تجارت ناجائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی حلال نہیں ہوگی اور نہ ہی اس پر عقدِ مزارعت کرنا درست ہوگا۔

۴۔ ٹیوب ویل کے پانی کی بنیاد پر مزارعت:

آج کل مزارعت کے نام سے ایک صورت یہ رائج ہے کہ جس شخص کی زمین میں ٹیوب ویل ہوتا ہے، وہ اس سے کسی دوسری زمین والے کو فصل کی سیرابی کے لیے پانی مہیا کرتا ہے اور اس کے بدلے میں فصل پیداوار میں ایک خاص حصہ وصول کرتا ہے۔ یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ اپنی زمین میں لگے ہوئے ٹیوب ویل سے دوسرے شخص کو صرف پانی فراہم کرنا شرکت اور مزارعت کے زمرے میں نہیں آتا، بلکہ درحقیقت یہ ”پانی کی بیع“ ہے جس میں ٹیوب ویل کا مالک اپنے ٹیوب ویل کے ذریعہ زمین سے پانی نکال کر اپنے حوض میں محفوظ کرنے کے بعد دوسرے کی زمین سیراب کرنے کے لیے دے رہا ہے، اور بیع میں قیمت کا اس طرح معلوم ہونا ضروری ہے کہ اس میں باعثِ نزاع غرر نہ ہو، یہاں چونکہ قیمت میں جہالت ہے، کیونکہ پہلے تو یہ یقینی نہیں کہ پیداوار ہوگی یا نہیں؟ اور اگر ہوگی تو یہ معلوم نہیں کہ

کتنی ہوگی؟ اس لیے قیمت مجہول ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ فاسد ہے، البتہ اس کی جائز صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ٹیوب میں
 کے پانی کے بدلے میں پیداوار میں شرکت کے بجائے متعین مقدار پانی کے عوض نقد رقم یا غلہ کی متعین مقدار طے کر لی
 جائے، جو زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ساتھ مشروط نہ ہو، بلکہ مطلقاً ہو، یعنی پیداوار ہو یا نہ ہو بہر صورت ٹیوب
 دہل کے مالک کو وہ طے شدہ غلہ یا قیمت طے اور اسے طلب کرنے کا حق ہو۔

۴۔ اجارہ کے اُصولی مباحث (Leasing)

اس حصے میں اجارہ (کرایہ داری) کے اُصولی مباحث و احکام کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ اس خلاصہ کو مندرجہ ذیل

دس (۱۰) نکات میں جمع کیا گیا ہے:

- | | |
|-----------------------------------|-----------------------------|
| ۱۔ اجارہ کا تعارف | ۲۔ اجارہ کا ثبوت |
| ۳۔ کراء الارض اور فقہاء کی آراء | ۴۔ اجارہ کی شرائط |
| ۵۔ اجارہ کی اقسام | ۶۔ اجرت کے اصول |
| ۷۔ عقدِ اجارہ کے موجبات اور تقاضے | ۸۔ اختتامِ اجارہ |
| ۹۔ اجارہ کے عمومی ضوابط | ۱۰۔ اجارہ کے چند جدید مسائل |

۱۔ اجارہ کا تعارف

اس کے عنوان کے تحت تین نکات کی تفصیل عرض کی جائے گی:

الف۔ اجارہ کا مفہوم

ب۔ چند اصطلاحات

ج۔ اجارہ کارکن

الف۔ اجارہ کا مفہوم:

جب کوئی شخص کسی چیز کو مستقل طور پر حاصل کرنا چاہتا ہے، اس چیز کی عین اور منفعت دونوں کا مالک بننا چاہتا ہے تو وہ اس چیز کو خرید لیتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص عارضی طور پر کسی انسان کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہے، یا کسی مکان یا سامان وغیرہ کو عارضی طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے تو وہ کسی انسان کو مزدوری اور مکان اور سامان وغیرہ کو کرایہ پر لیتا ہے۔ اسی کو "اجارہ" یعنی کرایہ داری کہتے ہیں۔

اجارہ کے لغوی معنی کسی کو پناہ میں لینے، کسی کی حفاظت کرنے، ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑنے یا کسی عمل کا بدلہ اور جزاء

دینے کے آتے ہیں۔ لغوی طور پر بعض نے اس لفظ کو مصدر اور بعض نے اس کو اجرت کا اسم قرار دیا ہے۔^(۱)
فقہاء نے اجارہ کی اصطلاحی تعریف مختلف الفاظ میں بیان کی ہے، تاہم معنوی طور پر تمام تعریفات کا حاصل اور
مفہوم ایک ہی ہے۔ فقہاء حنفیہ نے اجارہ کی تعریف یوں کی ہے:

هِيَ بِنَعْرِ مَنَفَعَةٍ مَعْلُومَةٍ بِأَجْرٍ مَعْلُومٍ.^(۲)

کسی معلوم منفعت (service) کو معلوم اجرت کے بدلے بیچنا اجارہ ہے۔

فقہاء حنابلہ نے بھی حنفیہ کی طرح اجارہ کی تعریف میں ”بیع“ کا لفظ استعمال کیا ہے، جبکہ دیگر ائمہ نے اجارہ کی
تعریف میں لفظ ”بیع“ کے بجائے عموماً لفظ ”عقد“ کا استعمال کیا ہے۔^(۳) اجارہ کی حقیقت تقریباً سب کے ہاں یہی ہے
کہ کسی سے معلوم و متعین معاوضہ لے کر اس کو معلوم و متعین سروسز و خدمات فراہم کرنا، خواہ کسی انسان کی منفعت اور
خدمات ہوں یا کسی مکان اور سامان وغیرہ کی۔

ب۔ چند اصطلاحات:

- ۱۔ اجارہ لازماً: ایسا اجارہ جس میں خیار عیب، خیار رویت وغیرہ نہ ہو اور فریقین بلا عذر اس کو ختم نہ کر سکے۔
- ۲۔ اجارہ منجزہ: وہ اجارہ جو فی الفور ہی منعقد ہو کر شروع ہو جائے، مستقبل کی طرف منسوب نہ ہو۔
- ۳۔ اجارہ مضافہ: وہ اجارہ جس کو مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف منسوب کیا جائے۔
- ۴۔ اجرت: کرایہ، تنخواہ اور سیرلی کو کہتے ہیں۔
- ۵۔ آجر: کسی مکان یا سامان وغیرہ کا مالک جو اس مکان وغیرہ کو کرایہ پر دیتا ہے۔
- ۶۔ ماجور / شی متاجر: اس مکان، سامان وغیرہ کو ”ماجور“ یا ”شی متاجر“ کہتے ہیں جس کو کرایہ پر دیا جاتا ہے۔
- ۷۔ متاجر: کرایہ دار، جو مالک سے کسی مکان وغیرہ کو کرایہ پر لیتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کو بھی ”متاجر“
کہتے ہیں جو کسی انسان کو مزدوری و تنخواہ پر رکھتا ہے۔
- ۸۔ اجیر: اس مزدور کو کہتے ہیں جو کسی کے لیے مزدوری و تنخواہ پر کام کرتا ہے۔
- ۹۔ اجرت مثل: اس تنخواہ یا کرایہ کو کہتے ہیں جو کسی عمل یا مکان وغیرہ کے لیے اس جگہ معروف ہو۔ کسی انسان

(۱) معجم مقاییس اللغة ۱/۶۳

(۲) البحر الرائق ۷/۲۹۷

(۳) حاشیہ قلبیوی ۳/۶۷، المغنی ۶/۶

سے عمل یا سہی مکان وغیرہ کی منفعت کی اجرت مثل وورق ذیل طریقوں سے معلوم کیا جاسکتا ہے:

الف۔ اس علاقے میں موجود اس موضوع کے ماہرین سے دریافت کیا جائے۔ ایسے ماہرین اس عمل اور منفعت کو دیکھ کر، کرایہ کی مدت کو دیکھ کر، اس انسان (مزدور) اور مکان کو دیکھ کر اپنے تجربہ اور علاقے کے عرف کی بنیاد پر کرایہ / مزدوری طے کرتے ہیں۔

ب۔ آجر اور اجیر / مستاجر خود ہی اتفاق کر لیں کہ اس عمل یا منفعت کی اجرت مثل اتنی ہے۔

ج۔ شرعی گواہوں نے گواہی دے دی کہ اس عمل یا منفعت کی اجرت مثل اتنی ہے۔^(۱)

ج۔ اجارہ کے ارکان:

عقد اجارہ کے ارکان کے سلسلے میں فقہاء کے دو نقطہ ہائے نظر ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں اجارہ کے ارکان صرف ایجاب و قبول ہیں۔ ان کے لیے متعین الفاظ نہیں ہیں، بلکہ جن الفاظ کو بھی عرف میں کرایہ داری اور ملازمت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، وہی ارکان ہیں، خواہ اجارہ، ایجار، استیجار وغیرہ کے الفاظ ہوں، کراء کے الفاظ ہوں یا کوئی اور۔^(۲)

۲۔ ائمہ ثلاثہ کی رائے یہ ہے کہ عقد اجارہ کے ارکان چار ہیں: ۱۔ عاقدان (دو معاملہ کرنے والے، یعنی موجد اور مستاجر)۔ ۲۔ صیغہ (ایجاب و قبول)۔ ۳۔ اجرت (کرایہ / تنخواہ)۔ اور ۴۔ منفعت۔^(۳) اس اختلاف کا بنیادی سبب وہی ہے جو ہم نے عقد بیع کے رکن کے تحت بیان کیا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔

۲۔ اجارہ کا ثبوت

اجارہ کی مشروعیت قرآن، حدیث اور فقہاء کے اجماع سے ثابت ہے:

۱۔ قرآن کی درج ذیل آیات سے اجارہ کا ثبوت ملتا ہے:

۵۔ ایک آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی اپنے والد سے عرض کر رہی ہے:

{قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ}^(۴)

^(۱) درر الحکام فی شرح مجلة الأحكام ۱/ ۲۴۸

^(۲) مغنی المحتاج ۲/ ۳۳۲

^(۳) بدائع الصنائع ۴/ ۱۷۴

^(۴) النقص: ۲۶

ان دونوں میں سے ایک لڑکی نے کہا کہ: بابا آپ انہیں نوکر رکھ لیجئے کہ آپ جسے بھی نوکر رکھنا چاہیں، ان میں سب سے بہتر وہ ہو گا جو صاحبِ قوت بھی ہو اور امانتدار بھی ہو۔
 اسی طرح ایک آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت حضرت علیہ السلام سے دیوار ٹھیک کرنے کے سلسلے میں اجرت لینے کی بات کر رہے ہیں:

{اَقَالَ لَوْ شِئْتُ لَاتَّخَذْتُ عَلَيْهِ اجْرًا^(۱)}

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ آپ چاہتے تو اس کی اجرت لے سکتے تھے۔

ایک اور مقام پر باری تعالیٰ ان شوہروں کو حکم دے رہے ہیں جنہوں نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہو کہ اگر ان کی بیویوں ان کے بچوں کو دودھ پلانے پر راضی ہو جائیں تو ان کی اجرت دے دیا کرو۔ فرماتے ہیں:

{فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَارْحَمْنَ أَخْوَهنَّ^(۲)}

پھر اگر وہ تمہارے بچوں کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دو۔

سابقہ تینوں آیات سے اجارہ کا ثبوت ملتا ہے، کیونکہ پہلی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بکریاں چرانے کا معاملہ اجرت معلومہ پر کیا تھا اور آٹھ سالہ خدمت کو نکاح کا مہر قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح دوسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا تھا کہ اگر آپ چاہتے تو جھکی ہوئی دیوار کو سیدھا کرنے پر اجرت لے سکتے تھے۔ اس سے بھی اجارہ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ تیسری آیت میں باری تعالیٰ نے دودھ پلانے والی عورت کی اجرت ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔

۲۔ احارث سے بھی اجارہ کا ثبوت ملتا ہے: سرور دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے:

أعط الأجير أجره قبل أن يجف عرقه.^(۳)

مزدور کو اس کی اجرت، پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دیا کرو۔

اسی طرح مدینہ کی طرف ہجرت کے دوران آپ ﷺ نے قبیلہ بنی دہل کے کسی آدمی کو اجرت پر راہنمائی کے

لیے مقرر کیا تھا۔^(۴)

(۱) الکہف: ۷۷

(۲) الطلاق: ۶

(۳) سنن ابن ماجہ ۲/۸۱۷، حدیث نمبر: ۲۴۴۳

(۴) صحیح البخاری ص: ۱۹۳، حدیث نمبر: ۲۲۶۳

۳۔ اجارہ کے جواز پر فقہاء کا اجماع ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

وأجمع أهل العلم في كل عصر وكل مصر على جواز الإجارة إلا ما يحكى عن عبد الرحمن بن الأصم أنه قال: لا يجوز ذلك لأنه غرر يعني أنه يعقد على منافع لم تخلق وهذا غلط لا يمنع انعقاد الإجماع.^(۱)

ہر زمانہ اور علاقہ کے اہل علم کا اجارہ کے جواز پر اجماع ہے، سوائے عبد الرحمن بن اصم کے، وہ فرماتے ہیں کہ اجارہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں غرر ہے کہ اس میں غیر موجود منافع پر عقد کیا جاتا ہے، لیکن یہ رائے درست نہیں ہے اور اجماع کے انعقاد کے لیے کوئی مانع نہیں ہے۔

۳۔ کراء الارض اور فقہاء کی آراء

”کراء الارض“ میں صحابہ، تابعین اور فقہاء کی آراء مختلف ہیں، کیونکہ اس سلسلے میں احادیث مختلف ہیں۔ اس لیے اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے اس کی کچھ وضاحت ضروری ہے۔ ”کراء الارض“ کی دراصل تین صورتیں ہیں:

• پہلی صورت: کسی کو زمین کاشتکاری کے لیے دی جائے۔ ایک فریق کی طرف سے زمین ہو اور دوسرے کی طرف سے عمل ہو اور مالک زمین اپنے لیے پیداوار کی ایک مخصوص مقدار یا زمین کے ایک خاص حصے کی پیداوار متعین کر دے۔ یہ صورت تمام ائمہ کے ہاں ناجائز ہے، کیونکہ اس میں پیداوار میں شرکت منقطع ہو رہی ہے، ممکن ہے مالک زمین نے اپنے لیے جتنی پیداوار خاص کی ہے، اس سے زیادہ فصل پیدا ہی نہ ہو۔ ممانعت والی احادیث سے عموماً یہی صورت مراد ہے۔

• دوسری صورت: زمین کسی کو مزارعت اور کاشتکاری کے لیے دی جائے، لیکن کوئی بھی فریق اپنے لیے فصل کی کوئی خاص مقدار یا متعین مقامات کی فصل کو خاص نہ کرے، بلکہ ہر فریق کے لیے فصل میں سے فیصدی تناسب سے حصہ مقرر کیا جائے، جیسے آدھا آدھا حصہ وغیرہ۔ اسی کو فقہی کتب میں ”مزارعت“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے جواز اور عدم جواز میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے جو ہم نے ”مزارعت“ کی بحث میں ذکر کر دیا ہے۔^(۲)

• تیسری صورت: زمین کسی متعین رقم یا کسی متعین چیز کے بدلے کسی کو کرایہ پر دی جائے۔ مثلاً سونا، چاندی، کرنسی یا کپڑوں وغیرہ کے بدلے میں ایک متعین مدت تک کسی کو زمین کرایہ پر دی جائے۔ اس صورت کے بارے میں

(۱) المغنی ۵/۶

(۲) تکملة فتنع الملبم ۱/۱۱۱

فقہاء کی دو آراء ہیں:

الف۔ پہلی رائے امام طاووس، حسن بصری، علامہ ابن حزم رحمہم اللہ کی ہے۔ ان کے ہاں زمین کو کرایہ پر دینے کی یہ صورت جائز نہیں ہے۔ یہی رائے عطاء، عکرمہ، مجاہد اور ابن سیرین رحمہم اللہ کی بھی ہے۔

ب۔ دوسری رائے جمہور علماء کی ہے، جن میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں۔ ان کے ہاں اجارہ کی یہ صورت جائز ہے۔ البتہ جمہور علماء میں بھی پھر مختلف آراء موجود ہیں، چنانچہ:

۱۔ ربیعہ الرای رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ زمین کو صرف سونا، چاندی کے بدلے کرایہ پر دینا جائز ہے۔

۲۔ امام مالک رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ کھانے، پینے کی اشیاء کے علاوہ ہر چیز کے بدلے زمین کو کرایہ پر دینا اور لینا

جائز ہے۔

۳۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ زمین کو ہر قسم کے مال کے بدلے میں کرایہ پر دینا جائز ہے، خواہ کرایہ سونا، چاندی کی شکل میں ہو، کسی کھانے، پینے کی چیز کی شکل میں ہو یا کرنسی وغیرہ کی شکل میں ہو۔

جن حضرات کے ہاں ”کراء الارض“ کی تیسری صورت جائز نہیں ہے، انہوں نے ممانعت والی احادیث سے

استدلال کیا ہے، جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ:

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنِ كِرَاءِ الْأَرْضِ. (۱)

رسول اللہ ﷺ نے کراء الارض سے منع فرمایا ہے۔

لیکن جمہور علماء ممانعت والی احادیث کو پہلی صورت پر محمول اور منطبق کرتے ہیں، کیونکہ دیگر کئی ایسی احادیث

ہیں جن میں باقاعدہ اس کی وضاحت بھی موجود ہے۔ (۲)

۳۔ اجارہ کی شرائط

اجارہ چونکہ ایک عقد و معاملہ ہے، اس لیے اس کے لیے بھی وہ تمام عمومی شرائط ضروری ہیں جو کسی بھی عقد کے

لیے ضروری ہوتی ہیں۔ فقہاء نے اجارہ کی شرائط کو تفصیل سے لکھا ہے اور کچھ شرائط میں فقہاء کا اختلاف بھی ہے، تاہم

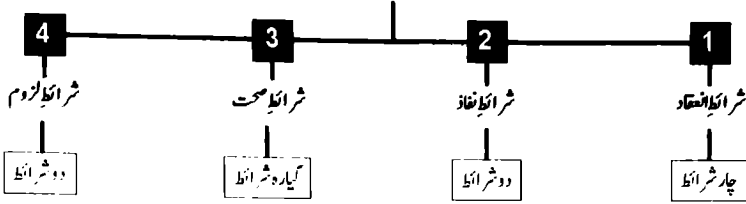
یہاں صرف فقہاء حنفیہ کے منہج کے مطابق اجارہ کی چار قسم کی شرائط کو ذکر کیا جائے گا:

(۱) صحیح مسلم ۱۱۷۸/۳، حدیث نمبر: ۱۵۳۶

(۲) سنن ابی داؤد ۲۶۸/۳، حدیث نمبر: ۳۳۹۳

- ۱۔ عقدِ اجارہ کے منعقد ہونے کی شرائط
- ۲۔ عقدِ اجارہ کے نافذ ہونے کی شرائط
- ۳۔ عقدِ اجارہ کے صحیح ہونے کی شرائط
- ۴۔ عقدِ اجارہ کے لازم ہونے کی شرائط

اجارہ کی شرائط



ہر قسم کی شرائط کی تفصیلات سے پہلے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہاں ”منعقد“، ”نافذ“، ”صحیح“ اور ”لازم“ کا وہی مفہوم ہے جو ہم نے بیع کی شرائط کے تحت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۱۔ عقدِ اجارہ کے منعقد ہونے کی شرائط

بیع کے سلسلے میں ایجاب و قبول کی جن شرائط کا تذکرہ ہو چکا ہے، وہ شرائط تقریباً اجارہ میں بھی ضروری ہیں، البتہ اجارہ کے منعقد ہونے کے لیے خاص چار بنیادی شرائط ہیں:

۱۔ عقدِ اجارہ کرنے والے فریقین عقلمند ہوں۔ لہذا پاگل اور ناسمجھ بچہ اگر اجارہ کا عقد کرے گا تو وہ منعقد نہیں ہوگا۔ البتہ مسلمان ہو نا، آزاد ہو نا اور بالغ ہو نا ضروری نہیں۔

۲۔ دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ ایجاب و قبول ایک دوسرے کے موافق ہوں۔ جس چیز کو کرایہ پر دینے یا لینے کے لیے ایجاب ہوا ہے، اسی چیز کو قبول کیا جائے۔ اسی طرح جس مقدار کے کرایہ پر ایجاب ہوا ہے، اسی کو قبول کیا جائے، ورنہ عقد منعقد نہیں ہوگا اور دوبارہ ایجاب کرنا ہوگا۔

۳۔ جس چیز کو اجارہ پر دیا جا رہا ہے وہ اس وقت موجود ہے۔ کسی معدوم چیز کو اجارہ پر دینا درست نہیں ہے۔

۴۔ جس چیز کو اجارہ پر دیا جا رہا ہے وہ قیمتی چیز ہو، لہذا غیر قیمتی یا جو چیز شریعت کی نظر میں مال ہی نہ ہو اس کو اجارہ پر دینا درست نہیں ہے۔

۲۔ عقدِ اجارہ کے نافذ ہونے کی شرائط

عقدِ اجارہ کے نافذ ہونے کی دو بنیادی شرائط ہیں:

۱۔ معقود علیہ (جس چیز کو کرایہ پر دیا جا رہا ہے وہ) کرایہ پر دینے والے کی ملکیت میں ہو یا اس کو مالک نے وکیل بنا دیا ہو، یا کرایہ پر دینے والا شخص، اصل مالک کا ولی ہو۔ اگر کسی فاضول اور غیر متعلقہ شخص نے اصل مالک کی اجازت کے بغیر اس کی چیز کسی کو کرایہ پر دے دی تو یہ معاملہ اصل مالک کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ عقدِ اجارہ میں خیار شرط نہ ہو۔ اگر کسی فریق نے اپنے لیے خیار شرط رکھا تو جب تک اختیار کی مدت باقی ہے، عقدِ اجارہ نافذ نہیں ہوگا۔

۳۔ عقدِ اجارہ کے صحیح ہونے کی شرائط

۱۔ عقدِ اجارہ کے صحیح ہونے کی ایک بنیادی شرط ”رضامندی“ ہے جو ہر معاملہ کے لیے شرعاً ضروری ہے۔ لہذا اگر کسی ایک فریق پر بھی زبردستی کی گئی ہو تو عقدِ اجارہ صحیح نہیں ہوگا۔

۲۔ معقود علیہ (جس چیز کو کرایہ پر دیا جا رہا ہے وہ) معلوم و متعین ہو۔ مثلاً تین مکانات میں سے کسی ایک غیر متعین مکان کو کرایہ پر دینا درست نہیں ہے، کیونکہ معقود علیہ معلوم و متعین نہیں ہے۔

۳۔ اجرت یعنی کرایہ / تنخواہ معلوم اور متعین ہو، اس کی جنس، صفت اور مقدار معلوم ہو۔

۴۔ جن منافع (services) کو کرایہ پر دیا جا رہا ہے، وہ معلوم ہوں۔

۵۔ اجارہ کی مدت متعین ہو۔ البتہ اجارہ کو مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف منسوب کرنا جائز ہے۔

۶۔ جس چیز کو کرایہ پر دیا جا رہا ہے، اس کے استعمال کا مقصد معلوم ہو۔ مثلاً حیوان کو بار برداری کے لیے لیا جا رہا ہے

یا کسی اور مقصد کے لیے؟

۷۔ کرایہ پر دی جانے والی چیز اور اس کی منفعت مباح ہو اور اجرت بھی حلال اور مال ہو۔

۸۔ معقود علیہ ایسی چیز ہو جس کو کرایہ پر دینے کا رواج اور عرف ہو۔

۹۔ مالک اس چیز کو کرایہ دار کے سپرد کرنے پر قادر ہو جس کو کرایہ پر دیا جا رہا ہے۔

۱۰۔ جس چیز کو کرایہ پر دیا جا رہا ہے، وہ اور اس چیز کا کرایہ دونوں ہم جنس نہ ہوں۔ اس شرط کو یوں بیان کیا جاتا

ہے کہ منفعت کے بدلے میں اسی جنس کی منفعت کا اجارہ درست نہیں ہے، البتہ اگر جنس تبدیل ہو جائے تو پھر جائز ہے۔

مثلاً ایک مکان کو ایک ماہ کے لیے کرایہ پر دوسرے کو دے کر، اس کے بدلے کرایہ دار کا مکان ایک ماہ کے لیے (بطور

اجرت) لینا درست نہیں ہے، کیونکہ دونوں طرف کی منفعت کی جنس ایک ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو مزدوری پر رکھا اور

اس کی اجرت کے طور پر اس کو کچھ عرصے کے لیے مکان استعمال کے لیے دے دیا تو یہ جائز ہے، کیونکہ ایک طرف کی

منفعت (مزدور کا عمل) دوسری طرف کی منفعت (مکان کے استعمال) سے مختلف ہے۔^(۱)

یہ فقہاء حنفیہ کی رائے ہے، جبکہ فقہاء مالکیہ کے ہاں منفعت (services) کے بدلے، منفعت کا بدلہ صورت درست ہے، اسی لیے فقہاء مالکیہ کے ہاں سابقہ دونوں صورتیں جائز ہیں، خواہ دونوں طرف کی منفعت کی صورتیں ایک ہو یا مختلف ہو۔^(۲) آج کل کے حالات میں حاجت کی وجہ سے اس قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے، کیونکہ خود فقہاء حنفیہ نے جس صورت کو ناجائز لکھا ہے، اس کی وجہ بھی عدم حاجت (حاجت نہ ہونا) ہی لکھی ہے۔

۱۔ صرف ایسی چیز کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے جو استعمال سے ختم نہ ہوتی ہو۔ جیسے زمین۔ لہذا گھاس کو کرایہ پر دینا

درست نہیں ہے۔^(۳)

۳۔ عقد اجارہ کے لازم ہونے کی شرائط

۱۔ معقود علیہ (جس چیز کو کرایہ پر دیا جا رہا ہے اس) میں ایسا عیب نہ ہو جو اس چیز سے منافع حاصل کرنے میں رکاوٹ بنتا ہو، جیسے ایسی چکی کو کرایہ پر دینا جس میں پانی نہ آتا ہو، یا مکان کرایہ پر دے دیا، لیکن وہ گر گیا۔

۲۔ کوئی ایسا عذر پیش نہ آجائے جس کی وجہ سے کسی فریق کو مجبوراً عقد ختم کرنا پڑے۔ اگر ایسا کوئی عذر پیش آگیا

تو عقد اجارہ لازم نہیں رہے گا۔^(۴)

۵۔ اجارہ کی اقسام

اجارہ کی اقسام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

الف- اجارہ کی قدیم اقسام

ب- اجارہ کی جدید اقسام

الف- اجارہ کی قدیم اقسام:

فقہاء نے اجارہ کی اقسام بیان کرتے ہوئے دو مناجج اور اسلوب اختیار کیے ہیں:

۱۔ پہلا اسلوب: مدت، اشارہ اور تعیین کا اعتبار کر کے

۲۔ دوسرا اسلوب: معقود علیہ پر نظر رکھتے ہوئے

(۱) درر الحکام فی شرح مجلة الاحکام ۵۲۳/۱

(۲) المدونة الكبرى ۲۶۶/۳

(۳) الفتاویٰ الہندیہ ۱۱۱/۴

(۴) بدائع الصنائع ۱۶۹/۳، الفتاویٰ الہندیہ ۱۱۱/۴

۱۔ پہلا اسلوب:

کچھ فقہاء نے اجارہ کی اقسام بیان کرتے ہوئے یہ اسلوب اور منہج اختیار کیا ہے کہ وہ اجارہ کی مدت، وقت اور عمل کی تحدید و تعیین کے اعتبار سے اجارہ کی مختلف قسمیں بیان کرتے ہیں۔ یہ اسلوب فقہاء شافعیہ، بعض حنفیہ اور بعض حنابلہ نے اختیار کیا ہے۔^(۱)

امام قدوریؒ نے اس اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے اجارہ کی تین قسموں کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ منافع معلومة بالمدّة: جس میں مدت اور وقت بیان کر کے منافع کو معلوم کیا جاتا ہے، جیسے زمین اور مکان کا اجارہ۔

۲۔ منافع معلومة بالعمل والتسمية: جس میں عمل اور منفعت کی وضاحت سے منافع کو معلوم کیا جاتا ہے، جیسے کسی کو کپڑا رنگنے کے لیے تنخواہ پر رکھنا یا کسی جانور کو خاص مسافت تک، خاص مقدار کی چیز لے جانے کے لیے کرایہ پر لینا۔

۳۔ منافع معلومة بالتعيين والإشارة: جس میں منافع کو تعیین اور اشارہ سے معلوم کیا جاتا ہے، مثلاً کسی کو یہ کہنا کہ یہ سامان وہاں تک سو روپے کے بدلے لے جاؤ۔^(۲)

۲۔ دوسرا اسلوب:

کچھ فقہاء نے اجارہ کے معقود علیہ میں غور و فکر کر کے اجارہ کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ معقود علیہ کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو اجارہ یا کرایہ پر دیا جا رہا ہے وہ کیا چیز ہے؟ اس اعتبار سے فقہاء نے اجارہ کی دو اقسام بیان کی ہیں:

۱۔ اجارة الاعیان

۲۔ اجارة العمل

اس اسلوب کو بھی کئی حنفیہ اور حنابلہ نے اختیار کیا ہے اور مجلہ الاحکام العدلیہ میں بھی اسی اسلوب کے مطابق اجارہ کی اقسام کو بیان کیا گیا ہے۔^(۳)

دوسرے اسلوب کی ترتیب کے مطابق ذیل میں اجارہ کی قدیم اقسام کا تذکرہ کیا جائے گا:

^(۱) نہایة المحتاج ۲۲۹/۵، المغنی ۷/۶

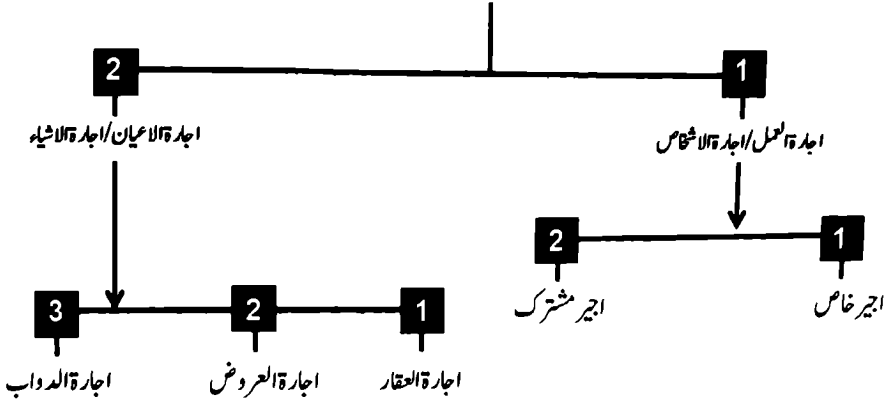
^(۲) مختصر القدوری ص: ۱۰۱

^(۳) بدائع الصنائع ۱۲۲/۳، کشف القناع ۳/۵۶۰

۱۔ اجارۃ العمل / اجارۃ الاشخاص (Employment)

۲۔ اجارۃ الایمان / اجارۃ الاشیاء (Leasing)

اجارہ کی قدیم اقسام



۱۔ اجارۃ العمل / اجارۃ الاشخاص (Employment Contract)

کسی انسان کے کام اور عمل کے بدلے میں اس کے ساتھ اجرت کا معاملہ کرنا۔ بالفاظ دیگر کسی انسان کو ملازمت و مزدوری پر رکھنا۔ مجملہ الاحکام العدلیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

عَقْدُ الْإِجَارَةِ الْوَارِدِ عَلَى الْعَمَلِ، وَهَذَا يُقَالُ لِلْمَأْجُورِ أَجِيرٌ كَمَا سَتَجَارِ الْخَدْمَةَ^(۱)

یہ ایسا اجارہ کا عقد ہے جو عمل پر ہوتا ہے، اس میں جس کو کرایہ پر رکھا جاتا ہے اس کو ”اجیر“ کہتے ہیں، جیسے کسی کی خدمات کو کرایہ پر لینا۔

اجارۃ العمل میں مزدور کو ”اجیر“ کہتے ہیں اور اجیر کی دو قسمیں:

الف۔ اجیر خاص

ب۔ اجیر مشترک

۱۔ اجیر خاص:

اس سے وہ مزدور مراد ہے جس کے ساتھ معلوم اور متعین مدت پر اجارہ کا معاملہ کیا جائے کہ وہ اس متعین وقت میں حاضر رہے گا اور مالک کو اس مکمل وقت میں مزدور کی خدمات حاصل کرنے کا حق ہوگا۔ علامہ ابن قدامہ نے

(۱) مجملۃ الاحکام العدلیہ ص: ۸۱ (المآذۃ ۳۲۱)

”اجیر خاص“ کی تعریف یوں کی ہے:

الخاص: هو الذي يقع العقد عليه في مدة معلومة يستحق المستأجر نفعه في جميعها كرجل استؤجر لخدمة أو عمل في بناء أو خياطة.^(۱)

اجیر خاص وہ ہے جس کے ساتھ مدت معلومہ کا عقد کیا جائے اور متاثر اس متعین وقت میں اس کے منافع کا حقدار ہوگا، جیسے کسی انسان کو کسی خدمت کے لیے یا کسی تعمیر کے لیے یا کپڑے سینے کے لیے مزدوری پر رکھ لیا جائے۔

اس قسم کے معاملہ میں اجیر کسی ایک فرد کا یا کسی ایک جماعت یا ادارہ کا مزدور ہوتا ہے، اس کے علاوہ متعین وقت میں وہ کسی اور کام نہیں کر سکتا۔ جیسے چوکیدار، سکول ٹیچر وغیرہ۔ یہ مزدور طے شدہ وقت میں کسی اور کام نہیں کر سکتا، اگر کر لیا تو اس کی تنخواہ میں کٹوتی کی جاسکتی ہے۔ ایسے مزدور کو تسلیم نفس یا وقت دینے کی اجرت ملتی ہے۔ یعنی اگر یہ متعین وقت میں حاضر رہا اور مالک نے اس سے کوئی کام نہیں لیا تو بھی اس کو مزدوری ملے گی۔ ایسا مزدور امین ہے، بلا غفلت و کوتاہی اس سے نقصان ہو جائے تو ضامن نہیں ہوگا۔

مجلد الاحکام العدلیہ میں ہے:

الْأَجِيرُ الْخَاصُّ أَمِينٌ. فَلَا يَضْمَنُ الْمَالُ الْهَالِكَ بِيَدِهِ بِغَيْرِ صُنْعِهِ وَكَذَلِكَ لَا يَضْمَنُ

الْمَالُ الْهَالِكُ بِعَمَلِهِ بِلَا تَعَدٍ.^(۲)

اجیر خاص امین کے حکم میں ہے، لہذا اس کے ہاتھ میں جو مال اس کے عمل کے بغیر ضائع ہو جائے، وہ اس مال کا ضامن نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر مال اس کے عمل سے، لیکن بغیر تعدی کے ضائع ہو جائے تو بھی وہ ضامن نہیں ہوگا۔

۲۔ اجیر مشترک:

اس سے مراد وہ مزدور ہوتا ہے جس کے ساتھ کسی خاص عمل اور کام پر اجارہ کا معاملہ کیا جائے۔ یا تو مدت کا سرے سے تذکرہ ہی نہ کیا جائے یا مدت کو بیان کر دیا جائے، لیکن مالک کو اس مکمل وقت میں مکمل طور پر خدمات کا حق حاصل نہ ہو، بلکہ مزدور اس وقت میں کسی اور کام بھی کر سکتا ہو۔ علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

^(۱) المغنی ۱۱۷/۶

^(۲) مجلة الأحكام العدلیة، ص: ۱۱۳ (المأذنة ۶۱۰)

المشترك الذي يقع العقد معه على عمل معين كخياطة ثوب وبناء حائط وحمل شيء إلى مكان معين أو على عمل في مدة لا يستحق جميع نفعه فيها كالكحل والطبيب.^(۱)

اجیر مشترک وہ ہے کہ جس کے ساتھ کسی متعین کام پر اجارہ کا معاملہ کیا جائے، جیسے کسی پڑے کو سینا، دیوار بنوانا، کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا۔ یا کسی مدت کے اندر کسی کام پر اجارہ کا معاملہ کیا جائے، لیکن مالک کو اس وقت میں مکمل نفع کا حق نہ ہو، جیسے آنکھوں کے ڈاکٹر یا عام طبیب کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرنا۔

ایسا مزدور ایک فرد یا جماعت کا مزدور نہیں ہوتا، بلکہ عوام کا مزدور ہوتا ہے اور ہر وقت ہر کسی کا کام کر سکتا ہے، جیسے دھوبی، درزی وغیرہ۔ اس کو اس کے عمل کے بدلے اجرت ملتی ہے، نہ کہ وقت کے بدلے۔ متفقہ میں علماء کا قول یہ تھا کہ یہ بھی امین ہے، لیکن حالات کو دیکھ کر متاخرین نے لکھا ہے کہ اس کا قبضہ، قبضہ امانت نہیں، بلکہ قبضہ ضمان ہے، لہذا اس کے پاس کوئی چیز ضائع یا خراب ہوگئی تو یہ بہر صورت ضامن ہوگا۔

مجلة الاحکام العدلیہ میں ہے:

الْأَجِيرُ الْمُشْتَرِكُ يَضْمَنُ الضَّرَرَ وَالْخَسَائِرَ الَّتِي تَوْلَدَتْ عَنْ فِعْلِهِ وَوَصْفِهِ إِنْ كَانَ يَتَعَدَّيْهِ وَتَقْصِيرِهِ أَوْ لَمْ يَكُنْ.^(۲)

اجیر مشترک اس ضرر اور خسارے کا ضامن ہوگا جو اس کے عمل سے وجود میں آجائے، خواہ اس نے تعدی و کوتاہی کی ہو یا نہ کی ہو۔

اجارۃ العمل کا عام ضابطہ یہ ہے کہ صرف ان کاموں پر اجارہ درست ہے جہاں منفعت مقصود ہو، معلوم ہو، قابل انتفاع ہو، عمل مباح ہو اور اس کا عوض متعین ہو۔ علامہ ابن عبدالبر اس ضابطہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وكل عمل فيه منفعة، وكان عمله مباحا، فحائز الإجارة فيه.^(۳)

اس کے علاوہ مزید تین نکات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

(۱) المغنی ۶/ ۱۱۷

(۲) مجلة الأحکام العدلیة ص: ۱۱۴ (المأذة ۶۱۱)

(۳) الکافی فی فقہ أهل المدينة ۲/ ۷۵۵

۱۔ اگر مزدور کو اجرت و تنخواہ کے بدلے کوئی کام سپرد کر دیا گیا اور یہ شرط لگائی گئی کہ مزدور خود اپنی ذمہ داری کرے گا تو ایسا مزدور یہ کام کسی اور سے نہیں کر داسکتا، بلکہ اس پر لازم ہو گا کہ خود ہی وہ کام کرے۔ البتہ اگر مالک نے مالک کی اجازت دے دی ہو اور خود کام کی شرط نہ لگائی ہو تو مزدور وہ کام کسی اور سے کر داسکتا ہے، جیسے آن کھل پینے، سینے، دالے کرتے ہیں کہ کسٹمر کے ساتھ ایک درزی معاملہ کرتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ وہی درزی ہی پینے سے ہی کمر دے گا۔^(۱)

۲۔ اگر کسی کو مزدور رکھا اور اس کے لیے کوئی اجرت و تنخواہ مقرر نہ کی گئی ہو تو ایسے مزدور کو اجرت مثل دی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی شخص سے کسی کام میں معاونت طلب کی گئی اور کوئی اجرت مقرر نہ کی گئی تو اس صورت میں بھی مدد کرنے والے کو اجرت مثل ملے گی، بشرطیکہ وہ شخص (مدد کرنے والا) عموماً اجرت پر کام کرتا ہو۔

۳۔ کسی کا مال بکوانے کے لیے خریدار مہیا کرنے پر اور کسی کو مال دلوانے پر کمیشن لینا اور دینا فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ کمیشن پہلے سے طے شدہ ہو اور اس میں غلط بیانی اور دھوکہ دہی سے کام نہ لیا جائے۔ اسی طرح بیچنے والی اور خریدنے والی دونوں پارٹیوں کے درمیان اگر معاملہ کروانے کی کوشش کی ہو تو دونوں پارٹیوں سے بھی طے شدہ کمیشن لینا جائز ہے۔^(۲)

یہاں دو اصولی باتیں قابل ذکر ہیں:

۱۔ مدت اور عمل کا اجتماع

۲۔ طاعت اور معصیت پر اجرت

۱۔ مدت اور عمل کا اجتماع:

اصول یہ ہے کہ اجیر خاص کے عمل کے لیے وقت بیان کرنا ضروری ہے، جبکہ اجیر مشترک کے لیے صرف اس کے عمل اور منفعت کو بیان کرنا ضروری ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی اجیر اور مزدور کے ساتھ عقدِ اجارہ کا معاملہ کرتے وقت مدت اور عمل دونوں کو بیان کر دیا جاتا ہے، مثلاً کسی کو ایک دن کے لیے کپڑا سینے کے لیے مزدور رکھنا۔ اس قسم کے معاملہ کی شرعی حیثیت پر فقہاء نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس بارے میں فقہاء کی تین آراء ہیں:

۱۔ امام ابو حنیفہؒ، فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ یہ صورت ممنوع ہے اور یہ اجارہ فاسدہ ہے۔ اس رائے

^(۱) مجلة الأحكام العدلیة، (المأذة ۵۶۲) تا (المأذة ۵۸۱)

^(۲) حاشیة ابن عابدین ۶۳/۶

کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں غرر لازم آتا ہے۔ مذکورہ صورت میں غرر کا مفہوم مندرجہ ذیل ہے:

الف- ایک احتمال تو یہ ہے کہ اجیر/مزدور نے وقت سے پہلے ہی عمل کر لیا۔ ایسی صورت میں اگر بقیہ مدت میں وہ کام نہیں کرے گا تو جس وقت کے لیے اس کو مزدور رکھا تھا، اس مکمل وقت میں اس نے کام نہیں کیا، بلکہ کچھ وقت میں کام کیا اور کچھ وقت میں کام نہیں کیا۔ اور اگر بقیہ مدت میں بھی کام کرے گا تو اس پر اضافی کام اور عمل لازم آئے گا جس کا عقد میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔

ب- دوسرا احتمال یہ ہے کہ مزدور نے بیان کردہ وقت میں مکمل کام اور عمل نہیں کیا۔ ایسی صورت میں اگر اس پر مزید وقت میں کام کی تکمیل کو لازم کیا جائے گا تو اضافی وقت لازم آئے گا اور اگر مزید وقت لازم نہیں کیا جائے گا تو کام اور عمل ادھورا رہے گا۔

ج- امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں معقود علیہ مجہول ہے، کیونکہ مدت اور عمل دونوں کو جمع کر دیا گیا اور دونوں میں سے کوئی چیز معقود علیہ ہے جس پر اجارہ ہوا ہے، یہ معلوم نہیں ہے۔^(۱)

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

ومتى تقدرت المدة لم يجز تقدير العمل وبهذا قال أبو حنيفة و الشافعي؛ لأن

الجمع بينهما يزیدها غررا۔^(۲)

۲- امام ابو یوسف، امام محمدؒ اور فقہاء شافعیہ کے ایک قول کے مطابق یہ صورت جائز ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس صورت میں اصل معقود علیہ عمل ہے، جہاں تک مدت اور وقت کی بات ہے تو یہ صرف تعجیل اور جلدی کام کرنے کے لیے طے کیا گیا ہے، لہذا اگر مزدور نے وقت مقررہ پر کام مکمل نہیں کیا تو دوسرے وقت میں کام مکمل کرنا ہوگا، کیونکہ کام اور عمل ہی معقود علیہ ہے۔^(۳)

۳- فقہاء مالکیہ کی رائے سابقہ دونوں آراء سے مختلف ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ جو وقت مقرر کیا گیا ہے، اگر وہ عمل کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے، جس میں آسانی سے عمل مکمل ہو کر مزید وقت بچ سکتا ہے تو یہ صورت جائز ہے، لیکن اگر عمل کے مقابلے میں وقت اتنا تنگ ہے جس میں مقررہ کام مکمل ہونا مشکل ہے تو یہ صورت درست نہیں ہے۔ اگر

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۸۵

(۲) المغنی ۶/۷

(۳) بدائع الصنائع ۲/۱۸۵، نہایۃ المحتاج ۵/۲۸۱

وقت اور عمل دونوں برابر ہیں کہ اتنا وقت ہے جس میں صرف عمل کی تکمیل ممکن ہے تو اس کے جواز اور عدم جواز میں دونوں اقوال موجود ہیں۔^(۱)

معلیٰ شریعہ میں اس صورت کی اجازت دی گئی ہے اور یہ رائے اختیار کی گئی ہے کہ اگر اجیر مشترک کے کام اور منفعت کے لیے وقت مقرر کیا گیا اور اس نے وقت مقررہ پر کام مکمل کر لیا تو اسے مکمل اجرت ملے گی، لیکن اگر اس نے وقت مقرر میں مکمل کام نہ کیا تو اس کی دو صورتیں ہیں:

الف- اس نے جتنا کام کیا ہے، اگر اس کام سے کسی بھی قسم کا انتفاع حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو اجیر مشترک کسی قسم کی اجرت کا مستحق نہ ہوگا۔

ب- اگر اس نے جتنا کام کیا ہے وہ کسی نہ کسی صورت میں انتفاع کے قابل ہے، لیکن مالک مزید مہلت دینے پر راضی نہیں ہے تو اجیر مشترک کو اجرت مثل دے کر فارغ کر دیا جائے گا۔

يجوز تحديد المنفعة بالعمل أو بالمدة، كما يجوز التحديد بهما، فإن أنجز العمل في المدة استحق جميع الأجر، أما إذا أنجز بعض العمل في المدة، فينظر إن كان لا ينتفع بالعمل بعد انقضاء المدة فإنه لا يستحق شيئاً، وأما إن كان ينتفع بما عمله ولم يرض المستاجر بتمديد المدة يستحق أجره المثل.^(۲)

۲- طاعت اور معصیت پر اجرت:

۱- اجرت علی الطاعات: عبادات (جیسے نماز پڑھانے، اذان دینے، قرآن کی تعلیم دینے وغیرہ) پر حنفیہ کے اصل مسلک کے مطابق اجرت لینا درست نہیں ہے، لیکن متاخرین نے ضرورت کے تحت صرف ان طاعات پر اجرت لینے کی گنجائش دی ہے جن میں خلل و تعطل کا اندیشہ ہو، جیسے امامت، اذان اور تعلیم قرآن (تاہم تلاوت قرآن اس میں داخل نہیں ہے)۔ حنابلہ کے ہاں اس سلسلے میں دونوں روایتیں ملتی ہیں۔ شوافع کے ہاں شعائر پر اجرت لینا درست ہے، فرائض پر اجرت لینا درست نہیں ہے۔ حضرات مالکیہ کے ہاں مطلقاً ان پر اجرت لینا درست ہے۔ تفصیل کے لیے مطول کتب کی طرف مراجعت کریں۔^(۳)

^(۱) مواہب الجلیل ۵/۳۱۰

^(۲) المعاییر الشرعیة ص: ۸۵۴، رقم المعیار: ۳۴

^(۳) الفقہ علی المذاهب الأربعة ۳/۵۸

۲۔ اجرت علی المعصیت: کسی گناہ کے کام پر کسی کو مزدور رکھنا (جیسے کسی کو کاناگانے کے لیے کرایہ پر لے لیا یا کسی گنہگار چیز (مثلاً آلاتِ غنا وغیرہ) کو کرایہ پر دینا حرام ہے۔ اگر کسی نے ایسا اجارہ کر لیا تو ایسی صورت میں اجرت کا لیا لیا جائے؛ حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ جس سے اجرت لی ہے، اسی کو واپس کی جائے، تاہم علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیمؒ کی رائے یہ ہے کہ ایسی اجرت صدقہ کر لی جائے۔ یہی رائے زیادہ مناسب ہے۔ اس کی مزید تفصیل کتاب کے آخری باب میں "مالِ حبیثہ" کے مقالہ میں آئے گی۔

۲۔ اجارۃ الاعیان / الاشیاء (Leasing)

کسی زمین، مکان، عین / چیز کی منفعت یا استعمال کے بدلے خاص وقت تک اجرت کا معاملہ کرنا۔ یعنی کسی مکان، سامان وغیرہ کو کرایہ پر لینا / دینا۔ مجلہ الاحکام العدلیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

عَقْدُ الْإِجَارَةِ الْوَارِدِ عَلَى مَنَافِعِ الْأَعْيَانِ.^(۱)

اجارۃ الاعیان ایسا عقد ہے جو اشیاء کے منافع پر ہوتا ہے۔

اس کی تین ذیلی اقسام ہیں:

الف۔ اجارۃ العقار: کسی زمین، مکان وغیرہ کو کرایہ پر دینا:

اس قسم کے اجارہ میں منافع کو معلوم کرنے کے لیے صرف "مدت" کا بیان کر دینا کافی ہے، خواہ مدت لمبی ہو، چھوٹی ہو، خواہ مستقبل کی طرف منسوب کیا جائے یا فی الحال عقد کر لیا جائے، ہر صورت جائز ہے۔ مکان اور دکان وغیرہ میں چونکہ عرف و عادات اور آس پاس کے معاشرے سے مقصد استعمال متعین ہو جاتا ہے، اس لیے مقصد استعمال کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہے، جبکہ زمین کے لیے مدت کے ساتھ باقاعدہ مقصد استعمال کو ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ زمین کو کس کام اور مقصد کے لیے اجارہ پر لیا جا رہا ہے۔

ب۔ اجارۃ العروض: کسی سامان، مثلاً برتن، کپڑوں وغیرہ کو کرایہ پر دینا:

جہاں تک عروض اور سامان کے اجارہ کی بات ہے تو اس میں بھی اس کی بناؤٹ وغیرہ سے مقصد استعمال معلوم ہو جاتا ہے، لہذا عقد میں مقصد استعمال کا تذکرہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

ج۔ اجارۃ الدواب: حیوانات کو کرایہ پر دینا:

جہاں تک جانور اور آج کل کی گاڑی کے اجارہ کی بات ہے تو اس سلسلے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ ان کے منافع کو

(۱) مجلة الأحكام العدلیة ص: ۸۱ (المأذوذ ۲۲۱)

معلوم کرنے کے لیے، چیزوں کو عقد میں لانا، گناہ اور بی بی ہے:

۱۔ بیان مقصد، اور جانور، اور بی بی کے لیے۔ اور یہ ایسا جارہا ہے یا اور بی بی وغیرہ کے لیے۔

۲۔ بیان مدت یا بیان مسافت، ۱۰۰ نوسوں بیان گناہ اور بی بی نہیں ہیں، بلکہ ۱۰۰ نوسوں میں سے کوئی ایک بہت ہوتی ہے

کہ مدت بیان کر دی جائے یا مسافت۔^(۱)

اجارۃ الاعیان کی نسبتہ تفصیل کے ماہہ مزید چند نکات بھی مذکور ہیں:

۱۔ یہ وہ عقد ہے جس میں متعین چیز، متعین اجرت پر، متعین وقت کے لیے، متعین مقصد کے لیے کرایہ پر دی

جاتی ہے۔ اس کا عمومی ضابطہ یہ ہے کہ جس چیز کی شریعت میں خرید و فروخت جائز ہے، اس چیز کو کرایہ پر دینا بھی جائز ہے۔

مامہ ابن عبد البر کہتے ہیں:

کل ما جاز بیعہ جاز فیہ الکرء۔^(۲)

۲۔ کرایہ دار پر لازم ہو گا کہ وہ کرایہ کی چیز کو ان شرائط کے مطابق استعمال کرے جن شرائط پر معاملہ ہوا ہے،

ان شرائط کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی قسم کی شرائط بیان نہ کی گئی ہوں تو عرف و عادت کے مطابق اس چیز

کے مقصد استعمال کو دیکھ کر اسی کے مطابق استعمال کرے گا۔ اگر کرایہ دار نے طے شدہ شرائط کی خلاف ورزی کی اور اس

کی وجہ سے کوئی نقصان ہو گیا تو سارا نقصان کرایہ دار کے ذمہ لازم ہو گا۔ اس سلسلے میں تقریباً فقہاء کا اتفاق ہے۔

۳۔ اس پر بھی تقریباً تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ دوران اجارہ اس چیز کی ملکیت سے متعلق ضمان و نقصان خود مالک

برداشت کرے گا۔ ملکیت سے متعلق اخراجات اور نقصان کا مطلب یہ ہے کہ کرایہ کی چیز / مکان کی ذات، جو ہریت اور

اجزاء پر کوئی خرچہ کرنا پڑے، جو عام حالات میں نہیں ہوتا، بلکہ کبھی کبھار کسی حادثہ کے نتیجے میں ہو سکتا ہے، جیسے گاڑی کا

انجن خراب ہو گیا، مکان کی دیوار گر گئی وغیرہ۔ البتہ روزمرہ کے استعمال کا خرچہ کرایہ دار کے ذمہ ہو گا، جیسے بجلی اور گیس کا

بل، یا گاڑی کا پیٹرول اور ٹائر میں ہوا بھرنا وغیرہ۔ اسی طرح اگر کرایہ دار نے جان بوجھ کر یا غفلت کر کے کوئی نقصان کر دیا

تو خود ہی ذمہ دار ہو گا۔

اگر عقد اجارہ میں یہ شرط لگادی گئی کہ ملکیت سے متعلق اخراجات بھی کرایہ دار کے ذمہ ہوں گے اور نقصان

ہو گیا تو وہ بھی کرایہ دار کے ذمہ ہو گا تو اس سے عقد اجارہ فاسد ہو جائے گا اور کرایہ دار پر اجرت مثل لازم ہوگی۔ اگر کرایہ

^(۱) درر الحکام شرح سنن مجلۃ الأحکام ۱/۲۲۹

^(۲) الکافی فی فقہ اہل المدینۃ ۲/۲۴۴

۱۔ ار نے مالک کی اجازت سے کرایہ کی چیز/امکان پر خرچہ کر دیا تو وہ خرچہ مالک سے وصول کر سکتا ہے۔

۳۔ مشترکہ چیز کسی کو کرایہ پر دینے کے لیے تمام شرکاء کی رضامندی ضروری ہے، ورنہ صرف شریک وہی

کرایہ پر دی جاسکتی ہے۔

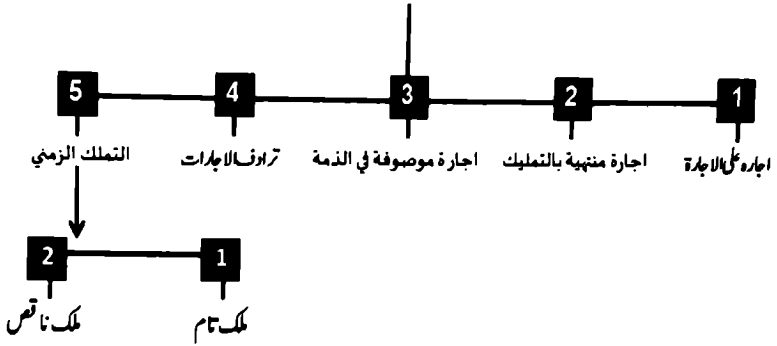
۵۔ ایسی چیز کو کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا جو استعمال سے ختم ہو جاتی ہو، جیسے گھاس وغیرہ، بلکہ ضروری ہے کہ جس

چیز کو کرایہ پر دیا جائے، استعمال کے بعد اس کی ذات اور عین برقرار رہے، جیسے زمین۔^(۱)

ب۔ اجارہ کی جدید اقسام:

اجارہ کی جدید اقسام میں سے پانچ اقسام اہم ہیں، جن کی تفصیلات سے پہلے مندرجہ ذیل خاکہ ذہن میں رکھیں:

اجارہ کی جدید اقسام



۱۔ اجارہ علی الاجارہ

۲۔ اجارہ منتهية بالتملك

۳۔ اجارہ موصوفة في الذمة

۴۔ ترادف الاجارات

۵۔ التملك الزممي

ذیل میں ان پانچ اقسام کی کچھ تفصیل عرض کی جاتی ہے:

^(۱) مجلة الأحكام العدلية (المادة ۵۲۲) تا (المادة ۵۳۵)، المعني ۱۲۸/۶، كشاف القناع ۱۶/۳

۱۔ اجارہ علی الاجارہ:

اس کو عربی میں ”إجارة من الباطن“ بھی کہتے ہیں۔ اردو میں اس کو ”ذیلی اجارہ“ کہتے ہیں اور انگریزی میں اس کو (sub-lease) کہتے ہیں۔ یہ جدید اصطلاح ہے، تاہم اس کا حکم قدیم کتب میں ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کرایہ دار، کرایہ پرلی ہوئی چیز، آگے کسی اور کو کرایہ پر دے دے۔ یہ صورت فی نفسہ سب سے ہاں جائز ہے۔ تاہم یہاں دو نکتے ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

۱۔ ائمہ ثلاثہ کے ہاں ایسی چیز کو آگے کسی بھی اجرت پر دینا جائز ہے، خواہ چیز آگے کرایہ پر دے کر سابقہ اجرت و کرایہ سے سے زیادہ اجرت لی جائے یا کم۔ مثلاً زید نے ایک دکان پانچ ہزار ماہانہ کرایہ پر لی تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس دکان کو آگے آٹھ ہزار، یا پانچ ہزار یا چار ہزار پر کرایہ پر دے۔

۲۔ حنفیہ کے ہاں کرایہ پرلی ہوئی چیز کو اسی کرایہ یا اس سے کم کرایہ پر آگے دینا تو جائز ہے، (مثلاً سابقہ مثال میں زید دکان کو پانچ ہزار یا پانچ ہزار سے کم میں کرایہ پر دے سکتا ہے) لیکن سابقہ کرایہ سے زیادہ کرایہ پر چیز آگے دینا صرف دو صورتوں میں جائز ہے:

الف۔ دونوں اجرتوں کی جنس الگ الگ ہو۔ مثلاً کسی نے خود مکان پاکستانی روپے دے کر کرایہ پر لیا، لیکن آگے کسی کو متعین ڈالرز کے بدلے کرایہ پر دے دیا۔

ب۔ یا کرایہ دار نے مکان میں اپنی طرف سے کوئی کام یا اضافہ کر لیا تو بھی زیادہ کرایہ پر آگے دے سکتا ہے۔^(۱) عصر حاضر کے کئی علماء نے جمہور کی رائے کو اختیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں معاہدہ شرعیہ میں مندرجہ ذیل دو نکات

بہت اہم ہیں:

۳/۳ یجوز لمن استأجر عینا أن یؤجرها لغير المالك بمثل الأجرة أو بأقل أو بأكثر بأجرة حالة أو مؤجلة (وهو ما یسمى التاجر من الباطن) ما لم یشرط علیه المالك الامتناع عن الإیجار للغير أو الحصول علی موافقة منه.

۳/۳ یجوز للمستأجر إجارة العین مالکها نفسه فی مدة الإجارة الأولى بأقل من الأجرة الأولى أو بمثلها أو بأكثر منها إذا كانت الأجرتان معجلتين. ولا یجوز ذلك إذا كان یترب علیها عقد عینة: بتغییر فی الأجرة أو فی الأجل. مثل أن تقع الإجارة الأولى بمائة دینار حالة، ثم یؤجرها المستأجر إلى نفس المؤجر بمائة و عشر دینار

(۱) بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة (مقالة: عقود البناء والتشغیل) ۲/۲۲۵، ۲۲۴

مؤجلة، أو أن تقع الإجارة الأولى بمائة وعشر مؤجلة ثم تقع الإجارة الثانية. بمانا، نقدا، أو أن تكون الأجرة في الإجارتين واحدة، غير أنها مؤجلة بشهر، وفي الثانية بشهرين.⁽¹⁾

• جس نے کسی اثاثے کو کرایہ پر لیا تو اس کے لیے وہ اثاثہ مالک کے علاوہ کسی اور کو آئے کرایہ پر لینا جائز ہے، خواہ اتنی ہی اجرت پردے جتنی اجرت پر اس نے خود کرایہ پر لیا تھا، یا اس سے کم پردے یا اس سے زیادہ پر اور اجرت خواہ فوری طور پر واجب الاداء ہو یا تاخیر کے ساتھ۔ اس معاملہ کو ”تاجیر من الباطن“ کہتے ہیں۔ البتہ اگر مالک نے آگے کرایہ پر دینے کی ممانعت کی شرط لگائی ہو یا آگے کرایہ پر دینے سے پہلے مالک کی اجازت کی شرط لگائی ہو (تو پھر مالک کی اجازت کے بغیر اثاثے کو آگے کسی کو کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے۔)

• کرایہ دار کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ کرایہ کی مدت کے دوران وہ اثاثہ مالک کو واپس کرایہ پر دے، خواہ اتنی ہی اجرت پردے یا اس سے کم پر یا اس سے زیادہ پر، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ دونوں اجرتیں فوری طور پر واجب الاداء ہوں۔ اگر ذیلی اجارہ، اجرت یا مدت میں تبدیلی کی وجہ سے ”عیسہ“ کا ذریعہ بن جائے تو پھر یہ ناجائز ہے۔ مثلاً پہلا اجارہ ایک سو دینار فوری کرایہ پر کیا گیا، پھر کرایہ دار نے وہی اثاثہ واپس مالک کو ایک سو دینار اجرت مؤخرہ پر دے دیا۔ یا پہلا اجارہ ایک سو دینار اجرت مؤخرہ پر کیا گیا اور دوسرا اجارہ ایک سو دینار فوری اجرت پر کیا گیا۔ یا دونوں معاملات میں اجرت تو برابر ہی ہو، لیکن پہلے معاملہ میں اجرت کی ادائیگی کے لیے ایک ماہ، جبکہ دوسرے معاملہ میں اجرت کی ادائیگی کے لیے دو ماہ کی مدت رکھی گئی۔ (تو یہ سب صورتیں جائز نہیں ہیں۔)

۳- اجارہ منہیہ بالتملیک:

یہ بھی جدید اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسا اجارہ جس کا اختتام کرایہ پر دی ہوئی چیز کی تملیک پر ہوتی ہے۔ اس کو عموماً اسلامی بینکوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب کسی شخص یا ادارہ کو کسی مشینری یا گاڑی وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اپنی رقم نہ لگا سکنے کی وجہ سے بینک کے پاس اجارہ کی سہولت حاصل کرنے کے لیے آتا

ہے تو بینک اس کی حالت کا جائزہ لے کر اس کی درخواست قبول کرتا ہے اور کلائنٹ کی مطلوبہ گاڑی یا مشینہ کی خرید و بیعت کا شخص سے خرید کر یا کہیں سے مہیا کر کے یہ مشینہ یا گاڑی اس کلائنٹ کو اجارہ کے شرعی اصول و قواعد کے مطابق ایک معینہ مدت کے لیے کرائے پر دے دیتا ہے۔

جب کرائے کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو بینک ایک الگ مستقل عقد کے ذریعے وہ گاڑی یا مشینہ کو بیچ دیتا ہے یا اسے ہبہ (gift) کر دیتا ہے، لیکن اگر کلائنٹ کو اس گاڑی کے لینے میں کوئی رغبت نہ ہو تو بینک گاڑی کو مارکیٹ میں فروخت کر دیتا ہے۔ آخر میں کرایہ دار کو مشینہ یا گاڑی ہبہ کرنے یا بیچنے کا پہلے سے الگ طور پر وعدہ کیا گیا ہوتا ہے، یا بعد میں مستقل عقد میں یہ کام کر لیا جاتا ہے۔^(۱)

اس قسم کے اجارہ کے لیے معایر شرعیہ میں جو اہم شرائط اور تفصیلات بیان کی گئی ہیں، ان کے اہم نکات کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اجارہ کے آخر میں اثاثہ، کرایہ دار کی ملکیت کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ (خواہ بیع کا ہو یا ہبہ کا) اجارہ سے الگ اور مستقل معاہدہ میں ہونا ضروری ہے۔ اس وعدہ کو اجارہ کا لازمی حصہ نہیں بنانا چاہیے۔

۲۔ اس قسم کے اجارہ میں وعدہ، صرف وعدہ کرنے والے پر لازم ہوگا، دونوں فریقین پر وعدہ کو لازم نہیں کیا جائے گا، بلکہ دوسرے فریق کو مکمل اختیار ہوگا، تاکہ جانبین سے وعدہ نہ ہو جو عقد کی مشابہت رکھتا ہے۔

۳۔ اجارہ کے آخر میں اثاثہ کو کرایہ دار کی ملکیت کی طرف منتقل کرنے کے لیے باقاعدہ ہبہ یا بیع کا عقد کرنا ضروری ہے، محض اجارہ ہی کی بنیاد پر کرایہ دار کو اس چیز کا مالک قرار دینا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر ہبہ کو اس شرط پر معلق کیا گیا کہ اگر کرایہ دار، کرایہ کی تمام اقساط ادا کرے گا تو اسے یہ اثاثہ ہبہ میں مل جائے گا تو پھر قسطیں ادا کرتے ہی کرایہ دار اس اثاثہ کا مالک ہو جائے گا۔

۴۔ اگر اثاثہ کرایہ دار سے ہی خرید کر اسے اجارہ پر دیا جا رہا ہے تو ”عینہ“ سے بیچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجارہ پر دینے سے پہلے اتنی مدت گزر جائے جس میں اثاثہ میں یا اس کی قیمت میں کچھ تبدیلی ہو جائے۔^(۲)

(۱) ”إجارة منتهية بالتملك“ کے بارے میں مجمع الفقہ الاسلامی نے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں اس کے جواز اور عدم جواز کے لیے ضابطے بیان کیے گئے ہیں: قرارات وتوصيات مجمع الفقہ الاسلامی التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ۱ - ۱۷۴ (ص: ۱۹۱) قرار رقم: ۱۱۰ (۱۲/۴) بشأن موضوع الإيجار المنتهي بالتملك وصكوك التأجير۔

(۲) ”المعايير الشرعية“ ص: ۷۸، رقم المعيار: ۹

۳۔ اجارۃ موصوفۃ فی الذمۃ:

اجارہ کی اس قسم کا ذکر بھی قدیم فقہاء کے ہاں ملتا ہے، تاہم اس پر زیادہ تر صورتوں میں "من قبل نفس" ہو رہا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے ساتھ اس طرح آجاریہ وارنی کا معاہدہ کرے کہ اگر یہ پرچیز دینے والے اپنے ذمہ کسی غیر متعین اثاثہ کی معلوم و متعین منفعت (services) یازم کرتا ہے اور اس کے برے معلوم و متعین ثمرات سے کی جاتی ہے اور مدت بھی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً زیرے نم کے ساتھ اس طرح آجاریہ وارنی کا معاہدہ کیا کہ زیرہ، عم کو ان کے جمعہ سے ایک ماہ تک کے لیے کوئی گاڑی (جس کی عمل حسنت بیان کی جائیں، لیکن گاڑی متعین نہ ہو) اس پر روپے کے بدلے کرایہ پردے گا۔ چونکہ اس قسم کے معاملہ میں اجارہ پر دی جانے والی چیز متعین نہیں ہوتی، بلکہ مؤجر کے ذمہ یازم ہوتی ہے، اس لیے اس کو "اجارہ موصوفۃ فی الذمہ" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کو "سلم فی المنافع" کہہ سکتے ہیں۔

اس قسم کی طرف قدیم شافعی فقہاء کی عبارات میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی آجاریہ کی دو اقسام کہتے ہوئے فرماتے ہیں:

وہی ضربان: أشار إلى الأول مینما بقوله (مدد مغلومة من عین مغلومة) فعینة
 كأجرتك هذا البعیر (أق) من عین (موصوفة فی الذمۃ) كأجرتك بعیرا صفته كذا
 وینستفصی صفتہ. (۱)

دیگر فقہاء کے ہاں تو یہ معاملہ درست ہے، لیکن فقہاء حنفیہ کے ہاں اجارہ کا یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟ چونکہ اس کی صراحت نہیں ملتی، اس لیے اس سلسلے میں عصر حاضر کے علماء کی رائے مختلف ہے، بعض حضرات نے حنفیہ کی طرف اس کا جواز اور بعض نے ممانعت منسوب کی ہے۔ (۲)

معالیہ شرعیہ میں اس کی اجازت دی گئی ہے:

۵/۳ يجوز أن تقع الإجارة علی موصوف فی الذمۃ وصفا منضبطا، ولو لم یکن
 مملوكا للمؤجر (الإجارة الموصوفة علی الذمۃ) حیث ینفق علی تسلیم العین
 الموصوفة فی موعد سریان العقد، ویراعی فی ذلك إمكان تملك المؤجر لها أو
 صنعها، ولا یشترط فیها تعجیل الأجرة ما لم تكن بلفظ السلم أو السلف، وإذا

(۱) کشف الغناع عن منن الإفناع ۳، ۵۶۶

(۲) فقه المعاملات المالیه والمصرفیه المعاصره، ص: ۳۲۸، استكمال موضوع الصکوک الإسلامیه، ص: ۴

سلم المؤجر غیر ما تم وصفه للمستأجر رفضه وطلب ما تتحقق فيه المواصفات.^(۱)

یہ جائز ہے کہ کسی مخصوص صفات کے حامل غیر متعین اثاثے کی حواگی اپنے ذمہ لے کر اس پر اجارہ کا عقد کیا جائے، اگرچہ وہ اثاثہ فی الحال اجارہ پر دینے والے کی ملکیت میں نہ ہو۔ اس کو ”اجارہ موصوفہ فی الذمہ“ کہتے ہیں۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ مخصوص صفات کے حامل اثاثے کو عقدِ اجارہ کرتے وقت ایک متعین تاریخ پر کرایہ دار کے حوالہ کرنے پر اتفاق کر لیا گیا ہو اور اس بات کا جائزہ بھی لیا گیا ہو کہ اس مدت میں کرایہ پر دینے والے کے لیے ایسے اثاثے کی ملکیت حاصل کرنا یا تیار کرنا ممکن بھی ہے۔ ایسا معاملہ اگر لفظِ سلم یا سلف کے بغیر کیا جائے تو اس میں اجرت پیشگی دینا ضروری نہیں۔ اگر کرایہ پر دینے والا، کرایہ دار کو اس کی مطلوبہ صفات کے خلاف اثاثہ سپرد کرے تو کرایہ دار کو انکار کرنے اور مطلوبہ صفات کے اثاثہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

چونکہ اجارہ کی یہ قسم بیعِ سلم سے ملتی جلتی ہے، اس لیے اس قسم کے اجارہ کے جواز کے لیے اجارہ کی دیگر شرائط کے ساتھ مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھنا ضروری ہوگا:

۱۔ توضیح صفات: یہ ضروری ہوگا کہ جس چیز پر اجارہ کا عقد کیا جا رہا ہے، اس کی تمام صفات اور کوالیٹی بیان کر دی جائے، تاکہ بعد میں کسی قسم کے جھگڑے کا اندیشہ نہ رہے۔

۲۔ تحدید: جس چیز کو اجارہ پر دیا جا رہا ہے، اس کی مقدار اور منفعت کی حدود بھی بیان کر دی جائے، تاکہ اصل معقود علیہ معلوم و متعین ہو سکے۔

۳۔ تعیین وقت: منافع کے وقت کو بھی بیان کیا جائے کہ کب اس چیز کو کرایہ دار کے حوالے کیا جائے گا اور کب تک اجارہ کا عقد برقرار ہے گا۔

۴۔ تراویف الاجارات:

اس کو انگریزی میں (successive leases) کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی اثاثہ کا مالک اپنے ایک ہی اثاثہ پر مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف دورانیہ کے لیے بیک وقت کئی اجارہ کے عقود کر لے اور ان عقود کو مستقبل کی طرف منسوب کیا جائے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً زید کا ہوٹل ہے اور وہ اس کے کمروں کی بنگلہ کر کے

(۱) المعایر الشرعية ص: ۸۰، رقم المعیار: ۹

لوگوں کو کرایہ پر دیتا ہے۔ اس میں ایسی صورت بھی پیش آسکتی ہے کہ وہ ہومل کا ایک ہی کمرہ آئندہ سال کے مختلف اوقات کے لیے مختلف لوگوں کو ابھی سے کرایہ پر دے دے، کسی کو ایک ماہ کے لیے تو کسی کو زیادہ یا کم عرصے کے لیے، لیکن سب کے اوقات الگ الگ ہوں۔

علماء عرب نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

إبرام عقود إيجار لفترات متغايرة لمستأجرين متعددين، بحيث لا يشترك عقدان في مدة واحدة على عين واحدة، وسميت بذلك: لأن كل أجارة منها تكون رديفة أي لاحقة للأخرى.^(۱)

مختلف اوقات کے لیے متعدد کرایہ داروں کے ساتھ اجارہ کے عقود کرنا، اس طور پر کہ ایک ہی مدت میں ایک ہی اثاثہ پر دو عقود جمع نہ ہوں۔ اس کو ”ترادف الاجارات“ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ہر اجارہ دوسرے کا ردیف یعنی اس کے بعد ہوتا ہے۔

معايير شرعية میں اس کی اجازت دی گئی ہے، چنانچہ لکھا ہے:

١/٢/٣ يجوز إبرام عقود إيجارات متغايرة لمستأجرين متعددين بحيث لا يشترك عقدان في مدة واحدة على عين واحدة، وهذه الحالة تسمى ترادف الإجازات: لأن كل إجارة منها تكون رديفة (لاحقة) للأخرى، وليست متزامنة مع بعضها، وذلك على أساس الإجارة المضافة للمستقبل.^(۲)

یہ جائز ہے کہ ایک ہی اثاثہ پر متعدد کرایہ داروں کے ساتھ مختلف دورانیے کے لیے متعدد اجارہ کے معاملات اس طرح کیے جائیں کہ کسی ایک مدت میں ایک ہی اثاثہ پر دو معاملات جمع نہ ہوں۔ اس صورت کو ”ترادف الاجارات“ کہتے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر اجارہ دوسرے کے بعد نافذ ہوتا ہے، ایک سے زائد اجارہ بیک وقت نافذ نہیں ہوتے۔ اس طرح کے اجارہ، مستقبل کی طرف منسوب اجارہ کی بنیاد پر ہی کیے جاسکتے ہیں۔

۵- التملك الزمني:

اس کو انگریزی میں (time sharing) کہتے ہیں۔ یہ ایک جدید معاملہ ہے جس کی صورت کبھی فقہی طور پر

^(۱) الامتثال للمالية الإسلامية. imtithal.com

^(۲) المعايير الشرعية ص: ۸۱، رقم المعيار: ۹۰

بک کے زمرے میں سنی ہے اور سبھی اجودہ کے زمرے میں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص کسی زمین اثاثہ وغیرہ۔ بک کے ساتھ اس طرح عقد کرتا ہے کہ مالک کو ایک خاص رقم ادا کر کے اس زمین/اثاثہ وغیرہ کے کسی غیر متعین، لیکن مقدار میں معوم حصہ کو ذمہ سے اوقات میں استعمال کرنے کا حق حاصل کرتا ہے۔

اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

هو عقد على تملك حصص شائعة، إما على سبيل الشراء لعين معلومة على شيوء، أو على سبيل الاستئجار لمنافع عين معلومة لمدد متعاقبة، أو الاستئجار لمنافع عين معلومة لفترة ما بحيث يتم الانتفاع بالعين المملوكة أو المنفعة المستأجرة بالمهايأة الزمانية، أو المهايأة المكانية، مع تطبيق خيار التعيين في بعض الحالات لاختصاص كل منهم بفترة زمنية محددة.^(۱)

یہ مشترکہ حصص کے مالک بننے کا معاہدہ ہے۔ اس میں یا تو ایک معلوم چیز کے کسی شائع حصہ کو خریداجاتا ہے یا کسی متعین اثاثہ کے منافع کو یکے بعد دیگر مدت کے لیے اجارہ پر لیا جاتا ہے۔ یا کسی خاص وقت کے لیے کسی اثاثہ کے منافع کو اجارہ پر لیا جاتا ہے اور اس میں ملکیت والی چیز یا اجارہ والی چیز کو مختلف اوقات میں باری باری استعمال کیا جاتا ہے یا مختلف حصوں کو مختلف فریق استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس میں بعض حالات میں ہر فریق کو تعین کا اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ خاص و محدود اوقات کو اپنے لیے خاص کر دے۔

اس قسم کے معاملات کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہوتی ہیں:

الف- ملک تام

ب- ملک ناقص

الف- ملک تام:

اس طریقہ میں مالک کو رقم ادا کرنے والا شخص، مالک کی زمین/اثاثہ میں ایک خاص تناسب سے ملکیت خریدتا ہے، مثلاً نصف حصہ یا ایک غیر متعین گز وغیرہ۔ اس کے بعد اصل مالک اور نیا خریدار اس زمین/اثاثہ کو باری باری خاص اوقات میں استعمال کرتے رہتے ہیں اور بعد میں باہمی رضامندی سے تقسیم کر کے ہر ایک اپنا حصہ الگ کر لیتا ہے۔ یہ

صورت شرعاً بیع کی ہے، لہذا اس پر بیع کے تمام احکام لاگو ہوں گے۔

ب۔ ملک ناقص:

اس طریقہ میں مالک کو رقم ادا کرنے والا شخص کسی حصہ وغیرہ کو نہیں خریدتا، بلکہ مالک کی زمین یا اثاثہ میں ایک شائع اور غیر متعین حصہ کی منفعت خریدتا ہے اور پھر مالک کی اجازت سے خاص اور متعین اوقات میں اس زمین یا اثاثہ کے کسی حصہ کو استعمال کرتا ہے، جب مدت ختم ہو جاتی ہے تو یہ حاملہ کبھی ستم ہو جاتا ہے۔ یہ صورت درحقیقت اجارہ ہے، لہذا اس پر اجارہ کے احکام لاگو ہوں گے۔^(۱)

۶۔ اجرت کے اصول

کسی انسان کی خدمات یا کسی زمین یا مکان وغیرہ کی منفعت کے بدلے جو معاوضہ دیا جاتا ہے، اس کو ”اجرت“ کہتے ہیں۔ اجرت سے متعلق مندرجہ ذیل اصول تقریباً تمام علماء کے ہاں اتفاق ہیں:

۱۔ جو حیثیت خرید و فروخت میں قیمت کی ہوتی ہے، وہی حیثیت اجارہ میں اجرت کی ہوتی ہے، اسی لیے اجرت کے اس عمومی ضابطہ میں فقہاء کا اختلاف نہیں ہے کہ ہر وہ چیز جو خرید و فروخت میں قیمت بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ اجارہ میں اجرت بن سکتی ہے۔ علامہ علی حیدر لکھتے ہیں:

ما صلح لأن یکون ثمننا للمبیع، یصلح لأن یکون بدل إجارة.^(۲)

۲۔ اسی طرح یہ اصول بھی اتفاق ہے کہ کرایہ / اجرت ابتداء میں ہی متعین اور طے ہونا ضروری ہے۔ اس کی جنس، نوع، مقدار وغیرہ سب معلوم ہونا ضروری ہے۔

۳۔ مختلف مدتوں کا کرایہ مختلف رکھا جاسکتا ہے، مثلاً پہلے مہینہ کا دس ہزار، دوسرے کا بارہ ہزار، وغیرہ۔ اور آئندہ کا کرایہ کسی اشاریہ کے ساتھ بھی منسلک کیا جاسکتا ہے، مثلاً یہ طے کیا جائے کہ پہلے مہینہ کا کرایہ دس ہزار ہے اور آئندہ ہر ماہ کا کرایہ مارکیٹ ویلیو اور کرایہ کے زیادہ اور کم ہونے کی بنیاد پر زیادہ اور کم ہوگا، جس کا ایک خاص معیار طے کیا جائے اور کرایہ کی بلندی کی سطح اور نچی سطح (Cap and Floor) واضح کر دی جائے کہ اگر مارکیٹ میں کرایہ بڑھتا ہے تو کرایہ دو ہزار روپے تک بڑھے گا اور اگر کرایہ کم ہوگا تو دو ہزار تک ہی کم ہو سکتا ہے۔^(۳)

^(۱) قرارات ونوصیات مجمع الفقہ الاسلامی التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ۱- ۱۲۴ (ص: ۳۲۶)

^(۲) درر الحکام فی شرح مجلة الأحکام ۵۲۱ / ۱

^(۳) المعاییر الشرعیة ص: ۸۲، رقم المعیار: ۹

- ۴۔ ایڈوانس میں کرایہ (اجرت منجملہ) دینا بھی جائز ہے۔ بعد میں اگر کام طویل نہ ہو یا مالکان کرایہ دینے سے کرایہ واپس لیا جائے گا۔ اسی طرح دوران اجارہ اگر چیز بائٹل قابل استعمال نہ رہی تو اس سے بعد کا ایسا مقدار واپس لیا جائے گا۔
- ۵۔ ”تردید اجرت“ بھی درست ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجرت اور کرایہ کی مقدار کو وقت، مکان یا مسافت کے مختلف ہونے سے مختلف رکھنے کی شرط رکھ لی جائے۔ مثلاً اسی کو لہنا لے کر تم نے یہ کام آج کر لیا تو ایک ہزار روپے اجرت دوں گا، اگر کل تک مؤخر کر لیا تو پانچ سو روپے اجرت دوں گا۔ یا اگر تم اس مکان میں آج سے کام لے لو گے تو بیس ہزار کرایہ ہو گا اور اگر کپڑے کا کاروبار کرو گے تو پندرہ ہزار کرایہ ہو گا تو یہ بھی جائز ہے۔^(۱)
- ۶۔ اگر کسی شخص نے دوسرے کی چیز بغیر کسی عقد اور اجازت کے کچھ مدت کے لیے استعمال کر لی تو لیا یا پکرایا یہ لازم ہو گا؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں یہ غصب ہے اور غصب میں منافع کا ضمان لازم نہیں ہوتا، لہذا اس پر کرایہ لازم نہیں۔ لیکن متاخرین حنفیہ نے اس میں یہ تفصیل کی ہے کہ اگر وہ چیز معدلاً استعمال ہو (یعنی اس چیز کو عمومی طور پر مالک کرایہ پر دیتا ہو، اور اسے کرایہ کے لیے ہی تیار کیا ہو) تو تب کرایہ لازم ہو گا، ورنہ نہیں۔ فقہاء شافعیہ کے ہاں بہر صورت کرایہ (اجرت مثل) لازم ہو گا۔ معاصر علماء نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔^(۲)
- ۷۔ اگر کسی انسان نے دوسرے انسان سے کسی کام کے کرنے کا مطالبہ کیا اور کوئی اجرت و مزدوری ملے نہ ہوئی تو کام کے بعد مزدور کو اجرت مثل دی جائے گی، بشرطیکہ وہ شخص عمومی طور پر مزدوری کرتا ہو۔^(۳)
- ۸۔ مالک یہ شرط عائد کر سکتا ہے کہ اگر کرایہ دار نے کرایہ کی کسی قسط میں تاخیر کر دی تو مالک اس معاملہ کو ختم کر دے گا۔^(۴)
- ۹۔ اس بات پر تو ائمہ کا اتفاق ہے کہ جب عقد اجارہ ہو جائے اور چیز کرایہ دار کے سپرد کر دی جائے تو کرایہ شروع ہو جاتا ہے، اس سے پہلے کرایہ شروع نہیں ہوتا، لیکن سوال یہ ہے کہ مالک کو کرایہ کے مطالبہ کا حق کب حاصل ہو گا؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں، اس اختلاف کو سمجھنے سے پہلے ایک اصولی اختلاف سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ عقد اجارہ کے ثبوت اور وجود کی کیفیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

(۱) الفقه على المذاهب الأربعة ۱۳۰/۲

(۲) مجلة الأحكام العدلية ص: ۹۰ (المأذنة ۳۷۲)، المدخل الفقہی العام ۱۳۲/۱

(۳) حوالہ بالا (المأذنة ۳۶۳) تا (المأذنة ۳۸۳)

(۴) المعاییر الشرعية ص: ۸۶۰، رقم المعیار: ۳۴

الف- فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ اجارہ کا وجود اور ثبوت وقتاً فوقتاً منافع کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے، کیونکہ سارے منافع فی الحال موجود نہیں ہوتے، بلکہ مستقبل میں کچھ کچھ وجود میں آتے ہیں، اس لیے جتنے منافع وجود میں آتے ہیں، ان پر اجارہ کا عقد ثابت ہوتا رہتا ہے۔

ب- فقہاء شافعیہ اور حنبلیہ کی رائے یہ ہے کہ اجارہ کا عقد مکمل طور پر تمام منافع پر فی الفور ہی ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ ان کی رائے میں غیر موجود منافع کو موجود مان لیا گیا ہے۔

اسی اختلاف کی وجہ سے فقہاء میں اس بارے میں بھی اختلاف ہو گیا ہے کہ مالک کو کرایہ کے مطالبہ کا حق کب حاصل ہوگا؟ اگر عقد اجارہ میں کرایہ کی وصولی کے لیے کسی قسم کی شرط نہیں لگائی گئی تو حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں مالک کو تدریجاً کچھ کچھ کرایہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا، جتنے منافع وجود میں آتے جائیں گے، اتنے منافع کا کرایہ وہ طلب کر سکتا ہے، جبکہ شافعیہ اور حنبلیہ کے ہاں عقد اجارہ کے فوراً بعد ہی مالک کو کرایہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہو جائے گا، البتہ اگر کرایہ کی وصولی کے لیے کوئی خاص وقت مقرر کر کے اس کو مؤخر کر لیا گیا ہے تو پھر اس پر اتفاق ہے کہ اسی وقت ہی مالک مطالبہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں مالک تین صورتوں میں کرایہ کا مالک سمجھا جاتا ہے اور اس کو مطالبہ کا حق حاصل ہو جاتا ہے:

۱- بشرط التعجیل: عقد اجارہ میں باقاعدہ ایڈوانس کرایہ کی شرط لگادی گئی تو عقد کے فوراً بعد مالک کو کرایہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

۲- تعجیل بغیر شرط: بغیر کسی شرط کے کرایہ دار نے خود ہی ایڈوانس میں کرایہ دے دیا تو وہ مالک کی ملکیت میں چلا جائے گا۔

۳- استیفاء أو تمکین: کرایہ دار نے کرایہ کی چیز سے منافع حاصل کر لیا یا مالک نے کرایہ دار کو چیز یا مکان دے دیا اور اس طور پر کرایہ دار کے قبضہ اور اختیار میں رہا کہ وہ استعمال کر سکتا تھا تو بھی مالک کو اتنی مدت کے کرایہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہو جائے گا۔^(۱)

۱۔ عقد اجارہ کے موجبات اور تقاضے

اس عنوان کے تحت ان ضروری مباحث کو بیان کیا جائے گا جن کا تعلق عقد اجارہ کے وجود میں آنے کے بعد تقاضے، تقاضیات اور تقاضوں کے ساتھ ہیں۔ اس کے تحت مندرجہ ذیل نکات بیان ہوں گے:

۱۔ صفتِ اجارہ

۲۔ منفعت کا تملک

۳۔ مرمت کی ذمہ داری

۴۔ ضمان کا اصول

۵۔ اجارہ باطلہ و فاسدہ

۲۔ إجارة بجزء من العمل / قفيز الطحان

۱۔ صفتِ اجارہ:

اس بات پر امام شریحؒ کے علاوہ تقریباً تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ عقدِ اجارہ ایک لازم عقد ہے، جب یہ عقد ہو جائے تو فریقین میں سے کسی کو دوسرے کی رضامندی کے بغیر یکطرفہ طور پر اس عقد کو ختم کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، جبکہ امام شریحؒ اس عقد کو غیر لازم سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی بھی فریق کسی بھی وقت دوسرے کی رضامندی کے بغیر اس عقد کو ختم کر سکتا ہے۔ راجح قول جمہور علماء کا ہے، البتہ اس کے باوجود کچھ حالات ایسے ہیں جن میں عقدِ اجارہ کو ختم کیا جاسکتا ہے اور ان میں سے بعض احوال میں فقہاء کا اختلاف بھی ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ عیب کی بنیاد پر کرایہ دار اس عقد کو ختم کر سکتا ہے، اگرچہ مالک راضی نہ ہو۔ یہ صورت تمام ائمہ کے ہاں اتفاقی ہے۔ عیب سے مراد ایسی خرابی اور نقصان ہے جس کی وجہ سے اس منفعت اور خدمات میں نقص اور خلل آجائے، جن پر عقدِ اجارہ ہوا ہے اور کرایہ کی چیز سے انتفاع کا حصول مشکل ہو جائے۔ مثلاً مکان کی دیوار گر گئی، یا جانور کو کرایہ پر لیا تھا، لیکن اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو کرایہ دار اس عقد کو ختم کر سکتا ہے۔ اسی طرح کسی انسان کو مزدوری پر رکھا تھا، لیکن وہ پاگل ہو گیا یا اس کی آنکھوں کی بنائی چلی گئی تو اس کو مزدوری سے نکالا جاسکتا ہے۔

۲۔ کسی فریق نے اپنے لیے کچھ دنوں تک خیار شرط رکھا تھا تو ان دنوں کے اندر وہ معاملہ ختم کر سکتا ہے۔

۳۔ عذر کی وجہ سے عقدِ اجارہ کو فسخ کیا جاسکتا ہے۔ عذر سے مراد یہ ہے کہ کرایہ کی چیز اور اس کی منفعت میں تو کسی قسم کا خلل نہ آئے، لیکن کسی فریق پر ایسی حالت پیش آجائے کہ اس کے لیے عقدِ اجارہ کو باقی رکھنا نقصان دہ اور مضر ہو۔ یہ فقہاء حنفیہ کی رائے ہے، جبکہ جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ عقدِ اجارہ کو کسی عذر کی بنیاد پر فسخ یا ختم نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ ابن عابدینؒ نے اس سلسلے میں یہ ضابطہ لکھا ہے:

كُلُّ عُدْرٍ لَا يُمَكِّنُ مَعَهُ اسْتِيفَاءَ الْمَغْفُودِ عَلَيْهِ إِلَّا بِضَرَرٍ يُلْحَقُهُ فِي نَفْسِهِ أَوْ مَالِهِ،

يُثْبِتُ لَهُ حَقُّ الْمَسْخِ.^(۱)

فقہاء حنفیہ کے ہاں اس طرح کے عذر کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ متاجر کا عذر: کرایہ دار کو کوئی ایسا عذر پیش آجائے، جس کی وجہ سے اس کے لیے عقدِ اجارہ کو باقی رکھنا نقصان دہ ہو تو وہ معاملہ ختم کر سکتا ہے۔ مثلاً اس کو سخت ضرورت یا نوکری کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا پڑے یا جس کام کے لیے اس نے چیز کرایہ پر لی تھی، کرایہ دار کو وہ کام چھوڑنا پڑے یا انتہائی غریب اور مفلس ہو جائے اور کرایہ کی کوئی ترتیب نہ بن سکے۔

۲۔ مؤجر کا عذر: مالک کو کوئی ایسا عذر پیش آجائے جس کی وجہ سے معاملہ کو جاری رکھنا مشکل ہو جائے، مثلاً مالک کو قرضوں کی وجہ سے کرایہ کی زمین یا مکان پینا پڑے یا مالک نے جو چیز کرایہ پر دی ہے، وہ اس نے کسی اور سے خریدی ہو اور اس میں کوئی عیب نظر آجائے، جس کی وجہ سے مالک اس چیز کو واپس کرنا چاہتا ہے تو وہ عقدِ اجارہ ختم کر کے چیز واپس کر سکتا ہے۔

۳۔ شئی ماجور کا عذر: جس چیز کو کرایہ پر لیا ہے، اس کی طرف سے کوئی وجہ سامنے آجائے، مثلاً کسی نے ایک بستی میں دکان کرایہ پر لی تھی، لیکن بعد میں اس بستی کے تمام لوگ نقل مکانی کر لیتے ہیں تو کرایہ دار معاملہ ختم کر کے دکان واپس کر سکتا ہے۔^(۲)

۲۔ منفعت کا تمکک:

اس اصول پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ جس طرح خرید و فروخت کے معاملہ میں معاملہ ہوتے ہی خریدار، خریدی ہوئی چیز کا مالک ہو جاتا ہے، اسی طرح جیسے ہی عقدِ اجارہ ہو جائے تو کرایہ دار بھی اُن منافع اور خدمات کا مالک ہو جاتا ہے، جن پر اس نے اجارہ کا معاملہ کیا ہے،۔ علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

المستأجر يملك المنافع بالعقد كما يملك المشتري المبيع بالبيع ويزول ملك المؤجر

عنها.^(۳)

اس اصول پر خاص کر مندرجہ ذیل مسائل متفرع ہوتے ہیں:

^(۱) حاشیة ابن عابدین ۸۱/۶

^(۲) بدائع الصنائع ۲۰۱/۳، الدر المختار ۸۲/۶، فقہ المعاملات ۱/۱۵

^(۳) المغنی ۲۷/۶

۱۔ مالک نے جب اپنی زمین، مکان وغیرہ کسی خاص مدت کے لیے کسی کو کرایہ پر دے دیا تو وہ اسی زمین یا مکان کی اسی مدت کے لیے کسی اور کو کرایہ پر نہیں دے سکتا، کیونکہ اس مدت کے اندر منافع کا مالک پہلا کرایہ دار ہے، لہذا اسی اور کی ملکیت کو اب نہیں بیچا جاسکتا ہے۔

۲۔ مالک کے لیے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اس مدت کے اندر اندر اپنی زمین یا مکان کسی کو بیچ دے، اگر اس نے ایسا کر دیا تو یہ بیع کرایہ دار کی اجازت پر موقوف ہوگی۔ اگر کرایہ دار نے اجازت دے دی تو ٹھیک، ورنہ جب تک اجارہ کے معاملہ کی مدت باقی ہے، اس وقت تک بیع کا یہ معاملہ نافذ نہیں ہوگا اور خریدار کو بھی یہ اختیار ہوگا کہ یا تو بیع کو ختم کر دے یا اجارہ کے معاملہ کے ختم ہونے کا انتظار کرے۔

۳۔ کرایہ دار چونکہ خاص مدت کے لیے کرایہ کی چیز کے منافع کا مالک ہو جاتا ہے، اس لیے فقہاء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ وہ اس مدت کے اندر کرایہ کی چیز کسی اور کو بھی کرایہ پر دے سکتا ہے، بشرطیکہ وہ چیز ایسی نہ ہو جو مختلف لوگوں کے استعمال سے متاثر ہو سکتی ہو، یا اس میں خلل آسکتا ہو۔ اگر ایسی چیز ہے جو مختلف لوگوں کے استعمال کی وجہ سے متاثر ہو سکتی ہے، اس میں کوئی نقص یا خرابی آسکتی ہے تو پھر کرایہ دار وہ چیز کسی اور کو کرایہ پر نہیں دے سکتا۔ دیگر فقہاء کے ہاں کرایہ دار، کرایہ کی چیز کو قبضہ سے پہلے بھی آگے کسی کو کرایہ پر دے سکتا ہے، جبکہ فقہاء حنفیہ کے ہاں اگر کرایہ کی چیز منقولی ہے تو قبضہ سے پہلے کسی کو کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے اور اگر غیر منقولی چیز ہے، جیسے زمین، تو اس میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ حنفیہ کے ہاں یہ جائز ہے، جبکہ بعض نے حنفیہ کی طرف عدم جواز کی نسبت کی ہے۔ مجملہ الاحکام العدلیہ میں زمین پر قبضہ سے پہلے بھی آگے کرایہ پر دینے کی اجازت دی ہے۔^(۱)

آگے کسی کو کرایہ پر چیز دیتے ہوئے کتنا کرایہ لیا جاسکتا ہے؟ اس سوال کی تفصیل ہم نے ”اجارہ کی جدید اقسام“ کے تحت ”اجارہ علی الاجارہ“ کے ضمن میں بیان کر دی ہے۔

۴۔ کیا کرایہ دار، کرایہ پر لی ہوئی چیز اس کے مالک کو واپس کرایہ پر دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ فقہاء شافعیہ، مالکیہ اور ایک روایت کے مطابق فقہاء حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ مالک کو بھی اس کی چیز کرایہ پر دی جاسکتی ہے، جبکہ فقہاء حنفیہ کے ہاں یہ ممنوع ہے، لہذا مالک کو واپس چیز کرایہ پر نہیں دی جاسکتی، کیونکہ مالک کو اس کی چیز کرایہ پر دینا کسی کو اپنی ہی مملوکہ چیز کے منافع کرایہ پر دینا ہے، جو کہ درست نہیں ہے۔ اگر کرایہ دار نے کرایہ کی چیز واپس مالک کو کرایہ پر دے دی تو کیا اس کی وجہ سے ان کے سابقہ عقد اجارہ پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء حنفیہ

سے مختلف روایات منقول ہیں، تاہم صحیح یہ ہے کہ ان کا سابقہ اجارہ کا عقد فسخ اور ختم ہو جائے گا۔^(۱)

۳۔ مرمت کی ذمہ داری:

کرایہ داری کی مدت کے دوران اگر کرایہ کی چیز کی مرمت کی ضرورت پڑ جائے یا اس میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے اور اس کے بغیر کرایہ کی چیز کا استعمال اور اس سے نفع کا حصول مشکل ہو، مثلاً پانی کی لائن خرابی ہو گئی، یا گھر کی دیواروں کو پلستر کرنے کی ضرورت ہو یا بجلی کی لائن خراب ہو گئی وغیرہ تو اس خرابی کو دور کرنا اور اس چیز کی مرمت کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟ اس مسئلہ میں اصولی طور پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ ”اصلاح العین“ یعنی کرایہ کی چیز کی مرمت اور اصلاح اصل مالک کی ذمہ داری ہے، کیونکہ اجارہ کا عقد منافع پر ہوا ہے، مالک کی ذمہ داری ہے کہ کرایہ دار کو صحیح سالم چیز دے، تاکہ وہ اس سے انتفاع حاصل کرے اور جب تک کرایہ کی چیز کی مرمت اور اصلاح نہیں ہوتی، اس سے مکمل طور پر نفع حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے اس چیز کو ٹھیک کرنا مالک ہی کی ذمہ داری ہے۔ اسی اصول کی وجہ سے فقہاء کے ہاں مندرجہ ذیل مسائل پر بھی اتفاق ہے:

۱۔ دوران اجارہ اگر کرایہ کی چیز یا مکان وغیرہ بالکل خراب ہو جائے، منہدم ہو جائے تو کرایہ دار پر اس کے بعد کی مدت کا کرایہ لازم نہیں ہوگا۔

۲۔ ایسی چیز کو کرایہ پر نہ دیا جائے جو استعمال سے ختم ہو جاتی ہے یا جو جلد ہی خراب ہو جاتی ہے۔

۳۔ کسی غیر تقسیم شدہ حصہ کو شریک کے علاوہ کسی اجنبی کو کرایہ پر نہ دیا جائے، کیونکہ ایسی صورت میں کرایہ دار کے لیے اس حصہ سے انتفاع حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس حد تک اتفاق کے باوجود فقہاء میں اس ذمہ داری اور مسؤلیت کی تحدید اور درجہ میں اختلاف ہے، اس سلسلے میں دو آراء ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں کرایہ کی چیز کی مرمت اور اصلاح اصل مالک کی ذمہ داری ہے، لیکن مالک پر جبر و زبردستی نہیں کی جائے گی، بلکہ اس سے مطالبہ کیا جائے گا، اگر اس نے بات مان لی تو ٹھیک، ورنہ کرایہ دار کو معاملہ فسخ اور ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا۔^(۲)

۲۔ فقہاء شافعیہ اور حنبلیہ کے رائے یہ ہے کہ اس کام کے لیے مالک پر جبر اور زبردستی کی جاسکتی ہے، البتہ اگر اس

(۱) البحر الرائق ۴/۳۰۳

(۲) الدر المختار ۲/۳۰۰، مواہب الجلیل ۵/۳۴۴

کے باوجود اس نے تاخیر کر دی تو کرایہ دار کو معاملہ ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا۔^(۱)

۳۔ ضمان کا اصول:

اگر دروین اجارہ کرایہ کی چیز مکمل طور پر خراب اور ضائع ہو جائے یا جزوی طور پر خراب ہو جائے تو خرابی اور نقصان کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اسی طرح اگر مزدور کے ہاتھ میں مالک کی چیز خراب ہو جائے تو کون ضامن ہوگا؟ اس سلسلے میں کچھ تفصیل پہلے عرض کر دی گئی ہے، یہاں چند نکات سمجھنا ضروری ہے:

۱۔ اجارہ الایمان میں کرایہ کی چیز کرایہ دار کے پاس امانت کے حکم میں ہوتی ہے اور اس پر امانت کے احکام لاگو ہوں گے۔ اگر کرایہ دار نے جان بوجھ کر چیز خراب کر دی یا اس کی غفلت اور کوتاہی کی وجہ سے چیز میں خرابی ہو گئی تو کرایہ دار ہی ذمہ دار ہوگا۔ اسی طرح اگر کرایہ دار نے ان شرائط کی خلاف ورزی کر دی، جن پر معاہدہ ہوا تھا اور کرایہ کی چیز کو نقصان ہو گیا تو بھی کرایہ دار ہی ذمہ دار ہوگا۔ لیکن اگر کرایہ دار کی کوئی غلطی نہ ہو اور کرایہ کی چیز ضائع یا خراب ہو جائے تو اصل مالک ہی ذمہ دار ہوگا، کرایہ دار پر نقصان لازم نہیں ہوگا۔

۲۔ جہاں تک اجارہ الایمان کی بات ہے جس میں کسی انسان کو مزدوری پر رکھا جاتا ہے، اگر کسی مزدور کے ہاتھ سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو ”اجیر خاص“ کے بارے میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ اس کے ہاتھ میں چیز امانت ہوتی ہے، لہذا اگر اس کی تعدی، غفلت اور ارادہ سے چیز ضائع نہ ہوئی ہو تو وہ ضامن نہیں ہوگا۔ اگر ”اجیر مشترک“ کے ہاتھ سے کوئی چیز ضائع ہو گئی اور اس کی اپنی کوتاہی اور ارادہ سے ضائع ہو گئی ہے تو وہ خود ذمہ دار ہوگا، اس پر بھی فقہاء کا اتفاق ہے، لیکن اگر اس کی غلطی اور ارادہ کے بغیر ہی چیز ضائع ہو گئی کیا وہ ذمہ دار ہوگا؟ اس بارے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

۱۔ امام ابو حنیفہ، امام زفر، امام حسن بن زیاد، فقہاء حنابلہ کی راجح روایت اور فقہاء شافعیہ کی راجح روایت یہ ہے کہ اجیر مشترک بھی اجیر خاص کی طرح امین ہوتا ہے اور وہ اس نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

۲۔ فقہاء مالکیہ، امام ابو یوسف، امام محمد اور فقہاء حنابلہ کی ایک روایت یہ ہے کہ اجیر مشترک بہر صورت ضامن اور ذمہ دار ہوگا۔ فقہاء حنفیہ کے متاخرین علماء نے حالاتِ زمانہ اور لوگوں کی غفلت کو دیکھ کر اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ اگر اجیر مشترک کے ہاتھ سے کوئی نقصان ہوگا تو وہ بہر صورت ذمہ دار ہوگا، خواہ اس کی غفلت و تعدی سے نقصان ہو جائے یا اس کی غلطی اور غفلت کے بغیر۔^(۲)

^(۱) نہایۃ المحتاج ۲۹۸/۵، المغنی ۶/۲۶

^(۲) المغنی ۶/۱۲۸، بدائع الصنائع ۴/۲۱۰

۵۔ اجارہ باطلہ و فاسدہ:

فقہاء حنفیہ نے عاومہ کی فقہانہ سے ہاں باطلہ اور فاسدہ میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر اجارہ کا مفاد ایسا ہے جیسا کہ فقہاء حنفیہ نے عاومہ اور شریعتی اصول اور شریعتی خلاف و زنی لکھی جاتی ہے تو وہ مفاد اجارہ کا مفاد نہیں ہے، جو کہ کوئی باطلہ معاملہ کی حالت میں ہو یا کسی خارجی و منفی وجہ سے ہو۔ اس معاملہ کو فقہ حنفیہ ایسا ہے کہ۔ فقہاء حنفیہ سے ہاں اجارہ باطلہ و فاسدہ میں فرق ہے اور وہ تو اس کا علم بھی الگ الگ ہے۔

عامہ حاسانی نے اجارہ باطلہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

أما الإجارة الباطلة. وهي التي فاتها شرط من شروط الإنعقاد فلا حكم لها، أما لأن ما لا ينعقد فوجوده في حق الحكم وعدمه بمذلة واحدة. وهم تصيب الباطل من التصرفات الشرعية كالبيع.^(۱)

اجارہ باطلہ وہ ہے جس میں شرط اور اوقات میں سے کوئی شرط نہ لکھی جاتی ہے، اس کا کوئی بھی حکم درست نہیں ہوتا، کیونکہ جو عقد منقذ ہی نہ ہو تو علم کے حق میں اس کا وجود اور عدم وجود ایک چیز ہے۔ تصرفات شریعتیہ میں باطل کا سبب نہیں ہوتا، جیسا کہ فقہ حنفیہ نے بیان کیا ہے۔

اس تعریف کے مطابق عقد اجارہ کے منقذ ہونے کے لیے جو شرط اور شرائط لگی ہیں، اگر ان میں سے کوئی شرط نہ لکھی گئی تو عقد اجارہ باطل ہو جائے گا۔ مثلاً بیعت یا نذر یا غیرہ میں سے کسی نے اجارہ کا عقد لیا تو وہ اجارہ باطل ہے، یا اگر کسی چیز کو لیا گیا ہے۔ یا جس کا جائز استعمال ممکن نہ ہو، وہ اجارہ باطل ہے۔ اس میں اجرت الزم نہیں ہوتی، البتہ اگر شکریم یا وقف کی معمولات ہیں تو اجرت شامل الزم ہوگی۔^(۲)

جہاں تک اجارہ فاسدہ کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں عامہ حاسانی لکھتے ہیں:

أما الإجارة الفاسدة. وهي التي فاتها شرط من شروط الصحة.^(۳)

اجارہ فاسدہ وہ ہے جس کی شرط اور صحت میں سے کوئی شرط نہ لکھی جاتی ہے۔

اجارہ کی شرط لکھی جانی چاہے، اقسام بیان کی ہیں، ان میں سے اگر اجارہ کوئی معمولی شرط اور صحت نہ لکھی جائیں تو اجارہ کا عقد

^(۱) مدائع الصنائع ۴: ۲۱۸

^(۲) مجلة الأحكام العدلية، ص ۵۰ (المادة ۴۵۹)

^(۳) مدائع الصنائع ۴: ۲۱۸

فاسد ہو جاتا ہے۔ لہذا عقد جاری نہیں ہونے کی طرف متعلق شرط کی گائی، یہ اجرت وغیرہ میں بہت ہو، یہ کسی مشترکہ و مشترک چیز و چارہ یا دیگر چیز کو چارہ یا عقد فاسد ہو جاتا ہے۔ چارہ یا عقد فاسد ہو جاتا ہے۔ اجرت کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے دو صورتیں ہیں۔

۱۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اگر یہ (اجرت) اس سے سے شدہ ہو، یعنی نہ ہو، یہ سے شدہ ہو تو ہو، لیکن یہ سے شدہ ہو، یہ اجرت میں کے برابر ہو۔ یعنی سے شدہ ہو، اگر یہ اس سے سے شدہ ہو، اس سے سے شدہ ہو، اگر یہ یا اس سے کن جو عمومی اجرت (مارکیٹ) کی ہے، یہ سب سے اس کے برابر ہے تو چیز کے ایک کو یہ اگر مزدور کو اگر یہ پر رکھ ہے تو اس کو وہی اجرت مثل دی جائے گی جو مارکیٹ میں رہتا ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ چارہ یا عقد فاسد ہو، لیکن وہ اجرت مثل (مارکیٹ میں رائج اجرت) / اگر یہ سے شدہ ہو تو اس صورت میں چیز کے ایک کو یہ اگر کسی کو مزدور رکھتا تو اس کو طے شدہ اجرت / اگر یہ ہی سے گا۔^(۱)

مجموعہ: ۱۔ چارہ یا عقد فاسد ہو، لیکن وہ اجرت میں رکھتا ہے:

فَسَادُ الْإِجَارَةِ يُنْشَأُ بَعْضُهُ عَنْ كَوْنِ الْبَدَلِ مُجْهِولًا وَبَعْضُهُ عَنْ فِقْدَانِ بَاقِي شَرَائِطِ
نَصِيحَةٍ. فَبِئْسَ الصُّورَةُ الْأُولَى تَلْزِمُ أَجْرَ الْمِثْلِ بَالِغًا مَا بَلَغَ وَفِي الصُّورَةِ الثَّانِيَةِ يَلْزِمُ
أَجْرَ مِثْلِ بِشَرْطِ أَنْ لَا يَتَجَاوَزَ الْأَجْرَ الْمُسْتَعْي.^(۲)

چارہ یا عقد فاسد کبھی اس لیے فاسد ہوتا ہے کہ بدل / اجرت مجہول ہوتی ہے اور کبھی کسی اور شرط صحت کے نہ پائے جانے کی وجہ سے فاسد ہوتا ہے، لہذا پہلی صورت میں اجرت مثل لازم ہوگی، خواہ کتنی بھی ہو، جبکہ دوسری صورت میں اجرت مثل لازم ہوگی، بشرطیکہ وہ طے شدہ اجرت سے متجاوز اور زیادہ نہ ہو۔

۲۔ اجارة بجزء من العمل / قفيز الطحان:

اس عنوان کی تفصیلات کو تین نکات میں بیان کیا جائے گا:

۱۔ مفہوم

۲۔ فقہاء کی آراء

۳۔ صورتیں

^(۱) مجلة الأحكام العدلية، ص: ۸۷ (المادة ۲۶۱)

^(۲) حاشية ابن عابدين ۴۵/۶

^(۳) مجلة الأحكام العدلية ص: ۸۸ (المادة ۳۶۲)

۱- مفہوم:

قدیم فقہی کتب میں اجارہ کی اس قسم کی تعریف نہیں ملتی، بلکہ عقدِ اجارہ کے ضمن میں جب ”اجرت“ کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں تو وہاں اس صورت کی مثالوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ ان مثالوں کے ضمن میں بعض حنفی فقہاء نے اس صورت کو اصول کی شکل دیتے ہوئے اور اس کے عدم جواز کی وجہ بیان کرتے ہوئے ایک عبارت اکثر ذکر فرمائی ہے، اس عبارت کو بطور تعریف اختیار کیا جاسکتا ہے۔ وہ عبارت یوں ہے:

جعل الأجر بعض ما يخرج من عمل الأجير.^(۱)

اجر/مزدور کے عمل سے نکلنے والی چیز کے بعض حصہ کو اس کے لیے اجرت / تنخواہ مقرر کرنا۔
فقہاء کی بیان کردہ ان تمام مثالوں اور صورتوں کو سامنے رکھ کر معاصر علماء نے اس صورت کی جامع تعریف یوں لکھی ہے:

عقد علی منفعة مقصودة مباحة، بعوض معلوم مشاع، ناتج من عمل الأجير.^(۲)

کسی مقصودی اور مباح منفعت پر کیا ہوا عقدِ اجارہ، جو ایسے عوض کے بدلے میں ہوتا ہے جو معلوم اور مشاع ہوتا ہے اور مزدور کے اپنے عمل سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

اس تعریف کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا پہلا جملہ عام عقدِ اجارہ کو ہی بیان کرتا ہے کہ کسی جائز اور مباح منفعت، خدمت یا کام کے لیے کسی کے ساتھ عقدِ اجارہ کرنا اور کسی کو مزدور رکھنا۔ جہاں تک دوسرے جملہ کا تعلق ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کے اجارہ میں عوض یا اجرت مشاع ہوتی ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں ہے، بلکہ کبھی غیر مشاع اور متعین اجرت بھی ملے کی جاتی ہے، جیسے آگے مثال سے معلوم ہو جائے گا۔ اس تعریف میں سب سے اہم آخری جملہ (ناتج من عمل الأجير) ہے جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اس قسم کے اجارہ میں مزدور کے لیے جو اجرت اور تنخواہ مقرر کی جاتی ہے، وہ تنخواہ خود اسی مزدور کے عمل اور کام کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک آدمی نے دوسرے کو مزدوری پر رکھتے ہوئے یوں معاملہ کر لیا کہ تم میری اس گندم کو پیس کر آنا بناؤ، اس کے بدلے تمہیں اسی آنے کا دس فیصد یا اسی آنے سے پانچ کلو بطور مزدوری دے دیا جائے گا۔ یہ ”اجارہ بجزء من العمل“ ہے، کیونکہ مزدور کی مزدوری اسی کے عمل سے پیدا ہونے والی چیز (آنا) سے مقرر کی

^(۱) البناية شرح الهداية ۱/۲۹۸

^(۲) الإجارة بجزء من العمل: صورها، حکمها، تکلیفها، مجلة العدل، العدد: ۳۷، ص: ۱۹۸

گئی ہے۔ اگر اجرت کو فیصد کی شکل میں رکھا جائے تو یہ ”عوض مشاع“ کی مثال بنے گی اور اگر متعین مقدار میں اجرت طے کی جائے تو یہ ”عوض معین“ کی مثال بنے گی۔

فقہاء کے ہاں اس قسم کے اجارہ میں جو مثال سب سے زیادہ مشہور ہے وہ یہی گندم اور آٹے کی مثال ہے، اسی لیے بعض فقہاء کے ہاں ”تقزیر الطمان“ کا تذکرہ ملتا ہے۔ ”تقزیر“ ایک خاص پہنا ہوا ہے، جبکہ ”طمان“ گندم پس کر آنا بنانے والے کو کہتے ہیں۔

۲۔ فقہاء کی آراء:

اجارہ کی ایسی صورتیں جن میں مزدور کو اسی کے عمل سے پیدا ہونے والی چیز کا بعض حصہ بطور اجرت دینا طے ہو جائے، ان کے جواز اور عدم جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ اس اختلاف کو سمجھنے سے پہلے یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایسی صورتوں میں اجرت طے کرنے کے دو طریقے ہیں:

۱۔ پہلا طریقہ: مزدور کے لیے مشاع اور فیصدی حصہ بطور اجرت طے کرنا۔ مثلاً کسی کو یہ کہنا کہ تم اس گندم کو پس کر آنا بنا دو اور اس کا دس فیصد بطور اجرت رکھ لو۔

۲۔ دوسرا طریقہ: مزدور کے لیے متعین مقدار میں اجرت طے کرنا۔ مثلاً اسی سابقہ مثال میں گندم پینے والے کے لیے اسی آٹے میں سے کچھ خاص مقدار، مثلاً پانچ کلو بطور اجرت طے کرنا۔
ایسی صورتوں میں فقہاء کی چار آراء ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ، فقہاء شافعیہ کی رائے، فقہاء مالکیہ کی راجح روایت اور فقہاء حنبلیہ کی ایک روایت یہ ہے کہ ایسا معاہدہ شرعاً درست نہیں ہے۔ انہوں نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں، مثلاً ایک تو تقزیر الطمان کی ممانعت پر واضح حدیث موجود ہے۔ دوسرا اس میں اجرا اپنے لیے ہی عمل کر رہا ہے، کیونکہ اس کے لیے پہلے سے ہی حصہ مقرر کر دیا گیا اور وہ حصہ مجبوں بھی ہے، کیونکہ اس چیز کا وجود میں آنا یقینی نہیں ہے اور مؤجر کی قدرت سے بھی باہر ہے۔ فقہاء حنفیہ نے ایسی روایت میں اجرت طے کرنے کے لیے اجرت مثل کو لازم قرار دیا ہے، کیونکہ یہ اجارہ فاسد ہے۔

۲۔ ابراہیم نخعی اور امام حسن کی ایک روایت یہ ہے کہ یہ صورتیں جائز ہیں، لیکن مکروہ ہیں۔

۳۔ غابری نے یہ رائے ہے کہ اجارہ کی ایسی تمام صورتیں شرعاً جائز ہیں، خواہ اجرت کو مشاع اور فیصد کی شکل میں

طے کیا جائے۔

۴۔ فقہاء حنبلیہ کی راجح روایت، فقہاء مالکیہ کی ایک روایت اور فقہاء حنفیہ کے مشائخ، جیسے محمد بن مسلمہ اور نصر

بن یحییٰ کی رائے یہ ہے کہ اجارہ کی ان صورتوں میں اگر اجرت کو مشاع اور فیصدی شکل میں ملے لیا جائے تو جائز ہے اور اگر متعین مقدار میں اجرت ملے کر دی گئی تو پھر یہ تمام صورتیں درست نہیں ہیں۔ امامہ ابن تیمیہ اور امامہ ابن قیمؒ کی بھی یہی رائے ہے۔^(۱)

۳۔ صورتیں:

اس قسم کے معاملہ کی کئی صورتیں ہیں، کچھ کا تذکرہ قدیم فقہاء نے کیا ہے اور کچھ صورتیں آج کل وجود میں آچکی ہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند اہم صورتوں کا تذکرہ کیا جائے گا اور پھر اصولی طور پر جائز متبادل صورتوں کی نشاندہی کی جائے گی:

۱۔ عمومی صورتیں:

۱۔ ایک صورت یہ ذکر کی جاتی ہے کہ کسی جانور، مثلاً بکری، کے مالک نے کسی قصاب سے یوں معاملہ کیا کہ وہ بکری ذبح کرے اور بطور اجرت اسی بکری کا چمڑا وصول کر لے۔ اس صورت میں ایک خرابی تو یہی لازم آتی ہے کہ مزدور کو اسی کے عمل سے وجود میں آنے والی چیز (چمڑے) کو بطور اجرت ملے کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خرابی بھی ہے کہ چمڑا کبھی صحیح سالم نکل آتا ہے، کبھی اس میں عیب بھی ہوتا ہے، اس لیے یہ صورت ممنوع ہے۔^(۲)

۲۔ کسی کو سوت اور دھاگہ دے کر اس کے ساتھ یوں معاملہ کرنا کہ وہ اس سے کپڑا بن کر تیار کر لے اور اس کے عمل کے بدلے اس کو بطور اجرت اسی کپڑے میں سے کچھ کپڑا دے دیا جائے گا۔ اس میں بھی اجیر کے عمل سے پیدا ہونے والی چیز کا بعض حصہ بطور اجرت مقرر کیا گیا ہے۔^(۳)

۳۔ اس کی ایک مشہور صورت ”قفیز الطحمان“ کی بھی ہے، جس میں گندم کسی کو دے کر اسے پینے کا کہہ دیا جائے اور اس کے لیے اسی آٹے میں سے کچھ حصہ بطور اجرت ملے کر دیا جائے۔^(۴)

۴۔ بعض فقہاء نے یہ صورت بھی لکھی ہے کہ کسی شخص کا دوسرے پر قرض ہے اور مقروض اپنا قرض ادا کرنے میں نال مثل سے کام لے رہا ہے تو قرض خواہ کسی تیسرے شخص کے ساتھ یوں معاملہ کر لیتا ہے کہ وہ مقروض سے کسی

(۱) المبسوط ۱۰/۱۵، نہایۃ المحتاج ۲۶۸/۵، المغنی ۱۱۶/۲، بدایۃ المجتہد ۱۳۲/۵، بدائع الصنائع ۱۹۲/۳، المحلی ۱۹۹/۸

(۲) الوسیط ۱۵۵/۳

(۳) الجامع الصغیر ص: ۳۳۹

(۴) بدائع الصنائع ۱۹۲/۳

طرح قرض خواہ کا قرض وصول کر لے اور اس کو بطور اجرت اسی وصول شدہ قرض میں سے کچھ متعین حصہ دے دیا جائے گا۔^(۱)

اسی طرح کسی کو قرض کی وصولی کے لیے وکیل بنا کر عدالت میں کیس لڑنے کے لیے مقرر کیا جائے اور اس کے ساتھ یوں معاملہ کیا جائے کہ عدالت کے فیصلے کے نتیجے میں جو رقم ملے گی، اس کا ایک متعین حصہ یا ایک متعین فیصدی حصہ وکیل کو بطور اجرت دے دیا جائے گا۔

۵۔ اجارہ کی اس قسم کی ایک صورت آج کل مدارس میں رائج ہے۔ وہ یہ ہے کہ مدرسہ کی انتظامیہ مدرسہ کے لیے چندہ جمع کر کے لانے والے استاذ یا سفیر سے اس طرح کا معاملہ کرتے ہیں کہ وہ چندہ کی جتنی رقم لائے گا، اسی رقم کا پانچ یا دس فیصد حصہ اس استاذ یا سفیر کو بطور اجرت دے دیا جائے گا۔ اس میں بھی چندہ جمع کرنے والے کے عمل سے پیدا ہونے والی چیز سے اس کی اجرت مقرر کی گئی ہے۔

۶۔ اس طرح کی ایک صورت آج کل یہ بھی رائج ہے کہ کسان کسی تھریشر والے سے اس طرح کا معاملہ کرتے ہیں کہ تھریشر والا ان کی فصل صاف کرے اور اس کے بدلے گندم وغیرہ کی تھریشرنگ کے دوران جتنا غلہ صاف ہو کر آجائے گا، اس کا ایک خاص متعین حصہ یا فیصدی حصہ تھریشر والے کو دے دیا جائے گا۔ یہ صورت بھی اجارہ کی اسی قسم میں داخل اور ممنوع ہے۔

۲۔ متبادل جائز صورتیں:

اجارہ کی مذکورہ صورتوں کی آج کل کے علماء نے اجازت نہیں دی، ان کے بجائے اگر مزدور کی اجرت کسی کرنسی یا کسی اور متعین چیز میں مقرر کی جائے، جو مزدور کے عمل سے پیدا نہ ہو تو جائز ہے، البتہ ان کا جائز متبادل اور حل بھی موجود ہے، اس لیے اسے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے معاملات کی جائز متبادل صورتیں یہ ہیں:

۱۔ اس کا ایک جائز حل تو یہ ہے کہ مطلق اجرت ملے کی جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ مثلاً مزدور کے عمل سے جو چیز پیدا ہوگی، اس کے دس فیصد حصہ کے برابر حصہ مزدور کو بطور اجرت دے دیا جائے گا، لیکن یہ نہ کہا جائے کہ اسی چیز میں سے اس کو اجرت دی جائے گی جو اس کے عمل سے پیدا ہو رہی ہے۔ مثلاً مدرسہ کا سفیر جتنا چندہ لائے گا، اس کے دس فیصد حصہ کے برابر اس کو اجرت دی جائے گی، یا گندم کی صفائی سے جو غلہ حاصل ہوگا اس کے دس فیصد حصہ کے برابر تھریشر والے کو بطور اجرت دے دیا جائے گا، لیکن اجرت کی نسبت اسی چندہ کی رقم اور اسی گندم کی طرف نہ کی جائے، جو

یہ اور تہہ بیہ والے کے عمل سے پیدا ہوا ہے یعنی اس میں ایسا ہندہ اور ایسا نام سے اس کے لئے کیا گیا ہے تو جی جاتا ہے۔
اسی طرح ایسا شمال یہ بھی ہے کہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس نام کو پینے کے بعد آپ کو اس کا نام بطور اجرت دیا جائے گا (یہ
نہ ہے کہ اس میں سے کچھ ہی آئے ہیں۔ دے دے تو بھی جاتا ہے۔^(۱))

۴۔ وہی صورت یہ ہے کہ اگر کوئی بیانیہ انال ہندہ ہے اور اس میں کچھ تغیر و تبدل کرنے کے لیے کسی کو
مزدور رکھا جا رہا ہے تو اس پر کچھ حصہ دے۔ عمل کے پہلے ہی مزدور کو دے دیا جائے کہ تم جو کام کرو گے اس کی اجرت یہ
ہے۔ مثلاً آندم کی صفائی کے لیے تھریٹر والے کے ساتھ یوں معاملہ کر دیا جائے کہ پہلے سے ہی تھریٹر والے کو آندم کا
کچھ حصہ بطور اجرت دے کر الگ کر دیا جائے اور وہ اس کے بدلے بقیہ آندم کی صفائی کرے۔ اسی طرح اگر کسی پن چکی
والے سے آندم لیا جاتا ہے تو آندم کی کچھ مقدار پہلے سے ہی اس کو بطور اجرت دے دی جائے۔^(۲)

۸۔ اختتام اجارہ

اس عنوان کے تحت دو بنیادی نکات کی کچھ وضاحت کی جائے گی:

۱۔ شرعی مذر کی وجہ سے اجارہ کا معاملہ ختم کرنا

۲۔ اجارہ ختم کرنے کی وجوہات اور صورتیں

۱۔ شرعی مذر کی وجہ سے اجارہ کا معاملہ ختم کرنا:

اگر یہ داری کے دوران اگر کسی ایک فریق کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے کہ اس معاملہ کو جاری رکھنے میں
اس کا نقصان ہو رہا ہو اور اس نقصان سے بچ کر معاملہ جاری رکھنا ممکن نہ ہو تو اس کو ”عذر“ سمجھا جائے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ جس فریق کو عذر پیش آیا ہے کیا وہ عذر کی بنیاد پر معاملہ ختم کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں جمہور علماء کی رائے یہ
ہے کہ عذر لی بنیاد پر عقد اجارہ کو ختم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ بھی بیخ و غیرہ کی طرح ایک لازم عقد و معاملہ ہے۔ جبکہ فقہاء
تغییر کے ہاں ایسے عذر کی بنیاد پر معاملہ ختم کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر عذر کے باوجود صاحب عذر پر عقد اجارہ کو جاری رکھنا
لازم لیا جائے گا تو اس پر ایسا نقصان لازم آئے گا جس کا اس نے عقد میں التزام ہی نہیں کیا تھا، لہذا یہ ایک غیر ضروری
نقصان سے بچنے اور فاعل کرنے کا حق ہے جو صاحب عذر کو حاصل ہوگا۔^(۳)

^(۱) المحيط الدرہانی فی الفہم العمامی ۷/۲۷۲

^(۲) الدر المختار ۶/۵۶

^(۳) فہمہ المعاملات ۱/۱۱۵

۲۔ اجارہ ختم کرنے کی وجوہات اور اقسام:

فقہاء کی بیان کردہ تفصیلات کو سامنے رکھا جائے تو عقدِ اجارہ کو ختم کرنے کی وجوہات کو مندرجہ ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ پہلی قسم: اس میں وہ تمام وجوہات اور صورتیں داخل ہیں جن میں فریقین یا ایک فریق کے معاملہ ختم کرنے سے، معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی صورتیں یہ ہیں:

• دونوں فریقین باہمی رضامندی سے عقدِ اجارہ ختم کر لیں۔

• (خیار شرط) کسی فریق نے اپنے لیے کچھ دنوں تک اختیار رکھا تھا اس کو استعمال کر کے معاملہ ختم کرنا۔

• (خیار رؤیت) کرایہ دار نے کرایہ کی چیز پہلے دیکھی تھی، اور جائزہ لینے کے بعد اسے پسند نہیں آئی اور اس نے معاملہ ختم کر دیا۔

• (خیار عیب) کرایہ دار کو کرایہ کی چیز/مکان میں کوئی عیب نظر آیا، جس کی وجہ سے اس سے نفع حاصل کرنا

مشکل ہو تو خیارِ عیب کی وجہ سے اجارہ ختم کر سکتا ہے۔

• کرایہ کی چیز/مکان ٹوٹ جائے اور اس سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ رہے۔

• مالک مکان یا کرایہ دار مقررہ ہوا جائے اور اس کی وجہ سے دونوں کے لیے معاملہ جاری رکھنا ممکن نہ رہے، یا

کرایہ دار کو ضروری لمبا سفر درپیش ہو تو یہ بھی عذر ہے۔

۲۔ دوسری قسم: اس قسم میں وہ وجوہات یا صورتیں شامل ہیں جن میں عقدِ اجارہ خود بخود ہی ختم ہو جاتا ہے، کسی

فریق کو باقاعدہ معاملہ ختم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس میں مندرجہ ذیل صورتیں شامل ہیں:

• اجارہ کی مدت مکمل ہو جائے۔ یہ مدت مہینے کے اعتبار سے ہو، سال کے اعتبار سے یا تاریخ کے اعتبار سے۔

• مالک یا کرایہ دار میں سے کسی کا انتقال ہو جائے یا کوئی ایک مرتد ہو کر دار الحرب چلا جائے۔

• کرایہ دار کو کرایہ کا مکان وراثت میں مل گیا اور وہ خود اس کا مالک ہو گیا۔

• مالک نے کرایہ کا مکان اپنی ملکیت سے نکال دیا، مثلاً کسی کو گفٹ کر دیا یا صدقہ کر دیا۔

۳۔ تیسری قسم: اس قسم میں وہ وجوہات اور صورتیں شامل ہیں جن میں عقدِ اجارہ نہ خود ختم ہوگا، نہ کسی فریق کو

معاملہ ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ یہ صورتیں درحقیقت اعذار کے زمرے میں نہیں آتیں، بلکہ ان کو محض حیلے بہانے

کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

- مالک نے عقد اجارہ کے دوران کرایہ دار کو بھگانے کے لیے اپنا مکان بغیر کسی شرعی عذر اور مجبوری سے نہ بیچ دیا تو یہ عذر نہیں ہے اور اس کی وجہ سے معاملہ ختم نہیں ہوگا، نہ مالک معاملہ ختم کر سکتا ہے۔
- مالک کا اپنا ذاتی مکان گر گیا یا اس نے ذاتی مکان بیچ دیا تو یہ بھی عذر نہیں ہے کہ وہ کرایہ دار سے اپنی رہائش کے لیے مکان خالی کر دئے، بلکہ اس پر لازم ہوگا کہ اپنی رہائش کے لیے کوئی اور انتظام کر لے، مثلاً کوئی کھڑا کرایہ پر لے لے۔
- مالک مکان ایک لمبے عرصے کے لیے سفر پر جا رہا ہو تو یہ بھی ایسا عذر نہیں کہ معاملہ ختم کیا جائے۔
- مارکیٹ میں مکانات کا کرایہ بہت زیادہ بڑھ جائے، جبکہ مالک اور کرایہ دار نے ایک متعین کرایہ پر معاملہ کر لیا ہو تو یہ ایسا عذر نہیں ہے کہ مالک کرایہ داری کا معاملہ ختم کر دے۔ اسی طرح اگر مارکیٹ میں کرایہ بہت زیادہ کم ہو گیا تو اس کی وجہ سے کرایہ دار کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ معاملہ ختم کر دے۔^(۱)

۹۔ اجارہ کے عمومی ضوابط

- كلُّ ما أمکن الانتفاع به مع بقاء عینہ، صحَّت إجارته: جس چیز کی عین کو باقی رکھتے ہوئے اس سے نفع حاصل کرنا ممکن ہو، اس کو اجارہ پر دینا صحیح ہے۔
- كلُّ عملٍ فیہ منفعۃ وکان عملہ مباحاً فجازت الإجارۃ فیہ: جو عمل قابل نفع ہو اور شرعاً مباح عمل ہو، اس میں اجارہ جائز ہے۔
- الإجارۃ لا تنفسخ بغیر عذر: اجارہ عقد لازم ہے، بغیر عذر ختم نہیں کیا جائے گا۔
- الاستیجاز علی المعصیۃ لا یجوز: گناہ کے کام پر اجارہ جائز نہیں ہے۔
- الإجارۃ تفسد بالشروط الفاسدۃ: عقد اجارہ فاسد شرط لگائے جانے کی وجہ سے فاسد ہو جاتا ہے۔
- الإجارۃ لا یجوز تعلیقها بالشروط: عقد اجارہ کو کسی شرط پر معلق کرنا درست نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہہ دے کہ اگر میرا بیٹا زید آج آگیا تو یہ مکان میں نے آپ کو کرایہ پر دے دیا، ورنہ نہیں۔ یہ معاملہ شرعاً درست نہیں ہے۔
- الجهل بمقدار الأجرۃ مُفسد لعقد الإجارۃ: اجرت کی مقدار میں جہالت سے اجارہ کا عقد فاسد ہو جاتا ہے۔ لہذا کرایہ / تنخواہ کا معلوم و متعین ہونا ضروری ہے۔

- لا یصحُّ جَعْلُ الْأَجْرَةِ مِمَّا عَمِلَ فِيهِ الْأَجِيرُ: اس چیز کو اجرت میں طے کرنا درست نہیں جس میں اجیر نے عمل کیا ہے۔ اس ضابطہ میں ”اجارہ جزیء من العمل“ یا ”تفیز الطحان“ کا اصول بیان کیا گیا ہے۔
- إضافة الإجارة إلى وقتٍ مستقبلٍ جائزة: عقد اجارہ کو مستقبل کے کسی وقت کی طرف منسوب و مضاف کرنا درست ہے۔ مثلاً زید نے عمر کو اپنا مکان کرایہ پر دیتے ہوئے کہہ دیا کہ آئندہ ماہ کی یکم تاریخ سے کرایہ کا معاملہ شروع ہوگا۔
- كلُّ خيارٍ ثبت في البيع يثبت في الإجارة: ہر وہ اختیار (خیار عیب، خیار وصف وغیرہ) جو بیع میں ثابت ہے، وہ اجارہ میں بھی ثابت ہے۔
- الأجيرُ المشترِكُ ضامنٌ لما جنتَ يدهُ: اجیر مشترک کے ہاتھ سے نقصان ہو جائے تو وہ ضامن ہوگا۔
- يد الأجيرِ الخاصِّ يدُ أمانةٍ: اجیر خاص کا قبضہ، قبضہ امانت ہے۔ وہ بلا تعدی ضامن نہیں ہوگا۔
- الواجبُ في الإجارةِ الفاسدةِ أجره المثل: اجارہ فاسدہ میں اجیر کو اجرت مثل طے گی، بشرطیکہ وہ طے شدہ اجرت سے زیادہ نہ ہو۔ اس کی تفصیل بھی پہلے عرض کی جا چکی ہے۔
- الأجرُ والضمانُ لا يجتمعان: اجرت اور ضمان دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ یعنی کرایہ دار پر یا تو کرایہ لازم ہوگا یا جو چیز اس نے ضائع کی ہے اس کا ضمان و نقصان۔

۱۰۔ اجارہ کے چند جدید مسائل

۱۔ جمعہ کے دن کام کرنا:

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمعہ کے دن معمول کے کاموں سے خود کو فارغ کر کے اعمال جمعہ میں مشغول رہنا چاہیے اور یہی بہتر بھی ہے، لیکن بعض لوگ جمعہ کے دن کام کو ہی ناجائز سمجھتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ جمعہ کے دن مزدوری اور کام کر کے حلال رزق کمانا جائز ہے، البتہ اُس کے لیے ضروری ہے کہ جمعہ کی پہلی اذان کے بعد جمعہ کی طرف متوجہ ہو جائے، اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے نماز جمعہ ادا کرنے میں خلل آئے، البتہ نماز جمعہ کے بعد مزدوری کر سکتا ہے۔

قرآن کریم میں سورۃ الحجۃ^(۱) میں ارشاد ہے کہ جب جمعہ کے دن اذان ہو جائے تو ذکر اللہ کی طرف آؤ، یعنی نماز

جمعہ کے لیے آؤ اور بیچ (کاروبار) چھوڑ دو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان جمعہ سے قبل کاروبار کرنا جائز ہے، اسی طرح اٹلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کاروبار وغیرہ میں نکلنے کا حکم دیا ہے۔

بعض سلف صالحین سے منقول ہے کہ جو شخص نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کاروبار وغیرہ میں مشغول ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے ستر مرتبہ برکت نازل فرماتے ہیں۔^(۱)

۲۔ پنشن کی رقم کی شرعی حیثیت:

حکومت کی طرف سے ملنے والی پنشن کی رقم عطیہ ہے یا اجرت؟ یہ سوال اہم ہے کیونکہ اگر اسے عطیہ قرار دیا جائے تو یہ رقم مرحوم کے ترکہ میں شامل نہ ہوگی، بلکہ جس کے نام پنشن آئے گی، وہی اس کا مستحق ہوگا، لیکن اگر اسے اجرت قرار دیا جائے تو یہ رقم ترکہ میں شامل ہو کر تمام ورثاء میں تقسیم ہوگی۔

اگر غور کیا جائے تو ملازم کو موت یا ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن کے نام سے جو رقم ملتی ہے اس کی حیثیت میں دو احتمال ہیں:

الف۔ پنشن کو ادارے کی طرف سے ملازم کے لیے عطیہ اور گفٹ قرار دیا جائے، کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جن ملازمین نے اس ادارے میں خدمات انجام دیے ہیں اور اب جبکہ وہ روزگار سے معذور ہو رہے ہیں تو ان کی سابقہ خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی آئندہ زندگی کے گزارے کے لیے بطور گفٹ کچھ رقم دی جائے۔ ہمارے اکابر نے اسی بنیاد پر پنشن کی رقم کو گفٹ قرار دے کر میت کے ترکہ میں شامل نہ ہونے کی تصریح کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ ادارہ جس وارث کو یہ رقم دے گا وہی اس کا مالک ہوگا۔

ب۔ پنشن کے بارے میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ اسے اجرت کا حصہ قرار دیا جائے، کیونکہ اگرچہ اس کا نام عطیہ اور گفٹ رکھا گیا ہے، لیکن چونکہ اس عطیہ کا ملنا ملازمت کی شرائط کا حصہ ہے اور ملازم کا قانونی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازم اپنے اس حق کا قانونی طور پر بذریعہ عدالت بھی مطالبہ کر سکتا ہے۔ اگر یہ محض عطیہ ہوتا تو بذریعہ عدالت اس کے مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہ ہوتا۔ لہذا پنشن کا مطلب یہ ہوا کہ ملازم اگر چند سال ادارے کے پاس ملازمت کرے تو ہر ماہ اس کام کے عوض تنخواہ بھی ملے گی اور پھر معاہدہ کے مطابق طے شدہ مدت ملازمت پوری ہونے پر گذشتہ خدمات کے عوض پنشن کی صورت میں کچھ رقم مزید بھی ملے گی، تو درحقیقت یہ ”اجرت موجدہ“ ہے اور مرنے والے کے ترکہ میں شامل ہو کر سب ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگی۔ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت مدظلہم نے بھی اسی رائے

کی طرف رجحان ظاہر کیا ہے۔^(۱)

البتہ پیش کی رقم کو عطیہ کہا جائے یا خدمات کا عوض (اجرت)، دونوں صورتوں میں یہ رقم اس وقت ملکیت میں آئے گی جب اس پر ملازم یا اس کا کوئی نائب باقاعدہ قبضہ کر لے۔ جب تک یہ رقم انسان کی ملکیت میں نہیں آئے گی، اس وقت تک اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

۳۔ جانوروں کی جھنتی پر اجرت لینا:

احادیث مبارکہ میں جانور کو نسل بڑھانے کے لیے اجرت پر دینے سے منع کیا گیا ہے، لہذا اس مقصد کے لیے جانور کو دینا اور اس پر طے کر کے اجرت لینا جائز نہیں، البتہ اس کے متبادل کے طور پر درج ذیل طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے:

۱۔ جانور دیتے وقت کوئی رقم طے نہ کی جائے، بلکہ طے کیے بغیر جانور کو نسل بڑھانے کے لیے لے کر جانے والا

شخص بطور اکرام مالک کو کچھ دے دے تو اس کا لینا شرعاً جائز ہے۔^(۲)

۲۔ یا یہ صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ مثلاً ایک دن کے لیے مالک سے بھینسا بادر براداری یا کسی اور مقصد کے

لیے کرایہ پر لے لیا جائے اور مالک سے اس کے جانور کو بھینسوں پر چھوڑنے کی اجازت بھی لے لی جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

۳۔ یا مادہ جانور (مثلاً گائے) کا مالک ایک دن کے لیے اپنا جانور ایسے شخص کو دے دے جس کے پاس نہ جانور

(مثلاً تیل) موجود ہو اور اس کو کہے کہ اس جانور کی خدمت کرے اور چارہ وغیرہ ڈالے اور اس کام کی اجرت طے کر لی

جائے جو نہ جانور کے مالک کو ادا کی جائے گی اور اس دوران نہ جانور کا مالک اپنا تیل، گائے پر چھوڑ دے، تو یہ بھی جائز ہے۔

۴۔ جانور کو بنائی پر دینا:

آج کل جانور کو بنائی پر دینے کا بھی رواج ہے، جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک آدمی جانور خرید کر دوسرے کو

اس شرط پر پالنے کے لیے دے دیتا ہے کہ وہ اس کی پرورش کرے اور کچھ عرصہ بعد جب جانور بڑا ہو جائے یا مہنگا ہو جائے

تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت آپس میں طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لی جاتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پالنے کے لیے دیے گئے جانور کو فروخت کرنے کے بجائے یہ طے ہوتا ہے کہ اس

جانور کی جو نسل بڑھے گی، اس میں دونوں شریک ہوں گے اور جانور کے بچے فروخت کر کے جو قیمت حاصل ہوگی وہ آپس

^(۱) فقہ البیہق ۱/۳۵۷

^(۲) سنن الترمذی ۳/۵۷۳، حدیث نمبر: ۱۲۷۴

میں تقسیم کر لیں گے۔

مذکورہ بالا دونوں صورتیں فقہاء حنابلہ کے ہاں جائز ہیں، کیونکہ یہ منافع پر مضاربت کے زمرے میں آتی ہیں، لیکن فقہاء حنفیہ کے ہاں درست نہیں ہیں، کیونکہ یہ اجارہ (کرایہ داری) کا معاملہ ہے جس میں جانور پالنے والے (اجیر) کی اجرت مجہول اور نامعلوم ہے، اس کے بجائے درج ذیل دو طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ جو جانور کا مالک ہے وہ دوسرے کو اس جانور کا آدھا حصہ فروخت کر دے، اس کے بعد اس کی قیمت معاف کر دے اور دوسرے آدمی کو کہہ دے کہ تم بلا اجرت اس کی پرورش کرو اور دوسرا آدمی اس پر راضی ہو جائے تو اس طرح یہ جانور ان دونوں میں آدھا آدھا مشترک ہو گا اور بعد میں جب فروخت کیا جائے گا تو جانور فروخت کرنے سے حاصل ہونے والی قیمت کو باہم آدھا آدھا تقسیم کر لیں۔ تاہم اس صورت میں پرورش کرنے والا چارے کا نصف خرچہ اصل مالک سے وصول کر سکتا ہے اور چاہے تو معاف بھی کر سکتا ہے۔

۲۔ جانور کا مالک اپنے جانور کا آدھا حصہ دوسرے پر فروخت کر کے اس کی قیمت اس سے وصول کر لے اور پھر اس کو جانور میں سے اپنے آدھے حصے کی حفاظت و پرورش کے لیے مزدور رکھ کر اس کو وہی قیمت بطور اجرت دے دے جو اس نے پرورش کرنے والے سے لی تھی، بعد میں جانور فروخت ہو تو قیمت دونوں میں آدھی آدھی تقسیم کی جائے گی اور جانور کے بچے بھی دونوں میں مشترک ہوں گے۔

۵۔ ناجائز کام کے لیے جگہ کرایہ پر دینا:

ناجائز کام کے لیے اپنی جگہ کرایہ پر دینے کے جواز و عدم جواز کا تعلق درحقیقت ایک اور مسئلہ سے ہے جس کو "امانت علی العصیۃ" کہتے ہیں۔ پہلے اس کو سمجھنا ضروری ہے:

اگر عقد میں گناہ کے کام میں تعاون کا قصد وارد ہو، یا نفس عقد میں کسی ایک فریق کی طرف سے معصیت کی تہ تیغ اور وضاحت کر دی جائے تو یہ معاملہ "امانت علی العصیۃ" ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ اسی طرح اگر نفس عقد تو مطلقاً بوجہی اس میں ناجائز کام کرنے کی صحت نہ ہو، لیکن کرایہ پر دی جانے والی جگہ خاص اس طرز کی بنا کر دی جائے جس میں ناجائز کام نہ انجام دینے جائیں، تو اس طرح معاملہ کرنا بھی ناجائز ہے۔

البتہ اگر کرایہ دار کو جائز مقصد میں استعمال کرنے کے لیے جگہ کرایہ پر دی جائے، یا عقد مطلق کیا جائے، عقد میں ناجائز مقصد کے لیے استعمال کی صحت نہ کی جائے، لیکن کرایہ دار کے ہارے میں مالک مکان/زمین کو معلوم ہو کہ وہ اس کو ناجائز مقصد میں استعمال کرے، تاہم اس صورت میں حضرت امام ابو حنیفہ اور حضرات صاحبین کا اختلاف ہے، امام

ابو حنیفہؒ کے نزدیک فی نفسہ کرایہ کا معاملہ اگرچہ درست ہو جائے گا، لیکن گناہ کا موجب ہو گا۔^(۱)
اس کے بعد چند صورتیں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ سودی بینک کو جگہ کرایہ پر دینا:

سودی بینک میں چونکہ اکثر معاملات ناجائز ہوتے ہیں، اس لیے اگر عقدِ اجارہ میں صراحۃً بینک کے لیے شاخ بنانے کا مقصد پیش نظر نہ ہو، لیکن مالک کو معلوم ہو کہ یہاں شاخ قائم کی جائے گی تو ایسی صورت میں سودی بینک کو جگہ کرایہ پر دینا مکروہ ہے۔ اور اگر کرایہ داری کے معاہدہ میں اس بات کی صراحت ہو کہ یہاں سودی بینک کی شاخ قائم کی جائے گی تو اس طرح سودی بینک کو جگہ کرایہ پر دینا جائز نہیں، بلکہ سبب کے درجہ میں اس معاہدہ میں شامل ہونے کا گناہ ہے، جس سے اجتناب کرنا لازم ہے۔ البتہ اگر کسی نے سودی بینک کے ساتھ معاملہ کر لیا ہو اور اپنی جگہ اُسے کرایہ پر دے دی ہو تو حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عقدِ اجارہ منعقد ہو جائے گا اور کرایہ دار پر قضاءِ اجرت لازم ہوگی اور حاصل شدہ آمدنی کو حرام بھی نہیں کہا جائے گا۔

۲۔ انشورنس کمپنی کے لیے جگہ کرایہ پر دینا:

مروجہ انشورنس کمپنی کے معاملات ربا، قمار اور غرر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہیں، اس لیے اس کمپنی کو جگہ کرایہ پر دینے میں وہی تفصیل ہے جو سودی بینک کو کرایہ پر دینے کے بارے میں ہے۔

۳۔ شراب فروخت کرنے کے لیے جگہ کرایہ پر دینا:

شراب فروخت کرنے کے لیے جگہ کرایہ پر دینے کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی نے اس نیت کے ساتھ جگہ کرایہ پر دی کہ کرایہ دار اس میں شراب فروخت کرے یا عقدہ میں اس کی وضاحت تھی تو یہ معاملہ جائز نہیں، البتہ اگر کسی نے جگہ کرایہ پر دے دی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عقدِ اجارہ فی نفسہ منعقد ہو جائے گا، لیکن گناہ کا موجب ہو گا، اس لیے حتی الامکان اس معاملہ کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۴۔ اجارہ میں بطور ضمانت رقم لینا:

اجارہ میں مالک مکان یا مالک زمین کے لیے کرایہ کے علاوہ بطور ضمانت کچھ رقم ایڈوانس لینا جائز ہے، اس رقم کا اصل حکم تو یہ ہے کہ یہ رقم مالک مکان کے پاس امانت ہے، لیکن چونکہ مالک مکان کا اس رقم کو استعمال کرنا عام ہو چکا ہے

اور کرایہ دار کی اجازت بھی ہوتی ہے، اس لیے اسے ”إجارة بشرط القرض“ قرار دیا جائے گا، اور اس شرط کا چونکہ عرف عام ہو چکا ہے، اور اس میں مقرض (کرایہ دار) کو اس قرض پر کوئی نفع بھی نہیں مل رہا، اس لیے یہ اجارہ جائز ہے۔ البتہ اس ضمانت کی رقم کی وجہ سے کرایہ میں کمی کرنا جائز نہیں ہے۔^(۱)

۷۔ ٹول ٹیکس (Toll Taxes)

آج کل اکثر ممالک میں سڑک پر گزرنے کا کرایہ ”ٹول ٹیکس“ کے نام سے وصول کیا جاتا ہے۔ کہیں اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب گاڑی کسی خاص سڑک پر داخل ہوتی ہے تو وہاں کاؤنٹر (counter) پر ٹکٹ لے کر ٹیکس ادا کر دیتی ہے اور کہیں پر ایسا ہوتا ہے کہ سڑک پر داخل ہوتے وقت صرف ٹکٹ یا ٹوکن لے کر جب اس سڑک سے گاڑی باہر نکلتی ہے تو وہاں کے کاؤنٹر (counter) پر ٹکٹ یا ٹوکن دیکر کرایہ / ٹیکس ادا کر دیتی ہے۔ یہ ٹیکس مختلف گاڑیوں کا مختلف ہوتا ہے اور کہیں اس میں مسافت کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ جو گاڑی سڑک پر جتنی زیادہ مسافت طے کرتی ہے، اتنا زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ شرعی اعتبار سے ”اجارہ“ میں آتا ہے اور اگرچہ زبانی طور پر ایجاب و قبول نہ ہو، لیکن عملی طور پر یہ معاملہ منعقد ہو کر مکمل ہو جاتا ہے اور شرعی اعتبار سے درست ہے۔

۸۔ پارکنگ کا کرایہ (Parking)

آج کل یہ ایک معمول بن چکا ہے کہ لوگ جب کسی خاص جگہ گاڑی کھڑی کرتے ہیں تو اس جگہ کا کرایہ ادا کرتے ہیں، اس کی آج کل تین صورتیں رائج ہیں:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ گاڑی کھڑی کرنے والے کو ٹکٹ دے کر اس سے یکمشت کرایہ وصول کر لیا جاتا ہے، خواہ کتنی دیر تک گاڑی اس جگہ میں کیوں نہ رہے۔ یہ ایک ”اجارہ“ کا معاملہ ہے اور اس میں جگہ، کرایہ اور منفعت وغیرہ تو معلوم ہے، لیکن عموماً اس صورت میں مدت اور ٹائم معلوم نہیں ہوتا کہ کتنی دیر تک اس جگہ پر گاڑی رہے گی۔ بظاہر اس وجہ سے یہ معاملہ درست معلوم نہیں ہوتا، لیکن اس صورت میں جو ٹکٹ دیا جاتا ہے وہ صرف اسی روز کے لیے قابل استعمال ہوتا ہے، بلکہ عموماً ٹکٹ پر اس کی تاریخ بھی درج ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں مدت معلوم ہے جو کہ ایک دن ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ مکمل دن کو استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی خوشی سے دن مکمل ہونے سے پہلے ہی گاڑی لے جاتے ہیں۔ لہذا یہ معاملہ شرعاً درست ہے۔

۲۔ پارکنگ کے کرایہ کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ فی گھنٹہ کے حساب سے کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں کوئی شرعی خرابی نہیں ہے اور یہ بھی جائز ہے۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ اپنے یومیہ معمول کے مطابق کسی خاص جگہ پر یومیہ گاڑی کھڑی کرتے ہیں، وہ لوگ پارکنگ والوں کے ساتھ ماہانہ یا سالانہ معاہدہ کر لیتے ہیں اور لم سم رقم بطور کرایہ ملے کر لی جاتی ہے۔ یہ صورت بھی شرعاً درست ہے، کیونکہ اس صورت میں جگہ، کرایہ، منفعت اور مدت سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔

۹۔ ہائر پزیز (Hire Purchase)

کرسٹل بینک سے گاڑی خریدنے یا کرایہ پر لینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کو عربی میں ”البيعه الإيجاري“ کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی بینک یا ادارہ سے گاڑی یا کوئی اور چیز کرایہ پر لیتا ہے اور اس کی ماہانہ یا خاص اوقات میں کرایہ کی قسطیں ادا کرتا رہتا ہے۔ کرایہ کی ان قسطوں کو گاڑی وغیرہ کی قیمت میں شمار کیا جاتا ہے اور جب وقت اور کرایہ کی قسطیں مکمل ہو جاتی ہیں تو کرایہ پر لینے والا شخص اس گاڑی کا خود بخود مالک ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ معاملہ ابتداء میں کرایہ داری کا ہوتا ہے، لیکن اس کا اختتام بیع پر ہوتا ہے۔^(۱)

یہ معاملہ شرعاً جائز نہیں ہے اور اس کے ناجائز ہونے کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ معاملہ ”بیع“ اور ”اجارہ“ کے درمیان متردد ہے، کیونکہ اس میں کرایہ کی قسطوں کو بھی قیمت شمار کیا جاتا ہے، لہذا نہ تو یہ مکمل طور پر بیع ہے اور نہ ہی اجارہ، بلکہ دونوں کا مرکب و مجموعہ ہے جس کی شریعت میں کوئی نظیر نہیں ملتی، اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کرایہ داری کی مدت کے دوران چیز تو مالک (بینک) کی ملکیت میں ہوتی، لیکن وہ کسی قسم کا رسک اور ضمان برداشت نہیں کرتا، بلکہ اگر کرایہ پر دی ہوئی چیز (گاڑی وغیرہ) کو کوئی نقصان لاحق ہو جائے تو بہر صورت کرایہ دار ہی ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ اجارہ کا اصول ہے کہ کرایہ دار کی غفلت و تعدی کے بغیر جو نقصان ہو جائے وہ مالک کے ذمہ ہوگا۔

۳۔ اس معاملہ میں تیسری خرابی یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کرایہ پر دی ہوئی چیز قابل استعمال نہ رہے تو اس کے بعد بھی مالک (بینک) کرایہ دار سے کرایہ وصول کرتا رہتا ہے، یہ بھی اجارہ کے اصولوں کے خلاف ہے، کیونکہ اصول یہ ہے کہ اگر کرایہ پر دی ہوئی چیز قابل استعمال نہ رہے تو اس کے بعد کرایہ دار پر کرایہ لازم نہیں ہوتا۔

۴۔ اسی جیسی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ جب کرایہ داری کا معاملہ ہو جائے تو اس کے فوراً بعد کرایہ دار پر کرایہ کی ادائیگی لازم سمجھی جاتی ہے، اگرچہ کرایہ پر دی ہوئی چیز کے حوالہ لرنے میں وقت لگ جائے۔ یہ بھی اجارہ کے اصولوں کے خلاف ہے، کیونکہ کرایہ دار پر اس وقت کرایہ لازم ہو ناشر و ع ہو جاتا ہے جب چیز اس کے قبضہ میں دے دی جائے۔

۱۰۔ پگڑی:

کرایہ داری کے معاملات میں آج کل عموماً مالک، کرایہ دار سے ایڈوانس میں کچھ رقم یکمشت لیتا ہے، ایسی رقم کی

دو صورتیں ہیں:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ کرایہ داری کی صورت میں ایڈوانس کچھ رقم وصول کرنا اور کرایہ داری کی مدت ختم ہونے اور دکان / مکان واپس کرنے کی صورت میں یہ رقم واپس کرنا اور اگر کرایہ دار نے کچھ نقصان کیا ہو یا بجلی وغیرہ کا بل ادا نہ کیا ہو تو اس کو ایڈوانس رقم سے لے کر باقی رقم واپس کرنا۔ یہ صورت شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ اس رقم کی وجہ سے کرایہ میں عام متعاد کرایہ سے کمی نہ کی جائے۔

۲۔ ایڈوانس رقم لینے کی دوسری صورت پگڑی کی ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مکان یا دکان کو کوئی مدت طے کیے بغیر کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ کے علاوہ کچھ نقد رقم یکمشت وصول کر لیتا ہے۔ اس نقد رقم کی ادائیگی کے ذریعے کرایہ دار کو اس بات کا حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس معاملے کو جب تک چاہے اپنے اختیار سے باقی رکھے۔ پھر بعض اوقات کرایہ دار اپنا یہ حق دوسروں کو منتقل کر دیتا ہے اور اس سے یہ رقم بمع اضافہ کے لے لیتا ہے اور مالک اس سے کچھ اپنا حصہ بھی وصول کرتا ہے، پھر اگر مالک مکان یا دکان اپنا مکان یا دکان واپس لینا چاہے تو اس کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ کرایہ دار کو اتنی رقم دے جس پر دونوں راضی ہوں۔ پگڑی کی یہ صورت رشوت ہے اور حرام ہے اور اس سے نفع حاصل کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

اس معاملہ (پگڑی) کے جواز کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ متعین طور پر پچاس یا سو سال کی ایک طے شدہ مدت کے لیے مکان یا دکان کرایہ پر لینے اور دینے کا معاملہ کریں اور کرایہ ماہوار طور پر طے کر لیں، پھر کرایہ کا اکثر حصہ باہمی رضامندی سے پیشگی لے لیں اور باقی کرایہ ماہوار لے لیا کریں۔ اس صورت میں کرایہ دار اس کو یہ مکان یا دکان کرایہ پر دینا چاہے تو اس مقررہ پچاس یا سو سال کی مدت تک دے سکتا ہے اور اس صورت میں کرایہ دار اس جگہ سے دستبرداری کا معاوضہ بھی لے سکتا ہے اور مالک مکان یا دکان اس کرایہ دار کو اس مقررہ مدت سے پہلے اس جگہ سے نہیں نکال سکتا۔^(۱)